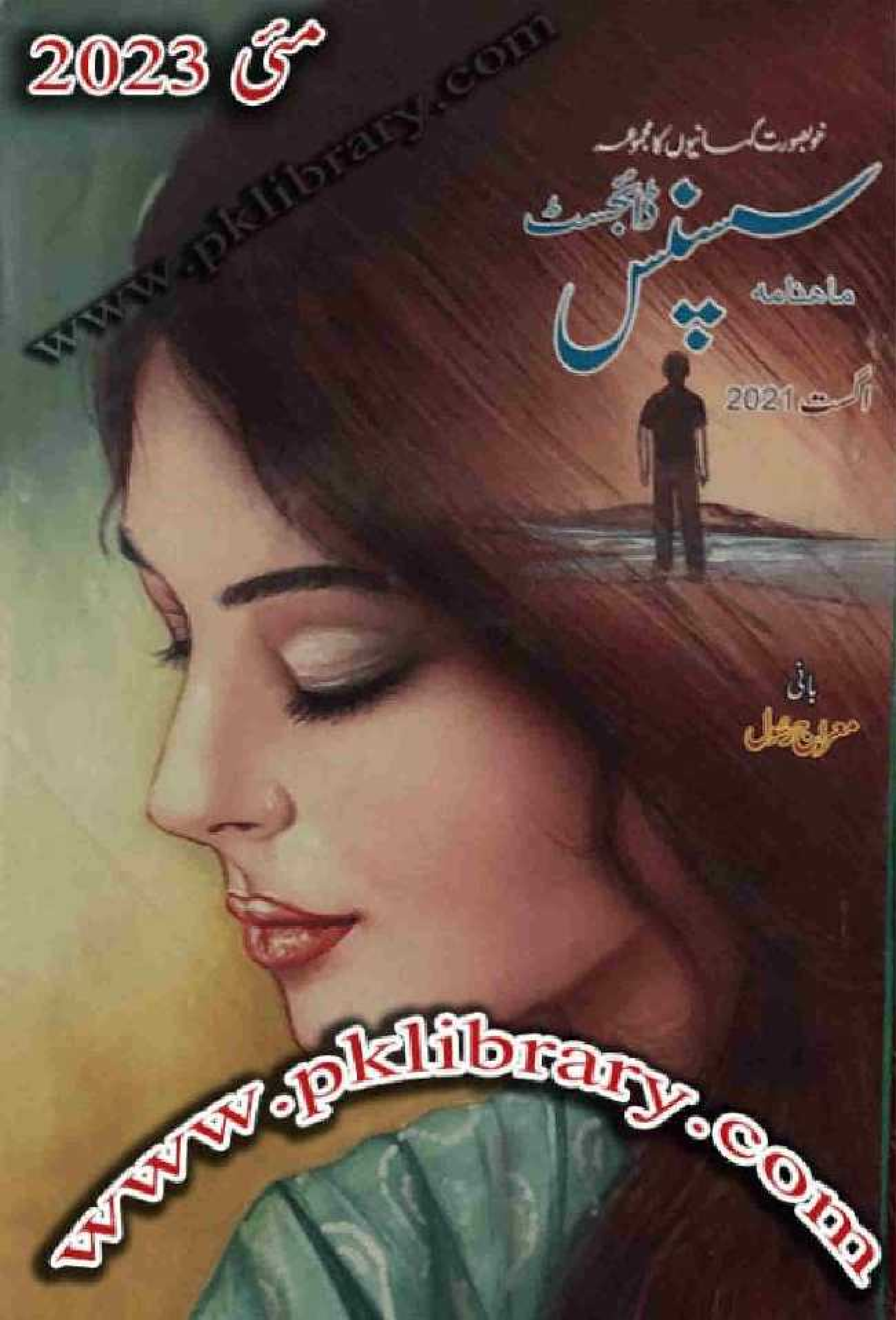

مئی 2023
خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ
سسپنس ڈائجسٹ
اگست 2021
بانی
معراج رسول
www.pklibrary.com
www.pklibrary.com

سسپنس ڈائجسٹ

مدیرِ اعلیٰ
عذرا رسول

مدیرہ
[illegible] احمد

نائب مدیر
اطہر حسین

مارکیٹنگ منیجر
محمد شہزاد خان
0333-2256789

سرکولیشن منیجر
سید شبیر حسین
0333-3285269
محمد شہزاد خان
0333-2256789

جلد 52 • شمارہ 05 • مئی 2023 • زرِ سالانہ 2400 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 180 روپے •
خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون (021) 35895313 E-mail:jdpgroup@hotmail.com

زبان
109

زندگی کے اہم معاملات میں زبان سے مکر جانے والوں کا انجام

مردود
[illegible]

دنیا کی [illegible] چاہنے والی [illegible] کی سازشوں کا [illegible]

محفلِ شعر و سخن
[illegible]

[illegible]

سایا
119

خاندانی ملکیت پر قبضہ کرنے کی ایک خوفناک سازش کا احوال

جنگ باز
[illegible]

[illegible] ایک جنگ باز کی [illegible] داستان

طریقۂ واردات
[illegible]

حیران کر دینے والے ایک [illegible] چور کا طریقۂ واردات

چھینا عقاب
[illegible]

[illegible]

شاکا
[illegible]

[illegible] سے جنم لینے والی ایک لرزہ خیز داستان

اسیر
[illegible]

[illegible]

ڈاکٹر [illegible]
[illegible]

[illegible]

پبلشر و پروپرائٹر [illegible] 63-C [illegible] کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

انشائیہ

جون ایلیا

آخری المیہ

شام ہے، افق لالہ فام ہے اور فضا سے کلام ہے مگر چند لمحے سے میں اور میرا ہمزاد ابھی چند لمحے پہلے بیسویں صدی اور خاص طور پر بیسویں صدی کے اس دوسرے آدھے حصے کے نفع و نقصان کا حساب لگا رہے تھے اور اس کی سیاسی، اخلاقی، نفسیاتی اور عمرانی صورت حال کو معرض گفتگو میں لا رہے ہیں۔

ہم وہ لوگ اس دور کے ایک غالب رجحان اور میلان کے باعث بہت بہت شکن، تشویش اور بہت مایوس کن خدشوں میں مبتلا ہیں۔ ہمارے اردگرد سانس لینے والے جاندار، ہماری تشویش اور خدشوں کو شاید وہم اور مالیخولیا خیال کریں لیکن ان کے کسی خیال سے ہمارے مسئلے اور معاملے کی سنگینی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جو کچھ ہے، وہ ہے۔

انسان نے گزشتہ چند صدیوں کے دوران میں خاص طور پر گزشتہ چار ساڑھے چار صدیوں کے دوران میں علمی اور فنی (تکنیکی) ارتقا کا جو عالی شان سفر طے کیا ہے، وہ نوعِ انسانی کے ذہنی اعجاز کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ صدیاں علم اور فن (ٹیکنالوجی) کے درجہ بدرجہ اوج اور عروج، حیران کن اوج اور عروج کی صدیاں رہی ہیں اور بیسویں صدی کا یہ دوسرا حصہ تو ان روشن سے روشن تر اور روشن ترین صدیوں کا حاصل ہے۔

اس دور کو خوش حال اور منطقی اور شائستگی کا سب سے زیادہ زریں دور ثابت ہونا چاہیے تھا لیکن یہ حقیقت کس قدر اذیت ناک حقیقت ہے کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اس برعکس حقیقت کے ذمے دار وہ لوگ ہیں جنھیں صاحبان امر و قدر کی حیثیت حاصل ہے۔ دنیا کے ان صاحبان امر و قدر نے اپنے آپ کو بدترین انداز میں نااہل، ناہنجار اور نابکار ثابت کیا ہے۔

پتھر کے دور کے انسانوں کا کوئی ایک گروہ بھی دوسرے گروہ کے حق میں اتنا مہیب، مدہش اور مہلک نہیں رہا جتنا مہیب، مدہش اور مہلک بیسویں صدی میں رہا ہے۔ تاریخ کی جتنی تباہ کن لڑائیاں علم اور فن کی اس سب سے پُرمایہ صدی میں لڑی گئی ہیں، اتنی تباہ کن لڑائیاں وحشت، بہیمیت اور بربریت کے بدترین دور میں بھی نہیں لڑی گئیں۔

بیسویں صدی کا کیا مطلب ہے؟ بیسویں صدی کا مطلب ہے لاکھوں برس کی انسانی ریاضت، علم، تحقیق، ہنرمندی، کاریگری (ٹیکنالوجی) اور مہارت کے کمال کی سب سے تابندہ، درخشندہ اور درخشندہ صدی۔ اس صدی کو تو انسانی تاریخ کی سب سے زیادہ سکون بخش، فرحت ناک اور جاں فزا صدی ہونا چاہیے تھا۔ اس صدی کے انسانوں کو گزشتہ تمام صدیوں کے انسانوں سے کہیں زیادہ انسانیت دوست انسانوں، نفیس انسانوں کی حیثیت سے سامنے آنا چاہیے تھا۔

تاریخ کے شریف اور لطیف انسان لاکھوں برس سے انسانیت کی خجستگی، فیروز مندی اور خرسندی کے جو خواب دیکھتے چلے آئے ہیں، اس صدی کو ان خوابوں کی روح پرور ترین تعبیر ثابت ہونا تھا لیکن کیا ایسا ہوا؟ یہ شرمناک ترین اور اشتعال انگیز ترین حقیقت ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔

میں نے بیسویں صدی کے اس آخری دور کی بات کی تھی۔ بیسویں صدی کا یہ آخری عشرہ اپنے مزاج میں انتہائی وحشیانہ دور ثابت ہو رہا ہے۔ اس حقیقت کا ثبوت وہ نسلی، لسانی، سیاسی اور مذہبی تعصبات ہیں جو شرق و مغرب کے اعصاب پر بری طرح طاری ہیں۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے اس صورت حال کے ذمے دار مہذب انسانیت کے سردھرے ہیں۔ ان ارجمند سردھروں نے ذہنی توازن کھو دیا ہے، بری طرح کھو دیا ہے۔ ان کا وجود تاریخ کی انتہائی بیہودہ مسخرگی ثابت ہو رہا ہے۔ یہ عالمی ٹولا صحت مند انسانیت کے حق میں ایک زہریلی گندگی کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس عہد کے شائستہ اور شریف ذہنوں کا جو سب سے بڑا فرض ہے، وہ تعصبات کے عالمی رجحان کے خلاف جنگ کرنا ہے۔ یہ جنگ بیک وقت شعور اور جذبے کے ساتھ کی جانی چاہیے۔ اگر یہ جنگ نہ کی گئی تو انسانیت کا تمام تر سرمایہ تباہ و برباد ہو جائے گا۔ انسان کی لاکھوں برس کی علمی، فنی اور تہذیبی کمائی نیست و نابود ہو کر رہ جائے گی اور یہ کہکشاؤں کی کائنات کا شاید سب سے بڑا حادثہ، سب سے بڑا اور آخری المیہ ہوگا۔

☆☆☆

معزز قارئین!
السلام علیکم!

جناب مئی 2023ء کا سسپنس گرمی کی آمد کا اعلان کرتے ہوئے آپ کے ہاتھوں میں ہے اور تمام مسلمانانِ عالم ماہِ رمضان کی باسعادت گھڑیوں میں رحمتوں اور برکتوں سے مستفیض ہو رہے ہیں۔ اگرچہ کسی بھی حوالے سے کوئی بھی اہم ایام ہوں یا تہوار... موجودہ مسائل ان کی خوشگواریت کو دل سے محسوس ہی نہیں کرنے دیتے جبکہ تمام دنیا میں کوئی بھی تہوار ہو، اشیا کی قیمتیں کم کر کے ان کی خوشیوں میں اپنا حصہ ڈالا جاتا ہے اور ہمارے ملک میں... معاشی بدحالی کے حوالے سے مغربی ممالک کی طرح ہر گھر کا ہر فرد کمانے پر مجبور ہے مگر... مغربی ممالک کی طرح سہولتیں اور حکمران کہاں سے لائیں... جو اپنے عوام کو ایمانداری سے ان کے حقوق کی ادائیگی میں انہیں آسانیاں فراہم کرتے ہیں... مگر یہاں تو حکومت کی نظر اپنے مفاد پر... اور اپوزیشن کی توجہ خامیاں تلاش کرنے پر لگی رہتی ہے... جبکہ ملک یا حالاتِ حاضرہ پر نظر رکھتے ہوئے بھی بہت سی چیزوں کو نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ جانے والے کل سے عبرت اور آنے والے کل کی دوڑ کسی کو فکر ہے نہ مسائل کا حل کسی کے پاس ہے۔ پاکستان کی معاشی بنیاد کو کمزور کرنے میں پاکستان کی بڑھتی ہوئی آبادی کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ دوسرے سب سے بڑے شہر سے دوسرے شہر میں منتقلی کا شدید ترین رجحان ہے جو اب ایک مسئلہ اور گھمبیر صورت اختیار کرتا جا رہا ہے... جبکہ رمضان اور عید کے دنوں میں پیشہ ور بھکاریوں کی بڑی تعداد میں دوسرے شہروں سے منتقلی اور پھر مستقل قیام... کسی بھی شہر کا سکون برباد کرنے کے لیے کافی ہے۔ چھوٹے سے روزگار کے نام پر بے تحاشا آنے والوں کو اگر روکا نہ گیا تو شاید ایک دن مقامی آبادی کا نام و نشان تک مٹ جائے گا... قتل و غارت گری اور ڈاکہ زنی جیسے واقعات اسی کا شاخسانہ ہیں... آئے روز بڑھ رہے ہیں کہ شہریوں کے دلوں میں انجانے خوف اور دہشت نے جگہ بنا لی ہے اور غیر مقامیوں کی بے جا منتقلی کی وجہ سے ہی مقامی شہریوں کے لیے روزگار کی تنگی اور اشیا کی فراہمی میں مشکلات جیسے مسائل پیدا ہو رہے ہیں... یہ کاروباری افراد جو اشیا کی قیمتوں کا تعین منافع کے نام پر اپنی مرضی سے کرتے ہیں کیونکہ کوئی چیک اینڈ بیلنس نہیں... معقول ہوں یا غیر معقول... حکومتی ادارے اور ایسے ہی افراد کی من مانیوں کی وجہ سے عوام کی دسترس سے دور ہوتی جا رہی ہیں... اسکولوں میں تعلیم کا معیار، اسپتالوں میں علاج کی سہولتوں کا فقدان اور دواؤں کی قلت... سڑکوں پر ٹریفک کا اژدحام... اس طرح کے مسائل منہ کھولے اژدہے کے مانند منہ کھولے کھڑے ہیں... جب تک وسائل اور تقسیم میں توازن قائم نہیں ہوگا تب تک مسائل حل نہیں ہوں گے۔ بااختیار طبقے کو اپنی ذاتی جنگ بھلا کر اگر ہو سکے تو ذاتی مفادات سے نظریں ہٹا کر ان قومی مسائل پر بھی گہری نظر ڈالنی چاہیے... اپنی زمین اور اپنے رشتوں سے محبت کا عملی ثبوت دینا ہر محبِ وطن کا فرض ہے... ہجرت تو ایک مجبوری کا نام ہوتا ہے... اپنے وطن کے مسائل سے ہجرت تکلیف دہ قدم ہے جس کا نتیجہ ہمیشہ تباہ کن نکلتا ہے... امید ہے کہ اربابِ اختیار اس بڑے شہر کے بڑھتے ہوئے گمبھیر مسائل میں سے ان چند مسائل پر سنجیدگی سے غور کرتے ہوئے ان کی روک تھام کے لیے جلد ہی کوئی مناسب حل ضرور تلاش کریں گے اور قرار دینے والے ان مسائل سے صرفِ نظر کرتے ہوئے تمام اہلیانِ وطن کو عید کی ڈھیروں مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ اللہ پاک ہم سب کو ہدایت اور روزوں کی رحمتوں، برکتوں اور بخششوں کی سوغات سے ہمارا دامن بھر دے اور میٹھی عید کی میٹھی خوشیاں ہم سب کو نصیب فرمائے مگر ایسے میں ہمیں ان ناداروں کا بھرپور خیال رکھنے کی بھی شدید ضرورت ہے جو اپنی سفید پوشی کا بھرم رکھنے کے لیے جانے کتنی اذیتوں میں مبتلا رہتے ہیں۔ اب ذرا دستک دیتے ہیں اپنی خوبصورت محفل کے دروازے پر جہاں کچھ محبت نامے بہت شدت سے ہمارے منتظر ہیں۔

⊕ روبینہ اشعر کی مصروفیات کراچی سے۔ "ماہِ اپریل 2023ء کا شمارہ جلد ہی مل گیا تھا لیکن ماہِ رمضان کی مصروفیات اور عبادات کے باعث فوراً نہ پڑھ سکی۔ بہرحال جب جب فرصت ملتی رہی رسالے پر نظر ڈالتی رہی۔ ماہِ رمضان میں پھلوں کی قیمتوں میں من مانے اور ہوشربا اضافے نے غریب عوام کی کمر توڑ دی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ گرانفروشوں سے کوئی پوچھنے والا نہیں۔ حکومتی ادارے تو مکمل طور سے غائب ہی رہے جس کے باعث بیوپاریوں نے قیمتوں میں ہوشربا اضافہ کر دیا اور پھل غریب آدمی کی پہنچ سے دور ہو گئے۔ اللہ پاک ناجائز منافع خوروں کو ہدایت دے اور غریب عوام کی داد رسی فرمائے۔ تمام قارئین کو عید کی ڈھیروں مبارک باد۔ انشائیہ میں جون

ایلیا کی منطق اور فلسفے پر سیر حاصل گفتگو سے مستفید ہوتے ہوئے خطوط کی محفل میں جا پہنچے جہاں ناہید یوسف، مہتاب احمد، ملک وحید اور جنید ملک تفصیلی تبصرے لیے حاضر تھے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے اے آر راجپوت کی تحریر ''نئی وفا'' پڑھی۔ بلوچستان کی قتل و غارت گری اور انسانیت سوز مظالم کے احوال کے ساتھ ہی جنید اور نفیسہ کی محبت کے نازک اور لطیف جذبات کی داستان پڑھنے کو ملی۔ تحریر کیا باقی آدھی۔ اب آگے دیکھتے ہیں کہ نفیسہ اور جنید کے ساتھ کیا معاملات ہوتے ہیں۔ وہ اپنی محبت پاتے بھی ہیں یا اپنے ملک کی حفاظت اور اس کی ناموس پر قربان ہو جائیں گے۔ بہت خوب ویل ڈن۔ سیدہ شاہدہ شاہ کی تحریر ''وار پ سین'' بھی بہترین تحریر تھی، پسند آئی۔ مرزا امجد بیگ کی کہانی ''دو پیسے'' متاثر کن رہی۔ یہ حقیقت ہے کہ ازدواجی زندگی میں میاں بیوی گاڑی کے دو پہیے ہوتے ہیں۔ مشکل کے برے وقت میں ریحانہ نے اس کا ساتھ دے کر یہ ثابت کر دیا۔ عابدہ زی شیریں کی کہانی ''گورکھ دھندا'' بہترین تحریر تھی۔ پسند آئی۔ تنزیلہ احمد کی تحریر ''مہمان'' کچھ خاص متاثر نہ کر سکی۔ شازیہ رضوان کی کہانی 'معزز چور' اچھی کہانی تھی۔ واقعی کچھ لوگوں کو چوری کی عادت ہو جاتی ہے اور اگر ضرورت نہ بھی ہو پھر بھی عادتاً کچھ نہ کچھ چرا لیتے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی سلسلے وار کہانی ''جنگ باز'' اپنی ڈگر سے ہٹنے لگی ہے۔ سہراب کے اصل دشمن تو نہ جانے کہاں چلے گئے اور نئے کرداروں کے ساتھ دشمنی بڑھتی جا رہی ہے اور ماورائے عقل ایکشن اور سسپنس سے بھرپور واقعات بھی ظہور پذیر ہو رہے ہیں۔ قرۃ العین سکندر کی تحریر ''دھوکا'' زبردست رہی۔ سچ ہے کہ لالچ کی بنیاد پر کوئی بھی تعلق زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکتا۔ رچرڈ نے لیزا کو اپنی محبت کے دام میں پھنسانے اور مونیکا کو اپنے راستے سے ہٹانے کے لیے جو جال بچھایا تھا، مونیکا کی چالاکی نے بازی پلٹ دی اور رچرڈ اپنے ہی بچھائے ہوئے جال میں پھنس کر جان کی بازی ہار گیا۔ اچھی کہانی تھی۔ ضیا تسنیم بلگرامی کی تحریر ''قیمتیا کا عقاب'' ایمان افروز تحریر تھی جس میں کافروں کے حوالے سے امام شامل کی کاوشیں اور کارنامے پڑھنے کو ملے۔ سر پھرے اور سروں کو ہتھیلیوں پر لیے پھرنے والوں کی داستان۔ اللہ والے جو اللہ کے نام پر مرمٹے۔ عائشہ نصیر کی تحریر ''خود پرست'' بھی خوب رہی۔ خود پرستی کے فریب میں مبتلا ایک قاتل کی چالاکی کا قصہ مگر ... جب وارداتیں کرتے ہیں تو کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی سقم ان کے منصوبے کو بے نقاب کر دیتا ہے اور وہ قانون کی گرفت میں آ جاتے ہیں۔ فرح بخاری کی کہانی ''شکستہ سائے'' بہت زبردست رہی۔ پسند آئی۔ ویلڈن فرح جی۔ محفل شعر و سخن بھی خوب سجی رہی۔ کتنی ... بھی اچھی لگی۔''

⊕ نجمہ جبار کی بہاولپور سے پہلی بار آمد۔ ''میں پہلی بار سسپنس ڈائجسٹ میں خط لکھ رہی ہوں۔ اگرچہ سسپنس پہلی بار پڑھا ہے مگر یہ بہت اچھا اور معیاری رسالہ ہے۔ خواتین کے رسائل ... بہت شوق سے پڑھتی ہوں اور پاکیزہ میں تو تبصرہ بھی ... اب اس بار سسپنس میں بھی سوچا خط لکھا جائے۔ رسالہ وقت پر مل گیا۔ ... انشاء اللہ تبصرہ کب لکھنا ہے اور کب تک ملنے والا تبصرہ ... تو جلدی جلدی پڑھ لیا اتنا ہی لکھ رہی ہوں کہ رمضان المبارک ... بڑی مشکل سے ہی وقت نکلتا ہے پھر ساتھ میرے ... بھی ہیں ... پر تو ان کا کام الگ ہے۔ سرورق پر ... پسند آیا ... پہاڑی علاقے کی کوئی دوشیزہ ... اور اندر رسالے میں بھی تحریریں سسپنس کی طرح ... ہیں ... سب سے پہلی کہانی اے آر راجپوت کی تھی۔ یہ مرد مصنف ہیں یا خاتون مصنفہ؟ ہیروئن اور ہیرو کے کردار اچھے لگے۔ وہ الگ ... تاریخی تحریریں کم پڑھتی ہوں مگر یہ کہانی پڑھ کر اچھا لگا۔ خاص کر جنید کا کردار۔ قسط وار ناول میں ... آسانی ہوگی۔ معاذ ہیرو ہے ناول کا اور دشمنوں کا مقابلہ کر رہا ہے۔ کمل کا چچا اعظم کاش جلدی اس کو مل جائے کہ ماں کا دل بہت حساس ہوتا ہے اپنی اولاد کے لیے۔ یہ دوسرا ناول سہراب والا کیا کوئی خوفناک ناول ہے؟ میں نے پہلی بار اتنی خوف میں لپٹی ہوئی کوئی تحریر پڑھی ہے ورنہ تو میں پاکیزہ اور دیگر ڈائجسٹ ہی پڑھتی ہوں۔ سہراب کے اصل دشمن کیا ... اچھی کہانی ہے ... سسپنس والی ہی سسپنس تھی۔ جون ایلیا کی باتیں تو بہت ہی فلسفیانہ تھیں مگر کچھ سمجھ آ ہی گئیں۔ ضیا تسنیم کا ... سلسلہ بھی معلوماتی سا تھا کہ اچھا ہے ... آگاہی بھی ضروری ہے۔ پہلی کہانی ''دھوکا'' سچ تھی اور ایسا ہی ہونا چاہیے۔ اچھا ہے سمندر میں مر گیا جو ماں بیٹی دونوں کو دھوکا دے رہا تھا۔ فرح بخاری کی لمبی کہانی بھی خوفناک تھی۔ ... کی آتما کا انتقام جو پورا نہ ہو سکا۔ میں نے فرح کے بہت سے ناول پڑھے ہیں مگر فرح اپنے خوفناک ناول بھی اتنے اچھے لکھ لیتی ہیں واہ۔ کچھ کہانیاں انگریزی ادب کی بھی تھیں جو کچھ صفحات پڑھ کر ہی سر چکرا گیا اور کچھ کچھ ہی سمجھ آیا ... بھی اتنے عجیب ہے۔ تیز خطوط میں ... اور ناہید یوسف کے تبصرے اچھے تھے اور ماشاء اللہ خواتین بھی سسپنس میں شریک ہوتی ہیں یہ اچھا ہے۔ مجھے پہلی بار سسپنس پڑھا اور بہت پسند آیا کیونکہ اس کا الگ ہی انداز ہے اور اس بار مختصر خط کہ بچے اسکول سے آ گئے ہیں اور کھانا مانگ رہے ہیں۔''

⊕ ملک وحید کا مختصر خط کراچی سے۔ ''ماہ اپریل 2023ء کا شمارہ کچھ تاخیر سے ملا۔ فہرست پر سرسری نظر ڈالی اور جون ایلیا

کا انشائیہ پڑھا۔ مرزا امجد بیگ کی تحریر ''دو پہیے'' عمدہ کہانی تھی۔ اے آر راجپوت کی تاریخی کہانی ''مقبل وفا'' زبردست رہی۔ قتل و غارت کے ساتھ ساتھ محبت اور نازک جذبات کا احوال اچھا لگا۔ شاہ زین رضوان کی کہانی ''معزز چور'' کچھ خاص تاثر قائم نہ کر سکی۔ سیدہ شاہدہ شاہ کی تحریر ''ڈراپ سین'' اچھی رہی۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کا سلسلے وار ناول ''جنگ باز'' اپنے ایکشن اور سسپنس کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے اور سہراب کی مشکلات میں اضافہ ہو رہا ہے۔ عابدہ نرجس کی کہانی ''گورکھ دھندا'' بھی پسند آئی۔ حزیلہ احمد کی تحریر ''نگہبان'' اچھی رہی۔ قرۃ العین سکندر کی تحریر ''دھوکا'' اچھی تحریر تھی۔ پسند آئی۔ ضیا تبسم بگرامی کی تحریر ''بچھیا کا تعاقب'' ایمان افروز تحریر رہی۔ عائشہ نصیر کی کہانی ''خود پرست'' زبردست رہی۔ بہت خوب۔ فرح بخاری کی کہانی ''مقتل سائے'' بھی پسند آئی۔ محفل شعر و سخن اور کترنیں بھی اچھی تھیں۔ مجموعی طور پر رسالہ بہترین رہا۔''

جنید علی، ملتان سے چلے آرہے ہیں۔ ''سسپنس ڈائجسٹ کا اسٹاف اور آپ تمام قارئین رمضان المبارک کی آمد اور چند دنوں بعد عیدالفطر کی مبارک باد قبول کیجیے۔ دعا ہے اللہ کریم ہم تمام کے مال و جان، عزت، رزق، صحت و عمر میں برکت عطا فرمائے۔ اس بار سسپنس ڈائجسٹ جلدی ہی موصول ہو گیا اور ڈائجسٹ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ وجہ معیاد جو دن گزرنے کے ساتھ مزید بہتر سے بہتر ہو رہا ہے۔ اس بار سرورق ظفر صاحب نے بہت ہی دلکش بنایا ہے۔ پچھلے ماہ سے بھی زیادہ۔ خاص کر رنگوں کا امتزاج اور منفرد انداز۔ سرورق پر موجود حسینہ رمضان المبارک کا احترام کرتے ہوئے سر پر آنچل لیے ہوئے ہے۔ امید ہے اب عید نمبر کا سرورق بھی عید کی مناسبت سے سجا سنورا ہو گا۔ ویل ڈن ظفر صاحب۔ ڈائجسٹ کے پیپر کی کوالٹی اور روشنائی بھی پچھلے ماہ سے کافی بہتر ہے اور ڈائجسٹ کی لینتھ بھی زیادہ محسوس ہو رہی ہے۔ بائنڈنگ بھی بہتر ہے۔ اندر فہرست قابل غور ہے۔ جون ایلیا کی گفتگو بالکل درست ہے کہ ہم نے اپنی منطق اور فلسفہ بنا لیا ہے۔ ہم خود ہی اتنا بٹ گئے ہیں کہ غیر مسلم ہمیں دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ ہماری اپنی یہ منطق و فلسفہ اور نا اتفاقی ہی تو ہماری تباہی اور خستہ حالی کی وجہ ہے۔ کاش ہم اپنے نبی حضرت محمد ﷺ کے آخری خطبے پر عمل بھی کریں۔ صرف زبان سے اقرار کرنے کے بجائے کہ رنگ، نسل، زبان اور قبیلے کو اہمیت نہ دی جائے۔ کسی کو کسی پر فضیلت نہیں سوائے تقویٰ کے اور یہی جون صاحب کی سوچ تھی جو ان کے کلام میں دینا چاہی۔ خطوط میں ناہید یوسف، روبینہ اشرف اور جناب احمد صاحب کے تفصیلی تبصرے اور ملک وحید کا مختصر تبصرہ محفل میں چار چاند لگا رہے تھے مگر محفل بہت ہی سکڑی ہوئی سی لگی۔ تاریخی تحریر میں اس بار حسب روایت ایک شاندار تحریر ہی شامل ہے یعنی اے آر راجپوت صاحب نخلستان، قص اور حدود کے باسیوں بیش، شجاعت، اور دیگر کی ہمت، بہادری، جذبۂ اتحاد اور محب وطنوں کی داستان سناتے ہوئے تاریخی باتوں کی معلومات میں اضافہ کر رہے ہیں۔ امید واثق ہے کہ اگلی قسط میں نصیب کوئی بچ جائے اور مسلمان تاجروں کو ان کے ظلم کا منہ توڑ جواب دیں گے اور اپنا بدلہ پورا کرنے کے ساتھ شرح صفحہ ہستی سے مٹا کر۔ اگلی قسط کے شدت سے منتظر ہیں۔ ویسے سسپنس مجھے ان تحریروں، انشائیہ، پرانی اور نئی تحریروں کی وراثتی کی وجہ سے پسند ہے جو کہ اس کی انفرادیت ہے۔ ادارے کا ایک اور قابل داد عمل کہ تمام تحریروں کے آخر میں ان کے عین مطابق ہوتے ہیں اور یہ خوبی صرف بے ڈی پی ڈائجسٹس میں ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔ تب ہی تو ہم صرف ان ہی رسائل کا مطالعہ کرتے ہیں۔ شاہدہ شاہ کی تحریر ''ڈراپ سین'' ایک سسپنس کے ساتھ بہترین تحریر رہی جو انسپکٹر عارف کی ہوشیاری اور اپنے پیشے سے ان کی لگن اور ایمانداری ثابت کر رہی تھی۔ ہمارے اداروں کو بھی ایسے ہی لوگوں کی ضرورت ہے ورنہ زیادہ تر تو عارف جیسے لوگوں کے برعکس ہی دیکھنے کو ملتے ہیں جن کی وجہ سے وہ شعبہ بدنام ہو جاتا ہے۔ ''شاہ زور'' میں شکر ہے معاذ کو کچھ سکون میسر آیا۔ اس قسط میں بھی کچھ نئی معلومات کا آمد ہوئی تو وہیں دشمن اعظم کی جان کے ہاتھ دھو کر پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ مصنفہ ناول نہایت عرق ریزی سے لکھ رہی ہیں۔ اگرچہ ناول طوالت اختیار کرتا جا رہا ہے مگر جس انداز میں لکھا گیا اور جتنی تفصیل سے لکھا گیا ہے تو اس کا انجام بھی تفصیل سے ہی ہونا چاہیے کہ اب یہ تو نہیں ہو سکتا کہ ایک دم سے ختم کر دیا جائے۔ ''گورکھ دھندا'' کا احوال عابدہ نرجس سنا رہی تھیں جو کچھ زیادہ خاص پسند نہیں آیا اور تحریر میں طوالت بھی محسوس ہوئی۔ سسپنس کے وکیل شمروز اس بار ایک فراخ دل زوجہ کے شوہر کی کارستانیاں سنا رہے تھے۔ تحریر کے شروع میں ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ یہی کسی کو لگے جہاں میں پہنچا دینے کا سبب بنا ہو گا اور وہی ہوا۔ اس بار وکیل صاحب نے تحریر کو کچھ الگ انداز میں شروع کیا مگر پھر اپنی ڈگر پر آگئے۔ ماریہ کو بھی اللہ جانے کیا نظر آیا ان میں جو صدیقی صاحب کے لیے حرام کی موت کو گلے لگا لیا۔ نادیہ کی ہوشیاری بھی قابل داد تھی۔ ''جنگ باز'' میں اس قسط میں بھٹی صاحب نے بہت ہی اصلاحی لکھا۔ اگر مذہبی لحاظ سے دیکھا جائے تو بہت سے قابل غور پہلو تھے جو اس قسط میں بیان ہوئے۔ قبر کی منظر کشی جس انداز میں کی گئی، خوف، بے بسی اور اللہ پر یقین، بجوکی آمد گویا ہی جہاں بتا رہا ہو مُردوں کو کھاتا ہے۔ اللہ کریم ہم سب کی آخرت کی تمام منازل آسان فرمائے۔ کالی بیرا اور حلیمہ کو ہم سب بھی بخوبی سمجھ رہے تھے مگر یہ تو شیطان کے چیلے رشتے دار نکلے۔ قبر سہراب، چنگیزی اور اس کی ماں کی وجہ سے قبر سے نکل ہی گیا۔ اگلی قسط کا اب تو شدت سے انتظار ہی ہے۔ قرۃ العین سکندر کی تحریر ''دھوکا'' مختصر مگر بہتر تحریر تھی۔ لیز اور

سونیا نے اچھے سے اپنی رپورٹ کو سبق سکھایا اور پیلا بیگی صاحب جو وہاں بیٹی کو پاگل بنا کر اپنا الو سیدھا کرنا چاہتے تھے، آخر میں پانی کے سنگ اگلے جہاں میں پرواز فرما گئے۔ کیا پتا آبی مخلوق کی خوراک بھی بن گئے ہوں۔ ”چیچنیا کا عتاب“ اس بار یہ سلسلہ اس قدر پسند آیا کہ صفحات کی کمی محسوس ہوئی۔ قاضی ملا اور امام شامل کی ایمان افروز داستان تھی۔ اس میں جغرافیائی لحاظ سے بھی معلومات تھیں۔ شروع میں جو خلاصہ دیا گیا بہت کارآمد رہا۔ امید ہے اگلے ماہ کچھ زیادہ صفحات کے سنگ اسی طرح کچھ منفرد پڑھنے کو ملے گا۔ عائشہ نصیر حسب معمول ترجمہ ذاتحریر کے ساتھ آئی تھیں اور تحریر بھی کافی طویل محسوس ہوئی۔ کچھ خاص پسند نہ آئی کہ سسپنس کی کمی محسوس ہوئی۔ چند صفحات پڑھ کر ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ لوسی کا قاتل اس کا شوہر ہی ہے جو کچھ نفسیاتی اور خود پرست انسان ہے۔ ایک تو ان انگریزوں کے مکالمے بہت عجیب اور بے سروپا ہوتے ہیں اور زیادہ تر نفسیاتی ہی لگتے ہیں۔ آخری تحریر میں فرح بخاری صاحبہ ”الوپرا اور ایک آتما (سینا)“ کی طویل انتقامی، بہت بھری کتھا سنا رہی تھیں۔ اگر اس قسم کے موضوعات پر تحریریں دینی ہیں تو ذرا خوف کے مکمل لوازمات کے ساتھ ہی کہانی شامل کی جائے جس سے پڑھنے میں بھی کچھ دلچسپی آئے۔ چلیں ملتے ہیں اگلے ماہ سسپنس کے تازہ شمارے کے سنگ۔ ایک بار پھر سے آپ تمام کو عید الفطر مبارک۔“

٭ شیراز خان کا پہلی بار تبصرہ ڈیرہ اسماعیل خان سے۔ ”بڑے اچھے جذبات کے ساتھ پہلی بار خطوط کی محفل میں حاضر ہوں۔ خط پہلی بار ہے لیکن ادارے سے تعلق اتنا پرانا ہے کہ پہیلی والی بات بن چکی ہے۔ ہم جیسے مطالعے کے شوقین لوگوں کے لیے آپ جیسے لوگوں کا محنت کر کے رسالہ مہیا کرنا کسی نعمت سے کم نہیں۔ رسالے کی قیمت میں فقط 30 روپے کا اضافہ ایسا لگا کہ کچھ ہوا ہی نہیں۔ اچھے اچھے رائٹرز کی دلچسپ اور سبق آموز تحریر پڑھنے کی خاطر ہم 200 روپے دینے کو بھی تیار ہیں۔ 10 روپے کے تین نوٹ تو بچے بھی آسانی سے دے سکتے ہیں۔ رسالہ ایک بہترین کاوش ہے اور اس سلسلے میں قیمت کی کوئی اہمیت نہیں۔ بطور ٹیچر میں آج کل اسٹوڈنٹس کے امتحانات کی تیاری میں مصروف ہوں اس کے باوجود رسالے کا مطالعہ جاری ہے۔ جتنا پڑھا بہت اچھا لگا اور یقین ہے کہ باقی بھی حسب روایت دلچسپ ہی ہوگا۔ تمام لکھاریوں کی کاوش ہمیشہ بہترین ہوتی ہے۔ گزشتہ شمارے میں بڑی زبردست کہانی ”نفاق“ لکھنے والی عبوق بخاری کی غیر حاضری ہرگز اچھی نہیں لگی۔ ان کی کہانیاں ہمیشہ مختلف اور مزے کی ہوتی ہیں اور یہ سسپنس ڈائجسٹ کے لکھاریوں کا خاصہ ہے۔ رمضان کے بابرکت مہینے اور بہار کے خوبصورت رنگوں کے موسم میں دعا ہے کہ خدا ہمارے وطن کو ترقی دے اور جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کو مزید کامیابیوں سے ہمکنار کرے۔ آمین۔“

٭ سید محی الدین اشفاق کی فتح پور لیہ سے طویل عرصے بعد حاضری۔ ”آپ کے خوب صورت رسالے پر تبصرہ لیے طویل عرصے بعد حاضر ہوں۔ آج مجھے خط لکھتے ہوئے بڑا عجیب سا لگا کہ میں بھی کیا انسان ہوں جو رسالہ پڑھتا ہے، زندگی کی مصروفیات میں اس پر چند سطور کا تبصرہ لکھنے کا وقت نہیں نکالتا۔ میں کتاب کی اہمیت جتاتے ہوئے ہمیشہ اپنے اردگرد لوگوں کو رسالہ پڑھنے اور اس پر تبصرہ لکھنے کی ترغیب دیتا ہوں لیکن میں کافی عرصے سے خود کہانیاں تو پڑھتا رہا لیکن اپنے معزز و محترم لکھاریوں کی تعریف کر کے ان کے بارے میں کچھ لکھنا بھول گیا تھا۔ آج رسالہ پڑھا تو چند کہانیاں پڑھ کر بے اختیار خط لکھنے کو دل کیا اور اب سسپنس ڈائجسٹ کے [illegible] خوشی سے [illegible] ہے۔ ”معزز چور“ شاہ زین رضوان کی لکھی گئی تحریر بہت پسند آئی۔ ماجدہ نرجس کی ”کوارگھ وحشت“ نے خوب لطف دیا۔ [illegible] اچھی کہانی ہے۔ لکھاریوں نے خوب محنت اور قابلیت دکھائی۔ باقی رسالہ ابھی زیر مطالعہ ہے۔ اللہ پاک آپ کو اور اس ادارے کو مزید کامیابی سے چلانے کے لیے ہمت دے اور لکھاریوں کے قلم میں برکت دے۔ آمین۔ مجھے ڈر سا ہے کہ کہیں میرا خط شائع ہونے سے نہ رہ جائے۔ عرصے بعد لکھ رہا ہوں تو اس لیے خدشہ سا ہے لیکن بطور ایک جنونی قاری یعنی جو کتاب و رسالے کو دیکھ کر کھانا تک بھول جائے، شدت سے دعا ہے کہ میری طویل غیر حاضری کو نظر انداز کر کے میرے اپنے ادارے کے لوگ میرا خط شائع کریں گے۔ بہت سے یقین اور آپ کے لیے دعاؤں کے ساتھ خط بھیج دیا ہے۔“

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے

نصیر احمد، لاہور۔ قمر شہزاد قمری، سکھر۔ راجا احتشام، جہلم (پنڈی گھیب والا)۔ ریاض احمد، لاہور۔ تبسم فاطمہ، ملتان۔ محمد ارشد، لیہ۔ اعجاز احمد، پھالیہ۔

اطلاع

تمام مصنفین کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ مسترد شدہ کہانیاں محفوظ رکھنا ادارے کے لیے ممکن نہیں ہے۔
اس لیے کہانیوں کی نقول وہ اپنے پاس رکھیں کیونکہ مسترد کہانیاں تلف کر دی جاتی ہیں۔

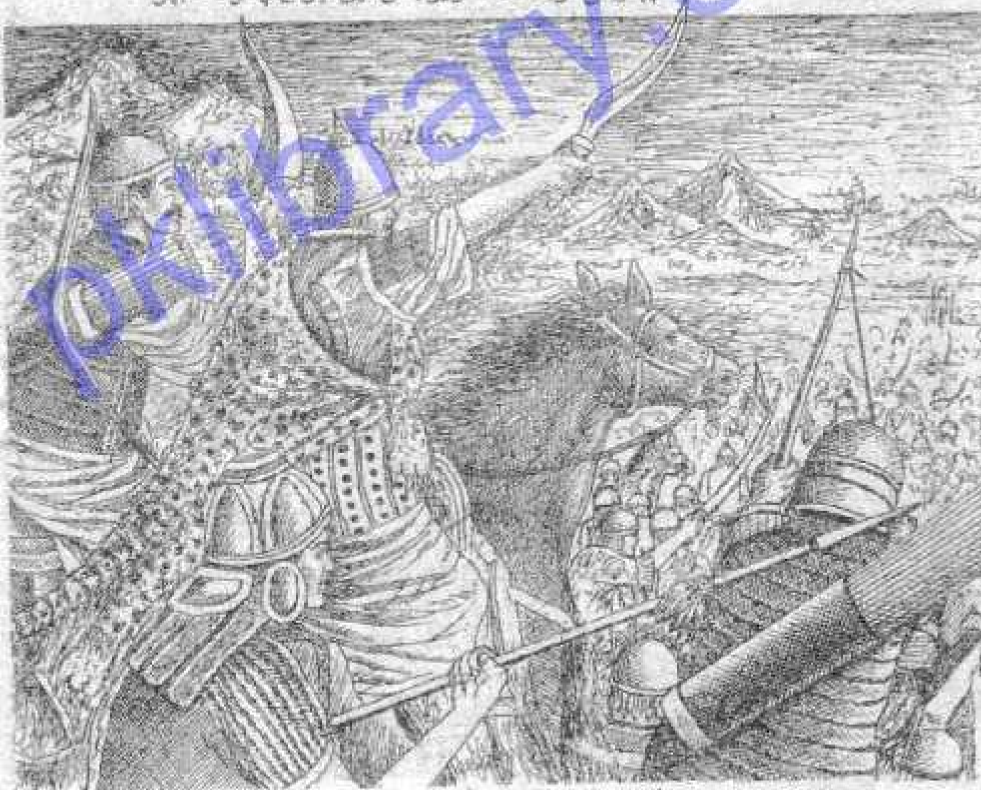
ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

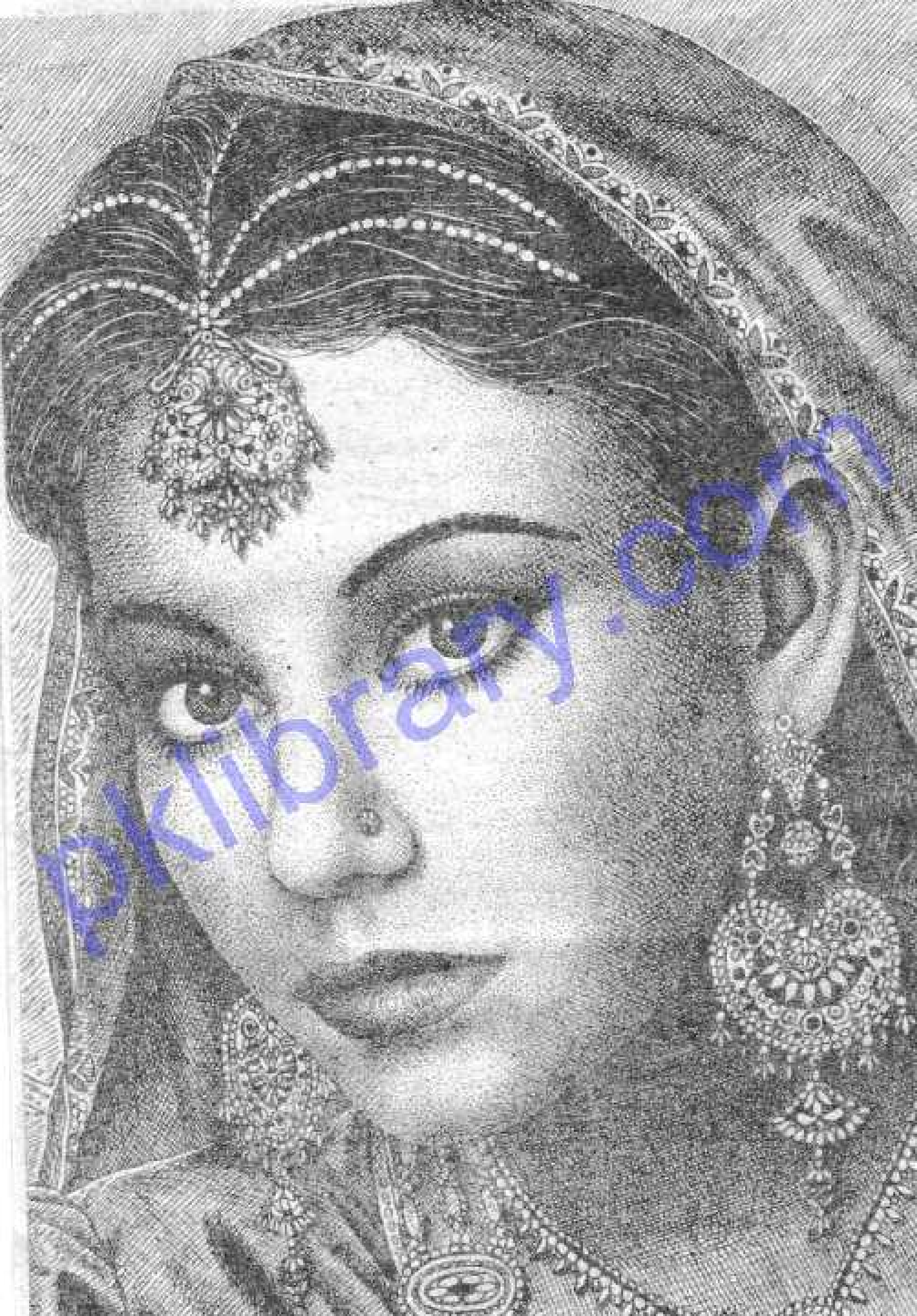
نخلِ وفا

اے آر راجپوت

دوسرا اور آخری حصہ

ماضی کا کوئی بھی قصہ ہو... ہمیشہ سننے یا پڑھنے میں بہت اثر رکھتا ہے... زیر قلم عہد کو بھی بھلانا کوئی آسان نہیں تھا... جس عہد میں قتل و غارت گری اور انسانیت سوز مظالم صفحۂ قرطاس پر اذیتوں بھری داستان رقم کرگئے... اسی عہد میں کچھ لوگوں نے بڑے خوبصورت خواب بھی آنکھوں میں سجالیے تھے لیکن فرائض کی ادائیگی نے کبھی انہیں محبت کی روش پر چلنے نہیں دیا... اس کے باوجود محبت نے ہمیشہ ان ٹوٹے ہوئے دلوں کا تعاقب کیا اور ایک آس اور امید نے ہر لمحہ ان کی ڈھارس بندھائے رکھی کیونکہ ان کے اس سفر میں کچھ اہلِ وفا اور کچھ راہنما بھی ان کے ہم قدم تھے... جن کی حوصلہ افزائی نے ہمیشہ انہیں خوش گمان رکھا... تاتاریوں کی زندگی کے حوالے سے ایک اور گمشدہ پہلو کی کربناک تصویر جس میں لہو نے اپنا رنگ بھرا





ہقلو خان نے کہا۔ ”سردار! آپ کے حکم کی تعمیل سے کون انکار کر سکتا ہے لیکن میں نے ان سے ایک وعدہ کیا ہے۔“

منجو تیمور نے جھلا کر کہا۔ ”دشمن سے بھی کوئی وعدہ کرتا ہے؟“

”جی، مجبوری کے عالم میں، میں نے ان سے وعدہ کر لیا۔ ہم راستہ بھول چکے تھے اور اگر یہ راستہ نہ بتاتے تو ہم یہاں تک کبھی نہ پہنچ سکتے تھے۔“ ہقلو خان نے استقلال سے کہا۔

”کیا وعدہ کیا ہے تم نے؟“ یہ اباخاقان کی آواز تھی جس کی نظریں ہنوز نفیسہ کے حسن سے ہٹنے نہیں پا رہی تھیں۔

ہقلو خان نے کہا۔ ”سردار! ہم نے وعدہ کیا تھا کہ اگر ہمیں یہ لوگ دھوکا دیے بغیر ہمارے لشکر تک پہنچا دیں گے تو ہم انہیں چھوڑ دیں گے۔“

منجو تیمور بل کھا کر بولا۔ ”ہاتھ آئے ہوئے مسلمانوں کو چھوڑنا ہمارے رواج کے خلاف ہے۔ ایسا کرنے سے ہمارے دیوتا ناراض ہو جائیں گے۔ انہیں قتل ہی کرنا پڑے گا۔“

اس اعلان سے ہقلو خان کے چہرے پر شکنیں پڑ گئیں اور اس نے قدرے تیز لہجے میں کہا۔ ”رواج ہمارے ہی بنائے ہوئے ہیں سردار! اور ہمارا دیوتا ہماری تلوار ہے۔ میں اپنے کیے ہوئے وعدے کو توڑنا نہیں چاہتا۔“

اباخاقان نے اندازہ لگایا کہ اگر زیادہ زور دیا گیا تو ہقلو خان بغاوت پر آمادہ ہو جائے گا اس لیے اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”منجو تیمور کا کہنا ٹھیک ہے لیکن ان سواروں کو صرف تمہاری خاطر آزاد کر دیتے ہیں۔ ان کے ہاتھ کھول دیے جائیں۔“

ہقلو خان کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا۔ اس نے سواروں کو حکم دیا کہ قیدیوں کے ہاتھ کھول دیے جائیں۔ ذرا دیر بعد ہی سب کے ہاتھ کھول دیے گئے۔ نائب سردار نے شکر گزار نظروں سے ہقلو خان کو دیکھا۔

ہقلو خان نے اسے اشارہ کیا کہ وہ اپنے ساتھیوں کو لے کر فوراً روانہ ہو جائے۔ پورے دستے کے ہاتھ کھول دیے گئے لیکن انہیں اسلحہ واپس نہیں کیا گیا۔ نائب نے بھی غنیمت جانا اور گھوڑا بڑھا کر چلا۔

یہی وہ وقت تھا جب اباخاقان نے چند سواروں کو اشارہ کیا جو بڑھ کر نفیسہ کے چاروں طرف پھیل گئے اور اسے دوسرے سواروں سے جدا کر دیا گیا۔

نائب سردار کو تاتاریوں کی یہ حرکت بہت ناگوار گزری لیکن وہ غیر مسلح تھے اور اس کے ساتھی بھی نہتے تھے۔

سب نے ایک دوسرے کو بڑی بے بسی سے دیکھا لیکن انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ ہقلو خان تلوار بلند کرتا نفیسہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔

تب ہی اس نے چیخ کر کہا۔ ”مصری سوار! تم خاموشی سے چلے جاؤ۔ اس لڑکی کی رہائی کا وعدہ ہقلو خان نے کیا ہے اور ہقلو خان ہی یہ حفاظت تم تک پہنچائے گا۔“

نائب نے ہقلو خان کے چہرے کو غور سے دیکھا اور اس کے چہرے پر عزم و استقلال کے آثار دیکھ کر مطمئن ہو گیا اور اپنے ساتھیوں کو چلنے کا اشارہ کیا۔

مصریوں کے دور چلے جانے کے بعد ہقلو خان ان سواروں کے پاس آیا جو نفیسہ کو گھیرے کھڑے تھے۔ اس وقت ہقلو خان کے چہرے پر غیظ و غضب کے آثار تھے۔ اس نے ڈانٹ کر پوچھا۔

”تم لوگوں نے کس کے حکم سے اس لڑکی کو گھیرا ہے؟“ گھیرنے والے سواروں نے اباخاقان کی طرف اشارہ کیا۔ ہقلو خان نے پلٹ کر اباخاقان کو دیکھا جو تھوڑے فاصلے پر کھڑا مسکرا رہا تھا۔ تب ہی ہقلو خان کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اباخاقان بولا۔

”ہقلو خان! اس لڑکی کو ہم نے پسند کیا ہے۔ شراب پلانے کے لیے اس جیسی حسینہ تمام صحرائے شام میں نہیں مل سکتی۔“

”لیکن میں اس کی رہائی کا وعدہ کر چکا ہوں۔“ ہقلو خان نے اکڑ کر کہا۔

اباخاقان نے کہا۔ ”کوئی بات نہیں۔ جو وعدہ کر سکتا ہے، وہ توڑ بھی سکتا ہے۔“

”لیکن میں اپنا وعدہ توڑ نہیں سکتا۔“ ہقلو خان نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ہقلو خان کی زبان سے یہ الفاظ نکلتے ہی اس کے بقیہ سواروں نے بھی اپنی تلواریں کھینچ لیں۔

اباخاقان بھیانک لہجے میں بولا۔ ”ہقلو خان! اس کے انجام سے واقف ہو؟“

”تاتاری انجام کی پروا نہیں کرتے۔ یہی ہم نے سیکھا ہے۔“ ہقلو خان نے دلیری سے کہا۔

”پہاڑ سے ٹکرانے کی کوشش نہ کرو ہقلو خان!“ اباخاقان کے چہرے پر وحشت چھلکنے لگی تھی۔

”لڑتے وقت ہم آگے نہیں دیکھا کرتے۔“ ہقلو خان نے بے پروائی سے جواب دیا۔

اباخاقان گرج کر بولا۔ ”ہقلو خان! میں اپنی تلوار کو

تاتاری کے خون سے رنگنا نہیں چاہتا۔" لیکن اس کے ساتھ ہی یہ کہتے ہوئے اباخاقان نے تلوار کھینچ لی۔

قتلو خان اطمینان سے بولا۔ "خاقان! تمہیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ تمہارے مقابلے پر بھی ایک تاتاری تلوار ہے۔ اس لڑکی کو چھوڑ دو تو تمہاری اطاعت پر جان دے دوں گا۔" کہتے ہوئے قتلو خان نے تلوار ہوا میں لہرائی۔

اس تیز گفتگو کے دوران وہ تمام تاتاری جو جمع تھے بالکل خاموش کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے۔

منگو تیمور اور اباخاقان اس کے لشکر کے سرداروں سے اعلیٰ تھے لیکن قتلو خان بھی کم اہمیت کا سردار نہ تھا۔ لشکر میں تیسرا نمبر اسی کا تھا۔

اس عرصے میں منگو تیمور نے کئی بار ارادہ کیا کہ نیزہ وار کر قتلو خان کو زخمی کر دے لیکن اباخاقان نے اسے روک دیا کیونکہ اس طرح قتلو خان کے مارے جانے سے تاتاری لشکر میں پھوٹ پڑ جانے کا امکان تھا۔

بات بہت بڑھ چکی تھی۔ حالانکہ بات کچھ بھی نہ تھی۔ اباخاقان کو غصہ پیدا ہو گیا کہ اگر قتلو خان کو زیر نہ کیا گیا تو اس کا اثر لشکر پر پڑے گا اور ممکن ہے کہ دوسرے سردار بھی اس طرح مقابلے پر کھڑے ہو جائیں۔ لہٰذا اباخاقان تلوار بلند کیے ہوئے قتلو خان کے پاس آیا اور بولا۔ "قتلو خان! اطاعت یا موت؟"

قتلو خان نے بھی تلوار آگے کرتے ہوئے کہا۔ "ہم نہیں جانتے موت کیا چیز ہے۔" کہتے ہوئے ساتھ ہی اس نے اپنی تلوار اباخاقان کی تلوار سے ٹکرا دی۔ دوسری طرف قتلو خان کے ساتھی بھی تلواریں نکالے ہوئے آگے بڑھے۔

انہیں آگے بڑھتے دیکھ کر منگو تیمور نے ڈپٹ کر کہا۔ "خبردار! کوئی آگے نہ بڑھے۔ جب دو تاتاری لڑتے ہیں تو تیسرا نہیں بولا کرتا۔" منگو تیمور کی آواز پر قتلو خان کے سوار رک گئے ورنہ شاید تاتاری لشکر میں ایک ہنگامہ برپا ہو جاتا۔

اباخاقان منجھا ہوا شمشیر زن تھا اس لیے دوسرے ہی وار میں قتلو خان کی ڈھال گرا دی۔

اب قتلو خان بغیر ڈھال کے لڑ رہا تھا لیکن ڈھال کے گر جانے سے اس میں دوگنا جوش پیدا ہو گیا اور اس نے اباخاقان پر ایسا زبردست حملہ کیا کہ اسے کئی گز پیچھے ہٹنا پڑا۔

رات کے پچھلے پہر، دم بخود سناٹے میں دو تاتاری تلواریں ایک دوسرے کی زبانیں چاٹ رہی تھیں۔ ایک طرف اسی ہزار تاتاریوں کا سردار اباخاقان تھا جسے اپنی تلوار پر بجا طور پر ناز تھا مگر دوسری طرف تاتاریوں کے بھیس میں ایک مخلص انسان تھا جو اپنے وعدے پر مرنے کے لیے اس عظیم پہاڑ سے ٹکرا رہا تھا۔

تلواریں الجھتیں، بلند ہوتیں، ٹکراتیں اور جھٹکے کے ساتھ الگ ہو جاتیں۔

دونوں گھوڑوں کی کنوتیاں ایک دوسرے سے ملی ہوئی تھیں اور وہ گتھے ہوئے تھے۔ نصف گھنٹے سے زیادہ گزر گیا لیکن کسی طرف سے سستی کے آثار دکھائی نہ دیتے تھے۔ تمام لوگ بڑے انہماک سے دو بدو لڑائی کا نظارہ کر رہے تھے۔

آخر اباخاقان نے شمشیر زنی کا آخری حربہ استعمال کیا۔ کچھ اس پھرتی سے وار کیا کہ قتلو خان کا بایاں شانہ بری طرح زخمی ہو گیا۔ قتلو خان کے پاس اگر ڈھال ہوتی تو وہ یہ وار بھی بڑی آسانی سے روک لیتا لیکن بغیر ڈھال کے وہ وار خالی نہ دے سکا اور اس کے شانے سے خون کا فوارہ چھوٹ گیا۔

نفیسہ سواروں میں گھری گھوڑے پر بیٹھی یہ تمام منظر دیکھ رہی تھی۔ اسے تاتاریوں سے سخت نفرت تھی لیکن قتلو خان کے سلوک نے اس کے دل میں بڑی جگہ پیدا کر لی اور جب قتلو خان کا شانہ زخمی ہو گیا تو وہ چیخ کر بولی۔

"قتلو خان! تم نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ اب تم میرے لیے اپنی جان نہ دو۔"

"قتلو خان تلوار ملانے کے بعد تلوار ہٹایا نہیں کرتا لڑکی!" قتلو خان نے اسی طرح وار روکتے ہوئے نفیسہ کو جواب دیا اور پھر زخمی شیر کی طرح ایسا وار کیا کہ اس کی تلوار نے اباخاقان کی ڈھال کا ایک ٹکڑا کاٹ دیا اور اگر ڈھال نہ ہوتی تو اباخاقان کا شانہ بھی زخمی ہو جاتا۔

اباخاقان فوراً ہی سنبھل گیا لیکن قتلو خان نے زخمی ہونے کے باوجود پے در پے اتنے وار کیے کہ اباخاقان کو چھوٹے چھوٹے کئی زخم آ گئے۔

اب قتلو خان کا شانہ بالکل جھول گیا لیکن اس کے واروں میں کوئی کمی نہیں ہوئی تھی۔ اباخاقان، قتلو خان کا وار روک کر چاہتا کہ اس پر جوابی وار کرے لیکن قتلو خان اس سے پہلے ہی دوسرا وار کر دیتا اور اس طرح اباخاقان کو وار کرنے کا موقع ہی نہ ملتا اور وہ دانت پیس کر رہ جاتا۔

منگو تیمور کا خیال تھا کہ لڑائی جلدی ختم ہو جائے گی کیونکہ اباخاقان کا مقابلہ کرنا ناممکن ہے لیکن قتلو خان نے جوش میں آ کر وہ جوہر دکھائے کہ سب ہی عش عش کر اٹھے

اور اب منجو تیمور کو خطرہ پیدا ہو گیا کہ اگر قطلو خان اسی طرح وار کرتا رہا تو اباقا خان مارا جائے گا۔

یہ خیال آتے ہی وہ پیچھے ہٹا۔ سب لوگ لڑائی دیکھنے میں منہمک تھے۔ اس نے اس سے فائدہ اٹھایا اور اپنے خاص دستے کو حکم دیا کہ وہ بڑی آہستگی سے قطلو خان کے دستے کو گھیرے میں لے لے۔

جب قطلو خان کے دستے کے گرد گھیرا ڈال دیا گیا تو منجو تیمور نے ایک سوار کو اشارہ کیا۔ اشارے کے ساتھ ہی اس نے اپنا نیزہ قطلو خان پر کھینچ مارا۔ نیزہ قطلو خان کی پشت میں پیوست ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی اباقا خان کی تلوار اس کے سینے میں بھی اتر گئی اور اس طرح ایک مخلص تاتاری اپنے وعدے پر قربان ہو گیا۔

قطلو خان کا دستہ پہلے ہی گھیرا جا چکا تھا۔ اس نے جب سلطان کو گرتے دیکھا تو بڑھنے کی کوشش کی لیکن منجو تیمور کے خاص دستے نے راستہ روک لیا اور انہیں تہ تیغ کر دیا۔

☆☆☆

سلطان [illegible] منصور قلاوون کے بدر [illegible] کے جھنڈے تلے تقریباً ایک لاکھ پچاس ہزار فوج جمع ہو چکی تھی۔ مصر کے امرائے ذی وقار، حماۃ کے [illegible] اور موصل و بغداد، ہرات کے والیان جو تاتاریوں کی تاراج سے بچ کر اپنے علاقے چھوڑنے پر مجبور ہوئے تھے، وہ سب حمص میں جمع تھے۔

عراق و عجم کی وہ فوجیں جو تاتاریوں کے حملے سے منتشر ہو گئی تھیں، وہ سلطان کی آمد کی خبر سن کر حمص پہنچ گئی تھیں اور سلطان پوری طرح کیل کانٹے سے لیس ہو کر تاتاریوں کے مقابلے کے لیے تیار تھا۔

سلطان کا خیال تھا کہ وہ تاتاریوں کو شام کے علاقوں میں داخل ہونے سے پہلے ہی روک دے گا لیکن کچھ سفری مشکلات اور دشمنان اسلام کے لشکر کی زیادتی نے سلطان کو مجبور کر دیا کہ وہ پوری طاقت سے یہ معرکہ کرے اور تاتاریوں کو ایسا سبق دے کہ وہ پھر اسلامی علاقوں کا قصد نہ کر سکیں۔

مدینہ کا لشکر جن علاقوں اور مقامات سے گزرتا تھا، مسلمان جہاد کے لیے خود کو پیش کرتے تھے اور جب والی مدینہ حمص پہنچا تو اس کے ذاتی منظم لشکر کے علاوہ عراق و عجم کے سواروں اور پیادوں کی ایک کثیر تعداد اس کے ساتھ تھی۔

جس دن والی مدینہ حمص میں داخل ہوا اس رات عشا کی نماز کے بعد سلطان نے ایک خاص مجلس منعقد کی تاکہ کوچ کے متعلق صلاح و مشورہ کیا جا سکے۔

تمام امرا اور سرداران فوج جہاد کے لیے بے چین ہو رہے تھے۔ اس لیے سب نے بالاتفاق کوچ کی درخواست کی اور سلطان نے فیصلہ کیا کہ صبح نماز فجر کے بعد لشکر اسلام حمص سے آگے بڑھے۔

فجر کی نماز مسلمانوں نے بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ حمص کے باہر میدان میں ادا کی اور پھر کوچ کے لیے تیار ہوئے۔

جب سورج کی پہلی کرن نمودار ہوئی تو حمص کے میدان میں مصری فوج اپنے زرق برق لباس میں قطار در قطار کھڑی نظر آئی۔

مصری لشکر کے سروں پر زرد کلاہیں موجود تھیں اور جسم پر سفید سوتی قبائیں جن کی تراش ڈھیلی تھی۔ یعنی ان کے جیب و گریبان تنگ تھے۔ فوج کے پاس گرز اور تیر اور نیزوں کے علاوہ فلاخنیں، گوپھنیں (رسی کا بنا ہوا وہ ہتھیار جس کے [illegible] میں پتھر رکھتے ہیں اور ہاتھ کی گردش دے کر اس پتھر کو حریف پر مارتے ہیں) اور کئی ساخت کی منجنیقیں بھی تھیں تاکہ دشمن اگر قلعہ بند ہو جائے تو پتھر پھینک کر دیواروں کو توڑا جا سکے۔

مصری لشکر کے علاوہ عراق و شام کا لشکر الگ تھا۔ اس کا لباس مصریوں سے کچھ مختلف اور اپنے اپنے مقامی اور [illegible] کا تھا [illegible] سلطان نے اسلحے سے لیس کر دیا تھا [illegible] سامان [illegible] اونٹوں پر بار کر دیا گیا تھا۔ شوق جہاد [illegible] ایک [illegible] لگانے کے بعد سلطان قلب فوج [illegible] اور [illegible] خطبہ دیا جس میں جہاد کی ضرورت [illegible] تاتاریوں کے مظالم اور بربریت کا تذکرہ کیا۔

اس خطبے سے مسلمانوں میں اور جوش پیدا ہو گیا اور انہوں نے اللہ اکبر کا ایسا نعرہ لگایا کہ دشت و جبل تھرا اٹھے۔ اس کے ساتھ ہی سلطان کے اشارے پر لشکر نے کوچ شروع کیا۔

سلطان نے فوج کو چھوٹے چھوٹے دستوں اور رسالوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ جب ہر دستہ اور رسالہ اپنے اپنے سردار کے پیچھے بڑے عزم و استقلال سے آگے بڑھ رہا تھا تو سلطان اپنے مخصوص سرداروں کے ساتھ ایک بلند مقام پر کھڑا لشکر کی پیش قدمی دیکھ رہا تھا۔

جب تمام لشکر حمص کے میدان کو خالی کر گیا تو سلطان نے اپنا گھوڑا بڑھایا۔ اس کے ساتھ ہی تمام سوار چل

بڑھے۔ حمص کی تمام آبادی لشکر کو دیکھنے فصیل کے باہر کھڑی ہوگئی تھی۔ سلطان نے چلتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے حمص والوں کو اللہ حافظ کہا جس کے جواب میں لوگوں نے نعرۂ تکبیر، اللہ اکبر۔۔۔ کے نعرے بلند کیے اور اب سلطان کی نظریں حمص کی جامع مسجد کے اس سبز گنبد پر ٹکی ہوئی تھیں جو میلوں دور سے نظر آتا تھا۔

جب سلطان نے گنبد سے نظریں ہٹائیں تو وہ آبدیدہ تھا۔ گو اس کی نظریں گنبد پر تھیں مگر دل مالکِ دو جہاں کے حضور تھا جس کے کرم سے وہ لشکرِ اسلام کی قیادت کر رہا تھا۔

☆☆☆

ادھر تاتاری، سلطان مصر کی حمص کی طرف پیش قدمی کی خبر پا کر ایک دم ٹھہر گئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ دمشق تک بہ آسانی پہنچ جائیں گے لیکن جس وقت وہ دمشق کا [illegible] رہے تھے، اس وقت سلطان دمشق کو عبور کر کے حمص روانہ ہو چکا تھا۔

سلطان کے لشکر کی برق رفتاری نے تاتاری سردار منگو تیمور اور اباقاآن کو پریشان اور حیران کر دیا تھا۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ اب آگے بڑھنے کے بجائے حمص سے دور ٹھہر کر سلطانی لشکر کا انتظار کیا جائے۔ لیکن تاتاریوں کی وحشت اور بربریت انہیں ایک جگہ کب ٹھہرنے دیتی تھی۔ ان کی خصلت میں تو لوٹ مار، قتل و غارت گری اور لہو و لعب تھا۔

لہٰذا ابھی دو ہی دن پڑاؤ ڈالے گزرے تھے کہ تاتاری اپنی عادت سے مجبور ہو کر خود آپس میں ہی لڑنے جھگڑنے لگے۔ انہیں تو خیر روکا جا سکتا تھا لیکن منگو تیمور نے محسوس کیا کہ ان کے پڑاؤ کا اثر تاتاریوں پر برا پڑ رہا ہے اور اب تاتاریوں میں یہ احساس جگہ پا رہا ہے کہ منگو تیمور اور اباقاآن، سلطان مصر کی آمد سے خوفزدہ ہیں اور آگے بڑھنے سے گھبراتے ہیں۔ ان باتوں کے پیشِ نظر منگو تیمور اور اباقاآن نے آگے بڑھنے کا فیصلہ کر لیا۔

یوں تاتاری لشکر بھی آندھی اور طوفان کی طرح حمص روانہ ہو گیا۔ انہوں نے حسبِ عادت راستے کی تمام آبادیوں کو جلا کر خاک کر دیا۔ تاتاریوں کی خبر دور دور تک پہنچ چکی تھی اور اسی لیے اب وہ جن آبادیوں سے گزرتے، وہ ویران اور سنسان نظر آتیں۔ آبادیوں کے مکینوں نے محفوظ مقامات کی طرف ہجرت شروع کر دی تھی اور چلتے وقت گھروں کو برباد کر دیا تھا تاکہ تاتاریوں کے ہاتھ کچھ نہ لگے۔ مویشیوں کو بھی وہ اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ یہی سبب تھا کہ تاتاریوں کو کھانے پینے کی چیزوں کی دستیابی میں بڑی دشواری پیش آئی۔

تاتاریوں نے اپنی رفتار اور تیز کر دی تاکہ وہ جلد سے جلد مصری لشکر کے مقابلے پر پہنچ کر ایک فیصلہ کن جنگ کریں۔ سلطان نے بھی اس مقام پر پڑاؤ ڈالا جو جنگی نقطۂ نظر سے اس کے لیے بہت مفید تھا۔

یہ مقام ایک وسیع میدان تھا جس کے دو طرف اونچے اونچے ٹیلے تھے اور چھوٹی پہاڑیوں کا سلسلہ تھا جو بتدریج آگے کی طرف تنگ ہوتا چلا گیا تھا۔ سلطان کا اس جگہ ٹھہرنے کا یہ مقصد تھا کہ وہ اپنے لشکر کو پوری طرح پھیلا دے لیکن تاتاریوں کو پھیلنے کا موقع نہ ملے۔ اس کے علاوہ پہاڑیوں کے پیچھے فوج کو پوری طرح پوشیدہ رکھا جا سکے۔

لشکر کے خیمہ زن ہونے کے بعد جب سلطان نے اپنے سرداروں کے ساتھ اس میدان اور قرب و جوار کا معائنہ کیا تو ہر ایک سلطان کی عقل اور حکمتِ عملی کا قائل ہو گیا اور اس جگہ سلطانی لشکر کو جمع کرنے کے پورے مواقع میسر تھے اور وقتِ ضرورت فوجوں کو نظم و ضبط کے ساتھ پیچھے بھی ہٹایا جا سکتا تھا۔

یوں سلطان کے لشکر نے تمام دن اس میدان میں ٹھہر کر آرام کیا لیکن رات کو جب وہ کھانے کے انتظام میں مصروف تھے تو انہیں دشمنوں کی آمد سے مطلع کیا گیا۔

تاتاری [illegible] کرتے ہوئے اور دن رات سفر کرتے [illegible]

سلطان نے [illegible] تاتاریوں [illegible] سرداروں کو طلب کر لیا اور ان [illegible] معقول انتظام کیا [illegible] انہیں منہ توڑ جواب دیا جا سکے۔ اس [illegible] سلطان نے [illegible] پورے لشکر کا چکر لگایا۔ اس وقت خیموں کے سامنے آگ روشن تھی اور لوگ کھانے پینے میں مصروف تھے۔

سلطان مصر اپنے خیمے میں واپس آیا تو اسے اپنے مخبروں کی واپسی کی اطلاع ملی۔ مخبروں نے سلطان کو بتایا کہ تاتاری صبح ہونے سے پہلے ہی اس میدان میں پہنچ جائیں گے۔ انہوں نے تاتاری فوج کی تعداد کا اندازہ ایک حد دو لاکھ کے قریب بتایا۔ سلطان نے ہر بات غور سے سنی اور اپنے سرداروں سے مشورہ کرتا رہا۔

مخبروں کا اندازہ صحیح تھا۔ صبح کو جب آدھا لشکرِ اسلام خداوند کریم کے حضور سربسجود تھا تو تاتاری لشکر میدان میں نمودار ہوا اور جلدی جلدی ادھر ادھر پھیل گیا جیسے وہ اس

وقت حملہ آور ہوگا۔

سلطان نے اپنے لشکر کو تیاری کا حکم دیا اور دم کے دم میں لشکرِ اسلام صف آرا ہوگیا۔ مصری سرداروں کی رائے تھی کہ تاتاریوں کو موقع دیے بغیر فوراً حملہ کردیا جائے لیکن سلطان نے اس رائے کی مخالفت کی۔

سلطان نے کہا۔ ''ہم بھوکے پیاسوں پر حملہ نہیں کرنا چاہتے۔ ہاں، اگر انہوں نے حملے میں پہل کی تو ہم حق بجانب ہوں گے۔'' سلطان کی زبان سے یہ الفاظ سن کر تمام سرداروں نے تعمیلِ حکم کے لیے گردنیں جھکا دیں۔ اب تمام فوج نماز سے فارغ ہوچکی تھی اور تمام سردار سلطان کے بتائے ہوئے مقامات پر اپنی اپنی فوج کے سامنے پہنچ کر حملے کے بگل کا بڑی بے چینی سے انتظار کررہے تھے۔

یہ وقت تاتاری میدان میں جم گئے تھے اور اس انتظار میں تھے کہ حملہ مصریوں کی طرف سے ہو لیکن مصری اپنے سلطان کے حکم سے انہیں کھانے پینے کا پورا موقع دے رہے تھے۔ تاتاریوں نے مصریوں کو اس طرح خاموش کھڑے دیکھا تو وہ بہت حیران ہوئے۔

اس وقت مصری فوج سے ایک سوار سفید جھنڈا لے کر تاتاریوں کی طرف چلا۔ سوار تاتاریوں کے لشکر میں پہنچا اور اس نے اطلاع دی کہ مصری سلطان معظم، تاتاریوں کو اتنی مہلت دینا چاہتے ہیں کہ وہ کھانے پینے اور [illegible] سے فارغ ہولیں اور انہیں یہ شکایت نہ رہے کہ ان کے لشکر کو بھوکا پیاسا مار دیا گیا ہے۔

تاتاریوں کو مسلمانوں کا یہ سلوک بھی کچھ عجیب سا معلوم ہوا۔ بہرکیف، انہوں نے اس موقع سے فائدہ ضرور اٹھایا اور گوشت خوری اور شراب نوشی میں مصروف ہوگئے۔ بھنا ہوا گوشت اور شراب ان کے ساتھ تھی۔ وہ وحشیانہ قہقہے لگاتے اور جنگلیوں کی طرح شراب پیتے، گوشت نوچتے رہے۔

دن پوری طرح نکل آیا تھا اور دھوپ میں بھی حدت پیدا ہوگئی تھی۔ سلطان نے اپنی فوج کا چوتھائی حصہ دائیں بائیں پہاڑیوں اور ٹیلوں کے پیچھے چھپا دیا اور تقریباً ایک لاکھ فوج تاتاریوں کے سامنے صف آرا کردی۔

سلطان خود قلب فوج میں رہا اور میمنہ اور میسرہ پر مملوک بحریہ کے تجربہ کار سرداروں کو مامور کردیا۔ عراق وشام اور تمام منظم فوج کو سلطان نے اپنے ساتھ ہی رکھا تاکہ ان کو اپنی حکمتِ عملی سے اپنی کمان میں لڑائے اور کوئی بدنظمی پیدا نہ ہو۔

تاتاریوں کے لشکر میں پوری طرح نظم وضبط نہ تھا۔ تاتاری حملہ کرتے وقت میمنہ اور میسرہ کی پروا نہیں کرتے تھے۔ ان کا سب سے بڑا حربہ یا جنگی تدبیر یہ تھی کہ وہ ایک ساتھ پورے لشکر پر حملہ آور ہوتے اور دشمن کا جو حصہ بھی انہیں کمزور نظر آتا، اس پر عقاب کی طرح ٹوٹ پڑتے۔

سلطان منصور قلاوٗن، تاتاریوں سے پہلے بھی مقابلہ کرچکا تھا۔ ان کے جنگی حربوں سے اچھی طرح واقف تھا اس لیے اس نے اپنی فوج کو اسی انداز سے ترتیب دیا۔ وہ جانتا تھا کہ تاتاری لڑائی کو زیادہ طول نہیں دیتے بلکہ فوری فیصلہ کرتے ہیں۔

جنگ کا بگل ہوتے ہی تاتاری چیختے چلاتے اور وحشیانہ آوازیں نکالتے حملہ آور ہوگئے۔ ان کے حملے کا رخ سیدھا قلب پر تھا اور ان کا تمام لشکر ایک ساتھ حملہ آور ہوا تھا۔ سلطان نے اپنے لشکر کو حرکت کرنے کا حکم اس وقت تک نہ دیا جب تک تاتاری ان کے بالکل قریب نہ آگئے۔

جب تاتاری بڑھتے ہوئے مصری لشکر کے قریب پہنچ گئے تو سلطان کے اشارے سے قلب کی فوج دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ یعنی قلب کا ایک حصہ ہٹ کر میمنہ سے مل گیا اور دوسرا حصہ میسرہ سے جاملا اور مصری فوج کے درمیان ایک کشادہ راستہ بن گیا۔

فوجوں کا دباؤ بڑھتا جارہا تھا۔ تاتاری بڑی مضبوطی سے جمے ہوئے تھے لیکن دیر تک وہ ایسا نہ کرسکے کیونکہ دونوں طرف سے سلطانی فوجوں کا دباؤ بڑھتا جارہا تھا پھر بھی انہوں نے بچتے بچتے کافی مسلمانوں کو شہید کردیا۔

سلطان کے اشارے سے مصری لشکر کا وہ چوتھائی حصہ جو پہاڑیوں کے پیچھے چھپا ہوا تھا، بادل کی طرح نمودار ہوا۔ تیس، چالیس ہزار کا یہ لشکر بڑی تیزی سے آیا اور آتے ہی تاتاریوں کی فوج کے دونوں حصوں کے درمیان ایک دیوار کی طرح پھیل گیا۔

تاتاریوں نے اس تازہ دم فوج کو دیکھا تو ان میں گھبراہٹ پیدا ہوگئی اور انہوں نے دونوں حصوں کے درمیان خود کو گھرا محسوس کیا۔

منگو تیمور نے کوشش کی کہ اپنی فوج کے دونوں ٹکڑوں کو پھر یکجا کرے اور میدان میں جم کر لڑے لیکن سلطان، تاتاریوں کی اس حکمتِ عملی سے پہلے ہی واقف تھا۔ اس نے حملے کا زور اور بڑھا دیا اور تاتاریوں کو جنگ میں اس قدر الجھا دیا کہ منگو تیمور کی یہ حکمتِ عملی کارآمد نہ ہوگی اور دونوں حصے ایک دوسرے سے ملنے کے بجائے اور دور ہوگئے۔

تاتاریوں کو سب سے زیادہ مشکل سلطان کی درمیانی

فوج کے تازہ دستے سے پیش آئی۔ انہوں نے آتے ہی پشت سے دونوں ٹکڑوں پر زبردست وار کیا اور دم کے دم میں لاشوں کے پشتے لگا دیے۔

تاتاریوں پر آگے اور پیچھے دونوں طرف سے مار پڑنا شروع ہوئی۔ یہی نہیں، بلکہ ان کی تمام بہادری اور بربریت ختم ہو کر رہ گئی۔ ان کے لیے حملہ کرنا تو در کنار، اب انہیں جان بچانا بھی مشکل نظر آنے لگا۔ وہ مدافعانہ جنگ کرنے پر مجبور ہو گئے۔

ابا خاقان بھی بہت پریشان تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس تازہ مصیبت سے کیسے نجات پائے۔ ادھر مصری تھے کہ بڑھ بڑھ کر حملے کر رہے تھے۔ سہ پہر تک تو کسی نہ کسی طرح تاتاریوں نے مصریوں کا مقابلہ کیا لیکن دن ڈھلتے ہی ان میں سستی اور سراسیمگی کے آثار پیدا ہو گئے اور وہ دبے دبے سے لڑنے لگے۔

جب وہ آگے کی طرف بڑھتے تو پیچھے سے ان پر حملہ ہوتا اور جب وہ پیچھے ہٹتے تو آگے سے ریلا آتا اور ان کو کاٹنا شروع کر دیتا۔

کئی ہزار تاتاری قتل ہو چکے تھے لیکن انہوں نے میدان نہ چھوڑا تھا۔ سلطان کے پیدل فوجی جو سواروں کے پیچھے تھے، انہوں نے تاتاریوں کے بغیر سوار گھوڑوں کو ادھر ادھر بھاگتے دیکھا تو دوڑ کر انہیں پکڑنا شروع کر دیا اور ان پر سوار ہو کر فوج میں شامل ہو گئے۔ اس طرح سلطانی لشکر کے سواروں کی تعداد بڑھ گئی اور تاتاری پہلے سے زیادہ جہنم واصل ہونے لگے۔ تاتاریوں نے اپنی بہادری کے بڑے جوہر دکھائے لیکن مسلمان مجاہدین نے انہیں تلوار پر رکھ لیا اور ان کی شمشیر زنی دھری کی دھری رہ گئی اور شام کے دھندلکے میں تو ایسا ہو گیا کہ تاتاری گھبراہٹ میں اپنے ہی آدمیوں کو مارنے لگے۔

دراصل جنگ کا نقشہ ایسا تبدیل ہو گیا تھا کہ تاتاری بالکل اندھے ہو گئے تھے اور انہیں اب اپنے چاروں طرف مصری ہی مصری دکھائی دے رہے تھے اور وہ گھبرا کر اپنے قریب آنے والے ہر سوار پر حملہ کر دیتے تھے۔ ان میں اکثر ان کے سوار بھی ہوتے جو اپنے ہی آدمیوں کے ہاتھوں قتل ہو جاتے۔

سورج مغرب کی طرف جھک گیا لیکن جنگ کا کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ سلطان نے محسوس کیا کہ اگر رات ہو گئی تو جنگ بغیر کسی فیصلے کے رک جائے گی اور کل پھر لڑنا پڑے گا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ بلاوجہ جنگ کو طول دے اس لیے اس نے خود اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا اور تاتاریوں کو دھکیلتا ہوا دور تک لے گیا۔

مصری سواروں نے اپنے سلطان کو اتنی تیزی سے بڑھتے دیکھا تو ان میں اور جرأت پیدا ہوئی اور انہوں نے پوری قوت سے حملہ کر دیا۔ اس حملے کا یہ نتیجہ ہوا کہ تاتاری بالکل ہی بدحواس ہو گئے اور ان کے قدم میدان سے اکھڑنے لگے لیکن وہ چاروں طرف سے گھرے ہوئے تھے اور انہیں مصری بھاگنے کا موقع نہ دیتے تھے۔

ابا خاقان اور منجو تیمور نے اپنی فوج کو بھاگتے دیکھا تو انہیں اپنی فکر ہوئی اور انہوں نے بھی فرار کی راہ تلاش کی اور آخر وہ کمزور حصے کی طرف اس قدر جھک گئے کہ سلطانی لشکر کا حلقہ ٹوٹ گیا اور تاتاری بے تحاشا گھوڑے موڑ کر بھاگ پڑے۔

اب تاتاری سوار دم دبا کر بھاگ رہے تھے اور مصری بڑھ بڑھ کر ان بھگوڑوں کو قتل کر رہے تھے۔ وہ تاتاری جو خیموں کی حفاظت پر مامور تھے، انہوں نے اپنی فوج کو میدان چھوڑتے دیکھا تو وہ بھی بھاگ کھڑے ہوئے اور اس طرح رات ہونے سے پہلے پہلے تاتاری ستر سے پچھتر ہزار لاشیں میدان جنگ میں چھوڑ کر اس طرح بھاگے کہ انہوں نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔ علاوہ ازیں پچیس ہزار تاتاریوں نے ہتھیار ڈال دیے اور جان کی امان طلب کی۔

تاتاریوں کے میدان چھوڑ جانے کے بعد سلطان کا پورا لشکر میدان میں جمع ہوا اس نے فتح و نصرت کے نعرے لگائے۔ سلطان نے شہیدوں کی لاشوں کو میدان سے اٹھوایا اور انہیں دفنانے کے انتظامات کیے۔ اس جنگ میں تاتاریوں کو تقریباً اسی ہزار جانوں سے ہاتھ دھونے پڑے اور صرف گیارہ ہزار مسلمان شہید اور زخمی ہوئے۔

شہیدوں کی تجہیز و تکفین کے بعد سلطان نے تاتاری سرداروں کی تلاش شروع کرائی۔ اس کا خیال تھا کہ ممکن ہے کہ منجو تیمور اور ابا خاقان بھی اس جنگ میں کام آ گئے ہوں لیکن تلاش بسیار کے باوصف ان کی لاشیں نہ مل سکیں جس کا مطلب تھا کہ وہ دونوں جان بچا کر بھاگنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

تاتاری، مصریوں کے ہاتھوں شکست کھا کر اس بدحواسی کے عالم میں بھاگے کہ انہیں ایک دوسرے کی بھی خبر نہ رہی۔ جس کا جس طرف منہ اٹھا، وہ ادھر بھاگ اٹھا۔ بدحواسی میں کچھ ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ تاتاری بھاگ رہے تھے اور فاتح مصری ان کے پیچھے لگے چلے آ رہے تھے اور جب بھی وہ قریب پہنچتے، تاتاریوں کو مار گراتے۔

بھاگنے والوں کی یہ دوڑ دھوپ سورج چھپنے تک جاری رہی۔ جب اندھیرا پھیل گیا تو مصریوں نے ان کا پیچھا چھوڑ دیا اور اپنے لشکر میں واپس آ گئے۔ تاتاریوں نے انہیں واپس جاتے دیکھا تو ان کی جان میں جان آئی مگر ان کے بھاگنے کی رفتار اب بھی کم نہ ہوئی۔

بھاگنے والوں میں تیمور بھی تھا۔ لشکر سے جدا ہو کر ایک ہزار سواروں کے ساتھ جان بچا کر میدان سے نکل آیا تھا۔ آج اس پر مسلمانوں کا بڑا رعب طاری ہو گیا تھا اور اس نے ارادہ کر لیا تھا کہ اگر وہ بچ کر اپنے علاقے میں پہنچ گیا تو آئندہ عمر بھر مسلمانوں کے مقابلے کی جرأت نہیں کرے گا۔

تیمور رات بھر بھاگنے کے بعد صبح کے وقت ایک ویران نخلستان میں ٹھہرا۔ وہ میدان جنگ سے اتنی دور آ گیا تھا کہ اب اسے اپنی جان کا تو کوئی خطرہ نہیں تھا لیکن اس ویران نخلستان میں کھانے پینے کی کوئی چیز موجود نہ تھی کیونکہ مسلمانوں نے اس نخلستان کو چھوڑنے سے پہلے ہر چیز کو تباہ کر دیا تھا پھر بھی ان لوگوں نے کچھ نہ کچھ مرے ہوئے جانور حاصل کر لیے اور ان سے اپنے پیٹ بھرے۔ اس شکست عظیم سے وہ اپنے ساتھیوں سے شرمندہ تھا اور آنکھ ملا نہ پاتا تھا لیکن بہرکیف وہ سردار تھا اور اسے اپنے سواروں پر اپنی بہادری قائم رکھنا تھی۔

کھانے پینے کے بعد اس نے سواروں سے جنگ اور اسباب شکست پر گفتگو کی۔ اس نے شکست کی سب سے بڑی وجہ یہ بتائی کہ مسلمانوں کا لشکر آٹھ دس لاکھ سواروں پر مشتمل تھا حالانکہ تاریخیں شاہد ہیں کہ مجاہدین اسلام کی تعداد ڈیڑھ لاکھ سے کسی صورت زیادہ نہ تھی اور تاتاری [illegible] ایک لاکھ ساٹھ ہزار سے زیادہ تھے۔

تیمور اس قسم کی باتوں میں مصروف تھا اور اپنی ڈینگیں مار رہا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ طے کر چکا تھا کہ اگر زندہ رہا تو اسلامی علاقوں کا بھی رخ نہ کرے گا لیکن اب وہ اپنے ساتھیوں کے سامنے مسلمانوں کی بزدلی اور تاتاریوں کی بہادری کے راگ الاپنے لگا۔ اس نے خیال ظاہر کیا کہ اگر تاتاری اور مسلمان برابر تعداد میں ہوں تو تاتاری، مسلمانوں کو دم بھر میں ختم کر سکتے ہیں۔

اس نے یہ خیال ظاہر کیا ہی تھا کہ قدرت نے اسے اس لاف زنی کے ثبوت کا ایک اور موقع دیا۔ تاتاریوں نے دیکھا کہ ایک طرف گرد اڑ رہی ہے۔ گرد کو دیکھتے ہی ان کے حواس جاتے رہے اور چہرے پیلے پڑ گئے۔ انہوں نے محسوس کر لیا کہ یہ سلطانی لشکر ہے جو ان کے تعاقب میں آ رہا ہے۔ وہ بھاگ بھاگ کر گھوڑوں پر سوار ہوئے۔

اتنی دیر میں خطرہ ان کے سروں پر پہنچ گیا۔ گرد چھٹ گئی اور اس میں سے صرف دو تین سو سوار نمودار ہوئے۔ تیمور کے پاس اس وقت بھی ایک ہزار سواروں کا دستہ موجود تھا جو آنے والوں کی تعداد سے تقریباً تین گنا تھا پھر بھی تیمور اور اس کے ساتھی مقابلے سے جان چرانے اور بھاگنے پر آمادہ تھے۔

تیمور جو ابھی ابھی مسلمانوں کی توہین کر رہا تھا، ان سواروں کو دیکھ کر حواس باختہ ہو گیا لیکن اسے اپنے ساتھیوں کے سامنے بہرصورت اپنی آن رکھنی تھی۔ حالانکہ اگر وہ اپنے ساتھیوں سے بھاگنے کا مشورہ کرتا تو وہ بخوشی آمادہ ہو جاتے کیونکہ وہ پہلے ہی تیار تھے۔

تیمور نے کوئی چارۂ کار نہ دیکھتے ہوئے اپنے ساتھیوں کو للکارا۔ ”ساتھیو...... ان سواروں کو آتے ہی ختم کر دو۔ ان کی تعداد بہت کم ہے اور ہم انہیں آسانی سے مار سکتے ہیں۔“

اس کے تاتاری ”بہادروں“ نے کوئی جواب نہ دیا لیکن مرتے کیا نہ کرتے کے مصداق اپنی تلواریں کھینچ لیں اور مقابلے کے لیے تیار ہو گئے۔

تیمور بھی آنے والے خطرے کے پیش نظر تلوار کھینچ کر تیار ہو گیا اور ان کے دیکھتے ہی دیکھتے سرخ اور زرد کلاہ والے سوار ان کے سر پر پہنچ گئے۔

جب وہ کافی قریب پہنچے تو ان میں سے ایک شخص چیخ کر بولا۔ ”خدا کی قسم، خوش قسمتی ہے یہ تاتاریوں کا سردار۔ اسے بالکل زندہ نہیں چھوڑنا چاہیے۔“ یہ آنے والے مصری اس وقت سلطانی لشکر سے نہیں آ رہے تھے بلکہ یہ سوار وہ تھے جو جیش کی سربراہی میں والیٔ حمص نے دیے تھے تاکہ وہ نفیسہ اور مصری فوج کے سو سواروں کو تاتاریوں سے رہا کرا لیں جو لڑائی میں گرفتار ہوئے تھے اور ان کا سردار جیش تھا۔

جیسا کہ مذکور ہو چکا، جیش خفاری نے بغلو خان کے دستے پر حملہ اس وقت کیا تھا جب وہ تاتاری لشکر کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس حملے میں جیش نہ تو نفیسہ کو رہا کرا سکا تھا اور نہ مصری سواروں کو۔ لہٰذا ادھر سے ناکام ہو کر جیش نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔

اس کے بوڑھے ساتھی نے رائے دی کہ اب اسے حمص پہنچ کر سلطان کو ان حالات سے آگاہ کرنا چاہیے لیکن اس نے خالی ہاتھ جانے سے قطعی انکار کر دیا۔

جیش کے اس انکار کی وجہ اور تھی۔ وہ وجہ تھی مصریوں

کے سردار کی ضد اور شرمندگی۔ مصری سردار جو حبش کے ساتھ چلا تھا، اس نے راستے میں قسم کھائی تھی کہ یا تو وہ نفیسہ کو حاصل کر کے سلطان کی امانت اس کے پاس لے جائے گا یا پھر عمر بھر سلطان کا سامنا نہ کرے گا اور اس طرح حبش اپنے سواروں کے ساتھ بجائے حمص جانے کے، ریگستان اور پہاڑوں میں سرگرداں گھومتا رہا۔

وہ تاتاری لشکر سے چھپ کر ان کے ساتھ ہی ساتھ آگے بڑھ رہے تھے اور جب بھی موقع ملتا سو پچاس تاتاریوں کو ختم کر دیتے۔ ان میں وہ سوار بھی آملے تھے جنہیں تاتاریوں نے ہلاکو خان کے کہنے پر رہا کر دیا تھا۔

ان سواروں کے بیان نے حبش کو پُرجوش بنا دیا اور اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ وہ نفیسہ کو حاصل کیے بغیر سلطانی لشکر میں واپس نہ جائے گا۔

تاتاری حمص کی طرف بڑھتے رہے اور حبش اپنے سواروں کے ساتھ ان کے پیچھے پیچھے چلتا رہا اور جس وقت تاتاری اور مصری میدانِ جنگ میں مصروفِ پیکار تھے تو حبش نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ تاتاریوں کے پیچھے پر دوبارہ حملہ کرنے کی کوشش کی تاکہ خیموں میں آگ لگا کر نفیسہ کو حاصل کرے لیکن وہ اس کوشش میں ناکام رہا۔

خیموں کے پاس پانچ ہزار تاتاری زبردست پہرا دے رہے تھے جن کی موجودگی میں نفیسہ کو حاصل کرنا ناممکن تھا۔

اس تنگ و تاز میں شام ہو گئی اور تاتاری شکست کھا کر بھاگے لیکن اس طرح بھاگے تھے کہ حبش کو اپنے سواروں کو بچانا مشکل ہو گیا تھا۔ تاتاری چاروں طرف سے بھاگ رہے تھے۔ اس موقع پر خیموں پر حملہ کرنا تو ایک طرف رہا، سامنے آنا بھی دشوار تھا۔

جب ذرا سکون ہوا اور حبش اپنے سواروں کے ساتھ پوشیدہ جگہ سے نکلا تو اس نے دیکھا کہ نہ تاتاری ہیں اور نہ خیمے بلکہ خیموں کی جگہ پر چند لاشیں تڑپ رہی تھیں۔ حبش کو بہت افسوس ہوا اور یہ سوچتے ہوئے کہ شاید نفیسہ بھی ان تاتاریوں کے ساتھ ہو، وہ مصری لشکر میں جانے کے بجائے تاتاریوں کے پیچھے روانہ ہوا۔

حبش کا خیال صحیح تھا کیونکہ اباخاقان بھاگتے وقت نفیسہ کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ یوں حبش رات بھر چلتا رہا اور صبح کو جب وہ گلستان میں داخل ہوا تو وہاں نفیسہ کے بجائے اس کی مڈبھیڑ منگو تیمور سے ہو گئی۔ منگو تیمور جان بچا کر یہاں پہنچا تھا لیکن اس کی قضا اس کے ساتھ ساتھ یہاں آ رہی تھی۔

یوں حبش نے جب اپنے ساتھی کی آواز سنی تو وہ چونک پڑا۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ تاتاری لشکر میں ہلاکو خان کے دو بیٹے منگو تیمور اور اباخاقان موجود ہیں لیکن وہ انہیں پہچانتا نہ تھا۔ جس نے منگو کو پہچانا تھا وہ مصریوں کا نائب سردار تھا جسے ہلاکو خان گرفتار کر کے اپنے لشکر میں لے گیا تھا۔

حبش نے نائب سے پوچھا۔ "دوست اچھی طرح سے دیکھو، کیا یہ واقعی وہی منگو تیمور ہے جسے ہلاکو خان کا بیٹا کہا جاتا ہے؟"

نائب نے ایک بار پھر پورے یقین سے کہا۔ "سردار! میں نے اسے تاتاری لشکر میں دیکھا ہے۔ نظریں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔" ساتھ ہی اس کی تصدیق بوڑھے نے بھی کر دی۔ اس نے حبش کو بتایا کہ تاتاری سردار سر پر بالوں والی ٹوپی پہنتے ہیں جن پر بڑے بڑے پر لگے ہوتے ہیں۔ دوسرے تاتاری منڈھی ہوئی گول ٹوپیاں استعمال کرتے ہیں۔

منگو تیمور کے سر پر بالوں والی ٹوپی تھی۔ یہ اطمینان کر لینے کے بعد حبش نے اپنا گھوڑا دو قدم آگے بڑھایا اور بولا۔

"تمہارا سردار کون ہے؟" منگو تیمور اتنا حواس باختہ تھا کہ وہ بول بھی نہ سکا مگر اس کے ساتھیوں نے اس کی طرف اشارہ کر دیا۔ کیا وقت تھا کہ کہاں تاتاری اپنے زعم میں پہاڑ سے بھی ٹکرانے کا دعویٰ کرتے تھے اور کہاں اب تعداد میں کئی گنا ہونے کے باوصف ان میں مقابلے کی ہمت موجود نہ تھی اور وہ شاید ٹل جانے کی دعا مانگ رہے تھے۔

فتح اور شکست میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ کل تک تاتاری کتنے مغرور اور ظالم تھے اور آج وہ بکریوں کی طرح دبکے ہوئے کھڑے تھے۔

اس اعلان پر تاتاری سواروں کے چہروں پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ انہوں نے اپنے سردار کی طرف دیکھا۔ منگو تیمور کھڑا پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ آخر اس سے رہا نہ گیا اور وہ باز کی طرح حبش پر جھپٹا۔ اس کے ساتھ ہی تلواروں کے ٹکرانے سے فضا میں ایک ہلکا شعلہ لپکا۔

مصری نہیں چاہتے تھے کہ حبش اکیلا مقابلہ کرے کیونکہ منگو تیمور بڑا گرانڈیل اور مضبوط تاتاری تھا۔ حبش اسے للکار چکا تھا اس لیے وہ لوگ خاموش رہے اور خدا سے حبش کی فتح کی دعا مانگنے لگے۔

حبش نے بھی شاید اسی دن کے لیے شمشیر زنی سیکھی تھی۔ اس نے منگو تیمور کے ہر وار کو بڑی صفائی سے روکا پھر جوابی وار کرنا شروع کیے۔ منگو تیمور جھپٹ کر وار کرتا تھا اور

جیش بجلی کی سی پھرتی سے یا تو اس کا وار خالی دیتا یا اسے اپنی ڈھال پر روک لیتا تھا۔

دونوں طرف کے سوار لڑائی کو بڑے غور اور بے صبری سے دیکھ رہے تھے۔ تب ہی منجو تیمور نے ایک ایسا وار کیا کہ جیش کے بچنے کے باوجود اس کی ٹھوڑی کے نیچے ایک ہلکا زخم آ گیا۔

منجو تیمور نے اسے زخم لگا کر ایک خوفناک قہقہہ لگایا لیکن اس قہقہے کی آواز ابھی پوری طرح فضا میں سمائی بھی نہ تھی کہ جیش کا جوابی وار ہوا اور منجو تیمور کے ہاتھ سے تلوار جھول کر رہ گئی اور پھر دوسرے وار میں جیش کی شمشیر آبدار تاتاریوں کے سردار اعلیٰ کے سینے میں سما گئی اور وہ تیورا کر پشت کے بل زین پر جھول کر رہ گیا۔

تاتاریوں نے سردار کو گرتے دیکھا تو اپنے ہتھیار پھینک دیے اور جان کی امان طلب کی اور جیش کے بوڑھے ساتھی نے دوڑ کر جیش کو گلے لگایا۔ جیش نے تیمور کا سر قلم کیا اور ایک نیزے پر چڑھا دیا۔ تاتاریوں نے تصدیق کی کہ وہ واقعی منجو تیمور تاتاریوں کا سردار اعلیٰ ہے جو جیش کے ہاتھوں مارا گیا ہے۔

اس خبر سے تمام لوگ بہت مسرور ہوئے پھر یہ رائے ہوئی کہ اب سب لوگ یہ سر لے کر سلطان کے حضور چلیں کیونکہ کارنامہ یہ بھی کم اہم نہ تھا۔

جیش اور مصری سردار نے بھی اس رائے سے اتفاق کیا اور وہ منجو تیمور کا سر اور تاتاریوں کو گرفتار کر کے خوش خوش حمص کی طرف روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

جنگ سے فراغت پانے کے بعد سلطان منصور قلاوون نے بھی اپنے لشکریوں کے ساتھ میدان جنگ میں نمازِ شکرانہ ادا کی۔ اس موقع پر سلطان پر اس قدر رقت طاری ہوئی کہ اس کی سسکیوں کی آواز دور دور تک پھیلے ہوئے لشکریوں نے سنی۔

سلطان نے گڑگڑا کر اس باری تعالیٰ کے حضور اظہار تشکر کیا جس نے اسے اس شاندار فتح سے ہمکنار کیا تھا۔ تشکر کے اظہار کا اس سے زیادہ موزوں موقع اور کون سا ہو سکتا تھا کہ ایک طرف ایک لاکھ ساٹھ ہزار تاتاری کافروں کا لشکر عظیم مسلمانوں کی واحد سلطنت مصر کو تباہ کرنے کے لیے موجود تھا اور دوسری طرف ڈیڑھ لاکھ مجاہدینِ اسلام اپنے سر ہتھیلیوں پر لیے کھڑے تھے۔

یہ تائیدِ غیبی تھی جس نے مسلمانوں کو ان خوفناک درندوں پر فتح دلائی اور وہ اسی ہزار لاشیں میدان جنگ میں چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

دن بھر کی جنگ کے بعد لشکر اور خود سلطان کافی تھک گئے تھے۔ سلطان نے حکم دیا کہ کھانے سے فراغت کے بعد سوائے پہریداروں کے، تمام لشکر کامل آرام کرے۔ اس وقت بعض سرداروں نے تاتاریوں کا فوری تعاقب کرنے کا مشورہ دینا چاہا مگر سلطان نے ارشاد فرمایا کہ آج رات لشکر کو آرام کا پورا موقع دیا جائے اور تعاقب کے بارے میں صبح کو کوئی فیصلہ کیا جا سکے گا۔

سلطان کے حکم کے مطابق تمام سپاہی کھانے سے فارغ ہو کر ایسے بے خبر ہوئے کہ اس وقت تک انہوں نے کروٹ بھی نہ بدلی جب تک صبح مؤذن نے انہیں نمازِ فجر کے لیے نہ جگایا۔ اذان کی آواز سن کر سپاہی بیدار ہوئے اور پھر سب بارگاہِ الٰہی میں سربسجود ہو گئے۔

اب سلطان نے سرداروں اور امیروں کو اپنے خیمے میں طلب کیا تاکہ آئندہ لائحہ عمل کے متعلق کوئی فیصلہ کیا جا سکے۔ بعض امیروں کی رائے تھی کہ چونکہ تاتاریوں کے دونوں سردار اباقاآن اور منجو تیمور بھی بچ کر نکل گئے تھے اس لیے ان کا فوراً تعاقب کیا جائے اور جہاں بھی ہوں، انہیں دم نہ لینے دیا جائے لیکن بعض امراء کا خیال تھا کہ تاتاری ایسی بری طرح شکست کھا کر بھاگے ہیں کہ وہ اب حدودِ شام میں نہیں رکیں گے۔ اس وقت ان کے تعاقب میں فوج کو خواہ مخواہ پریشانی ہوگی اور اس سے کچھ حاصل بھی نہ ہوگا۔

سلطان نے تمام امراء کو آزادی سے بحث کی اجازت دی تھی اس لیے خوب گرما گرم بحث ہو رہی تھی اور دونوں گروہ ایک دوسرے کو اپنا ہم خیال بنانے میں مصروف تھے۔ فیصلہ تو دراصل سلطان نے کرنا تھا لیکن وہ چاہتا تھا کہ دونوں گروہوں کے نقطۂ نظر اور حکمتِ عملی کو سنے تاکہ درست نتیجے پر پہنچ سکے۔

اس بحث کے دوران میں ہی اس کے لشکر کے چند سوار سلطان کے روبرو پیش کیے گئے جن کو تاتاریوں کی خبر لینے کے لیے روانہ کیا گیا تھا۔ ان سواروں نے سلطان کو فوری مطلع کیا کہ تاتاریوں نے شکست کھا کر اب حمدان کا رخ کیا ہے اور وہ سب کے سب ایک جگہ جمع ہو کر حمدان کی طرف بڑھ رہے تھے۔

حمدان اس وقت ہلاکو کے تیسرے بیٹے تیکودار اوغلان کے زیرِ حکومت تھا۔ تاتاریوں کا حمدان کی طرف بڑھنے کا صاف مطلب تھا کہ وہ حمدان جا کر تیکودار اوغلان

سے مدد حاصل کریں گے اور ممکن ہے کہ پھر وہ ان کی مدد کے زور پر دوبارہ مسلمانوں کے مقابلے پر نکلیں۔

صورتِ حال تشویشناک تھی کیونکہ تاتاری حمدان پہنچ کر اگر مسلمانوں کے مقابلے میں دوبارہ نہ بھی آتے تو بھی وہاں بیٹھ کر وہ اپنی طاقت اکٹھا کر سکتے تھے اور آئندہ اسلامی علاقوں کو پامال کر سکتے تھے۔ اس تازہ صورتِ حال کے مطابق وہ لوگ جو فوری تعاقب کے مخالف تھے، خاموش ہوگئے اور انہوں نے متفقہ طور پر کہہ دیا کہ اس وقت حمدان پر حملہ ضروری ہے کیونکہ تاتاری اس وقت شکست خوردہ ہیں۔ ان کی ہمتیں پست ہیں۔ ہمارے حوصلے بڑھے ہوئے ہیں۔

اگر اس وقت ہم نے حمدان پر حملہ کیا تو اس کو فتح کرنے میں زیادہ دقت پیش نہیں آئے گی اور اگر تاتاریوں کو موقع دیا گیا تو وہ اپنی طاقت جمع کر کے مستقل خطرہ بن جائیں گے۔

جب تمام سردار اس فیصلے پر پہنچ گئے تو انہوں نے آخری حکم کے لیے سلطان کی طرف دیکھا۔ سلطان گہرے تدبر، عمیق سوچ اور فکر میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے سرداروں کو اپنی طرف متوجہ دیکھا تو غور و فکر ختم کرتے ہوئے سرداروں کی طرف دیکھا لیکن قبل اس کے کہ وہ کوئی فیصلہ کرتا، ایک پہریدار خیمے میں داخل ہوا اور سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ سلطان نے اس سے سوال کیا۔

"کیا کہنا چاہتے ہو؟ اجازت ہے۔"

"سلطان عالی مقام کا اقبال بلند ہو۔ حدیثہ کے سواروں کا ایک دستہ ابھی ابھی لشکر میں آیا ہے اور ان کا بھی سردار حضور کی قدم بوسی کے لیے بے چین ہے۔"

حدیثہ کے نام پر والیِ حدیثہ چونکا۔ سلطان نے والیِ حدیثہ سے پوچھا۔ "کون لوگ ہیں اور کیا چاہتے ہیں؟"

والیِ حدیثہ نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ یہ حدیثہ کے وہ جاں نثار ہیں جو ہم سے اجازت لے کر لڑکی نفیسہ کی رہائی کے لیے گئے تھے۔"

سلطان نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "ہاں، یاد آیا۔ اس لڑکی کا ذکر اس سے پہلے بھی آ چکا ہے۔ کہیں یہ لوگ اسے چھڑا کر تو نہیں لائے ہیں۔ اگر حدیثہ کے اس دستے نے اس مظلوم اور بے چاری لڑکی کو رہا کرایا ہے تو اس دستے کے ہر سپاہی کو منہ مانگا انعام دیا جائے گا۔ لڑکی ہمیں اپنی بیٹی کی طرح عزیز ہے۔"

پھر سلطان پہریدار کی طرف مخاطب ہو کر بولا۔ "کیا ان لوگوں کے ساتھ کوئی لڑکی بھی ہے؟" پھر بے چینی سے پہریدار کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔

پہریدار نے جواب میں پست کہا۔ "نہیں عالی جاہ! ان کے ساتھ لڑکی نہیں ہے لیکن ان کا سردار حضور کے قدموں میں ایک تحفہ پیش کرنے کا خواہشمند ہے۔"

سلطان نے پہریدار کو اشارہ کیا کہ سردار کو حاضر کیا جائے۔ پہریدار واپس چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد ایک نوجوان کو لے کر خیمے میں داخل ہوا۔ یہ جوان حبش خماری تھا اور اس کے نیزے پر منجو تیمور کا سر بلند تھا۔ خیمے کے ہر شخص نے پہلے آنے والے کو پھر نیزے پر بلند سر کو دیکھا۔

حبش آداب بجا لایا اور پھر بڑے فخر سے بولا۔

"سلطان ذی شان! اجازت دیں کہ میں اس مغرور سر کو حضور والا کے قدموں میں رکھوں۔"

سلطان نے حبش اور سر کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اے جوان! تمہارا نام کیا ہے اور یہ سر کس شخص کا ہے؟"

حبش نے اسی فخر سے کہا۔ "خادم کا نام حبش خماری ہے۔ یہ سر اس بے دین منجو تیمور کا ہے جس نے حضور کے خلاف تلوار اٹھائی تھی اور مسلمانوں کی بستی کو نیست و نابود کر دیا تھا۔"

سلطان منصور نے منجو تیمور کا نام سنا تو اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور کچھ دیر تک کبھی سر کو اور کبھی حبش کو دیکھتا رہا۔

دراصل اس کے لیے یہ خبر مسرت کے ساتھ ساتھ حیرت کا باعث بھی تھی۔ اسے تو معلوم ہوا تھا کہ تاتاریوں کے دونوں سردار اباقاآن اور منجو تیمور بچ کر نکل گئے ہیں اور اس وقت وہ منجو تیمور کا سر نیزے پر بلند دیکھ رہا تھا۔ آخر سلطان نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"نوجوان حبش! کیا تم اس شخص کا نام بتا سکتے ہو جس بہادر نے اسے اس سرکش تن سے جدا کیا ہے؟"

حبش نے خم ہو کر جواب میں کہا۔ "اس سر کو جدا کرنے کا فخر سلطان مصر کے اسی خادم کو حاصل ہوا ہے جو اس وقت اسے نیزے پر بلند کیے ہوئے ہے۔"

سلطان نے حبش کو بڑی محبت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"نوجوان! تم ہمارے قریب آؤ۔ اتنا قریب کہ تم ہمارے دل کی ان دھڑکنوں کو سن سکو جو تمہارے اس کارنامے سے بیدار ہوئی ہیں۔"

نوجوان حبش نے سر کو نیزے سے نیچا کر کے سلطان مصر کے قدموں میں لڑھکا دیا اور پھر آہستہ قدم چلتا ہوا سلطان کے قریب پہنچ گیا۔ سلطان نے جوشِ مسرت سے حبش کو اپنے سینے سے لگا لیا اور جب سلطان نے حبش کو سینے

سے الگ کیا تو باری باری ہر سردار نے جیش کے قریب آکر اس کے ہاتھ کو پیار و محبت سے بوسہ دیا۔

سلطان کا چہرہ ہنوز خوشی سے دمک رہا تھا اور وہ جیش کو ان نظروں سے دیکھ رہا تھا کہ جو نظریں صرف شفیق باپ کی ہی ہو سکتی ہیں۔ سلطان کے خیمے میں یہاں سے وہاں لہر مسرت و شادمانی دوڑ گئی۔ ہر شخص کا چہرہ دمکنے لگا۔ ہر ایک حسب حیثیت و مراتب جیش کے اس کارنامے کی تعریف کر رہا تھا۔ جب ذرا سکون ہوا تو جیش نے حدیثہ سے روانگی سے لے کر منجو تیمور کے قتل تک کے تمام واقعات سلطان کے گوش گزار کر دیے۔

والی حدیثہ نے سلطان کو پہلے ہی بتا دیا تھا کہ اس نے جیش کی فرمائش پر دو سو سوار اس کے ساتھ کر دیے تھے کہ اگر موقع ملے تو وہ نفیسہ کو حاصل کر لے۔ جیش نے حالات بیان کرنے کے دوران کوشش کی کہ اپنے اور نفیسہ کے تعلقات کے بارے میں احتیاط برتے لیکن سلطان نے اس سے نفیسہ کے ساتھ اس کے تعلق کا اندازہ لگا لیا اور آخر اس نے اس بات کا اظہار کر ہی دیا۔

”بہادر جیش! ہم تمہاری جرأت اور تمہارے خلوص اور کارنامے سے بہت متاثر ہوئے ہیں۔ ہم نے نفیسہ کو تمہاری کہا ہے اور اس بچی کو حاصل کرنے میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھیں گے۔“

جیش سمجھ گیا کہ سلطان کے سامنے وہ اپنے جذبات کو چھپا نہ رکھ سکا ہے۔ اس نے سر خم کرتے ہوئے کہا۔ ”تخت مصر کے سلطان پر میری ناچیز جان حاضر ہے۔“

سلطان نے کہا۔ ”جیش! تم تخت مصر کے لیے وہ دمکتا ہوا نگینہ ہو جسے ضائع نہیں کیا جا سکتا۔ ہم تمہیں مصر کے لشکر کے ایک اعلیٰ سردار کا عہدہ عنایت فرماتے ہیں۔“

جیش نے شکر گزار نظروں سے سلطان کو دیکھتے ہوئے اپنے سر کو دوبارہ خم کر دیا۔ اس وقت سلطان کے اشارے سے خلعت فاخرہ جیش کو پیش کر دی گئی اور سلطان نے خود دست مبارک سے اس کی کمر میں تلوار آویزاں کی۔ یہ رسم بڑی سادگی مگر مسرت و شادمانی کے اطوار میں ادا کی گئی۔

اس کے بعد جیش نے کہا۔ ”سلطان عالی کی نوازش ہے۔ میں کس زبان سے شکریہ ادا کروں۔ اس کے ساتھ ہی میں اس بات کے اظہار کی تمنا رکھتا ہوں کہ میں نے تاج و تخت مصر کے لیے جو کچھ کیا ہے، اس میں میرے ساتھی خصوصاً وہ مصری سردار جو نفیسہ کی حفاظت پر مامور تھا اور بوڑھا افغانستانی برابر کے شریک ہیں۔“

سلطان نے کہا۔ ”ہمیں ان کی خدمات کا بھی احساس ہے اور انہیں معقول نوازشات سے نوازا جائے گا۔“ پھر سلطان نے اعلان کیا کہ وہ بغیر وقت ضائع کیے حمدان کی طرف کوچ کرنا چاہتے تھا۔

اس سلسلے میں اس بات کا خاص طور سے اعلان کیا گیا کہ پانچ ہزار کا ایک لشکر جیش خاری کی زیر قیادت ہراول دستے کے طور پر پہلے حمدان روانہ ہوتا کہ وہ وہاں پہنچ کر حالات کا جائزہ لے اور اگر تاتاری قلعہ بند ہونے کی کوشش کریں تو جیش فوراً محاصرہ کر لے۔

جیش کے لیے یہ دن بڑی خوشی کا تھا۔ اس کی بھی یہی خواہش تھی کہ حمدان وہ سب سے پہلے روانہ ہو کیونکہ اسے پوری امید تھی کہ تاتاری نفیسہ کو لے کر حمدان گئے ہوں گے۔ سلطان کا فرمان سنتے ہی اس نے اپنے لشکر کی کمان سنبھال لی۔ اس لشکر میں اس نے مصر اور حدیثہ کے سواروں کو بھی شامل کر لیا جو اس کے ساتھ منجو تیمور کے معرکے میں شریک تھے اور شام ہونے سے پہلے پہلے جیش، سلطان سے رخصت ہو کر اپنے لشکر کے ساتھ حمدان کی طرف چل دیا۔

راستے کی دشواریوں سے نمٹنے کے لیے اس کے ساتھ بوڑھا افغانستانی موجود تھا۔ اس کے علاوہ جو دستہ اسے دیا گیا تھا اس میں مصری، شام اور عراق کے چیدہ چیدہ سوار تھے۔

☆☆☆

تاتاری شکست کھانے کے بعد سر پر پیر رکھ کر بھاگے اور ایک دو منزل تک انہوں نے مارے خوف کے پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔ حالانکہ اباخاقان کے ساتھ اس وقت بھی چالیس پچاس ہزار کا لشکر تھا۔ باقی فوج منتشر ہو کر ادھر ادھر بھاگ گئی تھی جن میں بیشتر مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہوئے اور بعض دور دراز کے علاقوں کی طرف نکل گئے۔

حمص سے کافی دور نکل آنے کے بعد تاتاریوں کے کچھ ہوش ٹھکانے ہوئے تو انہوں نے یہ سوچنا شروع کیا کہ اب کیا کرنا چاہیے؟ اباخاقان کو سب سے زیادہ فکر اپنے بھائی کی تھی۔ اسے اب پتا تھا کہ اس کا بھائی منجو تیمور دست بدست مقابلے میں جیش کے ہاتھوں مارا گیا ہے۔

ایک دو دن تک تاتاریوں نے منجو تیمور کا انتظار کیا لیکن جب اس کی کوئی خبر نہ ملی تو وہ ناامید ہو گئے۔ اس زمانے میں ہلاکو خان کا ایک اور بیٹا اباخاقان کا بھائی تکودار اوغلان حمدان کا حاکم تھا۔ اوغلان کے پاس کافی لشکر تھا اور حمدان کا علاقہ جنگی نقطہ نظر سے بھی بہت مضبوط تھا۔ لہٰذا

اباخاقان نے سوچا کہ کیوں نہ اس بھائی سے مدد لی جائے۔ اسے یہ بھی خطرہ تھا کہ شاید سلطان مصر اس کا پیچھا کرے۔ اس لیے حمدان سے بہتر اور کوئی جگہ ایسی نہیں ہے جہاں وہ پناہ بھی حاصل کرسکتا ہے اور ضرورت کے وقت سلطان مصر کا مقابلہ بھی کیا جاسکتا ہے۔

چنانچہ ان تمام باتوں کو سوچتے ہوئے اس نے حمدان کا رخ کیا اور باقی ماندہ فوج کو لے کر حمدان پہنچ گیا۔ تکودار اوغلان کو اس کے آنے کی خبر ملی تو وہ خوش ہونے کے بجائے پریشان ہوا۔

پچھلے دس برس میں تاتاریوں اور مصریوں کے درمیان جو لڑائیاں ہوئی تھیں، اس سے تکودار اوغلان نے اندازہ لگالیا تھا کہ اب تاتاریوں کا زوال شروع ہوچکا ہے اور سلطان مصر کو شکست دینا ایک خواب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔

تکودار اوغلان نے اپنے بھائی اباخاقان کا بڑی سرد مہری سے استقبال کیا۔ اس سرد مہری میں حمدان کے سردار بھی شامل تھے۔ حمدان کے تاتاری سرداروں کو یہ خوف پیدا ہوگیا تھا کہ اگر اباخاقان حمدان میں زیادہ ٹھہرا تو ممکن ہے کہ سلطان مصر حمدان کا رخ کرے اور یوں ان کا بھی وہی حشر ہو جو اباخاقان کا ہوا ہے۔ خود تکودار کو یہ خوف تھا کہ اباخاقان کے پاس اب بھی کافی فوج ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ حمدان ہی پر قبضہ کرلے۔

تکودار اوغلان نے قلعے سے نکل کر اپنے بھائی سے ملاقات کی۔ اباخاقان کا خیال تھا کہ اس کے اور اس کی فوج کے لیے حمدان کے دروازے کھول دیے جائیں گے لیکن اوغلان نے ایسا نہیں کیا اور رسمی گفتگو کے بعد صرف اباخاقان اور چند سرداروں کو قلعے میں آنے کی دعوت دی باقی فوج کو فصیل کے باہر ہی ٹھہرا دیا گیا۔

اباخاقان بڑی امید لے کر آیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ تکودار اوغلان اس شکست کا بدلہ لینے میں اس کا ہمنوا ہوگا اور پھر وہ تکودار کی مدد سے مصریوں سے دو دو ہاتھ کرکے اپنے کھوئے ہوئے وقار کو حاصل کرنے کی کوشش کرے گا لیکن اس کے سرداروں نے مسلمانوں سے جنگ کی سخت مخالفت کی اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے دبے الفاظ میں اس بات کا اظہار بھی کیا کہ اباخاقان کو اس وقت پناہ دینا خود اپنی موت کو دعوت دینا ہے۔

اباخاقان بھاگتے وقت اپنے ساتھ نفیسہ کو بھی لایا تھا۔ غریب نفیسہ بڑی مصیبت کے دن گزار رہی تھی۔ راستے

پھر بھی ایاخاقان نے اسے ساقی گری کے لیے مجبور کیا تھا لیکن نفیسہ نے شراب کے برتنوں میں ہاتھ لگانے سے صاف انکار کر دیا اور اس کے نتیجے میں بڑی بیدردی سے اسے کوڑے مارے گئے۔

قلعے میں داخلے کے وقت نفیسہ بھی اس کے ساتھ تھی۔ ایاخاقان نے اپنی شان جتانے کے لیے تیکودار سے کہا کہ یہ دمشق کی شہزادی ہے اور وہ اس کے ساتھ شادی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے لیکن نفیسہ کے مرجھائے ہوئے چہرے اور بجھے اطوار نے ظاہر کر دیا تھا کہ وہ ایاخاقان سے قطعی خوش نہیں اور وہ اس کے پنجے سے آزاد ہونا چاہتی ہے۔

نفیسہ اس پریشانی اور مصیبت میں بھی ایک دمکتا ستارہ اور چمکتا مہتاب تھی۔ تیکودار اوغلان کی اس پر نظر پڑی تو ہوش وحواس کھو بیٹھا اور خود نفیسہ کو حاصل کرنے کی فکر میں لگ گیا۔

یوں تیکودار اوغلان کے سردار بھی ایاخاقان کے پہلے ہی خلاف ہو رہے تھے۔ وہ اسے پناہ دے کر خود مصیبت مول لینا نہیں چاہتے تھے۔ اس بات سے تیکودار اوغلان کو شہ ملی اور اس نے سرداروں کی رائے اور مشورے سے آخر ایاخاقان کو زہر دے کر ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔

ایاخاقان کا خاتمہ بڑے ڈرامائی انداز سے ہوا تھا۔ حمدان کے باہر پڑے ہوئے تاتاری لشکر کو تین دن تک یہ معلوم بھی نہ ہو سکا کہ ان کا سردار موت کی نیند سلایا جا چکا ہے۔ آخر ایک شام انہیں یہ خبر سنائی گئی۔ تاتاری لشکر پر اس خبر سے بجلی گر پڑی اور ان کی امیدوں کا چراغ ہمیشہ کے لیے بجھ کر رہ گیا۔

تیکودار اوغلان نے اعلان کرا دیا کہ جو تاتاری اس کی سرداری تسلیم کرنے پر آمادہ ہیں، وہ حمدان میں داخل ہو سکتے ہیں ورنہ انہیں اختیار ہے کہ جس طرف چاہیں، چلے جائیں۔ اس اعلان سے کچھ تاتاری تو تیکودار سے مل گئے۔ باقی جس کا جدھر منہ اٹھا، چل دیا۔ ایک لاکھ ساٹھ ہزار کا وہ لشکر جو مصر کی فتح کو نکلا تھا، اس طرح تتر بتر ہو گیا۔

ایاخاقان کے خاتمے کے بعد تیکودار کو نفیسہ کو حاصل کرنے کا موقع ملا۔ وہ اس کے پاس گیا۔

"شہزادی! اب تمہیں خوش ہونا چاہیے کہ تم ایک بھگوڑے سردار کی نہیں بلکہ حکمران اور حاکم سردار کی بیوی بننے والی ہو۔" اوغلان نے اکڑ کر اس سے کہا۔ اسے یہ خوش فہمی تھی کہ وہ اس کی سلطنت اور حاکم داری دیکھ کر متاثر ہو گی اور ہاں کر دے گی مگر نفیسہ نے انتہائی بے جگری اور نفرت بھرے انداز میں تیکودار اوغلان سے کہا۔

"میں تمہاری حاکم داری اور تم پر تھوک پھینکتی ہوں۔ تمہارے ہاتھ بے گناہ اور مظلوم مسلمانوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔"

نفیسہ کے اس گرما گرم جواب پر اوغلان کا چہرہ مارے طیش کے ایک دم سرخ ہو گیا اور چاہا کہ اس منہ زور شہزادی (نفیسہ) کو ابھی سبق سکھا دے مگر پھر برداشت سے کام لیا اور ہزار جتن کر ڈالے مگر نفیسہ ٹس سے مس نہ ہوئی اور تیکودار کو اپنے قریب تک نہ آنے دیا۔

تیکودار اوغلان نے یہ سوچتے ہوئے کہ ابھی پنچھی نیا ہے، کچھ دن بعد خود راہ راست پر آ جائے گا، نفیسہ کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

حمدان کے جاسوس سوار روز یہ خبریں حمدان لاتے کہ سلطان مصر، ایاخاقان سے نمٹنے کے لیے اپنے لشکر کے ساتھ حمدان کی طرف بڑھتا آ رہا ہے۔ ان خبروں سے اہل حمدان میں بڑی بے چینی اور ہراس پھیل گیا۔ تیکودار بھی پریشان تھا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ اس نے ایاخاقان کو ختم کر کے حمدان کو تاتاریوں سے بچا لیا تھا لیکن سلطان کے کوچ کی خبروں نے اسے بہت زیادہ پریشان کر دیا تھا۔

ایک دن جاسوسوں نے یہ خبر بھی پہنچائی کہ ایاخاقان کا دوسرا بھائی تیمور مسلمانوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس کا سر نیزے پر بلند کر کے فوج کے آگے آگے عبرت کے لیے لٹکایا گیا ہے۔

اس کے ساتھ ہی مخبروں نے اس میں اس بات کا اضافہ کر دیا کہ سلطان نے اعلان کر دیا ہے کہ جب تک ایاخاقان اور تیکودار کا سر بھی اسی طرح نیزے پر بلند نہ ہو گا، سلطان قاہرہ واپس نہ جائے گا۔

افواہیں روز اڑتیں۔ کوئی کچھ کہتا اور کوئی کچھ۔ ہر جگہ، ہر مقام پر مسلمانوں کی پیش قدمی کا ذکر ہوتا۔ تیکودار سخت سراسیمہ تھا اور روز اپنے سرداروں سے صلاح ومشورہ کرتا مگر بغیر کسی فیصلے کے مجلس برخاست ہو جاتی۔

حقیقت یہی تھی کہ اس کے سردار مسلمانوں سے جنگ کے لیے کسی طرح آمادہ نہ تھے لیکن تیکودار خاموشی سے حمدان کو مسلمانوں کے حوالے نہیں کرنا چاہتا تھا۔ آخر ایک دن حمدان میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی کہ مصری لشکر حمدان کے بالکل قریب پہنچ گیا ہے۔ یہ بات سچ بھی تھی کیونکہ غروب آفتاب کے وقت اسلامی لشکر اپنا پرچم اڑاتا قلعہ حمدان کے سامنے نمودار ہوا۔

قلعے کے دروازے بند کرلیے گئے اور نگہداروں نے برجوں اور دیواروں پر سخت پہرا لگا دیا۔ نفیسہ کو یہ خبر ملی تو دوڑ کر برج کے روزن سے جھانکنے لگی۔ اسے شام کے دھندلکے میں اسلامی پرچم دور لہراتا نظر آیا اور وہ فرطِ مسرت سے کھل اٹھی۔

حقیقت میں وہ اسلامی لشکر نہیں تھا۔ البتہ اسلامی لشکر کا وہ حصہ ضرور تھا جسے سلطان مصر نے جیش خماری کی سرکردگی میں بطور ہراول دستہ حمران روانہ کیا تھا لیکن حمران کے جاسوس اسے اسلامی لشکر سمجھ بیٹھے۔ دراصل وہ مسلمانوں سے اس قدر خائف ہو گئے تھے کہ انہیں ایک ایک مسلمان سو سو نظر آئے تھے اور اسی لیے حمرانی جاسوسوں نے کل پانچ ہزار سواروں کو اسلامی لشکر سمجھ لیا۔

جیش نے قلعے کے سامنے پہنچ کر لشکر کو خیمہ زن ہونے کا حکم دیا اور پھر بوڑھے تغلستانی اور دوسرے سرداروں کو لے کر قلعے کے گرد چکر لگانے چلا تاکہ رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے قلعے کے کمزور حصے کا پتا لگائے اور صبح کو اسی کے مطابق قلعے پر حملہ کرے۔

رات کچھ زیادہ تاریک نہ تھی۔ شروع رات کا چاند نکل کر غائب ہو چکا تھا لیکن روشنی کا عکس موجود تھا جس میں جیش نے قلعے کے چاروں طرف کا خوب جائزہ لیا۔

حمران کا قلعہ ایک اونچے مقام پر واقع تھا اور اس قلعے میں پورا شہر آباد تھا۔ اس دور میں شہر عام طور پر قلعوں میں آباد ہوتے تھے تاکہ بیرونی حملوں سے محفوظ رہیں۔

قلعے کے چاروں طرف مضبوط فصیل کے ساتھ ساتھ گہری نہر تھی جس میں پانی بھرا ہوا تھا۔ شہر کے چاروں طرف دروازے تھے جن میں داخل ہونے کے لیے نہر کے اوپر لٹکنے والے پلوں کو پار کرنا ہوتا تھا۔ لڑائی کے زمانے میں پل اٹھا لیے جاتے تھے تاکہ دشمن آسانی سے قلعے کے دروازے تک نہ پہنچ سکے۔

جیش کے پاس صرف پانچ ہزار سوار تھے اور انہیں قلعے کے چاروں طرف پھیلانے کا مطلب تھا کہ ہر طرف سے دشمن حملہ آور ہوتے۔ اتنی قلیل تعداد کا ایک ایسے مضبوط قلعے پر حملہ کرنا بڑا مشکل تھا۔

قلعے کے تینوں دروازے اتنی بلندی اور اونچائی پر تھے کہ ان تک پہنچنا تقریباً ناممکن تھا۔ دروازوں تک پہنچنے کے لیے سیدھی چٹانوں سے گزرنا پڑتا تھا اور ان چٹانوں کے عین سامنے قلعے کی برجیاں تھیں جن پر تیر انداز نشانہ باندھے بیٹھے تھے۔

ان تمام خطرات کے باوجود جیش نے قلعے کو دیکھنے کے بعد صبح کو حملہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے بوڑھے تغلستانی سے اس سلسلے میں مشورہ کیا۔ بوڑھا تغلستانی، جیش سے محبت کرتا تھا۔ اسے حمص سے اپنی بیٹیاں مل گئی تھیں لیکن اس نے جیش کا ساتھ نہ چھوڑا اور اس کے ساتھ ہی حمران روانہ ہو گیا۔

بوڑھے کی رائے تھی کہ سلطان کا انتظار کرنا چاہیے تاکہ قلعے پر بھرپور حملہ کیا جاسکے لیکن جیش، سلطان کے آنے سے پہلے ہی قلعے پر قبضہ کر کے نفیسہ کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ نفیسہ اسی قلعے میں موجود ہے اور اب وہ اسے جلد از جلد آزاد کرانا چاہتا تھا۔

رات اسی گفتگو میں گزر گئی۔ جیش کا پورا لشکر قلعے پر حملہ کرنے کے حق میں تھا۔ وہ فتح کا سہرا اپنے سر لینا چاہتے تھے۔ تمام سپاہی رات بھر جاگتے رہے اور انتظار کرتے رہے کہ دیکھیں ان کا سردار جیش کیا فیصلہ کرتا ہے اور جب انہیں فجر کی نماز کے وقت یہ معلوم ہوا کہ ان کے سردار نے قلعے پر حملے کا فیصلہ کر لیا ہے تو وہ خوشی سے جھوم اٹھے۔

انہوں نے نماز کے بعد فتح کی دعا کے ساتھ ساتھ اپنے نوجوان سردار کی درازیِ عمر کی بھی دعا مانگی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے قلب کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی دعاؤں کو قبول فرمایا۔ نماز فجر کے بعد جب مصری سواروں نے قلعے پر نظر ڈالی تو یہ دیکھ کر متعجب ہوا کہ قلعے کے سامنے کے دروازے پر تاتاری پرچم کے بجائے اسلامی پرچم لہرا رہا تھا۔

یہ واقعی بڑی حیرت انگیز بات تھی۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ رات بھر میں کیا کرشمہ ہو گیا اور اسلامی پرچم قلعے پر کیسے پہنچ گیا؟ کیا مسلمان قلعے میں داخل ہو گئے ہیں؟ یہ سوال ہر سوار کی زبان پر تھا لیکن اس کا جواب کوئی بھی نہ دے سکتا تھا۔ رفتہ رفتہ تمام سردار جیش کے گرد جمع ہو گئے اور اس حیرت انگیز بات پر اظہار خیال کرنے لگے۔ جیش خود حیران تھا۔

''یا اللہ! یہ کیا ماجرا ہے۔ یہ اسلامی پرچم قلعے پر کیسے پہنچا اور اگر مسلمان قلعے پر پہنچے تو کون ہیں اور مسلمانوں کے کس لشکر سے تعلق رکھتے ہیں؟''

سلطانی لشکر تو ان کے پیچھے آ رہا تھا۔ اب یہ کون بہادر مسلمان ہیں جنہوں نے رات کے سناٹے میں قلعے پر اس طرح قبضہ کر لیا کہ کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہوئی؟

مصری سوار ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھتے لیکن انہیں جواب دینے والا کوئی نہ تھا۔ وہ اسی انداز سے

دریائے حیرت میں غوطے کھا رہے تھے کہ قلعے کا دروازہ کھلا۔ لٹکتا ہوا پل نہر پر بچھ گیا۔ اس کے بعد دس سوار اسلامی پرچم لہراتے ہوئے قلعے سے باہر آئے۔ ان کا رخ جیش کے پڑاؤ کی طرف تھا۔ آنے والوں کے ہاتھوں میں اسلامی پرچم تھا اس لیے جیش نے چند سوار سرداروں کے ساتھ آگے بڑھ کر ان کا استقبال کیا۔

جیش کے لیے یہ تمام صورتیں اجنبی تھیں لیکن ایک سوار کو دیکھ کر اس نے اندازہ لگا لیا کہ یہ سوار ضرور مسلمان ہے کیونکہ اس کے لباس کے علاوہ چہرے پر ایسا جلال اور چمک تھی جو صرف ایک پکے اور سچے مسلمان ہی کے چہرے پر ہو سکتی ہے۔

قریب پہنچ کر آنے والوں میں وہی سوار آگے بڑھا جس کے متعلق جیش کو مسلمان ہونے کا شبہ تھا۔ اس نے گھوڑا روکتے ہوئے آواز بلند "السلام علیکم" کہا جس کے جواب میں جیش اور دوسرے سرداروں نے "وعلیکم السلام" کہا۔ اس نے آتے ہی کہا۔

"ہمیں سلطان مصر کے سامنے پیش کیا جائے۔ ہم ان سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔"

جیش نے فوراً ہی پوچھا۔ "میرا خیال ہے کہ میرا مخاطب میری طرح ایک سچا مسلمان ہے؟"

"الحمدللہ! صرف میں ہی نہیں بلکہ میرے ساتھ آنے والے تمام ساتھی مسلمان ہیں۔"

"آپ سلطان سے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟" جیش نے پوچھا۔

"صلح کی گفتگو کے لیے۔" اس نے جواب میں کہا پھر اس نے ایک شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ ہیں، احمد خان..... آپ احمد خان کا نام سن کر متعجب تو ہوں گے؟" وہ ایک لمحے کے لیے رکا پھر آگے کہنا شروع ہوا۔

"لیجیے، میں آپ کی حیرت دور کیے دیتا ہوں۔ احمد خان کل تک تیکودار اوغلان تھے لیکن رات کو وہ حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ میں حمدان کی جامع مسجد کا پیش امام ہوں۔ میں نے ان کا اسلامی نام "احمد خان" رکھا ہے۔"

یہ خبر سن کر مسلمانوں میں خوشی اور مسرت کی لہر دوڑ گئی اور انہوں نے اللہ اکبر کا فلک شگاف نعرہ لگایا۔ جیش اور دوسرے سردار گھوڑوں سے اتر پڑے اور پھر پیش امام اور دوسرے آنے والوں نے گھوڑے چھوڑ دیے اور یہ لوگ ایک دوسرے سے بڑی گرم جوشی سے ملے اور بغل گیر ہوئے۔ ہر ایک کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا اور وہ خوب چہک رہے تھے۔

مصری لشکر میں فوراً یہ بات پھیل گئی اور مسلمان جوق در جوق اپنے نئے بھائیوں سے گلے ملنے چل پڑے۔ اسلامی خلوص اور مروت کا بڑا حسین نظارہ تھا۔ ہر مسلمان کی یہ کوشش تھی کہ وہ ان نومسلموں سے پہلے بغل گیر ہو کر ثواب حاصل کرے۔ یوں ملنے ملانے کا یہ سلسلہ دوپہر تک جاری رہا۔

جیش ان نومسلموں کو اپنے خیموں میں لے گیا اور احمد خان کو دوپہر کے کھانے تک اپنے ساتھ رکھا۔

احمد خان کے ساتھ اس کے تمام سردار تھے۔ ان کی جیش نے خاطر داری کی۔ مسلمانوں کے اس سلوک سے کل کے وحشی تاتاری بہت متاثر ہوئے اور احمد خان نے شام کے کھانے پر جیش کو اور اس کے سرداروں کو مدعو کیا۔ انکار کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی تھی۔ جیش نے دعوت میں شرکت کا وعدہ کر لیا۔

احمد خان کو معلوم ہو گیا تھا کہ اسلامی لشکر کا سردار یہی نوجوان جیش ہے۔ وہ دیر تک جیش سے مصری لشکر، سلطان مصر اور جنگ حمص کے متعلق گفتگو کرتا رہا۔

جیش نے احمد خان کو اس کے حلقہ بگوش اسلام ہونے پر مبارک باد دی اور اسے اطمینان دلایا کہ مسلمان ہونے کے بعد اس کے اور مسلمانوں کے درمیان تمام اختلافات خود بخود ختم ہو گئے ہیں۔ لہٰذا مزید گفتگو اور مفاہمت کی شرائط کے لیے جیش نے کہا کہ یہ تمام چیزیں سلطان کے آنے پر طے ہو جائیں گی۔

بعد دوپہر احمد خان اپنے سرداروں کے ساتھ واپس چلا گیا۔ مسلمان، احمد خان کے مسلمان ہونے پر بہت خوش تھے۔ جیش نے مسلمانوں کو حمدان کی سیر کی عام اجازت دے دی۔ شام کو مخبروں نے خبر دی کہ سلطان صبح تک حمدان پہنچ جائیں گے۔ اس خبر سے مسلمان اور خوش ہوئے۔

جیش نے دو تیز رفتار سواروں کے ذریعے سلطان کو "احمد خان" کے مسلمان ہو کر قلعے کے دروازے کھول دینے کی اطلاع بھیجی۔

جب جیش ان تمام باتوں سے فارغ ہو گیا تو اب اس کے دماغ پر نفیسہ کے خیال نے قبضہ کیا۔ حمدان کے دروازے کھلے تھے اور اسی وقت حمدان میں داخل ہو کر نفیسہ کے متعلق پوچھ گچھ کر سکتا تھا لیکن وہ ایک ذمے دار سردار بھی تھا اور اسے اپنی ذمے داری کا پورا احساس تھا اس لیے شام سے پہلے حمدان نہیں جانا چاہتا تھا۔

احمد خان سے اس کی کافی دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ اس نے کئی بار ارادہ کیا کہ وہ نفیسہ کے متعلق اس سے پوچھے

لیکن اس نے دل پر جبر کیا کیونکہ اسے یہ بات اپنے عہدے کے وقار کے خلاف محسوس ہوئی اور وہ ہر بار کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

اس نے فیصلہ کیا کہ رات کو دعوت کے بعد وہ احمد خان سے نفیسہ کے بارے میں پوچھے گا۔ اگر نفیسہ حمدان میں موجود ہے تو وہ اسے اپنے ساتھ لے آئے گا۔ انہی خیالات میں شام ہو گئی اور وہ حمدان کے قلعے میں جانے کی تیاریاں کرنے لگا۔

اس نے اپنے ساتھ جانے کے لیے دس سرداروں کو منتخب کیا جس میں بوڑھا قلتغانی بھی تھا۔ والیٔ حمدان نو مسلم احمد خان نے بڑے اعلیٰ پیمانے پر دعوت کے انتظامات کیے تھے۔ دراصل وہ چاہتا تھا کہ سلطان مصر کے حمدان پہنچنے سے پہلے وہ ان مسلمانوں کو اپنا گرویدہ کرلے تاکہ یہ لوگ سلطان کے سامنے اس کی سفارش کریں اور مفاہمت کے معاہدے میں اسے زیادہ مراعات حاصل ہو جائیں۔

حمدان کے قلعے میں جو چند مسلمان تھے، حکمران کے طور طریقوں سے تاتاریوں کی طبیعت میں بڑا فرق پیدا ہو گیا تھا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ زندگی کا مقصد صرف جنگ اور تباہی نہیں بلکہ زندگی کے کچھ اور بھی تقاضے ہوتے ہیں۔ وہ تاتاری جو چنگیز اور ہلاکو کے جھنڈے تلے محض جنگ کرنے کے لیے جمع ہوئے تھے، اب رفتہ رفتہ ان کو زندہ رہنے اور لوگوں کو زندہ رکھنے کے سلیقے آگئے تھے لیکن تاتاری سرداروں کی سخت گیر طبیعت کے سامنے ان کی ایک نہ چلتی تھی اور وہ خود کو تبدیل کرنے کی خواہش کے باوجود کسی نہ کسی طرح اس پرانی ڈگر پر چل رہے تھے۔ جب ان کے سردار نے اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا تو جیسے ان کی مراد بر آئی اور وہ بھی مسلمان ہونے لگے۔

رات کا کھانا چنا گیا تو دسترخوان پر انواع و اقسام کے کھانے موجود تھے۔ احمد خان نے اسلام قبول کرتے ہی شراب کے تمام ذخیرے اور دیگر تمام لوازمات ضائع کر دیے تھے۔ یہی نہیں، بلکہ شراب نوشی کی بھی منظرِ عام پر ممانعت کرادی تھی اس لیے دسترخوان پر شراب کے علاوہ ہر چیز موجود تھی۔

دوستانہ ماحول میں کھانا کھایا گیا۔ اس کے بعد مہمان تو رخصت ہو گئے اور اب صرف حبش کے ساتھی اور احمد خان کے کچھ اعلیٰ مرتبے کے سردار رہ گئے جنہیں مشاورت کے لیے احمد خان نے روک لیا تھا۔ ان سرداروں میں بہت سے مسلمان ہو گئے اور کچھ ابھی تک اپنے پرانے مذہب کے پابند تھے۔

احمد خان نے انہیں مذہب تبدیل کرنے پر مجبور نہیں کیا بلکہ عام اعلان کیا تھا کہ جو خوشی سے مسلمان ہونا چاہے وہ مذہب تبدیل کر سکتا ہے۔ کسی کو مجبور نہیں کیا جائے گا اور نہ اس کے مذہب میں دخل دیا جائے گا۔

احمد خان اور حبش دیر تک تاتاریوں اور مسلمانوں کی طرزِ معاشرت اور مذہب کے متعلق گفتگو کرتے رہے۔ نصرانیوں کی ریشہ دوانیوں کا ذکر ہوا اور کافروں کی شورشوں کے خاتمے کے موضوع پر بات چیت ہوئی۔

حبش نے محسوس کر لیا کہ احمد خان کے مذہب تبدیل کرنے کی خواہ کچھ بھی وجوہ ہوں لیکن اس وقت اس کے دل میں مسلمانوں کے لیے عزت اور خلوص کا جذبہ موجود ہے اور اس کے اندازِ گفتگو سے صاف پتا چلتا تھا کہ وہ مسلمانوں اور خصوصاً سلطان مصر کا بھی خیر خواہ ہے۔

ہر طرح کی گفتگو ہو چکی تھی۔ اب کوئی ایسا موضوع بظاہر باقی نہ تھا جس پر گفتگو کی جاتی۔ اس کے بعد محفل برخاست ہوتا تھی اور حبش کو اپنے سرداروں کے ساتھ اپنے لشکر میں جانا تھا۔ صرف ایک بات باقی رہ گئی تھی جس کا تعلق حبش سے تھا۔

حبش نے بھی مناسب خیال کیا کہ اس کا تذکرہ چلتے وقت کرے کیونکہ یہ کوئی عالمگیر یا ملک گیر مسئلہ بہرحال نہ تھا۔ چنانچہ جب رخصت کا وقت آیا تو حبش نے احمد خان سے سوال کیا۔

”خان! مجھے اس لڑکی کے بارے میں معلومات کرنا ہیں جو شاید ابا قاآن کے ساتھ حمدان آئی ہے۔“

احمد خان نے پہلے غور سے حبش کے چہرے کو دیکھا پھر مسکراتے ہوئے جواب میں بولا۔ ”مصری سردار! شاید تمہارا اشارہ نفیسہ نامی لڑکی کی طرف ہے؟“

”ہاں...... ہاں، میں اسی نفیسہ کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا ہوں۔“ کہتے ہوئے حبش بڑی بے چینی سے احمد خان کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔

احمد خان جواب دینے کے بجائے چند لمحے کچھ سوچتا رہا اور وہ اتنی دیر خاموش رہا کہ حبش کو مجبور ہو کر سوال کرنا پڑا۔

”خان! تم خاموش کیوں ہو گئے ہو؟ میں نفیسہ کے متعلق پوچھ رہا تھا۔“

خان نے چونکتے ہوئے کہا۔ ”نفیسہ اس وقت اس محل میں موجود ہے۔“

نفیسہ کے صحیح سلامت اور اس محل میں موجود ہونے سے

جیش کو بڑی خوشی ہوئی اور اس نے رگ و پے میں عجیب کیف محسوس کیا اور اسی کیفیت تلے اس نے احمد خان سے کہا۔
''خان! ہم اس لڑکی سے ملنا چاہتے ہیں اور اگر وہ پسند کرے تو ہم اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں۔''
جیش کی اس فرمائش پر احمد خان کی تیوریوں پر بل پڑ گئے اور اس کا چہرہ غصے سے لال ہو گیا۔ جیش کی سمجھ میں نہ آیا کہ احمد خان کو کس بات پر اتنا غصہ آیا ہے۔ اس نے آہستگی سے پوچھا۔
''احمد خان! شاید تمہیں ہمارے سوال سے تکلیف پہنچی ہے لیکن تمہیں شاید معلوم نہیں کہ وہ لڑکی میری چچا زاد بہن ہے اور اسے ساتھ لے جانے کا مجھے حق پہنچتا ہے۔''
احمد خان نے کچھ اکھڑے اکھڑے انداز میں کہا۔
''سردار وہ کوئی بھی ہو لیکن وہ مجھے اپنے بھائی سے حاصل ہوئی ہے اور اسے میں اپنے سے جدا کرنے پر آمادہ نہیں۔''
جیش نے احمد خان کے یہ الفاظ سنے تو اس کا دماغ گھوم گیا۔ خوابوں اور امیدوں کے وہ محل جو اس نے تھوڑی دیر پہلے تعمیر کیے تھے ان کی بنیادیں تک ہل گئیں لیکن اس نے صبر کو ہاتھ سے نہ جانے دیا اور غصے پر پوری طرح قابو پاتے ہوئے کہا۔
''احمد خان! اسلام اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ کسی کو اس کی مرضی کے خلاف محل میں رکھا جائے۔ آپ نفیسہ کو اس کی مرضی کے خلاف محل میں نہیں رکھ سکتے۔''
''لیکن میں اسے اپنی بیوی بنا کر رکھوں گا۔'' احمد خان جز بز ہو کر بولا۔
جیش نے سنبھل کر جواب دیا۔ ''خان! اسلام چار بیویوں کی اجازت ضرور دیتا ہے لیکن اس بات کی اجازت کسی بادشاہ کو بھی نہیں کہ وہ کسی لڑکی کو اس کی مرضی کے خلاف شادی پر مجبور کرے۔''
احمد خان نے طیش میں آتے ہوئے کہا۔ ''مصری سردار! میں بحث نہیں کرنا چاہتا لیکن میں نے نفیسہ کو بیوی بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔''
جیش نے اسے سمجھاتے ہوئے نرمی سے کہا۔ ''خان! میں تمہارے فیصلے میں مخل نہیں ہوتا لیکن اس کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ تم ہمیں نفیسہ سے ملنے دو۔ اگر نفیسہ تم سے شادی کرنے پر رضامند ہے تو تمہارے راستے میں کوئی حائل نہیں ہوگا۔''
احمد خان نے بگڑ کر کہا۔ ''ایک عورت کی رضامندی کو کوئی اہمیت نہیں دی جا سکتی۔ فیصلہ میں نے کیا ہے اور میرا فیصلہ اٹل ہوا کرتا ہے۔''
جیش نے احمد خان کو اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنے کے خیال سے پھر کہا۔ ''احمد خان! نفیسہ کو سلطان مصر نے اپنی بیٹی بنایا ہے اور سلطان مصر کی بیٹی کو اس کی مرضی کے خلاف مجبور نہیں کیا جا سکتا۔''
یہ سن کر احمد خان کوئی بات سمجھنے کے بجائے اور غصے میں آ گیا اور تیز لہجے میں بولا۔
''میں نے کہا نا، میرا فیصلہ اٹل ہوا کرتا ہے۔ اسے دنیا کی کوئی طاقت تبدیل نہیں کر سکتی۔''
اب جیش کو بھی غصہ آ گیا۔ اس نے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ آپ مسلمان ہوتے ہوئے بھی اسلام کے احکام کی خلاف ورزی کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔''
''ایسا ہی سمجھ لیا جائے لیکن میں اپنا ارادہ نہیں بدل سکتا۔'' احمد خان نے اسی تیزی سے کہا۔
جیش نے کہا۔ ''تو پھر ہم بھی مجبور ہو جائیں گے کہ تمہارے اس ارادے کو بزور شمشیر تبدیل کر دیں۔''
گفتگو میں کافی تلخی پیدا ہو گئی اور خطرہ تھا کہ کہیں اسی وقت تلواریں نہ کھنچ جائیں۔ جہاندیدہ بوڑھے نگلستانی نے دخل دیتے ہوئے کہا۔ ''سردار! آپ احمد خان کو سوچنے کا موقع دیجیے۔ ممکن ہے صبح تک یہ کوئی اور فیصلہ کر لیں۔''
لیکن احمد خان نے گفتگو کا دروازہ ہی بند کرتے ہوئے کہا۔ ''مصریوں کو یہ معلوم نہیں کہ تاتاری اپنا ارادہ کبھی نہیں بدلا کرتے۔ میں نے جو کہہ دیا وہی ہوگا۔''
جیش نے یاد دلایا۔ ''تم یہ مت بھولو کہ اب تم مسلمان پہلے اور تاتاری بعد میں ہو اور تمہیں اسلام کے احکام کا اس وقت تک احترام کرنا پڑے گا جب تک تم اس مذہب کے پابند ہو۔''
احمد خان نے ایک خوفناک قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔
''اور تم یہ نہ بھولو کہ میرے اشارے پر تمہاری گردنیں قلم کی جا سکتی ہیں۔''
''مسلمان گردنیں ہتھیلی پر رکھ کر نکلا کرتے ہیں لیکن تمہیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ کل شام سلطان مصر یہاں پہنچ کر تمہارے غرور کی گردن مروڑ کر رکھ دے گا۔'' جیش نے تمکنت سے کہا۔
احمد خان کا غیظ و غضب اب انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ اس نے بل کھاتے ہوئے کہا۔ ''مصری سردار! تمہیں اب احمد خان کے قید خانے میں اس وقت تک رہنا پڑے گا جب تک تمہارا سلطان اس قلعے کو فتح کر کے نہیں چھڑاتا۔ مصر

کے سلطان کا مقابلہ کیا جائے گا اور ہم اس پر ثابت کر دیں گے کہ تاتاریوں کے ہاتھوں میں اتنی طاقت ہے کہ وہ اگر تمام دنیا کے لشکر کے مقابل ہوں تب بھی شکست نہیں کھا سکتے۔"

اس کے ساتھ ہی احمد خان کے اشارے پر مصریوں کے سنبھلنے سے پہلے ہی انہیں چاروں طرف سے نیزوں کی زد میں لے لیا گیا۔

دس مصری سرداروں کے گرد پچاس سے زیادہ نیزے اور تلواریں ایک دم آ گئے تھے۔ ان کی نوکیں ان کے جسموں کے اس قدر قریب تھیں کہ وہ حرکت نہ کر سکتے تھے۔

انہیں بے بس دیکھ کر احمد خان نے کہا۔ "اپنا انجام جانتے ہو؟"

حبش نے کہا۔ "مسلمانوں کا انجام شہادت ہی ہوا کرتا ہے لیکن تم اپنے انجام سے بے خبر ہو۔"

"تمہیں آزاد کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ تم خلیفہ کی واپسی کا خیال چھوڑ دو۔" احمد خان نے بالآخر شرط عائد کر دی۔

حبش بولا۔ "اے احمد خان ہمیں ہلاک کیا جا سکتا ہے اور ہم کافروں کی شرطیں نہیں مانا کرتے۔"

احمد خان نے ایک قہقہہ بلند کیا اور اسی انداز میں کہا۔

"لے جاؤ ان ذلیل مصریوں کو اور شراب و کباب کا انتظام کرو۔ آج ہم ان کی گرفتاری کی خوشی میں مدہوش ہونا چاہتے ہیں۔"

☆☆☆

حمدان کے قلعے کے باہر ٹھہرے ہوئے پانچ ہزار مصری لشکر نے رات گئے تک اپنے سرداروں کا انتظار کیا اور جب بہت رات گزر گئی تو انہیں فکر ہوئی اور انہوں نے ایک سوار کو قلعے کی طرف بھیجا تاکہ وہ سرداروں کی خبر لائے لیکن یہ سوار تھوڑی دیر میں واپس آ گیا اور اس نے بتایا کہ قلعے کے تمام دروازے بند کر دیے گئے ہیں۔

اس خبر وحشت اثر سے مصریوں کو بڑی پریشانی ہوئی۔ ان کا سردار اعلیٰ اور دستوں کے تمام سردار ایک ساتھ حمدان گئے تھے اور اس وقت ان میں کوئی بھی ایسا بااثر آدمی نہ تھا جو ان کو صحیح مشورہ دیتا۔ آخر انہوں نے ہر دستے سے ایک ایک آدمی بلایا اور اس طرح پچیس آدمیوں کی ایک مجلس ترتیب دی گئی۔ اس مجلس نے فوج کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے کر متفقہ طور پر ایک آدمی کو اپنا سردار چن لیا اور اس کو پورے اختیارات سونپ دیے۔

مجلس سویرے تک کسی نتیجے تک نہ پہنچ سکی اور آخر کار

فیصلہ کیا گیا کہ کل شام تک حمدان کے قلعے کے سامنے ہی ٹھہر کر حالات کا مشاہدہ کیا جائے۔ ممکن ہے کہ صبح تک حمدان سے کوئی خبر آئے پھر کل شام تک سلطان کے حمدان پہنچنے کی بھی امید تھی۔

☆☆☆

مصری لشکر نے صبح کی نماز ادا کی۔ دھوپ نکل آئی اور دن بھی چڑھ گیا لیکن حمدان کے قلعے کا کوئی پھاٹک نہیں کھلا۔ یہی نہیں، دیکھتے ہی دیکھتے قلعے کی فصیل پر مسلح سنتریوں اور فوج کو بھی متحرک دیکھا جانے لگا جو مقابلے کے لیے بالکل تیار نظر آرہے تھے۔

اب مصریوں کو یقین ہو گیا کہ ان کے ساتھ ضرور دھوکا کیا گیا ہے اور تاتاریوں نے مصری سرداروں کو گرفتار کرنے کے لیے یہ سب ڈھونگ رچایا تھا۔

دوپہر ہو گئی، نہ تو قلعے کا دروازہ کھلا اور نہ مصریوں نے حملہ کیا۔ مصریوں کو سلطان کی آمد کا انتظار تھا۔ انہوں نے قلعے کے چاروں طرف فوج کو پھیلا دیا تھا لیکن پیش قدمی نہیں کر رہے تھے۔

دوپہر ڈھلتے ہی مصریوں کو اطلاع ملی کہ سلطان شام سے پہلے حمدان پہنچ رہے ہیں اور اس اطلاع کے تھوڑی دیر کے بعد مصری سلطان کا لشکر حمدان کے قلعے کے سامنے پہنچنا شروع ہو گیا۔

مسلمانوں نے اپنے لشکر کو آتے دیکھا تو خوشی کے نعرے بلند کیے اور ہراول دستے کے اس "نامزد" کردہ سردار نے سلطان کے پہنچتے ہی انہیں حمدان کے حالات سے باخبر کیا اور بتایا کہ کس طرح تیمور اور اوغلان نے مسلمان ہونے کا فریب دے کر ہمارے سرداروں کو قلعے کے اندر دعوت کے بہانے سے بلا کر گرفتار کر لیا ہے۔

سلطان نے یہ سنا تو غصے سے سرخ ہو گیا اور فوج کو اسی وقت ترتیب دے کر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

فوج تھکی ہوئی تھی لیکن جب اسے حمدان والوں کی غداری کا حال معلوم ہوا تو وہ بھی بے چینی سے حملے کے حکم کا انتظار کرنے لگی۔ سلطان نے لشکر کو چاروں طرف مناسب مقامات پر پھیلانے کے بعد منجنیقیں اور کوپھنیں لگانے کا حکم دیا جن سے بھاری قسم کے پتھر قلعے پر پھینکے جاتے تھے۔

اس زمانے میں لشکر کے ساتھ ساتھ بھاری پتھروں کو لوہے کی زنجیروں میں باندھ کر اپنے ساتھ رکھا جاتا تھا تاکہ ضرورت کے وقت استعمال میں لائے جائیں۔

سلطان نے حملے کا حکم دیا اور بھاری بھاری پتھر قلعے پر پھینکے جانے لگے۔ تھوڑے ہی عرصے میں اس قدر پتھر پھینکے گئے کہ قلعے والے بدحواس ہو گئے اور دیواروں کو شدید نقصان پہنچا۔

اوغلان خان جو ایک برج پر بیٹھا یہ تماشا دیکھ رہا تھا، گھبرا کر باہر نکل آیا اور اس نے سرداروں سے قلعے کے دروازے کھول کر مقابلہ کرنے کو کہا لیکن اس کے سردار جو اس ناگہانی آفت سے پہلے ہی پریشان ہو گئے تھے، انہوں نے اوغلان خان کی رائے سے اتفاق نہیں کیا۔ اگرچہ قلعے میں اس وقت ایک لاکھ سے زیادہ فوج موجود تھی۔

اوغلان خان اپنے سرداروں کو مقابلے پر آمادہ کر رہا تھا اور ادھر "سنگ باری" کا زور بڑھتا جا رہا تھا اور بھاری پتھر قلعے کی دیواروں پر گر کر برجیوں کو شکستہ کر رہے تھے۔

اب تک ان پتھروں سے سیکڑوں سپاہی مر چکے تھے اور خیال تھا کہ اگر یہ سنگ باری ایک گھنٹے اور قائم رہی تو قلعے کی مضبوط دیواریں ضرور ٹوٹ جائیں گی۔ اوغلان خان کو اپنے سرداروں کی طرف سے ناامیدی ہوئی تو اس نے پھر حمدان کے مسلمانوں کا سہارا لیا اور انہیں بلا کر سب کے سامنے اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے معافی کا خواستگار ہوا لیکن وہ جوشیلا امام جو اس سے پہلے احمد خان (اوغلان خان) کو تیش کے پاس لے گیا تھا، کسی طرح آمادہ نہ ہوا۔ اس نے صاف کہہ دیا کہ اوغلان خان نے ایک بار غداری کی ہے اس لیے اس پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔

سنگ باری بدستور جاری تھی اور اس کے ساتھ ہی مصری لشکر نے قلعے کی طرف آہستہ آہستہ بڑھنا شروع کر دیا اور اوغلان خان کو اب اپنی موت نظر آرہی تھی اس لیے اس نے مجبور ہو کر سفید علم قلعے پر لہرایا جو اس بات کی نشانی تھی کہ وہ صلح کا خواہشمند ہے۔

سلطان نے سفید علم دیکھا تو سنگ باری اور فوجوں کو آگے بڑھنے سے روک دیا اور انتظار کرنے لگا۔ اوغلان نے دو آدمی قلعے سے نیچے اتارے۔ ان کے ہاتھوں میں سفید علم تھے۔ وہ نیچے آنے کے بعد سلطان کے لشکر کی طرف بڑھے۔ سلطان نے یہ دیکھ کر دو خالی گھوڑے ایک سوار کے ساتھ قلعے کی طرف روانہ کیے تاکہ آنے والوں کو سوار کر کے جلد از جلد لے آئیں۔

قلعے کے دونوں آدمی سلطان کے حضور میں آئے اور انہوں نے اوغلان کی طرف سے معافی چاہی اور صلح کے لیے سلطان سے درخواست کی۔ سلطان نے کہہ دیا کہ اوغلان نے دھوکے سے کام لیا ہے اس لیے اس وقت تک اس سے صلح کی

گفتگو نہیں کی جا سکتی جب تک تمام مصری واپس نہیں کیے جاتے۔

یوں قلعے والے، سلطان کا حکم لے کر واپس چلے گئے اور کچھ دیر کے بعد آخر اوغلان خان نے جیش اور دوسرے سرداروں کو رہا کرنے کا حکم دیا۔ جیش اور اس کے ساتھیوں کو قید سے آزاد کر کے جب اوغلان کے سامنے لایا گیا تو اس نے بڑی لجاجت سے کہا۔

"مصری سردار...... میں اپنی زیادتی اور غلطی کی تم سے معافی چاہتا ہوں۔"

جیش نے کہا۔ "برادر! معافی اس بزرگ و برتر ہستی سے طلب کرو جس کے ہم سب تابع ہیں۔ تم نے اس کے حکم کی خلاف ورزی کرنے کی کوشش کی تھی اس لیے تم پر عذاب نازل ہوا۔"

اوغلان خان نے کہا۔ "اس سے تو معافی مانگ لوں گا لیکن کیا سلطان مجھے معاف کر دیں گے؟"

جیش بولا۔ "غدار اور دھوکے باز خواہ وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہو، اسے زندہ نہیں چھوڑنا چاہیے لیکن کیا عجب ہے کہ سلطان کو تم پر رحم آ جائے اور وہ معاف کر دیں۔"

اوغلان خان نے لجاجت سے کہا۔ "مصری سردار! اگر تم میری سفارش کرو تو امید ہے کہ سلطان صلح پر آمادہ ہو جائیں۔"

اوغلان خان نے جس انداز سے جیش کے سامنے اپنی غلطی کا اعتراف کیا، اس سے جیش کا دل بھی پگھل گیا اور اسے رحم آ گیا۔ اس نے وعدہ کر لیا کہ وہ سلطان سے ضرور اس کی سفارش کرے گا۔

یہ اطمینان ہو جانے کے بعد جیش اور اس کے ساتھیوں کو گھوڑے دے دیے گئے اور اوغلان خان خود بھی ایک گھوڑے پر سوار ہوا۔ احتیاط کے طور پر اس نے حمدان کے مسلمانوں کی ایک مختصر جماعت بھی اپنے ساتھ لی پھر وہ قلعے کا دروازہ کھول کر جیش کے ساتھ سلطان کے حضور صلح کے لیے چلا۔

وہ مغرور جو رات کو اس قدر ڈینگیں مار رہا تھا، وہی عذابِ الٰہی سے جو سلطان لشکر کی صورت میں اس پر نازل ہوا تھا، اس قدر گھبرا گیا کہ اب خود صلح کے لیے جا رہا تھا۔

اللہ اللہ...... کیا مسلمانوں کی شان تھی۔ سچ ہے، جو سچے دل سے اس کی پرستش کرتے ہیں، ان کا وہ خیال رکھتا ہے اور انھیں فتح و نصرت سے ہی ہمکنار نہیں کرتا بلکہ دوسروں پر ہمیشہ فوقیت بھی عطا کرتا ہے۔

گو تیمور قتل ہوا۔ اباخا قان کو زہر دے کر مار دیا گیا اور اب...... تکودار اوغلان خان مسلمانوں سے معافی مانگنے پر آمادہ تھا۔ یہ تھی مسلمانوں کی وہ فتح جس نے تاتاریوں کی کمر ہمیشہ کے لیے توڑ دی۔ وہ یا تو مسلمان ہو گئے یا پھر منگولیا کے اس ریگستان کی طرف بھاگ گئے جہاں سے انھوں نے قتل و غارت کا بازار گرم کیا تھا۔

جیش کو دیکھ کر سلطان نے گھوڑا بڑھایا۔ جیش گھوڑے سے اتر پڑا۔ سلطان نے گھوڑا چھوڑ دیا اور پھر ہاتھ پھیلا کر جیش کو سینے سے لگا لیا۔ اب اوغلان خان کو معلوم ہوا کہ جیش کی کیا حیثیت ہے اور سلطان اس کو کس قدر پسند کرتا ہے۔

جیش نے سلطان سے کہا۔ "سلطان کے حملے کی تاب نہ لا کر قلعہ دار اوغلان خود آپ کے قدموں میں حاضر ہو کر معافی کا خواستگار ہے۔" کہتے ہوئے جیش نے اوغلان خان کی طرف اشارہ کر دیا۔ اوغلان سر جھکائے ایک طرف کھڑا تھا۔

سلطان نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "یہ نابکار...... کسی رحم کا مستحق نہیں۔ اس نے خدا کے حکم سے سرتابی کی ہے۔ اس کے سر کو تن سے جدا کر دینا ہی بہتر ہے۔"

تمام لوگ اس حکم سے کانپ اٹھے اور اوغلان خان، سلطان کے سامنے کانپنے لگا لیکن سلطان اسے نظر انداز کر کے جیش سے محوِ گفتگو رہا۔

جیش نے اوغلان خان کے مسلمان ہونے اور دعوت میں شریک کرنے کے تمام واقعات سلطان کے گوش گزار کر ڈالے۔ جب نفیسہ کا ذکر آیا تو سلطان بے چین ہو گیا اور اس نے جیش سے کہا۔

"تم اسے اپنے ساتھ کیوں نہیں لائے؟"

جیش نے بتایا۔ "وہ غریب اب تک اوغلان خان کی قید میں ہے اور اس نے نفیسہ کو رہا نہیں کیا ہے۔"

یہ سن کر سلطان کو پھر طیش آ گیا اور اس نے اوغلان خان کو حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "نافرمان انسان! تم نے ہماری بچی کو قید کرنے کی کیسے جرأت کی؟ کیا تم نہیں جانتے کہ اسے حاصل کرنے کے لیے ہم سات سمندر بھی پار کر سکتے ہیں۔"

اوغلان نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔ "سلطان! معاف فرمائیں۔ نفیسہ میری قید میں ضرور ہے لیکن وہ صبح کی کرن کی طرح پاک و صاف ہے۔ میں نے اب تک اس سے آنکھ تک نہیں ملائی ہے۔"

"اسے فوراً سے پیشتر ہمارے سامنے حاضر کیا جائے۔" سلطان نے گرج کر کہا۔

"حضور! اجازت ہو تو میں ایک درخواست پیش کروں۔" اوغلان خان نے منت بھرے لہجے میں کہا۔

"جب تک نفیسہ یہاں نہیں آتی ہم تمہاری کوئی درخواست سننے کے لیے آمادہ نہیں۔" سلطان کو طیش آ گیا۔

اس وقت لوگوں نے دیکھا کہ دو تیز رفتار گھوڑے قلعے سے نکل کر آ رہے ہیں۔ سلطان اور دوسرے لوگ اس طرف دیکھنے لگے۔ تھوڑی دیر میں دونوں سوار سلطان کے قریب آ کر گھوڑوں سے اتر گئے۔ ان سواروں میں ایک تاتاری عورت تھی اور دوسری جیش کے دل کی ملکہ...... نفیسہ تھی۔

نفیسہ اور وہ تاتاری عورت، سلطان کے قریب آ کر تعظیم کے لیے جھک گئیں۔ سلطان نے نفیسہ کو پدرانہ محبت اور شفقت سے گلے لگایا اور پھر اسی شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

"اے نیک بیٹی نفیسہ! تم نے ہماری وجہ سے بہت تکلیف اٹھائی ہے لیکن ہم تمہیں ایسا انعام دیں گے کہ تم خوش ہو جاؤ گی۔"

اس کے بعد سلطان نے اوغلان کو گھورتے ہوئے کہا۔ "اس ظالم کو جس نے ہماری بیٹی کو قید رکھا ہے، قتل کر دیا جائے اور اس کا سر قلعے کے دروازے پر لٹکا دیا جائے تاکہ لوگوں کو عبرت ہو۔"

اب تو اوغلان خان کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ اس کی موت اس کی نظروں میں پھر گئی لیکن اس وقت نفیسہ نے سلطان سے کہا۔ "حضور! اس نیک دل خاتون نے جان پر کھیل کر مجھے قید سے نکالا ہے۔"

سلطان نے اس خاتون کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "نیک بی بی! ہم تم سے خوش ہیں۔ تم نے ہماری بیٹی پر مہربانی کی ہے۔ ہم تمہیں منہ مانگا انعام دیں گے۔"

تاتاری خاتون نے پہلے سلطان کو دیکھا پھر اوغلان کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیا میں امید کروں کہ سلطان مجھے منہ مانگا انعام دیں گے؟"

سلطان نے کہا۔ "خاتون! تمہیں سلطان مصر نے زبان دی ہے۔ کہو تم کیا چاہتی ہو؟"

خاتون نے اوغلان پر نگاہیں جماتے ہوئے کہا۔ "میں سلطان سے حمران کا قلعہ اور اپنے شوہر اوغلان خان کی جان کی بھیک مانگتی ہوں۔"

سلطان اس درخواست پر خاموش ہو گیا۔ اسے اب معلوم ہوا کہ نفیسہ کو رہا کرانے والی خود اوغلان کی بیوی ہے۔

سلطان نے کہا۔ "نیک خاتون! سلطان اپنی زبان پر قائم ہے۔ جاؤ ہم نے تمہیں حمران اور اوغلان بخش دیے۔"

اوغلان خان نے سلطان کی زبان سے یہ الفاظ سنے تو خوشی سے پھول گیا۔ آخر جیش کی سفارش پر اور حمران سے آنے والے مسلمانوں کی کوشش سے سلطان نے اوغلان خان کی خطا معاف کر کے اسے حمران کا پروانہ عطا فرمایا۔

اس کے بعد سلطان نے نفیسہ سے کہا۔

"بیٹی! اب تمہاری باری ہے۔ تمہیں جو چیز پسند ہو وہ لے سکتی ہو۔"

نفیسہ نے شرماتے، لجاتے ہوئے کن انکھیوں سے جیش کو دیکھا اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی اس کی طرف چلی۔

سلطان نے مسکرا کر دیکھا اور اعلان کیا۔ "آج بعد نماز عشا نفیسہ اور جیش کا عقد حمران کی جامع مسجد میں کیا جائے گا۔"

پورا لشکر اس اعلان سے بہت مسرور ہوا پھر سلطانی لشکر کو قلعے میں داخل ہونے کا حکم ہوا۔ قلعے والوں نے سلطانی لشکر کا پرتپاک خیر مقدم کیا اور نماز عشا کے بعد جیش اور نفیسہ جو عرصے سے بچھڑے ہوئے تھے، امید و وفا کے منتظر تھے، اب ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے مل گئے۔

سلطان نے اپنی بیٹی نفیسہ کے جہیز میں سرحد شام کی ایک لمبی پٹی کی ریاست جیش کو عطا کر دی اور اس طرح جیش کو علاقہ حدثہ کا والی بنا دیا۔

حمران کا قلعہ اوغلان خان کو جو اب سچے دل سے مسلمان ہو گیا تھا، واپس کر دیا۔ ایک ہفتے حمران میں قیام کے بعد سلطان مصر واپس ہوا۔ اس کے ساتھ ہی جیش دس ہزار عراقی لشکر کے ساتھ جو فوج میں شامل ہو گیا تھا، اپنی ریاست کی طرف روانہ ہو گیا۔

جیش نے خاریہ پہنچ کر اس کا نام حدثہ رکھا اور بوڑھے نخلستانی کو اپنا معتمد بنا کر خوشی خوشی دن گزارنے لگا۔

بوڑھے نخلستانی نے اپنی بیٹیوں کو حمص سے بلوا لیا اور پھر وہ تمام عمر جیش کو اپنے نیک مشوروں سے نوازتا رہا اور جیش، نفیسہ کے گھنیرے سیاہ بالوں کے سایۂ الفت میں اپنے دن گزارنے لگا۔

(ختم شد)

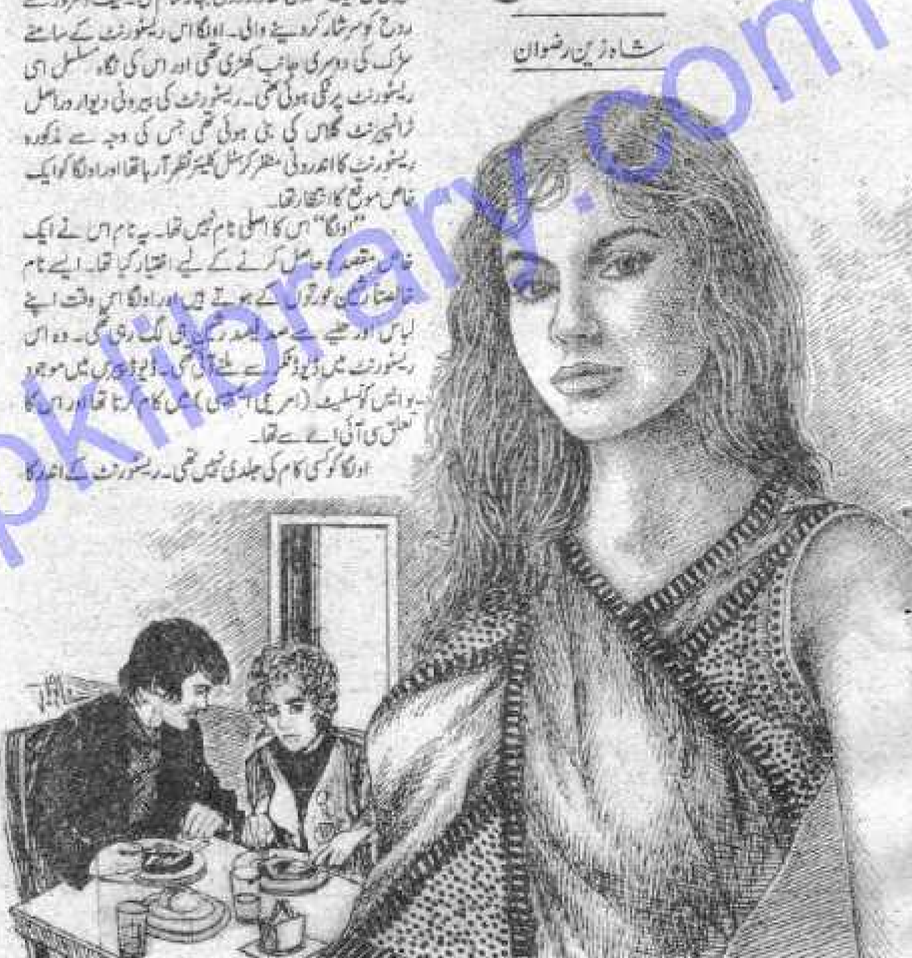
ماخذات: خوارزم شاہ۔ خاریہ کا مجاہد۔ سلطان مصر۔ تاتاری یلغار

مثل بہت پرانی ہے مگر ہر دور میں پوری اترتی آئی ہے۔۔۔ ”ایک جھوٹ کو چھپانے کے لیے ستر جھوٹ بولنا پڑتے ہیں۔۔۔“ کمال یہ ہے کہ ایک جھوٹ پر سے پردہ اٹھانے میں جو شرمندگی محسوس ہوتی ہے وہ ستر جھوٹ بولنے میں ایک فیصد بھی کوئی محسوس نہیں کرتا۔۔۔ کچھ ایسا ہی حال اس کا بھی تھا جو اپنی اصلیت چھپاتے چھپاتے بے حال ہو چکی تھی۔۔۔ لیکن برائیوں نے کب کسی پردے کی پروا کی ہے انہیں تو ہر حال میں منظرِ عام پر آنا ہوتا ہے۔۔۔

مطلب برآری کے لیے فساد پیدا کرنے والی ایک حسینہ کی تیز طراری۔۔۔۔

فسادی

شادزین رضوان



ریسٹورنٹ کی رونق اپنے عروج کو پہنچی ہوئی تھی۔ وہ پیرس کی ایک خنک فضا اور دل بہار شام تھی۔ کیف و سرور سے روح کو سرشار کر دینے والی۔ اولگا اس ریسٹورنٹ کے سامنے سڑک کی دوسری جانب کھڑی تھی اور اس کی نگاہ مسلسل اسی ریسٹورنٹ پر لگی ہوئی تھی۔ ریسٹورنٹ کی بیرونی دیوار دراصل ٹرانسپیرنٹ گلاس کی بنی ہوئی تھی جس کی وجہ سے مذکورہ ریسٹورنٹ کا اندرونی منظر کرسٹل کلیئر نظر آ رہا تھا اور اولگا کو ایک خاص موقع کا انتظار تھا۔

”اولگا“ اس کا اصلی نام نہیں تھا۔ یہ نام اس نے ایک خاص مقصد حاصل کرنے کے لیے اختیار کیا تھا۔ ایسے نام عام طور پر روسی لڑکیوں کے ہوتے ہیں اور اولگا اس وقت اپنے لباس اور حلیے سے مکمل طور پر روسی ہی لگ رہی تھی۔ وہ اس ریسٹورنٹ میں ڈیوڈ نکلسن سے ملنا چاہتی تھی جو ریسٹورنٹ میں موجود تھا۔ وہ اس کی اصلیت (امریکی ایجنٹ) کا کام کرتا تھا اور اس کا تعلق سی آئی اے سے تھا۔

اولگا کو کسی کام کی جلدی نہیں تھی۔ ریسٹورنٹ کے اندر گا

احوال اس کی نگاہ کے سامنے تھا۔ ویٹرز اور ویٹریس وہاں موجود کسٹمرز کے آرڈرز کی ٹرے اٹھائے اِدھر سے اُدھر حرکت کرتے دکھائی دے رہے تھے۔ نشست گاہ لگ بھگ بھری ہوئی تھی۔ ہر ٹیبل پر کوئی نہ کوئی بیٹھا، کھاتا پیتا نظر آ رہا تھا لیکن ڈیوڈ ٹکر ابھی تک اولگا کی نگاہ میں نہیں آیا تھا اور اولگا، ڈیوڈ کی آمد سے قبل ریسٹورنٹ میں داخل ہو کر اپنی اہمیت اور وقعت کو کم نہیں کرنا چاہتی تھی۔

اولگا اور ڈیوڈ کی پہلی ملاقات ایک عجیب و غریب واقعے کی رہینِ منت تھی۔ اولگا پیشے کے اعتبار سے ایک سڑک چھاپ نچلے درجے کی مجرم تھی۔ وہ اپنی ہوشیاری، چالاکی اور خوبصورت و پرکشش سراپا کا استعمال کر کے چھوٹی موٹی چوریاں اور اسی نوعیت کے دیگر جرائم کے ذریعے اپنی زندگی گزار رہی تھی۔ اس کی کوشش یہی ہوتی تھی کہ بس اسی درجے کا ہاتھ مارا جائے کہ بالفرض اگر وہ کبھی پکڑی بھی جائے تو اس جرم پر لمبی چوڑی سزا نہ ہو بلکہ معمولی سرزنش اور معمولی جرمانے کے بعد پولیس اسے چھوڑ دے۔ سو ایسی صورتِ حال میں مختلف دکانوں سے چیزیں اٹھانا اور راہ گیروں کی جیبیں مارنا اسے "سیف جاب" لگتا تھا۔

اس وقت بھی وہ ایک جرمن ٹورسٹ کے تعاقب میں تھی اور اس کی نگاہ اس ٹورسٹ کی ہپ پاکٹ پر تھی جس کے اندر رکھا ہوا بٹوا اولگا کی توجہ کا مرکز تھا۔ وہ موقع پا کر اس کا بٹوا لے جانا چاہتی تھی کہ اچانک توازن بگڑ جانے کے باعث وہ ڈیوڈ ٹکر سے ٹکرا گئی تھی۔

پہلے تو وہ یہی سمجھی تھی کہ وہ بھی کوئی پاکٹ مار ہے جو اپنے کسی شکار کا پیچھا کرتے ہوئے اس سے متصادم ہو گیا ہے لیکن اگلے ہی لمحے اولگا کو اپنا خیال بدلنا پڑا کیونکہ ٹکراؤ کے بعد وہ بندہ وہیں رک کر اس سے معذرت کرنے لگا تھا۔

"آئی ایم سوری! میرا نام ڈیوڈ ٹکر ہے۔" وہ اپنا تعارف کراتے ہوئے شائستہ لہجے میں بولا۔ "میں امریکن ایمبیسی میں کام کرتا ہوں۔ ایک ضروری کام کے سلسلے میں بہت جلدی میں تھا اس لیے دھیان نہیں رہا اور تم سے ٹکرا گیا۔"

"امریکن ایمبیسی......؟" اولگا نے حیرت بھری دلچسپی سے دہرایا اور سوالیہ نظر سے اپنے سامنے کھڑے ایک خوبرو امریکی ڈیوڈ ٹکر کی طرف دیکھا۔ "بہت خوب...... سن کر اچھا لگا۔"

"میں دراصل سی آئی اے سے تعلق رکھتا ہوں اسی لیے امریکن ایمبیسی میں میری آمد و رفت جاری رہتی ہے۔ آج کل آئزن ہاور سے ملاقاتیں چل رہی ہیں۔ بس اسی سلسلے میں......"

ڈیوڈ نے مبہم انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو اولگا گہری ٹٹولنے والی نظر سے اسے دیکھنے لگی۔ امریکن ایمبیسی، سی آئی اے اور صدر آئزن ہاور...... کوئی معمولی نام نہیں تھے۔ اولگا کے شیطانی دماغ نے برق رفتاری سے سوچنا شروع کر دیا۔

'یہ شخص میرے بڑے کام کا ہے۔ اگر میں ڈیوڈ کو کسی طرح اپنے شیشے میں اتارنے میں کامیاب ہو جاؤں تو ایک تگڑی رقم کما سکتی ہوں۔ بس مجھے بہت زیادہ احتیاط اور حاضر دماغی سے کام کرنا ہوگا۔ میں بڑی آسانی سے ایک رشین عورت کی اداکاری کر سکتی ہوں۔ بس، تو طے ہو گیا۔' اس نے فیصلہ کن انداز میں سوچا۔ 'وہ جرمن ٹورسٹ گیا بھاڑ میں۔ میرا اگلا ٹارگٹ یہی ہے...... ڈیوڈ ٹکر۔'

"کیا میں جان سکتا ہوں کہ تم اچانک خاموش کیوں ہو گئی ہو؟" ڈیوڈ نے الجھن زدہ لہجے میں استفسار کیا۔

"میں "کے جی بی" کی ایک ایجنٹ ہوں۔" اولگا مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔ "میں رشین ایمبیسی میں ہوتی ہوں۔ میرا نام اولگا ہے۔ جب تم نے مجھ سے کچھ نہیں چھپایا تو مجھے بھی جھوٹ بولنا اچھا نہیں لگا اور میں نے تمہارے سامنے اپنی اصلیت اگل دی۔ بس، اتنی سی بات ہے۔"

"اچھے لوگ، اچھے لوگوں سے ٹکراتے ہی رہتے ہیں۔" ڈیوڈ نے فلسفیانہ انداز میں جواب دیتے ہوئے اولگا کا ہاتھ تھام لیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔ "امریکا اور روس میں بھلے کشیدگی ہو اور بے شک ہم دونوں اپنے اپنے ملک کے وفادار ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں ہم اچھے دوست ثابت ہو سکتے ہیں۔ تم کیا کہتی ہو اولگا؟"

"ڈیوڈ! تمہیں دیکھتے ہی مجھے بھی کچھ ایسا ہی محسوس ہوا تھا۔" وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "شاید قدرت نے ہمیں ملانے کے لیے ایک دوسرے سے ٹکرا دیا ہے۔"

"قدرت......؟" ڈیوڈ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "مگر تم رشین لوگ تو قدرت پر یقین نہیں رکھتے؟"

"بے شک، یہی حقیقت ہے۔" اولگا بڑی چابک دستی سے صورتِ حال کو سنبھالتے ہوئے مکاری سے بولی۔ "یہ لفظ میں نے تمہارے لیے استعمال کیا ہے کیونکہ تم امریکی قدرت کو مانتے ہو۔ اسے تم میری طرف سے ہماری دوستی کا تحفہ سمجھ کر رکھ لو ڈیوڈ!"

"اوہ، تھینک یو اولگا!" وہ خوشی سے اچھل اٹھا۔ "مجھے یقین ہے میں نے تم سے دوستی کر کے کوئی غلطی نہیں کی۔"

"دوستی دنیا کا سب سے مضبوط رشتہ ہے ڈیوڈ!" وہ اس کے چہرے پر نگاہ جما کر بڑے اعتماد سے بولی۔ "اور میں سمجھتی ہوں کہ ہم دونوں اپنے اپنے ملک کے وفادار رہتے ہوئے بھی اس رشتے کو نبھا سکتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے ہمیں اپنی اپنی سطح پر قربانی دینا ہوگی اور اس نیک کام کا آغاز میں کروں گی، اپنی طرف سے ایک قربانی دے کر۔"

"میں کچھ سمجھا نہیں اولگا؟" وہ الجھن زدہ نظر سے اسے دیکھتے ہوئے مستفسر ہوا۔ "تم کس قسم کی قربانی دینے کی بات کر رہی ہو؟"

"میں اہم فائلوں کا ذکر کر رہی ہوں۔" وہ گہری سنجیدگی سے وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "میں رشین ایجنسی سے ایسی فائلیں لا کر تمہیں دے سکتی ہوں جو تمہارے ملک امریکا کے لیے بہت کام کی چیز ہوں گی۔ جب تم مذکورہ فائلیں سی آئی اے کے سپرد کرو گے تو وہ لوگ اسے رشین سیکرٹ ایجنسی کے جی بی کے خلاف تمہارا ایک بہت بڑا کارنامہ سمجھیں گے جس کے بعد تمہاری ترقی تو پکی ہے۔"

"اولگا! کیا تم واقعی ایسا کر سکتی ہو؟" ڈیوڈ نے حد درجہ حیرت بھرے لہجے میں استفسار کیا۔

"بالکل۔ یہ میرے ہاتھ میں ہے۔"

"اگر ایسا ہو جائے تو یہ تمہارا مجھ پر بہت بڑا احسان ہوگا اولگا!" ڈیوڈ نے جذباتی لہجے میں کہا۔ "مجھے لگتا ہے اس کے بعد میرا نام اور مرتبہ کافی بلند ہو جائے گا۔"

"دوستوں پر احسان نہیں کیا جاتا بلکہ ان کے کام آنے کی کوشش کی جاتی ہے۔" اولگا نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "اور میں یہی کر رہی ہوں ڈیوڈ!"

ڈیوڈ نے چوکنا نظر سے گرد و نواح کا جائزہ لیا پھر رازدارانہ انداز میں بولا۔ "اس نوعیت کی حساس باتیں ہمیں یوں سر عام کھڑے ہو کر نہیں کرنا چاہئیں۔ کیوں نہ ہم کل شام کسی ریسٹورنٹ میں ڈنر پر یہ گفتگو کریں؟"

"آئیڈیا برا نہیں ہے۔" اولگا نے اپنی رضامندی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "اس دوران میں، میں چند اہم فائلوں کو تمہارے لیے منتخب بھی کر لوں گی۔"

"ڈن!" ڈیوڈ مکر نے ٹھوس انداز میں کہا۔

اس کے بعد وہ دونوں اپنی اپنی راہ ہو لیے تھے اور اگلے روز یعنی آج شام اولگا ریسٹورنٹ کے باہر سڑک کی دوسری جانب ڈیوڈ کی آمد کا انتظار کر رہی تھی۔ یہ انتظار زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا تھا۔ ڈیوڈ نے جیسے ہی ریسٹورنٹ میں قدم رکھا، اس کے ٹھیک پانچ منٹ بعد اولگا بھی اندر داخل ہو گئی تھی۔

اولگا نپے تلے قدموں کے ساتھ چلتے ہوئے ڈیوڈ والی میز کے پاس پہنچی۔ ڈیوڈ اسے دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ دونوں نے ایک گرم جوش مصافحہ کیا اور اولگا اس کے سامنے ایک کرسی پر براجمان ہو گئی۔ ایک چاق و چوبند ویٹر ان کی میز کے نزدیک منڈلا رہا تھا۔ وہ آرڈر لینے کے لیے ان کی طرف بڑھا۔

دونوں نے مل کر ایک لمبا چوڑا آرڈر لکھوا دیا جس میں کھانے پینے کی کئی ایک چیزیں شامل تھیں اور سب کی سب اعلیٰ درجے کی اور بیش قیمت۔ گویا وہ لوگ ایک شاندار اور یادگار ڈنر کرنے جا رہے تھے۔ جب ویٹر نے ان کا آرڈر پلیس کر دیا تو اولگا نے بڑی لگاوٹ سے کہا۔

"ہم اس شام کا آغاز بونگر کی بوتل سے کریں گے تاکہ موڈ بن جائے...... اگر تمہیں میرا آئیڈیا پسند آئے تو؟"

"موڈ نہیں تو کچھ بھی نہیں۔" ڈیوڈ نے بونگر کی بوتل کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے ایک خاص ادا سے جواب دیا۔ "تمہاری یہ تجویز مجھے دل سے قبول ہے۔"

اولگا کو یہ سمجھنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ ڈیوڈ اس پر بری طرح ریجھ گیا تھا۔ اولگا کے سراپا میں صنف مخالف کے لیے بے پناہ کشش تھی اور وہ اپنے اسی ہتھیار سے شکار کیا کرتی تھی۔ ڈیوڈ بھی ایک ہینڈسم اور اسمارٹ امریکی تھا۔ اس نے اولگا کی تجویز سے اتفاق کر کے یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ اولگا پر مرمٹا تھا۔ اس نے اولگا اور اپنے لیے دو جام بنائے اور ان کے بیچ پیرس کے عاشقانہ موسم پر ہلکی پھلکی گفتگو ہونے لگی۔ جلد ہی بات چیت ان کے ملکوں کی باہمی چپقلش اور سیاست کی جانب مڑ گئی اور بالآخر وہ اصل موضوع کی طرف آ گئے۔

"میں نے تمہارے مطلب کی وہ فائلیں نکال لی ہیں۔" اولگا نے آواز دبا کر رازدارانہ انداز میں کہا۔ "کیا تم انہیں یہاں سے بآسانی لے جا پاؤ گے؟"

"میں بم کے علاوہ ہر شے کو پوری دنیا میں کہیں سے کہیں لے جا سکتا ہوں۔" ڈیوڈ نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "مجھے بتاؤ تم وہ دونوں فائلیں کب تک میرے حوالے کر سکتی ہو؟"

"کل اسی وقت، اسی ریسٹورنٹ میں۔" اولگا نے جواب دیا۔

ڈیوڈ نے پرمسرت انداز میں کہا۔ "بہت خوب۔ دوستی نبھانا تو کوئی تم سے سیکھے اولگا!"

"یہ تو کچھ بھی نہیں ہے ڈیوڈ!" وہ کھانے پینے کی مزید چیزوں کا آرڈر کرتے ہوئے معتدل انداز میں بولی۔ "میں

تمہاری دوستی میں اور کیا کیا کر سکتی ہوں، اس کا تمہیں بالکل اندازہ نہیں ہے۔"

"گریٹ!" وہ ستائشی نظر سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ "اس معاملے میں تم مجھے بھی پیچھے نہیں پاؤ گی۔"

ان کی گفتگو کے دوران ہی میں ویٹر نے نیا آرڈر بھی میز پر چن دیا۔ خورونوش کا وہ سامان بہت قیمتی تھا۔ وہ محض دو افراد تھے لیکن میز پر سجے ہوئے خوش ذائقہ کھانے کی مقدار کو دیکھ کر کوئی بھی بہ آسانی اندازہ لگا سکتا تھا کہ کم از کم پانچ انسان اس کھانے سے پیٹ پوجا کر سکتے تھے۔ اس غیر ضروری "آرڈر" میں اولگا کا ہاتھ تھا۔ وہ اپنے شکار کو قربان گاہ کی جانب لے جانے سے پہلے خوب اچھی طرح کھلا پلا رہی تھی اور مزے کی بات یہ کہ وہ اس عالیشان ڈنر کا بل بھی سی آئی اے کے ایجنٹ ڈیوڈ ملر کی جیب سے ادا کرانے والی تھی۔

"تو کل شام تم وہ دو اہم فائلیں میرے سپرد کر دو گی؟" ڈیوڈ نے کھانے سے کما حقہ انصاف کرتے ہوئے سوالیہ نظر سے اولگا کی طرف دیکھا۔ "اسی ریسٹورنٹ میں۔"

"میں نے جو کہا، وہ کر کے بھی دکھاؤں گی۔" اولگا ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ "لیکن اس سلسلے میں ایک چھوٹی سی دقت ہے۔ تم اسے ڈیپارٹمنٹل پرویجر سمجھو۔ تم خود بھی سی آئی اے سے تعلق رکھتے ہو۔ ایسے معاملات کا تمہیں بخوبی اندازہ ہے۔"

"ہاں، میں سمجھ سکتا ہوں۔" ڈیوڈ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "تم مجھے اپنی دقت کے بارے میں کھل کر بتاؤ۔"

"ان دو اہم فائلوں تک رسائی حاصل کرنے کے لیے مجھے ایجنسی کے ایک آدمی کی مدد لینا پڑے گی۔" اولگا وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "وہ بندہ مذکورہ فائلوں کو آفس ایریا سے باہر لا کر میرے حوالے کرے گا اور...... وہ اس کام کے لیے اپنے "سروس چارجز" مانگ رہا ہے۔"

"ہماری ایجنسی کے لیے پیسا کوئی معنی نہیں رکھتا اولگا۔" وہ بڑے فخر سے بولا۔ "اس بندے نے کتنی رقم کا تقاضا کیا ہے؟"

"پانچ سو......!" اولگا نے سپاٹ آواز میں جواب دیا۔

"پانچ سو کیا؟" ڈیوڈ نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ "ڈالرز، فرانک، پاؤنڈ اسٹرلنگ یا پھر جرمن مارک؟"

"پانچ سو یو ایس ڈی۔" وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کسی شکاری کے انداز میں بولی۔

"پانچ سو امریکی ڈالرز!" ڈیوڈ اس کے الفاظ کو دہراتے ہوئے بولا۔ "ٹھیک ہے۔ اگر وہ فائلیں ہمارے کام کی ہوئیں تو میں یہ رقم تمہیں ادا کر دوں گا۔"

"مگر اس معاون شخص کو یہ رقم ایڈوانس میں دینا ہو گی۔" اولگا نے تاکیدی لہجے میں کہا۔ "اس کے بعد ہی وہ ان فائلوں کو میرے حوالے کرے گا اور میں تمہارے سپرد کروں گی۔"

"نو ایشو۔" ڈیوڈ نے بے پروائی سے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ "میں اس بندے کو نہیں، تمہیں جانتا ہوں اولگا اور تم میرے لیے قابل بھروسا ہو۔ اگر تم سمجھتی ہو کہ وہ فائلیں بہت اہم ہیں تو یقیناً ایسا ہی ہو گا۔" لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک آسودہ سانس خارج کی پھر ان تسلی بخش الفاظ میں اضافہ کیا۔ "فکر نہیں کرو۔ میں ایڈوانس میں پے کر دوں گا۔"

وہ زبان سے ہم کلام تھے اور ان کے ہاتھ پیٹ پوجا میں مصروف تھے۔ جب وہ اپنے معدوں کو حلق تک بھر چکے تو ان کے اشارے پر بل آ گیا۔ ویٹر بل کو میز پر چھوڑ کر واپس چلا گیا تو اولگا، ڈیوڈ کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لینے میں مصروف ہو گئی۔ اولگا نے آرڈر کرتے ہوئے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اس بل کا اماؤنٹ آسمان سے باتیں کر رہا ہو گا اور ظاہر ہے اولگا نے ڈیوڈ کو وہ بل کی ادائی اپنے اس تازہ شکار ڈیوڈ کی جیب سے کرنا تھی لیکن ڈیوڈ کسی اور ہی موڈ میں نظر آ رہا تھا۔

ڈیوڈ نے ایک بار بھی بل کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ اس کے اس رویے سے تو یہی لگ رہا تھا کہ اسے کھانے کے بل سے کوئی دلچسپی نہ ہو بلکہ وہ یہ سمجھے بیٹھا ہو کہ بل تو اولگا ہی کو ادا کرنا ہے۔ اس نوعیت کے احساسات نے اولگا کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجا دی۔

"اگر ڈیوڈ نے یہ بل ادا نہیں کیا تو کیا ہو گا؟" اس کے دماغ میں ایک خطرناک سوال ابھرا۔ "یہ کوئی معمولی رقم نہیں ہے کہ تھوڑی بحث و تکرار کے بعد ریسٹورنٹ کا اسٹاف مجھے جانے دے گا۔ وہ یقیناً پولیس کو بلائیں گے اور اس کے بعد گرفتاری تو پکی ہے۔"

"ایسا کچھ نہیں ہو گا اولگا!" اس نے خود کو سمجھانے کی کوشش کی۔ "ڈیوڈ پوری طرح میرے فریب کے جال میں پھنس چکا ہے۔ یہ ابھی مجھے ان فرضی ٹاپ سیکرٹ فائلوں کی مد میں پانچ سو ڈالرز دینے والا ہے۔ اگر بالفرض اس نے بل کی ادائی کے سلسلے میں بے اعتنائی کا مظاہرہ کیا بھی تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میں اسی کے دیے ہوئے پانچ سو ڈالرز میں سے ریسٹورنٹ کا بل بھر دوں گی۔"

اس تسلی آمیز سوچ نے اولگا کو پُرسکون کر دیا اور وہ ڈیوڈ کو اپنے پھینکے ہوئے جال میں کسنے کی کوششوں میں مصروف

ہوگئی۔

"ہمیں لگتا ہے کہ ہمیں اسی طرح ملتے رہنا چاہیے تاکہ ایک دوسرے کو سمجھنے کا زیادہ سے زیادہ موقع ملے۔" اولگا نے ڈیوڈ کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ "اس طرح ہماری دوستی مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جائے گی۔ تم اس بارے میں کیا کہتے ہو؟"

اولگا نے طے کر رکھا تھا کہ یہ ان کی آخری ملاقات ہے۔ ڈیوڈ کھانے کے بل کی ادائی میں کوئی دلچسپی رکھتا ہو یا نہیں مگر وہ اسے پانچ سو ڈالرز ضرور دے گا کیونکہ اس نے ٹاپ سیکرٹ فائلوں والا ڈرامہ بڑی چالاکی اور ہنرمندی سے رچایا تھا۔ ادھر رقم اولگا کے پرس میں پہنچی، ادھر وہ غائب۔ پھر کیسی فائلیں اور کون سا ڈیوڈ!

یہ تمام خیالات سیکنڈ کے دسویں حصے میں اولگا کے دماغ سے گزرے اور اگلے ہی لمحے ڈیوڈ کی سرسراتی ہوئی آواز اس کی سماعت تک پہنچی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"سوری، ایسا ممکن نہیں ہو سکے گا اولگا!"

"میں کچھ سمجھی نہیں۔" اولگا پلکیں جھپکا کر رہ گئی۔

"تم یہ نہیں سمجھنا کہ میں تم سے کترانے کی کوشش کر رہا ہوں۔" وہ معذرت خواہانہ انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "میں کچھ عرصے کے لیے واپس جانے پر مجبور ہوں۔"

میری طرف سے تم پانچ سو ڈالرز مجھے دینے کے بعد کسی بھی جہنم میں جاؤ۔ میں بھلا تمہاری پروا کیوں کرنے لگی؟ اولگا نے سوچا مگر زبان سے کچھ اور کہا۔

"اوہ..... تو سی آئی اے والے تمہیں واپس امریکا بلا رہے ہیں؟"

"ہاں۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "مجھے بتایا گیا ہے کہ دو روز بعد میری واپسی کا بندوبست کر دیا گیا ہے۔ کل تم مجھے وہ فائلیں دو گی اور پرسوں کی فلائٹ سے میں روانہ ہو جاؤں گا۔"

"میں تمہاری مجبوری کو سمجھ سکتی ہوں ڈیوڈ!" وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ "ہمیں ہر حال میں اوپر والوں کی ہدایات پر چلنا پڑتا ہے اور وہ بھی کوئی سوال کیے بغیر۔" لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی اور معتدل انداز میں پوچھا۔

"تم دوبارہ پیرس کب آؤ گے؟"

"اگر میں دوبارہ ادھر آنے کی پوزیشن بنا پایا تو سمجھو کہ اگلے موسم گرما میں ممکن ہو سکے گا۔" ڈیوڈ نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "اور تب میں تمہارے مطلب کی بھی چند فائلیں ساتھ لاؤں گا اور وہ بھی کسی سروس چارجز کے بغیر میں تمہیں دے دوں گا۔"

اولگا کو کچھ عجیب سا محسوس ہوا۔ وہ پوچھے بنا نہ رہ سکی۔ "لیکن تم نے تو مجھے بتایا تھا کہ تم پیرس میں موجود امریکا کی ایمبیسی میں کام کرتے ہو؟"

"مجھے اچھی طرح یاد ہے۔" وہ نہایت ہی محتاط الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے بولا۔ "میں نے تم سے کہا تھا کہ میں سی آئی اے سے تعلق رکھتا ہوں اسی لیے امریکن ایمبیسی میں میری آمدورفت جاری رہتی ہے۔ آج کل آئزن ہاور سے میری ملاقاتیں چل رہی ہیں۔"

"ہاں، مجھے یاد ہے۔ تم نے یہ سب کہا تھا۔" وہ الجھن زدہ نظر سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ "مگر تم نے یہ بھی بتایا تھا کہ امریکن ایمبیسی میں کام کرتے ہو؟"

"بالکل کہا تھا۔" وہ بڑی مہارت سے صورت حال کو اپنی گرفت میں لاتے ہوئے بولا۔ "امریکن ایمبیسی میں میرے کام کا تعلق دراصل سی آئی اے ہی سے ہے۔ امید ہے تم میری بات سمجھ گئی ہوگی۔"

اولگا کو اپنا سر چکراتا ہوا محسوس ہوا۔ جیسے اس کے دماغ میں یہ خیال آیا کہ شاید یہ حد سے زیادہ مے نوشی کے مضر اثرات ہیں لیکن اگلے ہی لمحے اس نے اپنے اس خیال کی تردید کر دی۔ اسے یقین ہو گیا کہ ڈیوڈ اپنی چکردار باتوں سے اس کے دماغ کو گھمانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"اچھا یہ بتاؤ......" وہ ڈیوڈ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کریدنے والے انداز میں بولی۔ "کل جب تم مجھ سے ٹکرائے تو اس وقت تم امریکن ایمبیسی سے نکلے تھے۔ تمہارے بیان کے مطابق تمہیں کسی کام کی جلدی تھی۔ میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ وہاں ایمبیسی کے اندر ایسا کیا ہوا تھا جو تم افراتفری کے عالم میں باہر نکلے تھے اور بے دھیانی میں مجھ سے ٹکرا گئے تھے؟"

"بات دراصل یہ ہے کہ....." وہ ایک گہری سانس خارج کرنے کے بعد وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "میں روم سے پیرس آ رہا تھا تو ٹرین میں کسی حرام خور پاکٹ مار نے میرا بٹوا اڑا لیا تھا۔ میرا پاسپورٹ بیگ کے اندر تھا اس لیے وہ بچ گیا لیکن والٹ میں موجود نقدی وغیرہ سب وہ لٹیرا لے گیا۔ میں اپنی مصیبت کی کہانی کے ساتھ امریکن ایمبیسی پہنچ گیا۔ ایمبیسی والے صرف اسی صورت میں امریکا سے باہر اپنے سٹیزن کی مدد کرتے ہیں جب اس کا پاسپورٹ کہیں کھو گیا ہو یا کسی نے چرا لیا ہو۔ میرا پاسپورٹ محفوظ تھا چنانچہ انہوں نے مجھے صرف

اتنی فیور دی......" وہ سانس ہموار کرنے کے لیے تھما پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"ایجنسی نے امریکا میں موجود میری ماں کو فون کیا اور میرے لیے پیسے بھیجنے کے لیے کہا۔ ماں جو رقم بھیجے گی، وہ ایک سے دو دن میں مجھے امریکن ایکسپریس بینک سے موصول ہوجائے گی۔ اس کے بعد ہی میں اپنے ملک امریکا واپس جا پاؤں گا۔"

"اور وہ جو تم نے صدر امریکا آئزن ہاور سے اپنی ملاقاتوں کا ذکر کیا تھا؟" اولگا نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"او ہاں...... سی آئی اے میں ہونے والی ملاقاتیں......" وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ "بالکل...... میں کئی باران سے مل چکا ہوں۔" بات کے اختتام پر وہ تھوڑا سا آگے کو جھک آیا اور اولگا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مستفسر ہوا۔

"کیا تمہیں معلوم ہے کہ سی آئی اے کیا بلا ہے؟"

اولگا نے اپنا تعارف کراتے ہوئے خود کو رشین سیکرٹ ایجنسی کے جی بی کی ایجنٹ بتایا تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ کوئی روسی ایجنٹ سی آئی اے کا مطلب نہ جانتا ہو؟ ڈیوڈ کا یہ سوال اسے انتہائی فضول اور واہیات لگا تھا۔ بہرکیف کسی قسم کا ردعمل ظاہر کرنے کے بجائے اس نے معتدل انداز میں جواب دیا۔

"سی آئی اے...... امریکا کی سینٹرل انٹیلی جنس ایجنسی۔"

اس کے جواب پر ڈیوڈ معنی خیز انداز میں زیر لب مسکرایا اور نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "اولگا تمہارا اندازہ بالکل غلط ہے۔"

"تو...... تو پھر......؟" بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

"کیپٹل انویسٹمنٹ ایسوسی ایشن!" ڈیوڈ ایک ایک لفظ پر دباؤ ڈالتے ہوئے ٹھوس لہجے میں بولا۔ "ہماری کمپنی کا ہیڈ آفس شکاگو میں ہے۔ ہم بڑے لوگوں کو آسان شرائط پر فنڈز فراہم کرتے ہیں اور ان بڑے لوگوں میں بعض اداروں اور ملکوں کے سربراہ بھی شامل ہیں۔ ہماری ڈائریکٹر مسز روتھ کے بہت اونچے پیمانے پر تعلقات ہیں۔ صدر امریکا آئزن ہاور تو ان کے فیملی فرینڈ ہیں۔ پچھلے دنوں ہم آئزن ہاور کے کسی پروجیکٹ پر کام کر رہے تھے جس کی وجہ سے میری ان سے کئی ملاقاتیں بھی ہوئی ہیں اور چند روز بعد نیویارک میں ایک اہم کنونشن ہونے والا ہے جس میں آئزن ہاور کے علاوہ دیگر افراد بھی ہوں گے جن میں ہر کوئی ایک سے بڑھ کر ایک ہے۔ کل میری مسز روتھ سے بھی فون پر بات ہوئی ہے۔ وہ مجھے واپس آنے کو اس لیے کہہ رہی ہیں کہ اس کنونشن میں میرا موجود رہنا بعض حوالوں سے ضروری ہے۔ میں نے مسز روتھ کو ٹرین والے حادثے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں کے لیے کمپنی کی ڈائریکٹر کو ڈسٹرب کرنا ٹھیک نہیں لگتا۔ ویسے بھی میری ماں نے جو رقم بھیجی ہے، وہ ایک آدھ روز میں مجھے مل ہی جائے گی۔" لمحاتی توقف کر کے وہ بڑے بھونڈے انداز میں مسکرایا اور پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"اولگا! تم تو کے جی بی کی ایجنٹ ہو۔ تم یہ بات مجھ سے زیادہ بہتر جانتی ہو کہ انسان کو ہر نوعیت کے حالات کے لیے ذہنی طور پر تیار رہنا چاہیے۔ اگر اس وقت میری جیب خالی ہے تو کیا ہوا۔ ایک دو روز پیسوں کے بغیر بھی گزر ہی جائیں گے پھر تمہارے جیسی بے لوث اور پرخلوص دوست کے ہوتے ہوئے مجھے کس بات کی فکر۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟"

اپنی بات کے اختتام پر ڈیوڈ نے عیاری بردار سوالیہ نظر سے اولگا کی طرف دیکھا تو اس کے جی میں آئی وہ ڈیوڈ کی آنکھوں میں گرم سلائیاں گھسا دے یا اس کے منحوس چہرے پر خالص تیزاب پھینک دے اور یا پھر اس کا گلا دبا دے لیکن اس نے اپنے جذبات پر قابو رکھا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آج کے ڈنر کا بل مجھے ادا کرنا ہوگا؟"

"یہی حقیقت ہے۔" وہ ڈھٹائی سے بولا۔

اولگا نے کہا۔ "اور جب تک تمہارے پیسے نہیں آجاتے، مجھے تمہاری مالی مدد بھی کرنا ہوگی۔ ہیں نا؟"

"بالکل ٹھیک کہا۔" وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "تم میری بہت اچھی دوست ہو۔ یہ تمہارے لیے مشکل نہیں ہوگا۔ تم رشین سیکرٹ ایجنٹ ہو اور......"

"ایسی کوئی بات نہیں۔" وہ قطع کلامی کرتے ہوئے زہر خند لہجے میں بولی۔ "میں نے تم سے جھوٹ کہا تھا۔ میں ایک اسٹریٹ کرمنل ہوں۔ اس روز میں ایک جرمن ٹورسٹ کا والٹ مارنے کے لیے اس کا تعاقب کر رہی تھی تو تم سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ اس تصادم پر مجھے بہت غصہ آیا تھا کیونکہ تم سے ٹکرانے کی وجہ سے وہ جرمن ٹورسٹ اپنے پھولے ہوئے بٹوے سمیت میرے ہاتھ سے نکل گیا تھا پھر میں نے تمہیں بکرا بنانے کا فیصلہ کرلیا۔" وہ سانس ہموار کرنے کی غرض سے تھمی پھر ان الفاظ میں اضافہ کردیا۔

"تم سے رقم نکلوانے کے لیے میں نے رشین ایجنٹ والی کہانی گھڑلی اور تمہیں ٹاپ سیکرٹ فائلوں کے بارے میں بتایا۔ تم مجھے پانچ سو ڈالرز دینے کے لیے راضی بھی ہوگئے

"لیکن......"

اولگا بات ادھوری چھوڑ کر بے بسی، ناپسندیدگی اور نفرت کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ ڈیوڈ کو گھورنے لگی۔

ڈیوڈ اس کی نگاہ کی تاب نہ لاتے ہوئے اضطراری لہجے میں مستفسر ہوا۔ "اولگا! تمہارے پاس اس ڈنر کا بل ادا کرنے کے لیے تو پیسے ہیں نا؟"

"نہیں۔" وہ جھنجلائے لہجے میں بولی۔

"او مائی گاڈ!" ڈیوڈ اپنا سر تھام کر رہ گیا۔ "پھر تو بڑی مشکل ہو جائے گی۔"

"میرے پاس رقم تو نہیں مگر ایک آئیڈیا ہے۔" اولگا نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

"کیسا آئیڈیا؟" وہ چونکے ہوئے لہجے میں مستفسر ہوا۔

"ایک، ایک ڈرنک لیتے ہیں نا۔" وہ معنی خیز لہجے میں بولی۔

"ٹھیک ہے۔" ڈیوڈ نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔ "لیکن اس سے بل کی رقم میں کمی نہیں بلکہ اضافہ ہوگا۔"

اولگا نے ڈیوڈ کی تشویش کو نظرانداز کرتے ہوئے ویٹر کو اشارہ کر کے اپنے پاس بلایا اور دو اچھی قیمتی ڈرنک کا آرڈر دے دیا۔

"آخر تم نے سوچ کیا رکھا ہے؟" ڈیوڈ نے الجھن بھرے لہجے میں پوچھا۔ "مجھے بتاؤ، تمہارے ذہن میں کیا چل رہا ہے اور...... اور تم کیا کرنے کا ارادہ رکھتی ہو؟"

"مجھے جو بھی کرنا ہے، وہ تمہارے سامنے اسی ریسٹورنٹ میں کروں گی۔" اولگا نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "بلکہ یہ ہم دونوں کا جوائنٹ وینچر ہوگا۔"

"جوائنٹ وینچر......؟" وہ پلکیں جھپکاتے ہوئے بے حد الجھن زدہ لہجے میں بولا۔ "میں کچھ سمجھا نہیں اولگا؟"

"میں سمجھاتی ہوں۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ "تم پہلے میرا ساتھ دینے کا وعدہ کرو۔ میں نے جو کرنے کی ٹھان لی ہے، اس میں ہم دونوں کا مالی فائدہ ہے۔"

"اس وقت ہمیں پیسوں کی اشد ضرورت ہے۔" ڈیوڈ نے حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "میں تمہارا ساتھ دینے کو تیار ہوں۔ بتاؤ، مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

"وہ ادھر کونے والی ٹیبل پر تمہیں دو بوڑھے اور گنجے افراد بیٹھے ہوئے نظر آ رہے ہیں؟" وہ ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولی۔

"ہاں، بالکل نظر آ رہے ہیں۔" ڈیوڈ نے جواب دیا۔

"میں انہیں اچھی طرح جانتی ہوں۔" اولگا نے معتدل انداز میں کہا۔ "ان میں سے ایک وکیل ہے اور دوسرا اسٹاک بروکر۔ ان کا شمار پیرس کے امیر لوگوں میں ہوتا ہے۔ ان کے پاس دولت کی کوئی کمی نہیں۔ ہزاروں لاکھوں فرانک تو ہر وقت ان کی جیبوں میں بھرے رہتے ہیں اور ان میں ایک چیز قدرِ مشترک ہے اور وہ ہے...... خوبصورت عورت کو حاصل کرنے کا شوق۔ اس تمنا کی تکمیل کے لیے وہ پیسے کی پروا نہیں کرتے۔ وہ دونوں کافی دیر سے ریسٹورنٹ میں بیٹھے پی رہے ہیں اور اس وقت ان کی حالت خاصی مخدوش ہو رہی ہے۔ میں بہ آسانی انہیں ہینڈل کر لوں گی۔"

"انہیں ہینڈل کرنے سے تمہاری کیا مراد ہے اولگا؟"

ڈیوڈ پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

"میں ان کے پاس جا کر انہیں اپنے حسن کے جال میں پھنساؤں گی۔" اولگا وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "اس کے ساتھ ہی میں ان کے نوٹوں سے بھرے ہوئے بٹوؤں تک رسائی حاصل کر لوں گی۔ جب میں تمہیں اشارہ کروں تو تم نے اس ٹیبل پر آ جانا ہے۔"

"وہاں پہنچ کر مجھے کیا کرنا ہوگا؟" ڈیوڈ نے پوچھا۔

"تمہیں میرے شوہر کا کردار ادا کرنا ہے۔" وہ سپاٹ آواز میں بولی۔ "ایک غصیلے، حاسد اور بددماغ شوہر کا کردار جو اپنی خوبصورت بیوی کو دو بوڑھے شرابی مردوں کے ساتھ موج مستی کرتے دیکھ کر چراغ پا ہو جاتا ہے اور ان سے جھگڑا شروع کر دیتا ہے۔ تم نے وہاں خوب ہنگامہ برپا کرنا ہے۔ اس دوران میں، میں ان دونوں حریص بوڑھوں کی رقم پر ہاتھ صاف کر لوں گی۔ تم مجھے بازو سے پکڑ کر لگ بھگ کھینچتے اور گھسیٹتے ہوئے ریسٹورنٹ سے باہر لے جانا۔ امید ہے، اس ہنگامہ آرائی کے بعد ریسٹورنٹ والوں کا ہمارے بل کی طرف دھیان نہیں جائے گا اور اگر اتفاق سے کوئی آدمی ہم سے بل وصول کرنے باہر آ بھی گیا تو ہم اسے خالی ہاتھ واپس نہیں بھیجیں گے کیونکہ ہم تلاش سے جیب بھرے بن چکے ہوں گے۔"

"اچھا!" ڈیوڈ ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ "تو یہ ہے تمہارا وہ آئیڈیا؟"

جواب میں اولگا کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز، آسودہ اور پُراسرار مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کی نگاہ کسی شکاری کے مانند انہی عیاش بوڑھوں پر جمی ہوئی تھی۔

"اچھا ہے کہ تم رشین سیکرٹ ایجنسی میں نہیں ہو۔" ڈیوڈ سوچے بنا نہ رہ سکا۔ "ورنہ تم میرے ملک کا کباڑا کر کے رکھ دیتیں۔"

⌘⌘⌘

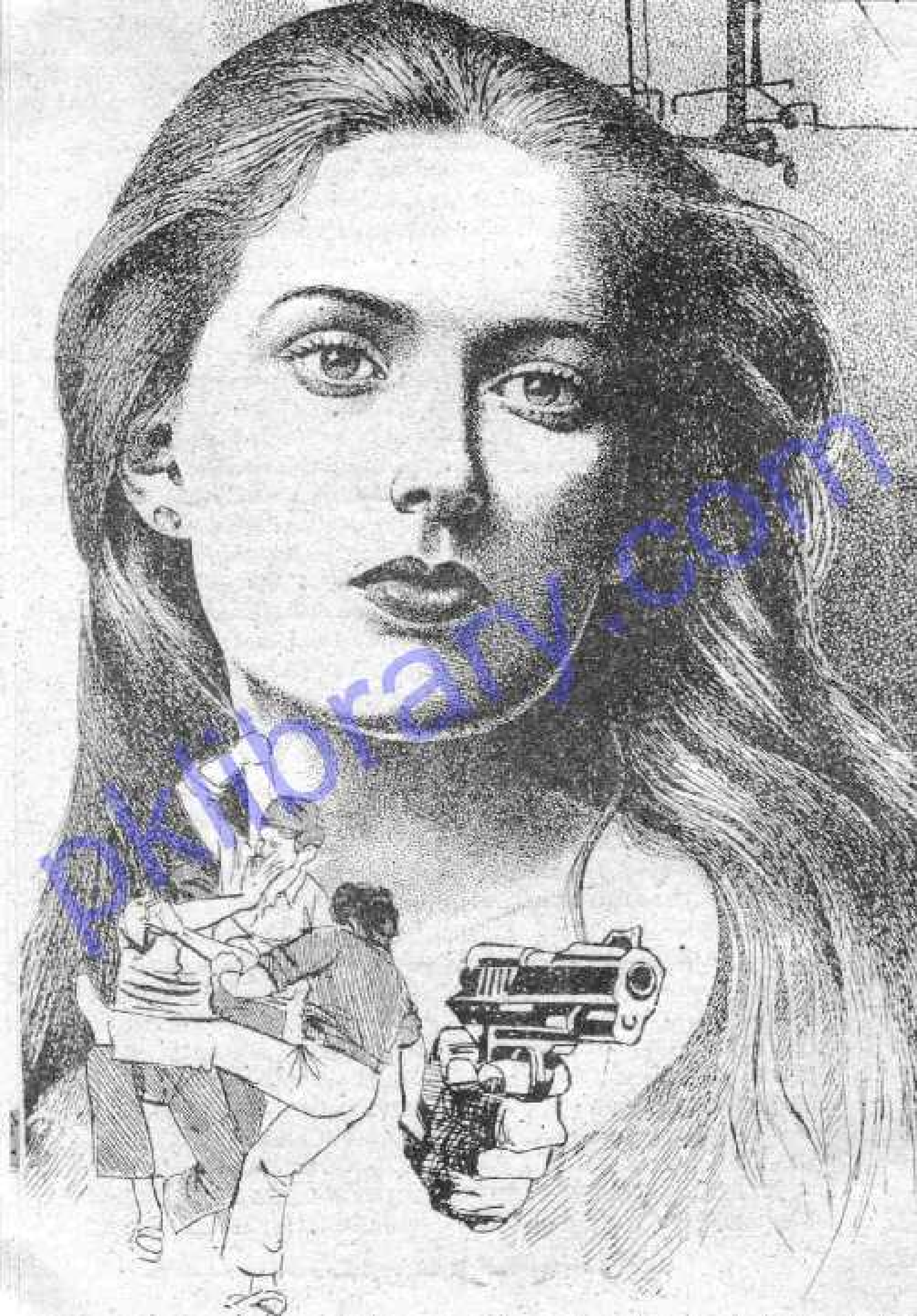


قسط نمبر: 39

اسماء قادری

زندگی پیار کا گیت ہے مگر... صرف وہاں جہاں معاشرہ ناہمواریوں کا شکار نہ ہو... جہاں انصاف اور توازن عنقا نہ ہوں اور بدقسمتی سے وہ جس معاشرے میں رہتا تھا وہاں ناانصافیوں کی تندوتیز آندھیوں نے اسے محض سراپا انتقام بنا دیا تھا... ایک طرف فنون حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اسے ناقابل شکست بنایا تو دوسری طرف ظلم و جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے اس پرعزم نوجوان کو حرف غلط کے مانند مٹائے جانے کے منصوبے بنائے جا رہے تھے... اس کی زندگی جوالمیوں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور روشنی سے دور تھی لیکن... بے خبری میں جنم لینے والے عشق کی لو اسے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی... اس کی بے قراریوں کو قرار دینے کے لیے اس کا جنون، اس کا پیار اس کے ساتھ تھا... پھر وہ کیسے زمانے کی چیرہ دستیوں کے آگے ہار مان لیتا... اگرچہ تارِ عنکبوت نے طاقت اور گھمنڈ کے نشے میں چور لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ ہر وار کا توڑ کرتا حق و باطل کی ازلی جنگ یوں لڑتا رہا کہ وارداتِ قلب بھی اس کے فرض کی راہ میں حائل نہ ہو سکی...

اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے ایک سراپا انتقام نوجوان کی حیرت انگیز داستان



گزشتہ اقساط کا خلاصہ

معاذ ایک ذہین لیکن مجنون مزاج لڑکا یونیورسٹی کا طالب علم ہے لیکن ساتھ ساتھ اس نے دیگر کئی مشاغل بھی پال رکھے ہیں۔ آج کل اس پر مارشل آرٹ سیکھنے کا شوق سوار ہے اور اس نے باقاعدہ ایک ادارہ جوائن کیا ہوا ہے۔ معاذ کے والد سرکاری افسر ہیں اور اچھے عہدے پر فائز ہیں۔ ایک شام معاذ اکیڈمی سے واپس آ رہا تھا تو وہ چند لڑکوں کو سڑک پر کھڑی ایک لڑکی کو اغوا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔ وہ لڑکی یونیورسٹی ہی میں پڑھتی ہے اور لڑکوں کا تعلق بھی وہیں سے ہے۔ اپنی نڈر فطرت کے باعث وہ اس معاملے میں کود پڑتا ہے اور بشریٰ نامی اس لڑکی کو بچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ بشریٰ ماس کمیونیکیشن کی طالبہ ہے اور ایک اخبار کے لیے کالم وغیرہ لکھتی ہے۔ اس ویران جگہ بھی وہ ایک زیرتعمیر ہاؤسنگ منصوبے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ہی آئی تھی۔ معاذ بشریٰ کو بہ حفاظت اس کے گھر پہنچا دیتا ہے اور خود اس واقعے کو فراموش کر دیتا ہے لیکن جن رئیس زادوں سے اس نے ان کا شکار چھینا تھا وہ اس واقعے کو فراموش نہیں کرتے اور موقعے کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ایک دن جنگل کی سیر کے دوران جب وہ فوٹو گرافی کے شوق میں سب سے الگ تھلگ ہو جاتا ہے وہ لوگ معاذ کو بے خبری میں گھیر کر بری طرح زدوکوب کرتے ہیں اور بلندی سے اسے دھکا دے دیتے ہیں۔ معاذ کے واپس نہ آنے پر انتظامیہ کے افراد، پولیس اور ریسکیو ذرائع کی مدد سے اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ ادھر معاذ کو ہوش آتا ہے تو وہ خود کو ایک جوگی کی جھونپڑی میں پاتا ہے۔ جوگی اپنی خاص جڑی بوٹیوں کی مدد سے اس کا علاج کرتا ہے۔ وہاں رہتے ہوئے جوگی کی شخصیت اس کے لیے دلچسپی کا باعث بن جاتی ہے۔ جوگی بھی اسے پسند کرنے لگتا ہے اور ایک دن اسے بتاتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہیں قدرت کچھ خاص صلاحیتوں سے نواز کر دنیا میں بھیجتی ہے۔

معاذ سے خاص بات چیت کے بعد وہ اسے پراسرار علم سکھانے کی ہامی بھر لیتا ہے اور معاذ اس سے یہ علم سیکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ادھر جائے وقوعہ سے ملنے والے معاذ کے کیمرے سے جب تصویریں نکلوائی جاتی ہیں تو ایک ایسی تصویر بشریٰ کی نظر میں آ جاتی ہے جس میں بہت دور ایک درخت کے پیچھے سے ایک چہرہ جھانکتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ کافی کوشش کے بعد اس چہرے کو پہچان لیتی ہے۔ یہ وہی لڑکا ہوتا ہے جو اس کو اغوا کرنے کی کوشش کرنے والوں میں شامل تھا۔ اصل میں وہ لڑکا کامران اس شخص کا بیٹا ہے جس کے پروجیکٹ کے غیرقانونی ہونے کے سلسلے میں بشریٰ تحقیق کر رہی تھی۔ بشریٰ کے والد جرنلسٹ ہوتے ہیں۔ اس انکشاف کے بعد وہ پولیس سے رابطہ کرتی ہے۔ اس کی پاداش میں بشریٰ کو کافی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کی ماں کو بے آبرو کر کے مار دیا جاتا ہے جبکہ باپ صدمے سے جان دے دیتا ہے۔ اس سب میں بازل نامی غنڈے کا ہاتھ ہوتا ہے۔ بشریٰ انتقام لینے کی ٹھان لیتی ہے۔ ان تکلیف دہ دنوں میں ہی معاذ واپسی کا ارادہ کرتا ہے تاہم ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ ڈاکو اسے پہچان کر اس کا سودا عرفان اللہ اور یزدانی سے کر جاتے ہیں۔ معاذ وہاں سے ایک لڑکا کو وہاں سے نکال لے جاتا ہے۔

ادھر بازل اچانک بشریٰ کو چھاپ لیتا ہے اور اسے بے آبرو کر رہا ہوتا ہے۔ معاذ کو بازل اسی کے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہوئے اس کے بھائی کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اسے واپس آنے کا پیغام دیا جاتا ہے۔ معاذ دشمنوں کے پاس خود حاضر ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ بھی دوسری پارٹی سے اس کا سودا کر کے اسے ان کے حوالے کر دیتے ہیں۔ قید میں معاذ سے معلومات نہ بتانے پر اس کے بھائی کو ایک کر کے نکال لیا جاتا ہے۔ مجبوراً معاذ کو سب بتانا پڑتا ہے۔ ادھر بشریٰ بھی سونیا خان سے مل جاتی ہے اور اس کی ٹریننگ شروع ہو جاتی ہے۔ معاذ کے دوست عالم شاہ کے بھائی کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ معاذ کئی فنون میں مہارت حاصل کر لیتا ہے۔ اسے ہپناٹائز کر کے اس کے دماغ پر کنٹرول کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاہم وہ وظیفے سے حاصل اقو کے علم کی بدولت ان کا معمول نہیں بنتا۔ عالم شاہ اور اس کا نوکر سرمد، بازل کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ [illegible] صداقت شاہ کے نومولود بیٹے کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اغوا کا الزام لطیف سومرو پر آتا ہے۔ عالم شاہ، بازل کی قید میں موجود ایک زخمی شخص کی مدد سے وہاں سے فرار ہو جاتا ہے۔ ادھر بشریٰ دبئی پہنچ جاتی ہے۔ وہاں وقاص اسے پارٹی کے روپ میں پہچان لیتا ہے۔ وہ سلطان کو مارنا چاہتی ہے تاہم وقاص اسے ایسا کرنے سے روکتا ہے۔ ادھر عالم شاہ، بازل کی قید سے نکل کر اس کا پیچھا کرتا ہے۔ وہ وہاں معاذ کو دیکھتا ہے۔ صداقت شاہ، لطیف سومرو کو گھیرنے کے لیے اس کی خفیہ بیوی اور بچے کا کھوج لگاتے ہیں اور بچے کو اغوا کر لیتے ہیں۔ لطیف سومرو مجبور ہو جاتا ہے۔ معاذ کو اس کے گھر والوں سے ملنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ وہ ایک مشن پر سونیا کے ساتھ انڈیا روانہ ہوتا ہے تاہم کچھ لوگ سکھ یاتریوں سے بھری بس کو یرغمال بنا لیتے ہیں۔ معاذ اور سونیا خان ان کے تمام افراد کو ٹھکانے لگا دیتے ہیں۔ صداقت شاہ کے انڈیا میں موجود رشتے دار کے ہاں شادی ہوتی ہے۔ عالم شاہ، کومل اور سرمد انڈیا روانہ ہو جاتے ہیں۔ ائیرپورٹ سے گھر روانگی پر راستے میں کچھ لٹیرے انہیں لوٹ لیتے ہیں۔ عالم شاہ ایکشن میں آنا چاہتا ہے تاہم اجالا نامی عالم شاہ کی کزن اس کا راستہ روک لیتی ہے۔ گھر پہنچنے پر پولیس کی ریڈ ہوتی ہے اور وہ عالم شاہ اور سرمد کو لے جاتے ہیں۔ ادھر بشریٰ اور وقاص بازل کو اسپتال میں مارنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ بچ جاتا ہے۔ معاذ اور سونیا اچھے سہولت کاروں سے مل جاتے ہیں۔ عالم شاہ اور سرمد کو تشدد کا نشانہ بنا کر ویرانے میں پھینک دیا جاتا ہے۔ وہ لوگ واپس اپنے میزبانوں کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔

شادی کے دوران انہیں پتا لگتا ہے کہ ان کے ساتھ جو کچھ ہوا اس میں اجالا اور اس کا عاشق شامل ہوتے ہیں۔ وہ چھپ کر ان کی باتیں سن رہا ہوتا ہے کہ اسے چھاپ لیا جاتا ہے۔ تاہم وہاں مار ماری ہوتی ہے اور اجالا کا عاشق مارا جاتا ہے۔ پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ ان کے کزن

انہیں اپنے دوسرے خفیہ بنگلے پر پہنچا دیتے ہیں جہاں کچھ لوگ ان پر حملہ کر دیتے ہیں۔ وہ وہاں سے بحفاظت نکل جاتے ہیں۔ ادھر معاذ کو سونیا اپنے ساتھ ملانے کی کوشش پوری کر جاتی ہے جس میں ایک ریلوے لائن کو دھماکے سے اڑانا ہوتا ہے۔ معاذ ایسا نہیں چاہتا اس لیے وہ ٹرین کی آمد سے قبل بارودی دھماکا کر دیتا ہے۔ وہ زخمی ہو جاتا ہے اور اسے چندو سادھو اپنی کٹیا میں لے جاتا ہے جہاں اس کی اچھی دیکھ بھال ہوتی ہے۔ سونیا کے آدمی معاذ کو تلاش کرتے ہیں مگر ناکام ہو جاتے ہیں۔ ادھر عالم شاہ اور سرمد خفیہ ذریعے سے بارڈر پار کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر دھر لیے جاتے ہیں اور "را" کی قید میں پہنچ جاتے ہیں۔ ادھر بشریٰ بادل کو مارنے کی کوشش میں خود نشانہ بن جاتی ہے۔ معاذ سادھو کی مدد سے ایک انڈین ایجرٹن کے گھر پہنچ جاتا ہے۔ وہیں اسے عالم اور سرمد کی گرفتاری کا پتا چلتا ہے۔ معاذ ڈاکٹر فردوس سے ملتا ہے اور اسے کجل کی مدد کرنے کا کہتا ہے۔ عالم اور سرمد قید سے فرار کا سوچتے ہیں اور دھر لیے جاتے ہیں۔ علیزہ اور وقاص وغیرہ کو لالہ عیسیٰ ملک سے باہر نکال دیتا ہے اور ہر ممکن احتیاط کی ہدایت کرتا ہے لیکن علیزہ پاکستان میں ٹوبیہ سے رابطہ کرتی ہے جو ان کے لیے مصیبت بن جاتا ہے۔ ٹوبیہ پر تیزاب پھینک دیا جاتا ہے۔ وقاص، علیزہ اور اس کے گھر والوں کو مار دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس معاذ کو دیوا نامی شخص سے مدد لینے کا کہتی ہے۔ معاذ اپنے کزن کو پاکستان کال کرتا ہے تو اسے پتا چلتا ہے کہ اس کے گھر والوں کو مار دیا گیا ہے۔ وہ اپنے دشمنوں سے انتقام لینے کی ٹھان لیتا ہے۔ ادھر ڈاکٹر فردوس کو اس کے سسرال والے کجل کو بھگانے کی پاداش میں تشدد کا نشانہ بناتے ہیں۔ معاذ، عالم اور سرمد کی رہائی کے لیے کارروائی کرتا ہے اور انہیں "را" کی قید سے نکالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن عالم اور سرمد کو دیوا کے آدمی کسی دوسری جگہ پہنچا دیتے ہیں۔ سونیا معاذ کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ ادھر بادل ایک جگہ لالہ عیسیٰ کی موجودگی پر کارروائی کرتا ہے تاہم لالہ خود کو گولی مار کر ختم کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس کا انتقال ہو جاتا ہے۔ دیوا گینگ، ڈاکٹر فردوس کی میت اٹھنے پر وہاں فائرنگ کر دیتے ہیں۔ پولیس دیوا کو گھیر لیتی ہے۔ معاذ دیوا اور اس کے آدمیوں کو ٹھکانے لگا کر عالم کا پتا معلوم کر لیتا ہے۔ سونیا اور معاذ حیدرآباد نواب بدرالدین کی حویلی پہنچ جاتے ہیں۔ تاہم کالے خان اور راؤ معاذ بوبی کو شگفتہ سے چھڑانے کے لیے انہیں واپس آنا پڑتا ہے۔ کالے خان کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ معاذ نواب صاحب کی حویلی میں عالم اور سرمد کی رہائی کے لیے کارروائی کرتا ہے لیکن رہا کرا لیتا ہے۔ وہ لوگ نئے ٹھکانے پر پہنچتے ہیں تو وہاں معاذ سے ملنے جارو نامی شخص آتا ہے۔ اسے معاذ نے "را" کی قید سے نکالا ہوتا ہے۔ جارو اور معاذ، کجل سمیت اسپتال جاتے ہیں اور پہچان لیے جانے پر پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ پولیس سے مقابلے کے بعد وہ ایک بستی میں پناہ لینے پہنچ جاتے ہیں اور وہ لوگوں کو یرغمال بنا کر ان کی جھونپڑی میں قیام کرتے ہیں۔ ادھر سونیا معاذ کی تلاش میں نکلتی ہے اور راستے میں اسے پہنچنے پر معاذ کا سراغ ملتا ہے۔ معاذ اور جارو وغیرہ انوپ نامی شخص کے ساتھ اس کے مالک کے بنگلے میں قیام کرتے ہیں۔ سونیا بھی معلومات حاصل کرتی ہوئی مذکورہ بنگلے تک پہنچ جاتی ہے۔ عالم شاہ اور سرمد بھی سونیا کا پیچھا کرتے ہوئے وہیں پہنچ جاتے ہیں۔ ادھر وقاص، علیزہ و دیگر لالہ زندہ ہوتے ہیں۔ وقاص حلیہ بدل کر گھوڑا گاڑی چلا رہا ہوتا ہے۔ وہ معاذ کو تلاش کرنے کے لیے انڈیا روانہ ہوتا ہے۔ وہاں اس کی گل خان سے ملاقات ہوتی ہے اور معاذ کا سراغ ملتا ہے۔ سونیا، معاذ اور دیگر ساتھیوں سے مل جاتی ہے تاہم وہ جس بنگلے میں ہوتے ہیں وہ دشمن کا ہوتا ہے۔ دشمن سب کو ہلاک کرنے کے لیے جا رہے ہوتے ہیں کہ ان کی گاڑی کو حادثہ پیش آجاتا ہے۔ ان سب کو بھی ہلکی طبی امداد دیتے ہیں اور ان سے پوچھ گچھ کی جاتی ہے۔ کجل کی حالت تشویشناک ہوتی ہے وہ وہاں موجود ایک وید دیکھتا ہے۔ ادھر لالہ واپس اپنے لوگوں میں پہنچ کر ایکشن میں آجاتا ہے اور حامد کو ... ہے۔ لالہ ... کے ٹھکانے کی نگرانی کرواتا ہے۔ بادل، معاذ وغیرہ کے ٹھکانے سے باخبر ہو جاتا ہے۔ ادھر لالہ کے آدمی ... میں مارے جاتے ہیں۔ لالہ اپنے آدمیوں کو انڈر گراؤنڈ کر دیتا ہے۔ معاذ وغیرہ جہاں ہوتے ہیں وہاں دشمن حملہ کر دیتا ہے اور کافی ... ہوتی ہے۔ بادل، معاذ کا پیچھا کرتا ہے اور چینیوں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ معاذ چینیوں کے ساتھ مل کر دشمنوں کے خلاف کارروائی کرتا ہے۔ اسی دوران اسے گل خان نظر آتا ہے۔ اسے پتا چلتا ہے کہ گیا تھا۔ وہ لارا نامی عورت کو بھی گرفت میں لے لیتے ہیں اور اسی سے معلومات لیتے ہیں۔ ادھر لالہ عیسیٰ، اعظم کو دشمن کی گرفت سے نکالنے کے لیے کارروائی کرواتا ہے اور موتی اور نیلی، اعظم کو نکالنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ معاذ دشمنوں کے کیمپ پر حملہ کر کے وہاں قبضہ کر لیتا ہے۔ موتی اور نیلی کی گاڑی پر حملہ ہوتا ہے تاہم بار بار ... کے بعد وہ صداقت شاہ کے پاس پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ لالہ عیسیٰ صداقت شاہ کو حویلی پر رکھواتا ہے۔ صداقت شاہ، اعظم کے محفوظ ٹھکانے کے لیے قربان شاہ کو فون کرتے ہیں۔ اعظم کو وہاں سے نکال لیا جاتا ہے اور دوسری جگہ منتقل کر دیا جاتا ہے۔ ادھر معاذ بیجنگ پہنچ جاتا ہے اور جلد از جلد وطن کے کرتا دھرتاؤں سے بات کرنے کا متمنی ہوتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

معاذ کجل کی بیماری کی وجہ سے جلد از جلد اسپتال پہنچنا چاہتا تھا اور اسی سلسلے میں بیجنگ میں موجود معاذ و دیگر کے معاون یوسف کے ساتھ ان کی گفتگو جاری تھی۔

"نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم اس کے مقابلے میں آرام کرنے یا کوئی تفریحی فلم دیکھنے میں زیادہ خوشی محسوس کریں گے۔" معاذ کے جواب دینے سے قبل وکی

بول پڑا۔ معاذ نے اسے تشکرانہ نظروں سے دیکھا۔ اسے آہستہ آہستہ اندازہ ہوتا جا رہا تھا کہ بظاہر وکی جتنا غیر سنجیدہ اور کھلنڈرا تھا، اندر سے انتہائی حساس اور معاملہ فہم بھی تھا۔

”ٹھیک ہے، جیسا آپ پسند کریں۔ ہم آپ دونوں کو ڈراپ کرتے ہوئے اپنی اگلی منزل کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔“ یوسف نے بنا کسی تبدیلی وجہت کے آگے کا پروگرام ترتیب دے دیا۔

”ہماری طرف سے بھی تنگ جی کی خیریت معلوم کر لیجیے گا۔ ہم ان شاء اللہ اگلی بار ان کی مزاج پرسی کے لیے ساتھ چلیں گے۔“ وکی نے آگے کا پروگرام بھی واضح کر دیا کہ وہ لوگ نہ صرف میٹنگ بلکہ اسپتال کے دورے میں بھی ان کے ساتھ شامل نہیں ہوں گے۔ اس بار معاذ نے اسے ذرا غور سے دیکھا۔ کیا وہ کچھ سمجھ گیا تھا اور چاہتا تھا کہ وہ تنگ سے اکیلے میں ملاقات کر سکے؟

وکی نے اس کا یوں غور سے دیکھنا محسوس کیا لیکن چہرے سے کچھ ظاہر نہ ہونے دیا اور ہونٹوں پر احمقانہ مسکراہٹ سجائے کھڑا رہا۔

”تو پھر چلیں۔“ یوسف کی مداخلت نے زیادہ غور کرنے کی مہلت بھی نہیں دی۔ پروگرام ترتیب پا چکا تھا چنانچہ وہ سب مسجد سے باہر نکلے اور یوسف کی میزبانی میں واپسی کا سفر شروع کیا۔ وکی اور جارو کو رہائش گاہ پر اتار کر وہ اپنی اگلی منزل کی طرف روانہ ہوئے۔

”مجھے اور میرے ساتھیوں کو لاک لگا کر کیوں رکھا جا رہا ہے؟ کیا ہماری حیثیت قیدیوں کی ہے؟“ وہ یوسف کا گیٹ لاک کرنا نوٹ کر چکا تھا اس لیے اس بار خود کو سوال کرنے سے نہ روک سکا۔

”میں ملنے والی ہدایات پر عمل کرنے کا پابند ہوں البتہ آپ لوگوں کو دیے جانے والے پروٹوکول کو دیکھ کر یہ رائے دے سکتا ہوں کہ یہ صرف ایک احتیاطی تدبیر ہے۔“ یوسف کے نہایت رسان سے دیے گئے جواب کے بعد اس نے خاموشی اختیار کرنا ہی مناسب سمجھا۔ تقریباً پینتیس منٹ کے سفر کے بعد وہ اپنی منزل پر پہنچ چکے تھے۔ کثیر المنزلہ دفتری عمارت کے داخلی و خارجی راستے پر لوگوں کا آنا جانا لگا ہوا تھا۔ زیادہ تر کوتاہ قد مگر اسمارٹ اور فٹ چینی مرد اور عورتیں تھیں۔ کئی عورتوں نے مغربی لباس پہن رکھے تھے لیکن اپنے مخصوص نقوش اور انداز کے باعث مغربی عورتوں سے مختلف ہی دکھائی دے رہی تھیں۔ بالکل چینی کی گڑیاؤں سی نازک اور

پرکشش۔ چینی مرد و زن کے درمیان کچھ غیر ملکی چہرے بھی الگ سے شناخت ہو رہے تھے۔ اسے ان میں اکا دکا پاکستانی بھی دکھائی دیے۔ ان چہروں کی دید نے دل میں وطن کی یاد کی چنگی بھری لیکن صبر کے سوا چارہ ہی کیا تھا سو، دل پر صبر کا بھاری پتھر رکھ کر یوسف کے سنگ شین یاہی سے ملاقات کے لیے جا پہنچا۔

”مسٹر شین یاہی سے تو آپ واقف ہی ہیں۔ ان سے ملیے، یہ ہیں میڈم زن ہو۔“

یوسف اسے ساتویں منزل کے جس دفتر میں لے کر گیا، وہاں شین یاہی کے ساتھ ایک خاتون بھی موجود تھیں۔ چھوٹی چھوٹی آنکھوں، قدرے چپٹی ناک، پتلے ہونٹوں اور گوری رنگت والی اس بوٹے سے قد والی اسمارٹ خاتون کا تعارف کرواتے ہوئے یوسف کے لہجے میں حد درجے احترام تھا۔

”ٹھیک ہے مسٹر مانوسائی اتم ویٹنگ روم میں انتظار کرو۔ جب تمہاری ضرورت محسوس ہوئی، میں تمہیں کال کر لوں گی۔“ عورت جس کی عمر معاذ کے اندازے کے مطابق پینتیس سے چالیس سال کے درمیان تھی، شستہ انگریزی میں یوسف سے مخاطب ہوئی۔

”جو حکم مادام!“ یوسف بنا تبدیلی وجہت کے پلٹ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

”تشریف رکھیے مسٹر معاذ!“ وہ اپنے سیاہ شولڈر کٹ بالوں کو غیر ارادی طور پر دھیرے سے جھٹک کر معاذ سے مخاطب ہوئی تو اس نے خاموشی سے اس کے مقابل کرسی سنبھال لی۔ میز کی دوسری طرف میڈم زن ہو کے ساتھ ہی شین یاہی بیٹھا ہوا تھا۔ زن ہو کے برابر بیٹھے ہونے کے باوجود وہ اس کے سامنے دبا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

”مجھے تمہارے متعلق تمام چھوٹی بڑی معلومات پہنچا دی گئی ہیں۔ تمہاری تعلیم، خاندان، مشاغل، حالات زندگی اور یہاں تک پہنچنے کی ساری تفصیلات مجھے معلوم ہیں۔ ان ساری معلومات کی روشنی میں، میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ اگر میں تمہیں اپنے ساتھ مل کر کام کرنے کی پیشکش کروں تو تم انکار نہیں کرو گے۔“ وہ بہت رواں انگریزی اور پُراعتماد لہجے میں اس سے مخاطب تھی۔

”آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں؟“ معاذ نے محتاط لہجے میں پوچھا۔

”وہ میں تمہیں بتاتی ہوں لیکن تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے چینی زبان کا جو ادھورا کورس کیا تھا، کیا اس میں سے کچھ

تمہارے ذہن میں ہے؟''

''جی، تھوڑا بہت۔'' اس نے شین یاہی سے نظریں چراتے ہوئے جواب دیا۔ برف زار میں قیام کے عرصے میں اس نے اپنی چینی زبان سے معمولی واقفیت کو کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیا تھا اس لیے اب شرمندہ ہورہا تھا کہ وہ لوگ تو الف سے ے تک اس کے متعلق سب کھنگال کر بیٹھے ہوئے ہیں۔

''ہم تم سے جو کام لینا چاہتے ہیں اس کے لیے تمہیں چین کی ایک مخصوص زبان تھوڑی سی سیکھنا پڑے گی تاکہ کسی قسم کی پیغام رسانی میں افشائے راز کا خدشہ کم سے کم ہو۔''

''میں کوشش کروں گا۔'' اس نے جھجکتے ہوئے جواب دیا۔ کام کی نوعیت سامنے آئے بغیر وہ کسی قسم کا وعدہ کیسے کرسکتا تھا۔

''تم ذہین نوجوان ہو۔ اگرچہ وہ زبان کچھ مشکل ہے لیکن تم سیکھ جاؤ گے وہ بھی بہت جلد۔'' زن نے اس کے اوپر اعتماد کا اظہار کیا۔

''وہ کون سی زبان ہے؟''

''نیوشو...... یہ ایک نہایت قدیم زبان ہے جو چین کے بھی مخصوص حصے میں بولی جاتی تھی، وہ بھی صرف عورتوں کے درمیان۔''

''صرف عورتوں کے درمیان؟'' وہ حیران ہوا۔

''اسے تم ایک طرح کی خفیہ زبان سمجھ لو۔ یہ زبان اُن شادی شدہ خواتین کی سہولت کے لیے ایجاد کی گئی تھی جو شادی ہوکر سسرال چلی جاتی تھیں اور وہاں کے دکھ سکھ بیان کرنے کے لیے کوئی خفیہ ذریعہ چاہتی تھیں۔'' زن نے اسے تھوڑی سی وضاحت دی۔

''اوہ...... مجھے یاد آرہا ہے کہ میں نے اس سلسلے میں سرسری سا کوئی کالم پڑھا تھا۔ اس کالم کے مطابق تو وہ کوئی بہت مشکل زبان ہے جسے آج کل زندہ کرنے اور سیکھنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ میرے خیال میں ایسی صورت میں وہ زبان خفیہ پیغام رسانی کے لیے مفید ثابت نہیں ہوگی۔ دنیا کا کوئی نہ کوئی ماہر اسے ڈی کوڈ کرلے گا۔''

''یہ باتیں ہمارے بھی ذہن میں ہیں اور اس پر ہمارے ماہرین نے کام بھی کیا ہے۔ تم چونکہ اس زبان کے بارے میں جانتے ہو تو یہ بھی جانتے ہوگے کہ یہ عام بول چال کی زبان نہیں ہے۔ یہ صرف تحریری شکل میں علامات کے طور پر لکھی جاتی ہے۔ ہمارے ماہرین نے ان علامات کو نسبتاً آسان بنادیا ہے۔ یوں بھی تم لوگوں کو بس چند سوئی سوئی باتیں سیکھنا ہوں گی۔''

''مطلب میرے ساتھیوں کو بھی......؟''

''یہ ضروری ہے۔ اس کے بغیر آپس میں یا ہم سے محفوظ رابطہ ممکن نہیں ہو پائے گا۔'' زن نے تصدیق کی۔

''اوکے۔ سمجھیں کہ ہم نے زبان سیکھ لی...... پھر اس کے بعد؟''

''اس کے بعد تم اسرائیل جاؤ گے۔'' زن نے اس کے سر پر دھماکا کیا۔

''کس لیے؟'' اس کی زبان سے سوال پھسلا۔

''کیا تم نہیں جانا چاہتے؟ میرے خیال میں تو یہ تمہاری حب الوطنی کا بھی تقاضا ہے اور مسائل کا واحد حل بھی۔'' زن نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہ صرف اس سے جوابی سوال کیا بلکہ جتایا کہ یہ تو خود اس کی اپنی ضرورت ہے۔

''اوکے۔ میں مانتا ہوں کہ آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ اب یہ بتایئے کہ ہمیں وہاں کیا کرنا ہوگا اور ہم وہاں کیسے جائیں گے کیونکہ پاکستانی پاسپورٹ پر تو وہاں جانا کسی صورت ممکن نہیں ہے۔''

''سارے انتظامات ہمارے ذمے ہیں۔ تم بس ہمارا پلان سنو اور فیصلہ کرو کہ کیا تم اور تمہارے ساتھی خود کو خطرے میں جھونکنے کے لیے تیار ہو؟'' وہ اسے سمجھانے لگی زن کا منصوبہ کیا ہے۔

''اس پر کام ہوسکتا ہے لیکن اس کے لیے سونیا سب سے بہترین ساتھی ثابت ہوگی۔ وہ اس علاقے سے تعلق رکھتی ہے اور وہاں کے سارے مسائل کو بہتر طور پر ہینڈل کرسکتی ہے۔ عمومی طور پر بھی دیکھا جائے تو عورت کی موجودگی کسی کو شک کی زد سے دور رکھنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔''

''وہ ہماری قومی مجرم ہے اور بہت ممکن ہے کہ اس کے لیے اس مہینے کے آخر تک کسی سخت سزا کا اعلان کردیا جائے۔'' زن کے چہرے کے تاثرات سونیا کے ذکر پر سخت ہوگئے۔ شین یاہی جو لبوں کو آپس میں پیوست کیے اب تک بالکل خاموش بیٹھا رہا تھا، اس موقع پر حرکت میں آیا اور جگ میں سے پانی انڈیل کر زن کے سامنے رکھا۔ وہ ایک سانس میں سارا پانی پی گئی۔

''کیا میں سونیا کے جرم کی نوعیت پوچھ سکتا ہوں؟''

''برسوں پہلے وہ یہاں ہونے والے ایک بم بلاسٹ کی ذمے دار ہے۔ اس نے اور اس کی ٹیم نے ایک ایسے

ہوٹل میں جہاں بڑی تعداد میں غیر ملکی سیاح ٹھہرے ہوئے تھے، بم نصب کیا تھا۔ ہمارے ایک بہادر نوجوان کی قربانی سے ہم بڑے نقصان سے تو محفوظ رہے لیکن وہ نوجوان اپنی جان سے چلا گیا۔'' اس بار جواب دینے کی ذمے داری شمین یاہی نے نبھائی۔ وہ زن ہو کی طرح روانی سے انگریزی نہیں بولتا تھا لیکن اتنی استعداد ضرور تھی کہ اپنی بات بیان کر سکے۔

''وہ جوان، مادام زن ہو کا بیٹا تھا۔'' شمین کے بتانے پر اس نے بے ساختہ زن ہو کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

''کیا یہ بات کنفرم ہے کہ سونیا ہی ذمے دار تھی؟'' اس نے دھیرے سے پوچھا۔

''ہوٹل کے سی سی ٹی وی کیمرے نے اس کا عکس محفوظ کر لیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ ہمارے پاس فنگر پرنٹس کے نمونے بھی موجود ہیں۔ سونیا خود اعتراف بھی کر چکی ہے کہ وہ اس کام میں ملوث تھی۔'' شمین یاہی کی بیان کردہ تفصیل سن کر وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا پھر گلا کھنکھار کر بولنا شروع ہوا۔

''میں جانتا ہوں کہ ایسے کسی مجرم کو رعایت دینا مشکل ہوتا ہے لیکن اپنی ضرورت اور اس کے حالات کو دیکھتے ہوئے آپ اس کے لیے رعایت کی گنجائش نکال سکتے ہیں۔ وہ بے شک مجرم ہے لیکن ایسی مجرم جسے اس کی مرضی کے خلاف ایسی عمر میں جرم کی تربیت دی گئی جب وہ کسی احتجاج یا مزاحمت کے لائق نہیں تھی۔ اس نے بچپن سے لے کر اب تک بہت تکلیف اور جبر میں زندگی گزاری ہے۔ آپ نے مجھے بتایا کہ یہ حادثہ برسوں پہلے پیش آیا تھا۔ یقیناً اس وقت سونیا بہت کم عمر ہو گی اور اسے زبردستی اس کام میں ملوث کیا گیا ہو گا۔ اس کے اس وقت کے جرم کی سزا آج ایسے وقت میں دینا جبکہ وہ ان لوگوں سے منحرف ہو چکی ہے اور ہمارے لیے بہت کارآمد ثابت ہو سکتی ہے، کوئی عقلمندانہ فیصلہ نہیں ہو گا۔''

''ہم مجرموں کو معاف کرنے کے قائل نہیں ہیں۔ اگر مجرموں کو رعایت دی جائے تو جرم کا سلسلہ کبھی نہیں رکتا۔'' شمین یاہی نے سپاٹ لہجے میں اسے صاف انکار پکڑا دیا۔

''تو آپ مجھے سونیا کا متبادل عنایت کر دیں۔ اس کے جیسی بہادر، پھرتیلی، باصلاحیت اور سب سے بڑھ کر اسرائیل سے واقف کوئی اور خاتون اگر آپ کے پاس ہے تو ٹھیک ہے، میں اس مشن پر اسے اپنے ساتھ لے جاتا ہوں ورنہ دوسری صورت میں مجھے اس مشن پر جانے سے ہی انکار ہے۔'' اس نے دوٹوک الفاظ میں اپنا فیصلہ سنایا تو کمرے کی فضا میں سناٹا سا چھا گیا۔

''ہم اس پر غور کریں گے۔'' آخر کار کچھ دیر بعد زن ہو نے لب کشائی کی۔

''لیکن مادام......!'' شمین یاہی نے اعتراض کرنا چاہا۔ زن نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا۔

''مسٹر معاذ کی بات معقول ہے شمین! ہمیں کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے سونیا کے حالات پر غور کرنا چاہیے اور یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ اب اس کا کردار کیا ہے۔''

''ہو سکتا ہے وہ ہم سب کو دھوکا دینے کی کوشش کر رہی ہو۔''

''کیا ہم کسی کے جھوٹ اور فریب کو پرکھنے کی صلاحیت سے محروم ہیں؟ میں نے معاذ سے اس معاملے پر غور کرنے کا وعدہ اسی بنیاد پر کیا ہے کہ ہم سونیا کے سچ اور جھوٹ کو پرکھنے کے بعد کوئی فیصلہ کریں۔'' زن نے شمین کے سارے اعتراض دور کر دیے پھر معاذ کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولی۔

''میرے بیٹے نے انسانی زندگیوں اور اپنے ملک کے عزت و وقار کو بچانے کے لیے اپنی زندگی کی قربانی دی تھی۔ اگر سونیا ہماری جانچ میں کامیاب ہو گئی تو میں بھی انہی وجوہات کی بنیاد پر اسے اپنے بیٹے کا خون معاف کر دوں گی۔''

''بہت شکریہ مادام کہ آپ نے میری بات سمجھی۔ میں آپ پر واضح کرنا چاہتا ہوں کہ ذاتی حیثیت میں مجھے سونیا کی زندگی بچانے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے لیکن ایک تو میں حتی الامکان لوگوں کو رعایت دینے کا قائل ہوں دوسرے سونیا کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے اس لیے میں آپ سے اس کی سفارش کر رہا ہوں۔''

''میں تمہاری بات سمجھ گئی ہوں اس لیے مزید صفائی دینے کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے پُروقار لہجے میں جواب دیا پھر کھڑے ہو کر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولی۔

''امید ہے ہماری دوسری ملاقات جلد ہو گی۔ اس عرصے میں تم اور تمہارے ساتھی پوری محنت سے وہ اشاراتی زبان سیکھتے رہو جو آگے چل کر تمہارے بہت کام آنے والی ہے۔''

''آپ بے فکر رہیں۔ ہم پوری کوشش کریں گے۔'' معاذ جو خود بھی اپنی جگہ چھوڑ کر کھڑا ہو چکا تھا، اس سے مصافحہ کرتے ہوئے گرمجوشی سے بولا۔ زن ہو اباری سا مسکرائی اور پھر پُروقار قدم اٹھاتے ہوئے باہر نکل گئی۔

''ڈاکٹر یوان منگ اپنے دفتر میں تم سے ملاقات کے

منتظر ہیں۔ میں یوسف سے کہتا ہوں کہ تمہیں وہاں پہنچا دے۔''

''ڈاکٹر یوان منگ..... مطلب یوان منگ ڈاکٹر ہے؟'' بوڑھے طبیب کے لیے ڈاکٹر کا لفظ اسے چونکا گیا۔

''کوئی عام ڈاکٹر نہیں بلکہ ٹاپ کے نیورو سرجن تھا۔'' شین نے اس کی حیرت سے لطف اٹھایا۔

''حیرت انگیز۔ میں حیران ہوں کہ ایک نیورو سرجن اس برف زار میں بھکشوؤں کے ساتھ کیا کر رہا تھا اور ڈگری ہولڈر ہوتے ہوئے کیوں قدیم اطباء کا طریقہ علاج اپنا رکھا تھا۔''

''تمہارے سارے سوالوں کے جواب وہ خود دے سکتے ہیں۔ بہتر ہے تم ان سے ملاقات کر لو۔'' شین نے اندر داخل ہوتے یوسف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ شاید اسے زن نے اندر بھیجا تھا۔

''کیوں نہیں۔ مجھے تو ہر صورت ہی ان سے ملاقات کرنا ہے۔'' اس کی نظروں کے سامنے تجل کی تصویر لہرائی۔

یوان منگ سے جب وہ کام تو تجل کی طبیعت سے متعلق معلومات حاصل کرنے کا ہی تھا۔ شین سے رخصت ہو کر وہ یوسف کی راہنمائی میں اس منزل کے ایک دفتر میں جا پہنچا۔

بوڑھے طبیب نے ایک مشفقانہ مسکراہٹ کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔ آج وہ نارنجی رنگ کے بھکشوؤں والے لبادے کے بجائے تھری پیس سوٹ میں ملبوس تھا اور اس کی میز پر وہی روایتی سامان رکھا تھا جو کسی ڈاکٹر کے آگے رکھی میز پر پایا جاتا ہے۔

''تو یہ ہے آپ کی اصلیت۔'' معاذ نے گردن گھما کر پورے کمرے کو دیکھا۔ دیواروں پر انسانی دماغ کی مختلف انداز کی تصویریں آویزاں تھیں۔

''جو پہلے دیکھ چکے ہو، وہ بھی نقلی نہیں تھا بس یہ کہہ سکتے ہو کہ وہ میری زندگی کا ایک رخ تھا اور یہاں تم دوسرا رخ دیکھ رہے ہو۔''

''لیکن کیوں؟ آپ اپنی اچھی بھلی زندگی چھوڑ کر ویرانوں میں کیوں بھٹکتے پھرتے ہیں؟''

''اپنے علم میں اضافے اور انسانیت کی فلاح کے لیے۔ مجھے ابتدا ہی سے طب کے شعبے سے دلچسپی تھی چنانچہ اس شوق کی تکمیل کے لیے میں میڈیکل کی فیلڈ میں آ گیا اور اتنی محنت کی کہ ملک کے چوٹی کے نیورو سرجنز میں شمار ہونے لگا لیکن اس سب کے باوجود میری قدیم طب سے دلچسپی ختم نہیں ہوئی۔ میں جب اور جہاں سے ممکن ہوا، اس علم کو بھی حاصل کرتا رہا۔ سرکاری ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد فرصت میں اضافہ ہوا تو تحقیقی کام پر مکمل توجہ دی اور آج میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے بڑی بڑی میڈیکل یونیورسٹیز سے وہ علم حاصل نہیں کیا جو مجھے اپنی اس تحقیق سے حاصل ہوا ہے۔'' یوان منگ نے ایک ہی بار میں اس کی ساری الجھن دور کر دی۔

''بہت خوب۔ یعنی میں امید رکھ سکتا ہوں کہ آپ کا یہ دو آتشہ علم تجل کے لیے مفید ثابت ہوا ہوگا اور وہ روبہ صحت ہوگی۔''

''انسانی علم تقدیر پر کبھی حاوی نہیں ہو سکتا۔ جس جگہ آ کر دنیا کے قابل ترین لوگ بے بس ہو جاتے ہیں، وہاں اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ کوئی ہے جو انسانوں کی تقدیر لکھتا ہے اور اس تقدیر کو بدلنے کی طاقت کسی انسان میں نہیں ہوتی۔'' وہ معاذ کی بات سن کر سنجیدہ اور اداس سا ہو گیا۔

''آپ کا مطلب ہے تجل......؟'' معاذ کا دل بری طرح سکڑا۔

''مجھے افسوس ہے کہ اس کے متعلق میرا اندیشہ درست ثابت ہوا۔ اسے تھرڈ اسٹیج برین ٹیومر ہے۔'' یوان نے اس کے سر پر بم پھوڑ دیا۔

''علاج......؟ اب تو میڈیکل سائنس بہت ترقی کر چکی ہے۔ کیا سرجری کر کے اس کا ٹیومر ریموو نہیں کیا جا سکتا؟'' وہ امید و بیم کی کیفیت میں تھا۔

''ٹیومر بہت بڑا اور خطرناک پوزیشن میں ہے۔ ہم نے سرجری کر کے اسے نکالنے کی کوشش کی تو فوری موت بھی واقع ہو سکتی ہے۔ کم سے کم نقصان بھی ہمیشہ کی معذوری کی صورت میں سامنے آئے گا۔'' یوان کے جواب نے اس کی ساری امیدیں توڑ دیں اور وہ سن سا بیٹھا اس کی شکل دیکھتا رہا۔

''مجھے معلوم ہے کہ تمہارے لیے یہ بہت تکلیف دہ ہے لیکن اس وقت صرف تم لوگوں کے ہمت اور حوصلے ہی کی ضرورت ہے۔ میں نے اس کے بھائی کو بھی یہ بات سمجھائی ہے اور تمہیں بھی سمجھا رہا ہوں کہ اگر تم لوگ حوصلے سے کام لو گے تو ہی وہ اس تکلیف سے گزر سکے گی۔ اس کے سامنے ہمتیں ہار جانے کا مطلب ہوگا، اسے وقت سے پہلے مار دینا۔ جیتے جی اپنے پیاروں کی آنکھوں میں اپنی موت دیکھنا بہت تکلیف دہ ہوتا ہے معاذ! میری تم سے درخواست ہے کہ اسے اس ٹیومر کی تکلیف سے ہی گزرنے دو۔ کسی اور تکلیف میں مبتلا نہ کرو۔'' یوان وہ شخص تھا جو بہت پہلے ہی تجل کے لیے اس کے دلی جذبات کو بھانپ گیا تھا اس لیے اس وقت بہت شفقت سے اسے سمجھا رہا تھا۔

"کیا کسی اور ڈاکٹر سے رائے لی جاسکتی ہے؟ شاید دنیا میں کہیں کسی دوسری جگہ اس کا علاج ممکن ہو۔"

"تم اپنی تسلی کے لیے جسے دکھانا چاہتے ہو، دکھالو۔ میں ذاتی طور پر اپنے شعبے کے ہر ماہر ڈاکٹر سے دنیا میں رابطہ کرچکا ہوں۔ کنول کی رپورٹس انہیں میل کرکے میں نے ان کی جو رائے حاصل کی، اس کا خلاصہ وہی ہے جو میں تمہیں پہلے ہی بتاچکا ہوں۔ سچ یہی ہے کہ ہم اسے نہیں بچاسکتے۔ ہم صرف اس کی تکلیف کی شدت کو کم کرسکتے ہیں اور جہاں تک ممکن ہو اسے خوش رکھ کر اس کے آخری وقت کو اچھا بناسکتے ہیں۔" یوان اسے سمجھا رہا تھا لیکن اس کی زبان سے نکلتے آخری وقت کے الفاظ نے معاذ کے دل پر ایک گھونسا سا مارا تھا۔

"میں فوری طور پر اس سے ملنا چاہتا ہوں۔" وہ اپنی سرخ ہوتی آنکھوں کے ساتھ یکدم نشست چھوڑ کر کھڑا ہوگیا۔ یوان نے اس پر ایک تاسف بھری نظر ڈالی اور رسان سے بولا۔

"ٹھیک ہے۔ میں یوسف سے کہہ دیتا ہوں۔ وہ تمہیں لے جائے گا لیکن پلیز وہاں میری باتوں کو یاد رکھنا۔"

"میں خیال رکھوں گا۔" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ سچ تو یہ تھا کہ اس وقت وہ کسی چھوٹے بچے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہتا تھا لیکن اپنے مرد ہونے کا بھرم رکھنے کی بھی مجبوری تھی۔

یوان نے اسے شانے پر ایک حوصلہ افزا تھپکی دیتے ہوئے یوسف کے ساتھ اسپتال کے لیے روانہ کیا۔ بیجنگ جو چند گھنٹے قبل اسے بہت متاثر کن لگ رہا تھا، اب کھلی آنکھوں کے باوجود دکھائی نہ دے رہا تھا کہ آنکھوں کے آگے تو وہی چہرہ تھا جسے اس نے پہلی بار حنائی چادر کے پلو کے پیچھے چھپا رکھا تھا اور جب وہ پلو ذرا کی ذرا اس کے رخ سے ہٹا تھا تو اس کے سینے میں دھڑکتے دل کی ہر دھڑکن میں کنول کا نام لکھا جاچکا تھا۔ وہ دولت حسن پر کسی دربان کی طرح پہرا دیتے سپاہی کی کوشش سے بھی خود کو آزاد نہیں کرواسکا تھا۔ آزاد کروانا بھی نہیں چاہتا تھا کہ اس اسیری میں بڑا سرور تھا۔

یوسف اسے بیجنگ کے جس جدید ترین اسپتال میں لے کر گیا، وہ یقیناً بہت شاندار تھا لیکن اس کی ذہنی کیفیت ایسی تھی کہ وہ اردگرد کے ماحول سے بالکل کٹ چکا تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ اس کے سارے حواس کام کرنا چھوڑ چکے ہیں اور وہ صرف ایک روبوٹ ہے جو اپنے اندر فیڈ کیے پروگرام کے مطابق بنا سوچے سمجھے عمل کیے جاتا ہے۔

"آپ اندر جاکر ملاقات کریں۔ میں باہر ہی آپ کا انتظار کروں گا۔" تیسری منزل کے ایک ایسے دروازے کے سامنے رک کر جس کے آگے باوردی گارڈ بیٹھا ہوا تھا، یوسف نے اس سے کہا۔ یقیناً یوسف گارڈ کے لیے جانا پہچانا فرد تھا اس لیے اس نے کسی قسم کا تعرض نہیں کیا لیکن اندر داخلے سے پہلے اس کے متعلق ضروری معلومات حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اسکینرز کی مدد سے اس کے فنگر پرنٹس لینے میں کسی تساہل سے کام نہ لیا۔

دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی اس کی نظر سب سے پہلے عالم شاہ پر پڑی۔ وہ جائے نماز پر بیٹھا ہوا تھا اور اس کے ہاتھ دعا کے لیے اٹھے ہوئے تھے۔ وہ بے آواز لبوں سے اپنے رب کے حضور دعا گو تھا لیکن اس کی بند آنکھوں سے نکل کر رخساروں پر بہتے آنسو صاف بتارہے تھے کہ وہ اپنے رب سے کیا مانگ رہا ہے۔ معاذ اس کے خشوع و خضوع میں دخیل ہوئے بغیر خاموشی سے وہاں رکھے صوفہ کم بیڈ پر ٹک گیا۔ کمرہ زیادہ بڑا نہیں تھا لیکن وہاں ضرورت کی تمام اہم اشیا موجود تھیں۔ جس صوفہ کم بیڈ پر وہ بیٹھا تھا، وہ یقیناً سونے اور آرام کرنے کے لیے عالم شاہ کے زیر استعمال رہتا تھا۔ اس صوفے کے علاوہ وہاں دو کرسیاں مزید موجود تھیں جن کے آگے شیشے کی ایک چھوٹی سی میز رکھی ہوئی تھی۔ ایک دیوار کے ساتھ سامان رکھنے کا چھوٹا سا ایک اور روم ریفریجریٹر موجود تھا۔ دیوار میں دو دروازے نظر آرہے تھے۔ ایک کا دروازہ مکمل بند تھا جس کے بارے میں اس کا قیاس تھا کہ وہ متصل غسل خانہ ہوگا جبکہ دوسرا دروازہ جو کہ نیم وا تھا، اس سے وہ مریضوں کے مخصوص بستر کا ایک پایہ دیکھ سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا اس بستر پر وہ عورت اپنی زندگی کے دن پورے کررہی تھی جس کا نام لے کر اس کا دل دھڑکتا تھا لیکن اس کا تصور اسے یہ منظر دکھانے کو تیار نہیں تھا۔ وہ جو دور رہ کر بھی اسے اپنے خواب و خیال میں واضح دکھائی دیتی تھی، اب چند فٹ کے فاصلے پر ہوتے ہوئے بھی تصور سے باہر تھی۔

"معاذ!" وہ نیم وا دروازے سے نظر آتے مختصر سے منظر میں ایسا کھویا تھا کہ عالم شاہ کی طرف سے بے خبر ہوگیا تھا۔ اس نے دعا سے فارغ ہونے کے بعد اسے وہاں بیٹھے دیکھا تو تیزی سے اس کی طرف آیا اور اسے پکارا۔ وہ عالم کی پکار پر متوجہ ہوا اور ایک جھٹکے سے کھڑا ہوگیا۔ اگلے ہی لمحے وہ دونوں ایک دوسرے سے بغل گیر ہوچکے تھے۔ یہ ملاقات دو دوستوں کی عام ملاقات نہیں تھی۔ یہ دو ایسے مردوں کی ملاقات تھی جو موت کے شکنجے میں کسی اس عورت سے بے

پناہ محبت کرتے تھے جو فی الحال تو ان سے چند فٹ کے فاصلے پر موجود تھی لیکن اس کا دور دیس جانا طے پا چکا تھا۔

ان دونوں مردوں میں اگر کوئی فرق تھا تو وہ یہ تھا کہ ان میں سے ایک کے پاس محرم رشتہ ہونے کا مان تھا اور اس مان کے سہارے وہ کھل کر اپنے غم کا اظہار کر سکتا تھا جبکہ دوسرا صرف دل کے رشتے سے بندھا تھا۔ دل کا رشتہ جو دنیا کا سب سے گہرا رشتہ ہوتا ہے لیکن اس رشتے کی کوئی شرعی و سماجی حیثیت نہیں ہوتی۔ اس رشتے سے بندھے لوگ تنہائی میں تو گریہ و ماتم کر سکتے ہیں لیکن ان کے پاس سب کے سامنے کھل کر اپنے غم کو رونے کی گنجائش نہیں ہوتی۔

عالم بھی بھائی ہونے کے ناتے کھل کر رو رہا تھا۔ اس کے رونے میں اتنی شدت تھی کہ باقاعدہ ہچکیاں بندھ گئی تھیں اور بدن پر لرزہ سا طاری ہو گیا تھا۔ ضبط کی کوشش کے باوجود معاذ کی آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔ غم سے جلتی آنکھوں کے لیے یہ نمی ایسی ہی تھی جیسے تپتے توے پر پانی کی چند بوندیں۔ ان چند بوندوں نے تڑپتے ہوئے دل کو ہلکا کیا کرنا تھا، الٹا سینے میں دھواں سا بھر گیا اور اسے سانس لینا مشکل ہونے لگا۔

"حوصلے سے کام لو عالم! تم یوں حوصلہ کھو بیٹھو گے تو تحمل کو کون سنبھالے گا۔ اسے اس تکلیف دہ دور سے گزرنے کے لیے تمہارے حوصلے اور ہمت کی ضرورت ہے۔" اسے خود تسلی و دلاسے کی ضرورت تھی لیکن جانتا تھا کہ اس کے پاس یہ حق موجود نہیں ہے اس لیے اپنی تمام تر ہمت کو مجتمع کر کے عالم کو سمجھانے لگا۔

"میں بابا سائیں اور اماں سائیں کو کیا جواب دوں گا معاذ! میں کیسے ان کے سامنے یہ حقیقت تسلیم کروں گا کہ میں بھائی ہونے کا حق ادا نہ کر سکا اور میری کمزور و نازک سی بہن مجھ پر اپنا آپ قربان کر گئی۔" ڈاکٹرز کا خیال تھا کہ ٹیومر عرصے سے خاموشی کے ساتھ تحمل کے دماغ میں موجود تھا لیکن پچھلے کچھ عرصے میں اس کی بہت تیزی سے گروتھ ہوئی تھی اور اس نے اپنی موجودگی کا احساس دلانا شروع کر دیا تھا۔ شاید فیصل کے ساتھ بیتے ذہنی و جسمانی تکلیف کے دن اس کے مرض کو بڑھانے کا محرک بنے تھے۔ وجہ کیا تھی، حتمی طور پر کچھ بھی کہنا مشکل تھا لیکن عالم شاہ کو رہ رہ کر یہی خیال آتا تھا کہ اگر تحمل اس کے تحفظ کی خاطر فیصل سے نکاح کے فیصلے کو قبول نہ کرتی تو کچھ اور ہوتا یا نہ ہوتا اس کی زندگی کی بساط اتنی تیزی سے لپٹنا شروع نہ ہوتی۔

"خود پر اس طرح بوجھ نہ لادو۔ انسان تقدیر کو بدلنے پر قادر نہیں۔ تحمل کے نصیب میں یہ موذی مرض لکھا تھا سو ہو کر رہا۔ تم، تمہارے ماں باپ یا کوئی بھی دوسرا چاہنے والا اس کی قسمت کے اس فیصلے کو بدل نہیں سکتا تھا۔" عالم شاہ سے تسلی کے یہ کلمات کہتے ہوئے اس کا اپنا دل غم سے پھٹ رہا تھا۔

"آؤ، یہاں بیٹھو۔" اس نے عالم کا ہاتھ پکڑ کر اسے صوفے پر بٹھایا اور میز پر پڑے ٹشو پیپر کے ڈبے سے کچھ ٹشوز کھینچ کر اس کے حوالے کیے۔ وہ اپنے بھیگے رخسار اور ناک وغیرہ صاف کرنے لگا لیکن حالت ابھی تک سنبھلی نہیں تھی۔ رہ رہ کر آنکھوں سے آنسو امڈ آتے تھے۔

"اس بدبخت نے بڑا ظلم کیا میری معصوم بہن پر۔ لوگ سمجھتے ہیں ہم زمینداروں کے ہاں عورتوں پر بہت سختی ہوتی ہے، ان پر زندگی کی ہر نعمت اور خوشی حرام کر دی جاتی ہے لیکن میں تمہیں بتاؤں کہ بابا سائیں نے اپنی دونوں بیٹیوں کو بہت پیار سے پالا۔ انہیں ہمیشہ بہت مان اور عزت دی۔ ہاتھ اٹھانا تو دور کی بات، کبھی تیز آواز میں بھی شاید ہی بات کی ہو اور اس ظالم نے میری نازو پلی بہن پر باقاعدہ تشدد کیا۔ مار مار کر اس کی اتنی بری حالت کر دی کہ اسے اسپتال میں داخل کروانے کی نوبت آ گئی۔ تم اگر اسے اسپتال سے نکال کر محفوظ مقام پر نہ رکھتے تو شاید اب تک وہ مر کھپ چکی ہوتی۔" وہ اپنے ہی نہیں، اس کے زخموں کو بھی کرید رہا تھا۔

"مجھ سے ہی دیر ہو گئی۔ کاش کہ میں پہلے ہی کچھ کر گزرا ہوتا۔" وہ سارا عرصہ اس کی یادداشت میں بالکل تازہ تھا جب بہت کوششوں کے بعد وہ تحمل کی جٹھانی ڈاکٹر فردوس تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکا تھا۔ نیک فطرت فردوس نے اپنی بساط سے بڑھ کر تحمل کا ساتھ دیا تھا لیکن اس جرم کی پاداش میں اپنی زندگی کھو چکی تھی۔ اس بے چاری کی اپنی تین عدد بیٹیاں تھیں جن کا معلوم نہیں ماں کے بعد کوئی پرسان حال تھا بھی یا نہیں۔

"تم نے جو کچھ کیا، وہ بھی بہت زیادہ تھا۔ ایک ایسے شخص سے دوستی کا حق ادا کیا تم نے جو تمہاری مصیبت کے وقت میں بابا کی ایموشنل بلیک میلنگ کی وجہ سے پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اس وقت کے لیے میں نے خود پر سیکڑوں بار لعنت بھیجی ہے پھر بھی خود کو معاف نہیں کر پایا۔"

"ان باتوں کو جانے دو۔ ان کا کوئی فائدہ نہیں ہے اور نہ ہی مجھے تم سے کوئی شکوہ ہے۔ میں حالات کے جس گرداب میں پھنسا تھا، تم چاہ کر بھی میرے لیے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔" اس نے عالم کو تسلی دی پھر ذرا سا توقف

کر کے بولا۔

"اصل اہمیت اس بات کی ہے کہ اب ہم گل کے لیے کیا کر سکتے ہیں؟ ڈاکٹری رائے جو بھی ہے، ہم یوں ہاتھ پر ہاتھ دھر کر اس کے مرنے کے انتظار میں تو نہیں بیٹھ سکتے۔" ہزار احتیاط کے باوجود وہ خود کو جذباتی ہونے سے نہیں روک سکا تھا۔

"میڈیکلی شاید ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ یوان نے دنیا بھر کے ڈاکٹرز سے رائے لیتے ہوئے مجھے بھی اعتماد میں لیا تھا۔ یوں سمجھو کہ میں اس پورے پروسس میں اس کے ساتھ ساتھ رہا ہوں اور سچ یہی ہے کہ ہمیں کہیں سے امید کی کوئی کرن نہیں دکھائی دی۔" عالم شاہ نے اس کی ہر امید توڑ دی ورنہ یوان سے سب کچھ جاننے کے بعد بھی اس کے ذہن کے کسی نہ کسی گوشے میں یہ بات موجود تھی کہ دنیا کے کسی ڈاکٹر کے پاس تو گل کے مرض کا علاج ہوگا۔

"اس وقت گل کے لیے سب سے زیادہ اہم یہ ہے کہ اس کے پیارے اس کے قریب موجود ہوں۔ وہ بابا سائیں، اماں اور سعدل کو بہت یاد کرتی ہے۔ سب سے بڑھ کر اعظم کی جدائی اسے مار رہی ہے۔ کسی تسلی اور دلاسے سے اسے کوئی فرق نہیں پڑ رہا ہے۔"

"پر بھی نہیں سکتا۔ اعظم تو پھر چھوٹا سا بچہ ہے۔ جن ماؤں کے بچے جوان ہو کر اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جاتے ہیں، وہ بھی ان کی جدائی نہیں سہہ پاتیں اور ان کے غم میں ہوش و حواس کھو بیٹھتی ہیں۔" اسے اپنی والدہ سعیدہ بیگم کا خیال آ گیا۔ انہوں نے زندگی کا وہ بدترین وقت دیکھا تھا جب وہ اور سعد دونوں ہی میڈم ایکس کی قید میں تھے اور وہ اس وقت کی سختی سے اس حال کو پہنچ گئی تھیں کہ پھر بات ان کی زندگی کے اختتام پر ہی ختم ہوئی تھی۔

"میں جانتا ہوں کہ اعظم کو واپس لانا اتنا آسان کام نہیں ہے لیکن باقی لوگوں کو تو کم از کم گل سے ملوایا جا سکتا ہے لیکن اس معاملے میں یہاں کوئی میرا ساتھ نہیں دے رہا۔ یہاں تک کہ ابھی تک بابا سائیں کو ہمارے زندہ ہونے کی اطلاع بھی نہیں دی گئی ہے۔ جب بھی پاکستان میں بابا سائیں سے بات کرنے کی درخواست کروں، یہی جواب ملتا ہے کہ سکیورٹی ایشوز کھڑے ہو جائیں گے۔" عالم شاہ کے لہجے میں شکوہ تھا۔

"تم فکر نہ کرو، میں بات کرتا ہوں کسی سے۔" معاذ نے دھیمے لہجے میں اسے تسلی دی لیکن اندر ہی اندر اس کا مزاج برہم ہو رہا تھا۔ سکیورٹی کے نام پر ان کی آزادی سلب کر لی گئی تھی۔

"جتنی جلدی ہو سکے اگر لیتا۔ میں چاہتا ہوں کہ میری بہن کی زندگی کے جتنے دن باقی رہ گئے ہیں، وہ سکھ میں گزریں۔" عالم کی آنکھوں میں ایک بار پھر آنسو چمکے۔

"میں نے کہا ہے نا کہ فکر نہ کرو۔ نہ صرف تمہارے گھر والے بلکہ اللہ نے چاہا تو اعظم بھی گل کی نظروں کے سامنے ہوگا۔" اس نے عالم کو تسلی دی تو اس نے آستین سے اپنی آنکھیں صاف کیں اور مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

"جب سے آئے ہو، میں بس اپنی ہی بولے جا رہا ہوں۔ تم سے تو پوچھا ہی نہیں کہ ہمارے یہاں آنے کے بعد تم لوگوں کے ساتھ کیا بیتی؟"

"کبھی فرصت میں سناؤں گا۔ داستان طویل ہے لیکن سب سے اچھی بات یہ ہے کہ ہم سب بخیریت یہاں پہنچ گئے ہیں۔"

"باقی لوگ کہاں ہیں؟"

"چارہ اور روگی تو میرے ہی ساتھ ٹھہرے ہوئے ہیں البتہ گل خان کو علاج کے لیے دوسری جگہ پر رکھا گیا ہے۔"

"گل خان کو کیا ہوا؟" عالم نے تشویش سے پوچھا۔

"اس کے دماغ کے ساتھ کھیلا گیا ہے۔ وہ ٹرانس میں ہے اور یہاں دواؤں اور تھراپی کے ذریعے اس کا علاج کیا جا رہا ہے۔" اس نے افسردگی سے بتایا۔

گل خان کے معاملے کو اس نے خود حل کرنے کی کوشش کرنے کے بجائے ڈاکٹروں کے حوالے کر دینا زیادہ مناسب سمجھا تھا۔ ایک طرف مسلسل کئی دن برف زار کے قیام اور وہاں پیش آنے والے واقعات نے اسے ذہنی و جسمانی طور پر تھکا دیا تھا تو دوسری طرف وہ کھلے عام اپنی ہپناٹزم کی صلاحیت کو استعمال کر کے دوسروں کو چونکانا نہیں چاہتا تھا۔ ایک صرف یوان تھا جو اپنی بے پناہ روحانی صلاحیتوں کی وجہ سے اس کے بارے میں بہت کچھ جان گیا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ علم والوں کا ظرف بھی بڑا ہوتا ہے۔ یوان کسی کے سامنے اس کا راز افشا نہ کرے گا۔

"اللہ اسے جلد از جلد صحت دے۔ بہت سادہ اور مخلص انسان ہے اور تم سے تو بے تحاشا محبت کرتا ہے۔"

"اس میں تو کوئی شک نہیں۔ میری خواہش ہے کہ صحت مند ہونے کے بعد اسے اس کی فیملی کے پاس واپس بھیج دوں۔ وہ بیوی بچوں والا آدمی ہے۔ اسے ان کی کفالت کے لیے ان کے پاس ہونا چاہیے۔"

"وہ شاید ہی تمہیں چھوڑ کر جانے پر راضی ہو۔" عالم نے گل خان کی اس کے لیے محبت کے پیش نظر اندازہ لگایا۔

"اگر وہ نہیں گیا تو اس کی فیملی کی کفالت کے لیے کوئی نہ کوئی بندوبست کروانا پڑے گا۔" اس نے تشکر سے جواب دیا پھر ہلکی سی دستک کے ساتھ دروازہ کھلنے پر اس طرف متوجہ ہو گیا۔ ایک نرس کھلے دروازے سے اندر داخل ہوئی۔

"کیا پوزیشن ہے پیشنٹ کی۔ پُرسکون نیند آئی ہے یا نہیں؟" اس نے عالم کی طرف دیکھتے ہوئے اس سے پوچھا۔ وہ انگریزی بول رہی تھی جو بری نہیں تھی لیکن لہجہ زیادہ رواں نہیں تھا۔

"اللہ کا شکر ہے کہ وہ ابھی تک بہت سکون سے سو رہی ہے۔" عالم نے جواب دیا۔

"میں ایک بار چیک کر لیتی ہوں۔" وہ نیم وا دروازے کی طرف بڑھ گئی اور اندر داخل ہونے کے لیے دروازے کو مزید تھوڑا اور کھولا۔ ادھورا منظر کچھ اور واضح ہوا اور بستر پر کمبل اوڑھے لیٹے وجود کی جھلک دکھائی دی۔ اس نے جلدی سے اپنی نظروں کا رخ پھیر لیا اور عالم کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"ڈی اور جارا میرے ساتھ یہاں نہیں آسکے لیکن انہوں نے تمہارے لیے دعائیں اور نیک تمنائیں بھیجی ہیں اور پیغام دیا ہے کہ بہت جلد وہ خود اس کی عیادت کے لیے اسپتال آئیں گے۔"

"میری طرف سے ان کا شکریہ ادا کرنا۔ وہ یہاں آئیں گے تو مجھے اچھا لگے گا اور یقیناً تمہیں کو بھی۔ یہاں مجھے ہر طرح کی سہولت اور آرام میسر ہے لیکن جو سکون کسی اپنے کو دیکھ کر ملتا ہے، اس کی بات ہی الگ ہے۔ یقین جانو، میں خود کو اتنا تنہا محسوس کر رہا تھا جس کی کوئی حد نہیں تھی۔ تمہارے آنے سے مجھے ایک سہارا سا مل گیا ہے اور وہ کندھا بھی جس پر سر رکھ کر میں اپنے آنسو بہا سکوں۔"

"اللہ نے چاہا تو جلد تمہارے اپنے خون کے رشتے تمہارے ساتھ ہوں گے۔" اس نے عالم کا بازو تھپتھپایا۔

"کبھی نسل تمہیں اٹھ جائے تو اس سے مل کر اسے بھی دے دینا۔"

"نہیں، میں اس سے نہیں ملوں گا۔" اس نے اتنی قطعیت سے انکار کیا کہ عالم شاہ حیرت سے اس کی شکل دیکھتا رہ گیا۔

☆☆☆

"لو جی منے میاں! ایک بار پھر ہم فرار کی راہ پر ہیں۔" نیلی نے اعظم کو چومتے ہوئے کہا اور بلاوجہ ہی ہنس دی۔ اسے ہنستے دیکھ کر وہ بھی کھلکھلایا۔

"موصوف کے پیروں میں ابھی سے اتنا چکر ہے۔ لگتا ہے بڑے ہو کر اس نے البیرونی اور ابن بطوطہ کے پائے کا سیاح بننا ہے۔" موتی نے ان دونوں کے ہنستے ہوئے چہروں پر نظر ڈالی اور گفتگو میں حصہ ڈالا۔ حقیقتاً اس وقت وہ اعصابی کشیدگی کا شکار تھے۔ اعظم کو ساتھ لے کر باہر نکلنے کا نتیجہ ہر بار برا نکلا تھا اور ہر بار انہیں انسانی لاشوں کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ لاشیں بھلے مخالفین کی تھیں لیکن ان کے اعصاب کے لیے امتحان ثابت ہوئی تھیں۔ وہ کھیل تماشے کے ذریعے لوگوں کا دل بہلانے اور انہیں سستی تفریح فراہم کرنے والے لوگ تھے۔ ان کے لیے اس طرح گولیوں کی برسات میں سفر کرنا اور انسانوں کی لاشیں گرتے دیکھنا ایک نہایت ناخوشگوار تجربہ تھا۔

"کیا معلوم وزیر خارجہ لگ جائے۔ بچپنے سے کچھ بھی خرچ کیے بغیر سرکاری خرچے پر مزے سے ملکوں ملکوں گھومتا رہے۔" نیلی دور کی کوڑی لائی۔

صورت حال جو بھی تھی، وہ خود بھی اسے ڈسکس نہیں کرنا چاہتے تھے اس لیے ہلکا پھلکا انداز اختیار کر رکھا تھا۔

"خیال تو اچھا ہے۔ ہوسکتا ہے کبھی اپنے دادا کی سیاست کو آگے بڑھائے اور اس میدان میں ان سے زیادہ نام کمائے۔"

"دادا بے چارے تو اپنی شرافت کی وجہ سے مارے گئے ہیں ورنہ یہاں ان سے چھوٹے جاگیردار اور بزنس مین سیاست میں گھس کر بڑے بڑے اژدہے بن گئے ہیں۔" موتی نے اس کی بات پر تبصرہ کرتے ہوئے باہر نظر ڈالی۔ ہر طرف سناٹے اور خاموشی کا راج تھا۔ دور دور تک ان کی اور آگے پیچھے چلتی گارڈز کی گاڑیوں کے سوا کسی گاڑی کا نام و نشان نہیں تھا لیکن دل میں یہ خدشہ مسلسل موجود تھا کہ کہیں بھی کسی لمحے کہیں سے کوئی نمودار ہوگا اور ہتھیاروں کے زور پر اعظم کو ان سے چھیننے کی کوشش کرے گا۔ اگلی نشست پر تن کر بیٹھے نکل کی بھی کچھ ایسی ہی کیفیت تھی۔ ہتھیار پر ہاتھ رکھے وہ کسی عقاب کی طرح اطراف پر نظر رکھے ہوئے تھا۔

"سامنے سے پولیس کی جیپیں آرہی ہیں۔" یکایک اگلی گارڈز کی گاڑی سے اطلاع دی گئی۔

"پولیس.....!" نکل کے ہونٹوں سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی۔ انور سونگی کے فارم ہاؤس سے روانہ ہونے کے بعد سے وہ سب مسلسل کسی بھی بات کے لیے تیار تھے لیکن یوں اس طرح براہ راست پولیس سے سامنا ہو جانے کا تو گمان ہی نہیں تھا۔

''لیے ہاتھ پر لے لو۔'' اسے فوری طور پر یہی حل سجھائی دیا کہ راستہ بدل لے کیونکہ اس بات کو تو وہ بھی سمجھتا تھا کہ اوروں کی طرح پولیس سے براہ راست تصادم نہیں کیا جاسکتا۔

''تم لوگ سیدھے چلتے رہو اور پولیس والوں کو اپنے ساتھ باتوں میں الجھانے کی کوشش کرو۔ اتنے میں ہم یہاں سے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں۔'' اس نے دوسری ہدایت آگے گاڑی والوں کے لیے جاری کی تھی۔ نیلی اور موی دم سادھے اس ساری صورت حال کو دیکھ رہے تھے۔ وہ اس خوش گمانی میں مبتلا نہیں ہوسکتے تھے کہ پولیس والے کسی اور مقصد کے تحت نکلے ہیں اور اتفاقاً ان کے راستے میں آگئے ہیں۔ انور سونگی کے فارم ہاؤس پر جو کچھ ہوا تھا اور جس طرح کے رویے کا اچانک وارد ہونے والے ڈی ایس پی نے مظاہرہ کیا تھا، اس کے بعد اس خوش فہمی کی گنجائش ہی نہیں تھی۔

''پولیس والے راہ میں آگئے ہیں سائیں! ہم راستہ کاٹ کر نکلنے کی کوشش کررہے ہیں۔'' اب وہ قربان شاہ کو اطلاع دے رہا تھا۔

''پوری کوشش کرو کہ براہ راست سامنا نہ ہو۔ اگر نوبت آجائے تو ہتھیار مت نکالنا۔'' انھوں نے ہدایت دی۔

''جو حکم سائیں!'' نگل خود ان معاملات کو سمجھتا تھا اور اسے بھی معلوم تھا کہ اسے قانونی پیچیدگیاں پیدا نہیں کرنا ہیں۔

''پولیس والوں نے ہمیں روکنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ شمال کی طرف نکل گئے ہیں۔'' گارڈز کی اگلی گاڑی سے پھر اطلاع دی گئی تو نگل نے بے ساختہ ہی رخ موڑ کر ان کی طرف دیکھا۔ خود ان کی گاڑی بھی شمال کے رخ جارہی تھی۔

''میں اور نیلی، اعظم کو لے کر گاڑی سے اتر جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر کھیتوں میں چھپے رہیں گے۔ پولیس والے مطمئن ہوکر چلے جائیں تو دوبارہ سوار ہوجائیں گے۔'' موی نے تجویز پیش کی جسے ذرا سے تذبذب کے بعد نگل نے قبول کرلیا اور گاڑی روک کر ان تینوں کو کھیتوں کے پاس اتار دیا۔ پیچھے آنے والی گارڈز کی گاڑی انھیں رکتے دیکھ کر رک گئی تھی۔ نگل نے ہاتھ کے اشارے سے اسے آگے بڑھ جانے کی ہدایت کی۔ دونوں گاڑیاں فراٹے بھرتے ہوئے آگے نکل گئیں۔ جاتے ہوئے ان کا پولیس کی گاڑیوں سے سامنا ہوا لیکن پولیس والوں نے ان سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ نگل کو اچنبھا سا ہوا اور دل میں خیال گزرا کہ پولیس ان کے پیچھے ہے ہی نہیں۔

''لیکن پھر وہ اتنی صبح صبح دو دو گاڑیوں میں کیوں نکلے ہوئے ہیں اور اب اچانک عام روٹ سے ہٹ کر اس طرف کیا کررہے ہیں؟'' فاصلے کے ساتھ ساتھ الجھن بھی بڑھتی جارہی تھی۔ اتفاق سے موڑ بھی جلدی آگیا تھا اور وہ بھی آئینے میں نہ تو ان کھیتوں کو دیکھ سکتا تھا جہاں نیلی اور موی، اعظم کو لے کر اترے تھے اور نہ ہی پولیس کی گاڑیوں کو۔

''بس، واپس لے لو۔'' بے نگل نے اسے زیادہ آگے نہیں جانے دیا۔ ڈرائیور نے اس کے حکم پر فوراً ہی گاڑی روکی لیکن کچے اور تنگ راستے پر اسے تیزی سے واپس موڑنا مشکل تھا۔ گارڈز والی گاڑی کو بھی اسی مشکل سے گزرنا پڑا۔

''ہم لوگ گاؤں سے باہر نکل گئے ہیں۔ اب کیا کریں؟'' اسی وقت پچھلی والی گارڈز کی گاڑی سے رابطہ کرکے پوچھا گیا۔

''وہیں رک کر انتظار کرو۔ ہم بس آرہے ہیں۔'' اس نے جواب دے کر رابطہ منقطع کیا ہی تھا کہ ان کے ساتھ موجود گاڑی جو واپس پلٹتے ہوئے اب ان سے آگے تھی، سے رابطہ کیا گیا۔

''آگے پولیس کی گاڑیاں رکی نظر آرہی ہیں۔ پولیس والے کھیتوں میں گھسے ہوئے ہیں۔'' اطلاع دینے والے کے لہجے میں سراسیمگی تھی۔

''تیز چلاؤ۔'' نگل اسے جواب دینے کے بجائے اپنے ڈرائیور پر چلایا۔ موڑ سے گزرتے ہی جونہی پولیس کی گاڑیوں پر نظر پڑی، اس کے کانوں میں پہلا فائر گونجا۔ اس کے بعد لگاتار تین فائر ہوئے تھے۔ پولیس اور اپنے ساتھی گارڈز کے پیچھے ان کی گاڑی رکی تو فضا پر ایک محسوس ہونے والا سناٹا طاری ہوچکا تھا اور مشرق سے بلند ہوتے سورج کی روشنی میں سرخی سی گھلی ہوئی تھی۔ وہ گن ہاتھ میں لیے بری طرح دھڑکتے دل کے ساتھ گاڑی سے باہر نکلا۔ اگلی گاڑی سے نکلنے والے گارڈز بھی اپنے ہتھیاروں سمیت نیچے اتر چکے تھے لیکن ان کے انداز میں ایک تذبذب سا تھا۔ اس نے سامنے کے منظر پر نظر ڈالی۔

ایک پولیس والا اعظم کو گود میں لیے کھڑا تھا۔ اس کے برابر میں ڈی ایس پی کھڑا اپنے ریوالور کی نال پر یوں پھونکیں مار رہا تھا گویا اس کے سوا اسے کوئی اور کام ہی نہیں ہے اور نہ ہی اسے وہ سب اپنے سامنے کھڑے نظر آرہے ہیں۔ اس کے اس قدر اطمینان اور بے نیازی کے پیچھے اس کے وہ مسلح سپاہی تھے جو گارڈز کی طرف اپنی بندوقیں تانے کھڑے تھے۔ ان مسلح سپاہیوں کے پس منظر میں آج کے

دن کا سب سے خوفناک منظر دکھائی دے رہا تھا۔ دو سپاہی خون میں تر بتر سوئی کو زمین پر گھسیٹتے ہوئے کھیتوں سے باہر لا رہے تھے۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور جسم میں ایسی کوئی جنبش دکھائی نہیں دے رہی تھی جس سے اس کے زندہ ہونے کی امید کی جاتی۔

''پولیس کو بہت دنوں سے اس اغوا کار جوڑے کی تلاش تھی۔ آج ہم بڑی مشکل سے ان تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے لیکن انہوں نے بجائے گرفتاری دینے اور بچہ پولیس کے حوالے کرنے کے، فائرنگ شروع کر دی۔ مجبوراً پولیس کو بھی جوابی فائرنگ کرنا پڑی۔ تھینک گاڈ فائرنگ کے اس تبادلے میں بچہ محفوظ رہا۔'' ڈی ایس پی کو جب اندازہ ہو گیا کہ بگل اس کے عقب میں کیا دیکھ رہا ہے تو اس کی طرف متوجہ ہوا اور بناوٹی لہجے میں اسے آگاہ کیا۔

اس کا جھوٹ اس کے چہرے پر درج تھا لیکن بگل کی اتنی اوقات نہیں تھی کہ اسے جھوٹا قرار دے سکتا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ ان کی نظروں میں سوال تھا۔ اگر وہ اشارہ کرتا تو وہ کسی بات کی پروا کیے بغیر پولیس والوں پر ٹوٹ پڑتے لیکن قتل و غارت گری سے کچھ حاصل ہونے والا نہیں تھا۔ الٹا ان سب سمیت اعظم کی زندگی بھی داؤ پر لگ جاتی۔

اس نے سر کو آہستہ سے نفی میں جنبش دیتے ہوئے ان سب کو کچھ بھی کرنے سے روکا اور خود رخ موڑ کر قربان شاہ کا نمبر ملانے لگا۔

☆☆☆

''تو یہ تمہارا حتمی فیصلہ ہے؟''

''بالکل۔ یہ میرا حتمی فیصلہ ہے کہ پہلے میں پاکستان جا کر اعظم کو تلاش کر کے بگل کے پاس لاؤں گا پھر کوئی اور کام کروں گا۔ یہ بات میں براہ راست شمین یا ذان ہو سے بھی کہہ سکتا تھا لیکن آپ سے اس لیے کہہ رہا ہوں کہ آپ اسے بہتر طور پر سمجھ بھی سکتے ہیں اور انہیں سمجھا بھی سکتے ہیں۔'' اس نے قطعیت سے یوان کو جواب دیا۔

''یہ کام ہم اپنے لوگوں کے ذریعے بھی کروا سکتے ہیں۔'' یوان نے پیشکش کی۔

''آپ لوگ کروانا چاہتے تو اب تک کروا چکے ہوتے۔ آپ لوگوں نے تو اتنا بھی نہیں کیا کہ بگل کے گھر والوں کو ہی اس سے ملوا دیتے۔'' وہ تلخ ہوا۔

''ایسا صرف رازداری کے خیال سے کیا گیا۔ اگر ان لوگوں کو یہاں بلوا لیا جاتا تو لامحالہ ان کے دشمن اس طرف متوجہ ہو جاتے۔''

''پلیز!'' اس نے ہاتھ اٹھا کر یوان کو بولنے سے روک دیا۔ ''آپ مجھ سے بچکانہ باتیں مت کریں۔ آپ اتنے کمزور نہیں ہیں کہ ان کی حفاظت نہ کر سکتے ہوں۔ سچ بس اتنا ہے کہ یہ سب کرنا آپ کی ترجیحات میں شامل نہیں ہے۔''

''میں متعلقہ لوگوں سے بات کر کے دیکھتا ہوں۔''

''صرف بات نہیں کرنی، انہیں سمجھانا ہے کہ اس کے بغیر بات نہیں بنے گی۔ میں اپنے اس ارادے میں کتنا پختہ ہوں، اس بات کا اندازہ اس بات سے کر لیجیے کہ میں نے قسم کھائی ہے کہ جب تک اعظم کو بگل سے نہیں ملوا دیتا، خود اس سے ملاقات نہیں کروں گا۔'' اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے یوان پر اپنی شرط کی اہمیت واضح کی۔

''خود پر قابو رکھو نوجوان! بے شک تم بہترین ہو لیکن یہاں کسی کو اپنی مجبوری نہیں بنایا جاتا اور بہت جلد متبادل ڈھونڈ لیا جاتا ہے۔'' یوان نے اسے تنبیہ کی۔

''ذرا سوچو کہ اگر انہوں نے تمہارا متبادل ڈھونڈ لیا تو تمہارا کیا ہوگا؟''

''میں موت قبول کرنے کے لیے تیار ہوں لیکن جیوں گا اپنی شرائط پر۔'' اس نے اٹل لہجے میں جواب دیا تو یوان ایک پل کے لیے اس کی شکل دیکھتا رہ گیا۔

''صرف اعظم کی تلاش کا معاملہ ہی نہیں ہے۔ میں ایک دو دوسرے اہم معاملات بھی اپنے اس چکر میں نمٹا لینا چاہتا ہوں۔ آپ لوگ جس مشن پر مجھے بھیجنا چاہتے ہیں، اس میں زندگی اور موت کا کوئی بھروسا نہیں ہے۔ میری زندگی کے کچھ حساب کتاب ایسے ہیں جنہیں بے باق کیے بغیر میں موت کو قبول کرنا بھی منظور نہیں کر سکتا۔''

''تم ایک ساتھ ہی مجھے اپنے سارے مطالبات نوٹ کروا دو تاکہ میں اپنا لائحہ عمل طے کر سکوں۔'' یوان کے انداز سے واضح نہیں تھا کہ وہ نارمل موڈ میں ہے یا خراب موڈ کے ساتھ اس نے یہ بات کی ہے۔

''زیادہ کچھ نہیں۔ بس اتنا کہ پاکستان واپسی کے سفر میں میرے ساتھی وقاص کے ساتھ ساتھ بادل بھی میرے ساتھ ہوگا اور ضرورت پڑنے پر وہاں بھی آپ لوگوں کو میری مدد کرنا ہوگی...... اور ہاں...... باقی ہر کام سے پہلے بگل کے والدین کو یہاں بلوا کر ان کی بگل سے ملاقات کروائیں۔ میں جانتا ہوں کہ یہ ایسا کام ہے جس میں آپ لوگوں کو کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا اس لیے اسے فوری طور پر ہی کرنا ہوگا۔'' وہ اپنے مطالبات پیش کرتے

میں پوری طرح سنجیدہ تھا۔ یوان اسے کچھ دیر دیکھتا رہا پھر مسکرا دیا اور دھیرے سے بولا۔

"میں تمہیں پسند کرتا ہوں اور پوری کوشش کروں گا کہ تمہیں ضائع نہ ہونے دوں۔"

"میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں گا۔" وہ چینیوں کے روایتی انداز میں یوان کے سامنے احتراماً جھکا۔ ملاقات ختم ہوئی اور یوسف جو اس کی درخواست پر اسے ملاقات کے لیے یہاں لایا تھا، اسے واپس پہنچانے کے لیے حاضر ہو گیا۔

اپنی قیام گاہ پر واپس پہنچ کر اس نے انتظار کا سارا وقت بہت خاموشی اور صبر سے گزارا۔ کسی کو اپنے احساسات میں شریک کرنا اسے گوارا نہیں تھا چنانچہ بس اللہ کے حضور ہی ہر معاملے کی بہتری کے لیے دعا گو رہا۔ ساتھی بن کے بھی بہت کچھ سمجھ رہے تھے اس لیے انہوں نے خود بھی اسے نہیں چھیڑا۔ البتہ وہ خود یوسف کے ساتھ جا کر گل سے ملاقات کر آئے تھے۔ واپس آنے کے بعد وہ قاسم کافی دیر تک گل کے حوصلے کی تعریف کرتا رہا کہ وہ بہت صبر سے اپنی جان لیوا بیماری سے لڑ رہی تھی اور شدید تکلیف کے باوجود اس کے لبوں پر کوئی شکایت نہیں تھی۔ وہ قاسم کی اس بات پر کوئی تبصرہ نہیں کر سکا۔ کہتا بھی تو کیا کہتا۔ کیا یہ بتاتا کہ گل کی ساری شکایتیں اور درد صرف اس سے کہنے آتے تھے۔ وہ روز اس کے خوابوں میں آتی تھی اور درد اور شکایت بھری نظروں سے اسے دیکھتی رہتی تھی۔ اپنی تکلیف اور اپنا دکھ کہنے کے لیے اس نے کبھی لبوں کا سہارا نہیں لیا تھا۔ بس اس کی چھلکی سی آنکھیں تھیں جو سب کچھ کہتی رہتی تھیں۔

"آج آپ کی میڈم زن ہو کے ساتھ میٹنگ ہے۔" یوان سے ملاقات کے بعد اسے زیادہ طویل انتظار نہیں کرنا پڑا تھا اور یوسف اس کے لیے پیغام لے آیا تھا۔ اس روز وہ یوسف کے ساتھ زن ہو سے ملاقات کے لیے پہنچا تو وہ اکیلی ہی اس کی منتظر تھی۔

"مجھے افسوس ہے کہ تمہیں انتظار کی زحمت اٹھانا پڑی لیکن میری خواہش تھی کہ تم سے اسی وقت ملاقات کروں جب اس ملاقات کو کارآمد بنانے کے لیے کچھ موجود ہو۔" زن ہو نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے خوشگوار لہجے میں کہا تو اس نے امید بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"مجھے خوشی ہے کہ تیانشیو کے حوالے سے جو ابتدائی مواد تمہیں بھجوایا گیا تھا، اس میں تم اور تمہارے ساتھی دلچسپی لے رہے ہیں اور تم نے اپنی چائنیز بولنے کی صلاحیت کو بھی امپروو کرنے کی کوشش شروع کر دی ہے۔" وہ جو سننا چاہتا تھا، وہ بتانے کے بجائے زن پرائمری اسکول کے بچوں کی طرح اس کی حوصلہ افزائی کر رہی تھی۔ اس کے پاس موجود رپورٹ یقیناً یوسف کی فراہم کردہ تھی کیونکہ وہ قیام گاہ پر یوسف کی موجودگی کا فائدہ اٹھا کر اس سے اس کام کے لیے مدد لیا کرتا تھا۔

"ہمارے ماہرین نے سونیا پر اپنا کام مکمل کر لیا ہے اور وہ اس متفقہ فیصلے پر یقین ہیں کہ وہ اپنے متعلق جو کچھ ظاہر کر رہی ہے، وہ سچ ہے اور اس بات کے امکانات بہت کم ہیں کہ وہ تمہارے ساتھ ہوتے ہوئے تمہیں کسی قسم کا دھوکا دے۔ بالفرض وہ کسی موقع پر ایسا کرنے کی کوشش کرتی ہے تو اسے سنبھالنا تمہاری اپنی ذمے داری ہوگی۔"

"بالکل۔ میں اسے بہت آسانی سے ہینڈل کر سکتا ہوں۔" اس نے اطمینان دلایا۔

"تمہارے ساتھی گل خان کی حالت بھی بہت بہتر ہے۔ اسے اپنا ماضی، گھر اور بیوی بچے یاد آنے لگے ہیں اور مجھے امید ہے کہ وہ اب تمہارے کہنے پر گھر واپس جانے کے لیے تیار ہو جائے گا۔"

"گڈ! اچھی خبر سنائی آپ نے مجھے۔" اس نے سچاؤ سے جواب دیا لیکن اس کا اصل سوال تو بڑا بڑا اس کے چہرے پر لکھا تھا۔

"ہم نے پاکستان میں گل کے والدین سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن......" اس بار زن اس کی مرضی کے موضوع پر آئی ضرور پر بات ادھوری چھوڑ دی۔

"لیکن کیا؟" وہ بے قرار ہوا۔

"فی الحال گل کے والد صداقت شاہ سے ہمارا رابطہ نہیں ہو سکا۔"

"وہ کیوں؟" اس نے زن ہو کے چہرے کو غور سے دیکھا کہ آیا وہ اس سے کوئی بہانہ بنانے کی کوشش تو نہیں کر رہی ہے۔

"انہیں اینٹی کرپشن کی طرف سے گرفتار کر لیا گیا ہے اور فی الحال تو کسی کو یہ بھی نہیں بتایا جا رہا کہ انہیں کہاں رکھا گیا ہے۔"

"مائی گاڈ!" وہ خبر سن کر کراہا۔

"ابھی کوئی مستند اطلاع نہیں ملی ہے لیکن سننے میں آ رہا ہے کہ کسی بچے کا بھی معاملہ ہے اور بچہ مبینہ طور پر ان کا نواسا یعنی گل کا بیٹا ہی ہے۔"

"بچے کا کیا معاملہ؟ کیا کہا جا رہا ہے بچے کے

متعلق؟'' وہ جاننے کو بے چین ہوا۔

''مجاہد کمال نامی ڈاکٹر کے کلینک سے خاصی ہنگامہ آرائی کر کے بچے کو اغوا کیا گیا تھا۔ سننے میں آیا کہ بچے کو اغوا کر کے صداقت شاہ کی حویلی پہنچایا گیا لیکن حویلی سے کوئی بچہ بازیاب نہیں ہوا۔ بس ہمیں شک ہے کہ وہ بچہ ان کا نواسا ہی تھا۔ اگر تم ہمیں تھوڑا ٹائم دو تو بچے کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کر کے تمہیں دے دی جائیں گی۔''

زن نے ملائمت سے درخواست کی۔

''اس کے مقابلے میں، میں فوری طور پر وہاں پہنچ کر اعظم کو محفوظ کرنا زیادہ مناسب سمجھتا ہوں۔ اگر اس کے لیے وہاں کسی قسم کی کھینچا تانی شروع ہو چکی ہے تو اس سے اسے نقصان پہنچنے کا بھی اندیشہ ہے۔'' اس نے زن کی درخواست قبول کرنے کے بجائے اپنا حتمی فیصلہ سنا دیا۔

''ٹھیک ہے۔ تم اپنی بات منوا لو لیکن پھر اس کے بعد تمہیں ہماری ہر شرط پوری کرنا ہوگی۔'' زن نے آخر ہتھیار ڈال دیے۔

''مجھے منظور ہے۔'' اس کے لیے سودا مہنگا نہیں تھا۔

''کب جانا پسند کرو گے؟''

''ابھی۔''

وہ اس بے ساختگی سے بولا کہ زن ہنس پڑی پھر تحمل سے بولی۔ ''بالکل ابھی تو نہیں لیکن بہت جلد تم اپنے وطن میں ہو گے۔''

''میں پوری بے قراری سے اس لمحے کا انتظار کروں گا۔'' اس نے اپنی بے چینی چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ کچھ دیر ان کے درمیان معاملات طے ہوتے رہے۔ وہ زن سے ملاقات کر کے واپس قیام گاہ پر پہنچا تو پُرجوش تھا۔ وکی اور جارو کو بھی فوراً اس بارے میں آگاہ کیا۔ وکی سن کر خصوصاً پُرجوش ہو گیا۔

''کیا وہاں ہمیں کوئی مدد مل سکے گی؟'' اس نے وکی سے پوچھا۔

''لالہ عیسیٰ ہے نا۔'' وکی جانتا تھا کہ لالہ کبھی اسے کسی بات کے لیے انکار نہیں کرے گا۔

''اس سے رابطے کا ذریعہ ہے نا تمہارے پاس؟''

''اگر وہ اب تک وہیں ہوا جہاں میں اسے چھوڑ کر آیا تھا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔'' وکی کی نگاہوں میں وہ پھولوں بھری سرسبز و شاداب وادی لہرائی جہاں وہ علیم، خاور احمد، سعد اور لالہ کو چھوڑ کر آیا تھا۔

''یعنی اگر وہ وہاں نہ ہوا تو مسئلہ ہوگا؟''

''تب بھی نہیں ہوگا۔ لالہ نے اپنا ایک خفیہ ای میل ایڈریس ذہن نشین کروا دیا تھا مجھے۔ ہم اس کے ذریعے لالہ سے رابطہ کر سکتے ہیں۔ اگر تم کہو تو میں ابھی کوشش کروں؟'' اس نے وہاں موجود کمپیوٹر کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

''نہیں۔ ابھی نہیں۔ یہاں سے مناسب نہیں ہے۔'' اس نے وکی کو روک دیا۔ جو کچھ کرنا تھا اب پاکستان پہنچ کر ہی کرنا تھا۔ انتظار کا وہ وقفہ طویل ثابت نہیں ہوا۔ زن ہونے اپنے وعدے کے مطابق بہت جلد سارے انتظام کروا دیے۔ حیحشن کے زیر اثر فرمانبرداری کا مظاہرہ کرتے بادل سمیت جس رات وہ آخری پہر چین سے پاکستان کے لیے روانہ ہوئے اس رات کی صبح وہ گھڑی جب اعظم محبت کرنے والوں کی پناہ سے نکل کر ظالموں کے قبضے میں پہنچ چکا تھا۔

☆☆☆

''سارا محنت غارت ہو گیا۔ اپنے کو اس معاملے سے الگ ہونے کا ہی نہیں تھا۔ یہ سالا کمینہ لوگ، شریفوں کے بس کی بات ہی نہیں تھا۔'' اصغر غصے میں بولتا جا رہا تھا لیکن لالہ کی زبان سے ایک لفظ نہیں نکل رہا تھا۔ وہ گمبھیر خاموشی کے ساتھ اپنی جگہ پر ساکت بیٹھا ہوا تھا۔ سومی اور نیلی کے مسکراتے چہرے مسلسل اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم رہے تھے۔ وہ دونوں صرف وکی سے اپنی دوستی نبھانے کے لیے اس کے کہنے پر اس جنگ میں اترے تھے۔ انہیں اپنے مقصد کے تحت استعمال کرتے ہوئے اسے پوری امید تھی کہ وہ محفوظ رہیں گے لیکن وہ محفوظ نہیں رہ سکے تھے۔

''کاش کہ وہ دونوں اعظم کو حویلی پہنچانے کے بعد وہاں رکنے کے بجائے فوراً واپس آ جاتے۔'' اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے دل میں سوچا۔ وہ دونوں اعظم کی نیلی کے لیے وابستگی دیکھ کر اپنی صوابدید پر وہاں رک گئے تھے لیکن خود اس نے بھی ان کو منع نہیں کیا تھا۔ یہی گمان تھا کہ صداقت شاہ کی اونچی دیواروں والی حویلی کے اندر وہ بالکل محفوظ ہیں لیکن وہاں تو خود صداقت شاہ محفوظ نہیں رہ سکے تھے اور انہیں قانون کی بیڑیاں پہنا کر پابند سلاسل کر دیا گیا تھا۔

''میں نے تو سوچا تھا کہ وکی آئے گا تو اسے سنانے کے لیے میرے پاس دنیا کی سب سے بڑی خوشخبری ہوگی لیکن دوست کے غم کے ساتھ اسے بھلا دنیا کی کون سی خوشی مزہ دے سکے گی۔'' اس کا دھیان وکی کے دنیا میں وارد ہونے والے بچے کی طرف چلا گیا۔ بچے کی پیدائش اگرچہ غیر متوقع طور پر وقت سے کچھ قبل عمل میں آئی تھی لیکن خوش

قسمتی سے کوئی مسئلہ نہیں بنا تھا اور اس چھوٹے سے گاؤں میں ہی سب کچھ بخیر وخوبی انجام پا گیا تھا۔ لالہ نے جب سے خاور صاحب کی زبانی یہ خوشخبری سنی تھی، خود وہاں جانے کے لیے بے تاب تھا لیکن یہاں کی ہنگامہ آرائیوں کی وجہ سے موقع ہی نہیں مل سکا تھا اور یہ موہی اور نیلی والا معاملہ...... اس دکھ نے تو خود اس کی خوشی کو گہن لگا دیا تھا۔

"میں کہتا ہوں لالہ! بس بہت ہو گیا صبر۔ اب ہمیں ان کو سبق سکھانا ہی ہوگا۔ خاص طور پر ان سارے پولیس والوں کو جو مجرموں اور ملک دشمنوں کی گود میں جا بیٹھے ہیں۔"

اصغر کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کیا کر گزرے لیکن لالہ کی طرف سے مسلسل خاموشی تھی۔ اس خاموشی کو فون کی گھنٹی کی مداخلت نے توڑا۔

"ہاں طاہر! بولو، کیا اطلاعات ہیں؟"

"[illegible] مر چکا ہے لیکن لڑکی زندہ ہے۔ اسے گولی لگی ہے اور خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے حالت سیریس ہے لیکن بہرحال زندہ ہے۔" طاہر نے اطلاع دی۔

"اور اعظم......؟"

"اس کے بارے میں کوئی خبر باہر نہیں نکالی جا رہی ہے۔ بازیابی کی کوئی رپورٹ تیار نہیں کی گئی ہے بلکہ ایسا لگتا ہے کہ پولیس اس پورے وجود کو ہضم کر جانے کے چکر میں ہے۔"

"ایسا نہیں ہونا چاہیے۔" لالہ تیز لہجے میں بولا پھر اس سے پوچھا۔

"میری بھیجی ہوئی تصویریں دیکھ لیں تم نے؟"

"جی جناب! تصویریں تو بالکل واضح ہیں اور صاف دیکھا جا سکتا ہے کہ اعظم کو پولیس کا ایک سپاہی گود میں لیے کھڑا ہے۔ ڈی ایس پی کی شکل بھی بالکل صاف آگئی ہے۔" طاہر بیگ نے جواب دیا۔

"بس تو پھر تم یہ اسٹوری ڈسکلوز کرو۔ موقع پر موجود آدمیوں کے بیانات بھی تمہیں مل جائیں گے۔ میری قربان شاہ سے بات ہو گئی ہے۔ ساری گواہیاں بالکل پکی ہوں گی۔ وہ خود اپنے پوتے کی حوالگی سے متعلق دعویٰ بھی دائر کرنے جا رہے ہیں۔" لالہ نے طاہر بیگ کو ہدایات جاری کیں۔ اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے موقع کی تصاویر لینے کا کارنامہ چپل کے ساتھی ڈرائیور نے انجام دیا تھا اور یہی تصاویر اب ان کے کام آنے والی تھیں۔

"میں اسٹوری تیار کرتا ہوں لیکن اخبار کے مالک سے بھی بات کرنا ہوگی۔ سامنے والے طاقتور ہوں تو ہماری سو کالڈ آزاد صحافت بھی لڑکھڑانے لگتی ہے۔" طاہر بیگ خدشات کا شکار تھا۔

"اس کی تم فکر نہ کرو۔ میں قربان شاہ کے ذریعے یہ بات تمہارے مالک سے منوا لوں گا۔ جیب بھاری ہونے کے ساتھ ساتھ ایک انوکھی اسٹوری سامنے لانے کا موقع نہیں گنوائے گا تمہارا مالک بلکہ ایسا کرو کہ خود یا اپنے کسی ساتھی کے ذریعے سائیں صداقت شاہ کی گرفتاری پر بھی کالم چھپواؤ۔ سوال اٹھاؤ کہ ایک نیک نام سیاست دان کے ساتھ اچانک ہی امتیازی سلوک کیوں برتا جا رہا ہے؟ ان کے مسائل کے حل کے لیے حکومت کوئی کردار کیوں ادا نہیں کر رہی اور انہیں کرپشن کے مقدمات میں پھنسانے کی سازش کس کی ہے؟"

لالہ جانتا تھا کہ طاہر خود بھی اس حقیقت سے واقف ہے کہ صداقت شاہ کے ساتھ جو کچھ ہو رہا تھا، وہ ایک سازش کے سوا کچھ نہیں تھا اسی لیے اسے اس طرح کی ہدایات دے رہا تھا۔ ورنہ طاہر کا شمار ان صحافیوں میں نہیں ہوتا تھا جو لفافہ لے کر کسی کی ہدایات پر اپنے قلم کو حرکت دیں۔

"آپ بے فکر رہیں۔ میں اپنا کام بہت اچھے طریقے سے انجام دوں گا۔ میں نے اسپتال میں زیر علاج نیلی کی تصویر بھی حاصل کر لی ہے لیکن......"

"لیکن کیا؟"

"[illegible] کی لاش کا کیا ہوگا؟ کیا آپ اسے لاوارث چھوڑ دیں گے؟"

"ہرگز بھی نہیں۔" لالہ تڑپ اٹھا۔ "اسے لاوارث چھوڑا جائے گا اور نہ ہی پولیس سمیت کسی کو اس کا خون معاف ہوگا۔ فی الحال میں خود سامنے نہیں آسکتا لیکن جس سرکس کمپنی میں موہی اور نیلی کام کرتے تھے، اس کے مالک سے بات ہو گئی ہے میری۔ وہ جائے گا موہی کی لاش کی وصولی کے لیے۔ بس پولیس کو یہ ڈر ہو جائے کہ وہ اس کو چپ چاپ ہضم نہیں کر سکتی۔ پولیس مقابلے میں ہی سہی، انہیں موہی کی ہلاکت کی ذمے داری قبول کرنا ہوگی۔"

"پھر تو الیکٹرانک میڈیا زیادہ بہتر رہے گا۔ ٹی وی پر بریکنگ نیوز چلتے ہی ہر طرف شور مچ جائے گا۔"

"اس کے لیے تم انتظامات کرو۔ جہاں پیسا خرچ کرنا ہوا، وہاں قربان شاہ پیچھے نہیں ہٹے گا۔ یہ اس کے اکلوتے پوتے کی بقا کا بھی مسئلہ ہے۔" اس نے طاہر کے مشورے کو پسند کیا۔

"میرے پاس کچھ اطلاعات عرفان اللہ کے حوالے سے بھی ہیں۔"

''کیسی اطلاعات؟'' گو اس کے لیے اس وقت درپیش معاملات ترجیحی حیثیت رکھتے تھے لیکن عرفان اللہ کے معاملات سے بھی باخبر رہنا ضروری تھا۔

''عرفان اللہ، یزدانی کی ذہنی حالت کا فائدہ اٹھا کر اس کی پراپرٹی پر قابض ہونے کی فکر میں ہے۔ عملی طور پر تو ویسے بھی معاملات اس کے ہاتھ میں ہی ہیں لیکن وہ قانونی طور پر بھی سب اپنے نام کرنے کے چکر میں ہے تاکہ آگے یزدانی یا اس کی بیوی کے خاندان سے کوئی اس جائیداد پر اپنا حق نہ جتا سکے۔''

''مار آستین۔'' خبر سن کر لالہ نے بے ساختہ تبصرہ کیا۔

''ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یزدانی نے ساری عمر جو بویا تھا وہی کاٹنے والا ہے۔ عرفان اللہ جیسے شخص سے دوستی کرنے اور اس کے ساتھ مل کر ملک کی جڑیں کاٹنے والے شخص کو یہ امید نہیں رکھنی چاہیے کہ ایسا شخص بھی اس کے ساتھ مخلص ثابت ہوگا۔'' طاہر نے سنجیدگی سے اپنی رائے پیش کی۔

''چلو، جو بھی ہے تمہارے ہاتھ تو ایک اور زبردست اسٹوری آگئی ہے۔ لگتا ہے جلد صحافت کے میدان میں تمہارا ستارہ بہت بلند ہونے والا ہے۔'' لالہ نے اسے داد دی۔

''مجھے شہرت سے زیادہ اپنے پیشے سے انصاف کی فکر رہتی ہے۔ میرے لیے یہ اطمینان کافی ہے کہ میں اپنا کام پورے خلوص اور ایمانداری سے کر رہا ہوں۔ آپ کا ساتھ بھی اس لیے دے رہا ہوں کہ آپ جو کچھ کر رہے ہیں اس میں ملک کو نقصان پہنچانے کی نیت نہیں ہے۔'' طاہر اپنی طرز کا ایک الگ شخص تھا اور لالہ کو اعتراف تھا کہ وہ اس کی اس درجہ ایمانداری سے متاثر ہوتا ہے۔

''میں تمہاری نیت کو اچھی طرح جانتا ہوں ینگ مین لیکن یاد رکھو کہ شہرت بھی کوئی بری شے نہیں۔ مشہور آدمی ایک عام آدمی کے مقابلے میں زیادہ تعلقات رکھتا ہے اور بہت سے کام اپنی شہرت کے سہارے بھی نکلوا سکتا ہے اس لیے اگر کبھی شہرت کی دیوی تم پر مہربان ہو تو اس سے کنی کترا کر نکلنے کی کوشش مت کرنا۔'' لالہ نے اسے مشورہ دیا۔

''میں آپ کی اس نصیحت کو یاد رکھوں گا۔ فی الحال تو آپ عرفان اللہ کے حوالے سے دوسری خبر بھی سنیے۔''

''میں ہمہ تن گوش ہوں۔''

''عرفان اللہ اپنی پی اے صوفیہ پر بری طرح عاشق ہو گیا ہے اور بضد ہے کہ صوفیہ اس سے شادی کرلے۔''

''صرف چار دن کے ساتھ میں شادی کا مطالبہ...... امید تو اسی انجام کی تھی لیکن اتنی تیزی کی بھی توقع نہیں تھی اس کی طرف سے۔'' لالہ نے حیرت کا اظہار کیا پھر پوچھا۔

''صوفیہ کا کیا ردعمل ہے؟''

''اس کی طرف سے شادی کے لیے مثبت جواب نہیں دیا گیا ہے لیکن امید ہے کہ وہ بن بیاہی بیوی کی تمام ذمے داریاں آرام سے سنبھال لے گی۔ قانونی بیوی بن کر رہنے میں یہ نقصان ہوگا کہ عرفان اللہ کو شرمناک آڈیو اور ویڈیوز کے جال میں پھانس کر بلیک میل نہیں کیا جاسکے گا۔''

''چلنے دو اس سلسلے کو بھی پھر دیکھیں گے کہ کیسے لگام کھینچی جائیں۔'' یہ واضح تھا کہ دولت اور عورت کے ذریعے عرفان اللہ کو اپنی راہ پر چلانے کی پوری تیاری تھی میڈم ایکس کی طرف سے۔

''بس تو پھر فی الحال مجھے اجازت دیں۔ اگر ضرورت پڑی تو پھر رابطہ کروں گا۔'' طاہر بیگ نے اجازت چاہی۔

''بندے لگا دو اسپتال میں جو نیلی کی خیر خبر بھی دیتے رہیں اور اس کی حفاظت بھی کریں۔ صاف بتا دینا ان کو کہ اگر نیلی کا بال بھی بیکا ہوا تو ان کے جسموں پر ان کی کھال موجود نہیں رہے گی۔'' فون سے فارغ ہوتے ہی اس نے اصغر کو اسپتال کا نام بتاتے ہوئے نیلی ہدایت نیلی کے سلسلے میں دی۔

''کہہ دوں گا لالہ! کہہ دوں گا۔'' اصغر اس کا موڈ دیکھ کر جلدی سے بولا اور اپنے فون پر مصروف ہو گیا۔ لالہ بھی اپنے فون پر مصروف ہو گیا۔ وہ خبریں دیکھ رہا تھا۔ خبروں میں وہی سیاست دانوں کے جھگڑے، روز بروز بڑھتی مہنگائی اور بے روزگاری کے مسائل، کھیلوں کی دنیا میں اپنے کھلاڑیوں کی خراب کارکردگی وغیرہ جیسے مسائل تھے اور کہیں کوئی ایسی خبر نہیں تھی جو دل کو خوشی دے سکے۔ ہاں، عرفان اللہ اور اس کے فلاحی کاموں کو بہت بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا تھا اور کوئی بھی عقل مند شخص اس بات کو سمجھ سکتا تھا کہ میڈیا کی اتنی مہربانی کے پیچھے کسی کا آشیرباد ہے۔ بے دلی سے ان خبروں کو دیکھتے لالہ کی نظر آنے والی ایک ای میل کے اشارے پر پڑی تو بیزار کن خبریں ہٹا کر وہ ای میل کھول لی اور پھر اگلے ہی لمحے گنگ رہ گیا۔

''بندے لگا دیے ہیں لالہ! بس دس منٹ میں وہ اسپتال میں ہوں گے۔'' اصغر اپنی کال نمٹا کر اسے اطلاع دینے کے لیے اس کی طرف پلٹا تو اسے ایک ٹک اسکرین کو گھورتے دیکھ کر چونک گیا۔

''لالہ......!'' اس نے آہستہ سے پکارا لیکن لالہ نے

جنبش نہ کی۔

"خیر تو ہے لالہ؟" اس بار اس نے ذرا جرأت سے کام لے کر لالہ کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"میرا وکی واپس آ گیا ہے اصغر! یہ دیکھو، یہ اس کی ای میل آئی ہے۔ وہ...... وہ اس وقت اپنے ہی شہر میں ہم سے تھوڑی دور موجود ہے اور مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔" فرطِ جذبات سے لالہ کی آواز کانپ گئی۔ اتنے عرصے سے اس کے پاس وکی کی کوئی خیر خبر نہیں آئی تھی۔ ایسے میں اس ای میل کے آنے پر لالہ کا جذباتی ہونا بنتا تھا۔

"کہیں کوئی دھوکا تو نہیں ہے۔ ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ آپ کو سامنے لانے کے لیے کسی نے یہ چال چلی ہو۔" اصغر نے خدشے کا اظہار کیا۔

"اپنا یہ ای میل ایڈریس میں نے خود ایمرجنسی کے لیے وکی کو بتایا تھا لیکن ہونے کو تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ دشمن کے عقوبت خانوں میں ہاتھ آئے شکار کی زبان کھلوانے کے بہت ہتھکنڈے ہوتے ہیں۔" لالہ کا جوش ماند پڑا۔

"ضروری نہیں کہ یہ کوئی چال ہی ہو۔ آپ مجھے وکی بھائی کا بھیجا ہوا ایڈریس دے کر خود آرام کریں۔ میں خود تصدیق کرتا ہوں کہ یہ ای میل ٹھیک ہے یا نہیں۔" اصغر نے لالہ کو تسلی دی۔

☆☆☆

"ویلکم بیک مائی بوائے!" جذبات کا ایک سمندر تھا جو وکی کو اپنے سامنے زندہ سلامت دیکھ کر لالہ کے اندر موجزن ہوا تھا لیکن حسبِ عادت اس نے اپنی کیفیات کو چھپاتے ہوئے ایک باوقار مسکراہٹ کے ساتھ وکی کا استقبال کیا تھا۔

"یقیناً آپ کو میری واپسی کی کم ہی امید رہی ہوگی۔" وکی خود آگے بڑھ کر اس سے گرم جوشی سے گلے ملا۔ لالہ کے سینے میں ٹھنڈ پڑ گئی۔

"کم ہی سہی، امید باقی ہو تو آدمی دعا کے سہارے ناممکن کو ممکن بنوا لیتا ہے۔" لالہ نے مسکراتے ہوئے اس کی بات کا جواب دیا۔

"آپ نے میری واپسی کی دعا کی تھی؟" وکی کو خوشگوار سی حیرت ہوئی۔

"اپنی خاطر نہیں، اس بچی کے لیے جسے تُو اپنے نام پر چھوڑ کر گیا تھا اور اس بلونگڑے کے لیے بھی جس کو اس دنیا میں سب سے زیادہ تیری ضرورت ہے۔" لالہ کے لہجے میں شوخی تھی۔

"بلونگڑا......؟" وکی اس کی بات پر ٹھٹکا۔

"ذرا پیچھے ہٹ تو میں دوسروں سے بھی ملوں۔" لالہ نے اسے ہاتھ سے ایک طرف کیا اور معاذ کی طرف بڑھا۔ معاذ نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن لالہ نے اسے کھینچ کر گلے سے لگا لیا۔

"مبارک ہو معاذ میاں! آپ ایک عدد بھانجے کے ماموں بن گئے ہیں اور شنید ہے کہ بچہ آپ پر گیا ہے اس لیے بہت خوبصورت ہے۔ باپ پر جاتا تو ایویں پھپھوندی لگتا۔" معاذ سے گلے ملتے ہوئے اس نے جو خوشخبری سنائی، اسے سن کر نہ صرف معاذ کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا بلکہ وکی کا چہرہ بھی ہزار وولٹ کے بلب کی طرح جگمگانے لگا۔ فوراً ہی وہاں مبارک سلامت کا شور مچ گیا۔ معاذ کے ساتھ ساتھ جارو اور اصغر نے بھی وکی کو گلے لگا کر مبارک باد دی۔ ماحول بے حد خوشگوار ہو گیا۔ ایک دوسرے سے کیا بیتی کیا نہیں، پوچھنا بھول کر اس خوشی کو منایا جانے لگا۔ لالہ نے جان بوجھ کر موسیٰ اور نیلی کا ذکر نہ چھیڑا کہ پہلے دل کھول کر خوش ہو لینے دیا جائے۔ فوری طور پر سٹیلائٹ فون کے ذریعے علینہ اور خاور صاحب سے رابطہ کیا گیا۔ علینہ کا اصرار تھا کہ وکی اور معاذ بغیر کسی تاخیر کے سیدھے ان کے پاس چلے آئیں۔ کچھ ایسی ہی خواہش خاور صاحب کی بھی تھی۔ علینہ کو بہلایا گیا۔ تسلی اور تشفی کے الفاظ کہہ کر جلدی آنے کے وعدے وعید کیے گئے۔ خاور صاحب کو البتہ اشارہ دے دیا گیا کہ ابھی راہ میں کچھ کانٹے حائل ہیں۔

"کوشش کرنا بیٹا کہ مرنے سے پہلے اس بوڑھے باپ کو اپنی ایک جھلک ضرور دکھا جاؤ۔ یہ نہ ہو کہ تمہاری ماں کی طرح میں بھی تمہاری راہ دیکھتا ہوا ہی اس دنیا سے چلا جاؤں۔" وہ بھی اتنے زیادہ جذباتی آدمی نہیں رہے تھے لیکن حالات کے مسلسل تھپیڑوں اور اولاد کی اندیشوں بھری لمبی جدائی نے انہیں کمزور کر دیا تھا۔

"ایسی باتیں نہ کریں ابو! میں جو حالات سے لڑ رہا ہوں تو صرف اس اطمینان کے سہارے کہ ہمارے پیچھے خاندان کے سر پر آپ کا سایہ موجود ہے اور دنیا کے کسی پرسکون گوشے میں آپ لوگ اپنے حصے کی خوشیاں پا رہے ہیں۔"

"ہماری ہر خوشی تمہارے بغیر ادھوری ہے بیٹے!" خاور صاحب کرلائے۔

"کچھ والدین کے حصے میں ادھوری ہی خوشیاں آتی ہیں کیونکہ انہیں یہ اعزاز حاصل ہوتا ہے کہ ان کی اولاد وطن کا دفاع کرنے اور حق کے لیے لڑنے والوں میں شامل

ہو جائے۔ آپ کو ساری زندگی مجھ سے یہ شکوہ رہا ہے نا ابو کہ میں نے اپنی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال نہیں کیا تو اب میں آپ کا یہ شکوہ دور کرنے جا رہا ہوں۔ مجھے اپنی خوشیوں میں شامل ہونے کا حق معاف کر دیں، ابو!''

''معاذ......!'' وہ کچھ ایسے لہجے میں بولا کہ خاور صاحب گنگ رہ گئے۔

''کوئی سوال نہ کیجیے ابو! بس اتنی تسلی رکھیں کہ آپ کا بیٹا ایسا کچھ نہیں کرے گا جس سے آپ کا سر جھک جائے۔'' اس نے انہیں ٹوک دیا۔

''اللہ کی امان میں بیٹا!'' خاور صاحب بس اتنا ہی کہہ سکے۔ ان سے یہ گفتگو کرنے کے بعد معاذ کا اپنا دل بوجھل ہو گیا تھا لیکن وکی کی خوشی کی خاطر اس نے اپنی کیفیت کو چھپا کر لبوں پر مسکراہٹ سجائے رکھی۔ کھانے پر خاصا اہتمام تھا۔ کھانا خوشگوار ماحول میں کھایا گیا۔ کھانے کے دوران وکی نے مسائل پر ہلکی پھلکی گفتگو کرنے کی کوشش بھی کی لیکن لالہ نے اسے ٹوک دیا کہ بعد میں اطمینان سے بات کریں گے۔ وہ خود اس دوران میں ایک بار اٹھ کر باہر گیا تھا۔ معاذ نے محسوس کیا کہ لالہ کے بظاہر پرسکون رویے کے پیچھے پریشانی پوشیدہ ہے۔ یقیناً تھوڑی دیر بعد اس وقت ہو گئی جب کھانے سے فارغ ہونے کے بعد لالہ نے ہر بات تفصیل سے بتانا شروع کی۔ اعظم کے حصول کی داستان سے لے کر اس کے بچاؤ کے لیے کی جانے والی ساری جدوجہد اور اس ساری کارروائی میں موسی اور نیلی کے کردار کو بیان کرتے ہوئے جب اس نے اعظم کے پولیس کسٹڈی میں جانے، نیلی کے زخمی ہونے اور موسی کی ہلاکت کے بارے میں آگاہ کیا تو وکی اور معاذ دونوں کو شدید شاک لگا۔ موسی کی موت کا سن کر وکی پر خصوصاً قیامت گزر گئی۔ بچپن کا پیارا دوست، جس کے ساتھ مل کر بے شمار خوشی اور غم کے لمحات بتائے تھے، یوں کسی کی بربریت کا شکار ہو گیا تو یہ کوئی معمولی صدمہ تو نہیں تھا۔

''میں تجھ سے معافی چاہتا ہوں لاڈلے کہ اپنے خطرناک کام میں تیرے دوست کو گھسیٹ لیا۔ سوچا تھا بس بچے کو کلینک سے نکالنے تک ان دونوں میاں بیوی سے کام لینا ہے۔ آگے سامنے صداقت شاہ خود سب کچھ دیکھنے لگا لیکن بچہ، نیلی سے انچ ہو گیا اور وہ لوگ وہاں سے نکل ہی نہیں سکے۔ دوسرے مخالفین نے ایک ننھے کے لیے بچے کو چھوڑا اور سازشوں کے جال پر جال بُنتے چلے گئے۔ اپنے مقصد کے حصول کے لیے جس طرح انہوں نے پولیس کا استعمال کیا ہے، اس سے ان کی بے خوفی اور اختیارات بالکل واضح ہیں۔'' لالہ کے لہجے میں حقیقی شرمندگی تھی۔ وکی سن کر تڑپ گیا اور غمزدہ لہجے میں بولا۔

''اصل میں تو وہ مجھ پر قربان ہوا ہے۔ یاری نبھانے میں اتنا پکا تھا کہ کبھی کسی بات کو انکار نہیں کیا۔ میری خاطر اپنی صحت گنوا کر پہلے سرکس کی دنیا سے دور ہوا اور اب بھی میرے لیے ہی اس آگ میں کود کر اپنی جان گنوا دی لیکن میں اس کے قاتلوں کو بالکل بھی معاف نہیں کروں گا۔ انہیں موسی کے خون کے ایک ایک قطرے کا حساب دینا ہوگا۔''

غم، غصہ، بے بسی، سب کچھ ایک ساتھ حملہ آور ہوئے تھے۔

''معافی تو میں نے بھی نہیں دینی کسی کو۔ پولیس والوں کا ناطقہ بند کرنے کا انتظام کر لیا ہے میں نے۔ یہ دیکھو، یہ بریکنگ نیوز چل رہی ہے ٹی وی پر۔'' لالہ نے ٹی وی آن کر کے انہیں بریکنگ نیوز دکھائی۔ طاہر نے کم وقت میں اچھا کام کیا تھا۔ اعظم کی پولیس والے کی گود میں تصویر اور موقع پر موجود نیلی اور گارڈز کے بیانات نے خبر کو خاصا جاندار بنا دیا تھا۔ مصلحتاً موسی اور نیلی سے تعلق کو ظاہر کیے بغیر اس واقعے کو صرف عینی شاہد کی حیثیت سے اٹھایا گیا تھا اور اصل مدعا یہ رکھا گیا تھا کہ قربان شاہ اور صداقت شاہ کے ملازمین اتفاقاً اس واقعے کے گواہ بن گئے تھے۔ انہوں نے فائرنگ کی آوازیں سنیں اور جب موقع پر پہنچے تو مرد اور عورت کو زخمی حالت میں پایا۔ ان کے علاوہ جو سب سے اہم شے دیکھی گئی وہ اعظم کی موجودگی تھی۔ نیلی اور کئی ملازمین نے اعظم کو شناخت کیا اور قربان شاہ کو اس کے بارے میں اطلاع دی۔ اب قربان شاہ کا مطالبہ تھا کہ ان کے پوتے کو ان کے حوالے کیا جائے۔ انہوں نے شکایت کی کہ بچے کی بازیابی پر پولیس نے ان سے از خود رابطہ کرنا تو دور کی بات، انہیں اس سارے واقعے سے آگاہ تک کرنا گوارا نہیں کیا۔ وہ اس معاملے کو اوپر تک لے کر گئے تھے اور مسلسل اعظم کی حوالگی کے لیے شور مچا رہے تھے۔

''یہ اچھا کام ہوا ہے لیکن ہمیں نیلی کے لیے کچھ کرنا ہوگا۔ سچائی چھپانے کے لیے وہ اس کی جان بھی لے سکتے ہیں۔'' وکی نے سرخ آنکھوں کے ساتھ نیلی کے لیے اپنی فکرمندی کا مظاہرہ کیا۔

''میرے ذہن میں بھی یہ بات تھی اس لیے میں نے اپنے آدمی نیلی کی حفاظت پر لگا رکھے ہیں۔ ڈاکٹر کو بھی ہم نے اپنے اعتماد میں لے لیا ہے۔ نیلی کی حالت اسٹیبل ہو جائے تو اسے اسپتال سے کسی دوسرے محفوظ مقام پر شفٹ

کر دیا جائے گا۔ اس کی مکمل ذمے داری اب ہماری ہے۔ موسی کے بعد اب تو اور میں اس کے والی وارث ہیں۔''

''موسی کا جنازہ......؟'' وکی کی آواز اس کے حلق میں پھنس گئی۔

''سب اچھی طرح ہوگا۔ سرکس کمپنی کا مالک سامنے رہے گا لیکن سب کچھ ہم خود ہی دیکھیں گے۔'' لالہ نے اسے تسلی دی۔

''جو ہوا، بہت برا ہوا لیکن اب ہمیں خود پر قابو پا کر آگے کی حکمتِ عملی تیار کرنا ہوگی۔ ہمارے سامنے فی الحال جو کرنے کے کام ہیں، ان میں سرفہرست صداقت شاہ اور اعظم کی پولیس سے بازیابی، موسی کی تدفین اور نیلی کی حفاظت کے کام ہیں۔ دوسرے مرحلے میں ہم دشمنوں کی بیخ کنی اور دوستوں کے ساتھ ہونے والے ظلم کا حساب لینے کے کام انجام دیں گے۔ یہ سب کرنے کے لیے ہمیں خود کو ذہنی اور جذباتی طور پر مضبوط کرنے کی ضرورت ہے اس لیے بی اسٹرانگ۔'' اس بار معاذ نے گفتگو میں دخل دیا اور آخر میں وکی کے شانے کو تھپتھپاتے ہوئے اسے سمجھایا۔

''معاذ کا کہنا ٹھیک ہے۔ جو کچھ ہوا ہمیں اس کا دکھ ہے اور اس دکھ میں ہم تمہارے ساتھ کھڑے ہیں۔ ہمارا وعدہ ہے کہ کسی بھی مقام پر تم خود کو تنہا نہیں پاؤ گے۔'' جارو... کم گو تھا اور بہت کم ہی کسی بات میں دخل دیتا تھا لیکن اس وقت اس نے بھی وکی کو اپنے ہونے کا احساس دلا کر اس کا حوصلہ بڑھانے کی کوشش کی۔ اس کے اس خلوص پر وکی کی آنکھیں بھیگ گئیں اور اس کا ہاتھ تھام کر جذباتی لہجے میں بولا۔

''میں خوش قسمت ہوں کہ اپنا سب سے پرانا دوست کھونے کے بعد بھی تہی داماں نہیں ہوا اور اللہ نے مجھے ایسے ساتھی دیے جنہوں نے غم کی اس گھڑی میں مجھے بکھرنے سے بچا لیا۔''

''جب تک دم میں دم ہے، ہم اسی طرح ایک دوسرے کا ساتھ نبھاتے رہیں گے۔'' معاذ نے بھی جارو کے ہاتھ پر رکھے اس کے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ کر اسے یقین دہانی کروائی اور پھر جارو اور اس نے بیک وقت دونوں طرف سے اسے اپنے بازوؤں کے گھیرے میں لے لیا۔ یہ ایک لازوال لمحہ تھا جس میں ان کی دوستی کا باب نئے سرے سے رقم ہونے جا رہا تھا۔

☆☆☆

''میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ اسے ہوش آرہا ہے۔ دیکھیں یہ بار بار اپنی پلکیں جھپک رہی ہے لیکن ایسا لگ رہا ہے کہ ابھی اپنے حواسوں میں نہیں ہے اور اردگرد کے ماحول کو پوری طرح سمجھ نہیں پا رہی ہے۔'' ڈاکٹر کو اپنے ساتھ نیلی کے کمرے میں لے کر آنے والی نرس پُرجوش لہجے میں اسے بتا رہی تھی لیکن اچھی بات یہ تھی کہ جوش میں بھی اسے آواز دھیمی رکھنے کا ہوش رہا تھا۔

''ٹھیک ہے سسٹر! میں خود انہیں دیکھ لوں گا۔ آپ باہر جائیں اور پلیز ابھی فی الحال کسی اور کو اس کے ہوش میں آنے کی اطلاع مت دیجیے گا۔'' ڈاکٹر نے اپنے نرم لہجے کو آخر میں تنبیہی کر لیا۔

''میں نے کیوں بتانا ہے جی۔ میں کوئی پاگل تھوڑی ہوں۔'' نرس بولتے ہوئے باہر چلی گئی اور یہ ٹھیک تھا کہ وہ اتنی سیانی تو تھی کہ جس زبان بندی کے لیے اسے باقاعدہ رقم فراہم کی گئی تھی، اسے قائم رکھتی۔ ڈاکٹر کا تعاون بھی لالہ نے خریدا تھا اور وہ سرکار سے تنخواہ لینے کے بعد سرکاری وردی والے کی عین ناک کے نیچے، لالہ سے لی ہوئی رقم حلال کرنے کے لیے کربستہ تھا۔ ویسے سرکاری وردی والے کا بھی فی الحال دور دور تک کچھ پتا نہیں تھا۔ اسے یہاں کچھ دیالو دوست مل گئے تھے جو وقتاً فوقتاً چائے کھانے کے لیے اسے اپنے ساتھ قریبی ہوٹل لے جاتے تھے۔ جاہی کو منظر سے غائب رکھنے والے لالہ ہی کے گُرگے تھے۔

''تم کھولو بی بی! ہوش میں آؤ اور بتاؤ کہ تمہارا کیا حال ہے۔'' ڈاکٹر نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کیا اور نیلی کے قریب کھڑے ہو کر اس کے رخسار تھپتھپاتے ہوئے اسے دھیمی آواز میں پکارنے لگا۔

''ہم..... میں کہاں ہوں؟'' اس نے اجنبی نظروں سے سب کچھ دیکھا اور الجھے ہوئے لہجے میں ڈاکٹر سے پوچھا۔

''تم اسپتال میں ہو۔ تمہیں گولی لگی تھی اور تم خون زیادہ بہہ جانے سے بے ہوش ہو گئی تھیں۔ اب تم اپنی طبیعت کیسی محسوس کر رہی ہو؟'' ڈاکٹر نے محتاط لہجے میں اس سے دریافت کیا۔

''میں......'' اس نے سوچنے والے انداز میں اپنی آنکھ کی پتلیاں سکیڑیں پھر کچھ یاد آجانے پر گھبرا کر پکاری۔

''موسی...... موسی کہاں ہے؟ وہ ٹھیک تو ہے نا؟ اسے بھی گولیاں لگی تھیں۔''

''وہ ٹھیک ہے اور ادھر مردانہ وارڈ میں داخل ہے۔ تم اٹھنے بیٹھنے کے لائق ہو جاؤ گی تو تمہیں اس سے ملوانے لے چلیں گے۔'' ڈاکٹر کو موسی کے سلسلے میں پہلے ہی بریف کر دیا گیا تھا کہ وہ کون ہے اور نیلی کے اس کے بارے میں کوئی

سوال کرنے پر اس کے متعلق کیا جواب دیتا ہے۔
"اس کو کتنی گولیاں لگی ہیں؟ اس کی حالت خطرے سے باہر تو ہے نا؟" اس نے اپنی نظروں کے سامنے معیز کو گولیاں کھا کر نیچے گرتے ہوئے دیکھا تھا اس لیے ڈاکٹر کی طرف سے تسلی دیے جانے کے باوجود مطمئن نہیں ہو پا رہی تھی۔
"میں اسے ٹریٹمنٹ نہیں دے رہا اس لیے مجھے اس کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ہیں۔" ڈاکٹر سے مزید جھوٹ نہ بولا گیا تو بات بتا دی اور پھر اسے متوجہ کرتے ہوئے گمبھیر لہجے میں بولا۔
"تم پولیس کیس میں یہاں آئی ہو اور پولیس کی طرف سے ہمیں حکم ہے کہ تمہارے ہوش میں آتے ہی انہیں اطلاع دی جائے تاکہ تمہارا بیان ریکارڈ ہو سکے لیکن تمہارے کچھ ہمدردوں نے مجھے ایسا کرنے سے منع کیا ہے۔ وہ نہیں چاہتے کہ پولیس کو بیان دے کر تم کسی مصیبت میں پھنسو۔"
"کون ہمدرد؟" نیلی کا دماغ سیدھا لالہ کی طرف ہی گیا لیکن عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کا نام لینے کے بجائے سوال کیا۔
"ٹھیک سے مجھے بھی نہیں پتا لیکن تمہاری بات کروانے کی کوشش کرتا ہوں۔" اس نے خود کو فراہم کیے جانے والے ایک نمبر پر کال کی۔ فوراً ہی کال ریسیو کر لی گئی۔ ڈاکٹر نے نیلی کے ہوش میں آجانے کی اطلاع دی۔
"فون بند کرو۔ ابھی تمہارے فون پر دوبارہ کال آئے گی۔ اس کال پر لڑکی سے بات کروانا۔" دوسری طرف سے ہدایت دے کر کال کاٹ دی گئی۔ کچھ ثانیے بعد گھنٹی بجنے پر ڈاکٹر نے اپنے موبائل کی اسکرین دیکھی تو کسی نام یا نمبر کے بغیر اسکرین پر ان نون کال لکھا ہوا آرہا تھا۔ اس نے کال ریسیو کی۔
"نیلوفر سے بات کرواؤ۔" کال کرنے والے نے بغیر کسی تمہید کے اسے حکم دیا۔ اس نے خاموشی سے اپنا فون بستر پر دراز نیلی کی طرف بڑھا دیا۔
"ہیلو، کون؟" اس نے محتاط لہجے میں پوچھا۔
"نیلی...... ایہ میں ہوں۔ کیسی ہو تم؟" دوسری طرف سے وکی کی جذبات میں ڈوبی آواز سنائی دی تو وہ بہ مشکل خود کو چھلکنے سے باز رکھ سکی۔
"تم...... تم کب آئے؟" اس نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔
"زیادہ وقت نہیں ہوا۔ کاش کہ پہلے آجاتا۔" وہ اداس تھا۔
"کوئی بات نہیں۔ اب تو آگئے ہو نا۔ ساری مشکلیں دور ہو جائیں گی۔" اسے وکی کی آواز سن کر بہت حوصلہ ملا تھا۔
"ضرور دور ہو جائیں گی۔ بس تمہیں حوصلے سے میری ہر ہدایت پر عمل کرنا ہے اور ڈاکٹر کی بھی۔"
"کرلوں گی بابا! لیکن کچھ اپنے دوست کی بھی تو خبر لو۔ ان ظالم اسپتال والوں نے ہم دونوں میاں بیوی کو ایک دوسرے سے ایسے دور دور رکھا ہوا ہے کہ ہم ایک دوسرے کی شکلیں بھی نہیں دیکھ سکتے۔" اس نے بیک وقت فرمائش و شکایت کی۔
"فکر مت کرو۔ میں موی کے پاس ہی ہوں اور اسے اچھی طرح دیکھ رہا ہوں۔" نیلی کو یہ بتاتے ہوئے وکی کی آواز ذرا سی لڑکھڑائی کیونکہ اس وقت وہ سچ مچ موی کے سرہانے کھڑا ہوا تھا اور اس کے بند آنکھوں والے چہرے کو نظروں میں سمو رہا تھا۔
"ذرا بات تو کرواؤ اس سے میری۔" نیلی کو وکی کی موی کے پاس موجودگی سے خاصا اطمینان محسوس ہوا تھا اس لیے اس کے لہجے کی تبدیلی کو محسوس کیے بغیر لاڈ سے فرمائش کی۔
"نہیں، ابھی نہیں۔ ابھی وہ آرام کر رہا ہے۔ تم میری ڈاکٹر سے بات کرواؤ تاکہ میں اس کو تمہیں یہاں بھجوانے کے سلسلے میں کچھ ہدایات دے سکوں۔" وکی نے اسے ٹال دیا۔ اس نے بھی مزید بحث کے بغیر ڈاکٹر کو اس کا موبائل واپس تھما دیا۔
"مریضہ کو بھی انجکشن کے لیے قریبی پرائیویٹ اسپتال منتقل کروا دو۔ اس سلسلے میں تمہیں اپنے سینئر کی تحریری ہدایت مل جائے گی۔ متعلقہ اسپتال میں انجکشن کی پوری تیاری ہوگی۔ تمہیں کوئی پریشانی نہیں اٹھانا پڑے گی۔ جاتے وقت مریضہ کے ساتھ ایمبولینس میں جانا لیکن واپسی میں کسی بہانے وہیں رک جانا۔" وکی نے ہدایات دیں تو ڈاکٹر کے وجود میں ایک سنسناہٹ سی دوڑ گئی اور اسے اندازہ ہو گیا کہ کیا ہونے جارہا ہے لیکن اب وہ پیچھے نہیں ہٹ سکتا تھا اس لیے "یس" کہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔
"بس تو پھر روانہ ہو جاؤ۔ ڈیوٹی پر موجود پولیس والوں کو ہمارے آدمی دیکھ لیں گے۔" وکی نے کہہ کر فون بند کر دیا اور موی کے چہرے کو دیکھ کر دلار سے بولا۔
"لیے جا رہا ہوں تیری دلربا کو۔ معلوم ہے وہ الوداع کہنے نہیں آئی تو تجھے مجھ سے شکایت رہے گی۔" لاش بھلا کیا جواب دیتی لیکن جو اس لاش کے سرہانے کھڑا جیتے جی مرا جا رہا تھا، اسے تو اپنی تسلی تشفی کے لیے سب کچھ کرنا تھا۔
اعظم والے معاملے کی تفصیلات سن کر ان سب نے

مشتہر کے طور پر اندازہ ہو گیا تھا کہ اعظم کے جسم میں کوئی ڈیوائس رکھی گئی تھی جس کی مدد سے بار بار اسے ٹریس کرلیا گیا تھا۔ خصوصاً پولیس والے تو کسی گائیڈڈ میزائل کی طرح اس تک پہنچے تھے اور انھوں نے چکل وغیرہ کی گاڑیوں تک کو نظر انداز کر کے سیدھے کھیتوں میں معمر اور نیلی کو اعظم سمیت گھیرا تھا۔ اعظم کے سلسلے میں پیدا ہونے والے اس شک کے بعد وہ نیلی کو اپنے پاس بلوانے سے پہلے شک دور کرلینا چاہتے تھے کہ کہیں اسپتال میں قیام کے دوران اسے بھی ایسے کسی تجربے سے تو نہیں گزارا گیا ہے۔ اسکین سے شک بھی دور ہوجاتا اور نیلی کو سرکاری اسپتال سے باہر نکالنے کا جواز بھی مل جاتا کیونکہ اسپتال کی اپنی مشین تو خراب پڑی ہوئی تھی۔

ڈاکٹرز نے اس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے فوری طور پر نیلی کی وہاں سے منتقلی کے انتظامات کیے۔ اپنے سینئر کا ہدایت نامہ، پروانۂ نجات کے طور پر اس کے پاس موجود تھا۔ اسے اطمینان تھا کہ کچھ بھی ہوا تو سوال اس سے نہیں، اس کے سینئر سے ہوگا اور سینئر ثابت کرسکتا تھا کہ اس نے جو کچھ کیا صرف اور صرف مریضہ کی بہتری کے لیے کیا۔ درمیان میں جو بھی پیش آتا اس کی ذمے داری اسپتال کے بجائے پولیس کے اس نااہل سپاہی پر ہوتی جو اپنی ڈیوٹی ڈھنگ سے انجام نہیں دے پایا۔

سارا کام نہایت صفائی سے ہوا۔ سی ٹی اسکین کے بعد نیلی کو ایمبولینس میں دوبارہ سرکاری اسپتال منتقل کرنے کے لیے لے جاتے ہوئے راستے میں ایمبولینس روکی گئی۔ ڈرائیور اور ایک عدد گارڈ کی لالہ کے مسلح گرگوں کے مقابلے میں بھلا کیا حیثیت تھی۔ نیلی کو ایمبولینس سے دوسری گاڑی میں منتقل کیا گیا اور وہاں پہنچا دیا گیا جہاں وکی پہلے ہی موی کی لاش کے ساتھ موجود تھا۔ جنازہ براہ راست اس جگہ سے نہیں اٹھنا تھا لیکن نیلی کو موی کا آخری دیدار کروانے کے لیے یہ خصوصی انتظام کیا گیا تھا کہ غسل اور تکفین کے بعد لاش وہاں لائی گئی تھی۔

"موی کہاں ہے؟" نیلی کو وہیل چیئر پر بٹھا کر اندر لایا گیا تو وہ وکی کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر بری طرح ٹھٹک گئی اور اسے یہ خیال نہیں آیا کہ اتنے عرصے بعد ملنے والے وکی کا حال احوال پوچھے۔

"تمہارا انتظار کررہا ہے۔ آؤ، اس سے آخری ملاقات کرلو۔" وکی نے نمناک آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو پہلے اس کی آنکھوں میں بے یقینی اتری پھر وہ ہسٹریائی انداز میں چلائی۔

"یہ کیا بکواس کررہے ہو۔ تمہیں شرم نہیں آتی اتنا بے ہودہ مذاق کرتے ہوئے۔ جو بندہ تم پر اپنی جان چھڑکتا ہے، اس کے لیے تم نے اپنی زبان سے ایسے الفاظ نکالے بھی کیسے؟"

"کاش، میری زندگی میں یہ منحوس وقت کبھی نہیں آتا کہ مجھے تم سے یہ تکلیف دہ الفاظ کہنے پڑتے لیکن سچ یہی ہے نیلی کہ ہمارا موی ہمیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلا گیا ہے۔" وہ مجرموں کی طرح سر جھکائے نڈھال سا اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔

"نہیں، یہ نہیں ہوسکتا۔ موی کبھی بھی اس طرح مجھے اکیلا چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔ موی..... موی.....!" اس نے بے یقینی سے کہا اور موی کو پکارتے ہوئے خود وہیل چیئر سے کھڑے ہونے کی کوشش کی۔ وکی نے مشکل سے اسے دونوں بازوؤں سے تھام کر اس حرکت سے باز رکھا۔

"پلیز، ایسا مت کرو نیلی! تمہارے زخم کچے ہیں۔ اس طرح کرنے سے بڑا نقصان ہوجائے گا۔" وہ چیختا ہوا۔

"نقصان تو میرا جو ہونا تھا، ہوگیا۔ موی کے بنا جی کر بھلا میں کیا کروں گی۔" وہ اونچا اونچا رونے لگی۔ وکی نے اسے رونے دیا بلکہ خود بھی ساتھ ساتھ آنسو بہاتا رہا۔ پھر کسی نے آکر ان دونوں کو پانی پلایا تو وکی نے خود کو سنبھالا اور بولا۔

"آؤ، میں تمہیں اس سے ملواتا ہوں۔" وہ اس کی وہیل چیئر دھکیلتا ہوا اس جگہ تک لے گیا جہاں موی اپنے آخری سفر پر جانے کے لیے کفن میں لپٹا بالکل تیار تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی نیلی ایک بار پھر دھاڑیں مارنے لگی۔ اس نے موی کے ماتھے پر کئی بوسے دیے، شکوہ کرتی رہی کہ وہ اسے یوں بیچ سفر میں اکیلا چھوڑ کر کیوں جارہا ہے لیکن جانے والا تو خود بے اختیار تھا۔ اس موقع پر وکی ہی ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے نیلی کو سنبھالتا اور سمجھاتا رہا لیکن جب اسے اندازہ ہوگیا کہ معاملہ صرف سمجھانے سے نہیں حل ہوگا تو نیلی کے لیے مستقل طور پر ملازمت پر رکھی جانے والی نرس کو اشارہ کیا۔ نرس نے اسے سکون آور دوا کا انجکشن لگایا اور وکی کی مدد سے بستر پر منتقل کیا۔

ظلم و جبر کے سامنے سینہ سپر نوجوان کی داستان جو غلط کاروں کے لیے غضب ناک تھا باقی واقعات آئندہ ماہ پڑھیے

وعدہ معاف گواہ

عائشہ نصیر

دنیا میں اکثر جرائم کی شروعات یا تو عورت یا دولت کی وجہ سے ہوتی ہے... جسے پانے کے لیے منفی سوچ کے لوگ بڑے بڑے پلان بناتے ہیں اور بعض اوقات بظاہر کامیاب بھی ہو جاتے ہیں... اس کے باوجود کوئی نہ کوئی سقم ایسا رہ جاتا ہے جہاں سے قانون اندر داخل ہوتا ہے... وہ بھی ایک ایسا ہی مجرم تھا جس نے دولت کے حصول کے لیے انتہائی فضول پلاننگ کی اور آخر میں ببول کے سوا اسے کچھ نہ ملا... کیونکہ یہی تو قدرت کا اصول ہے

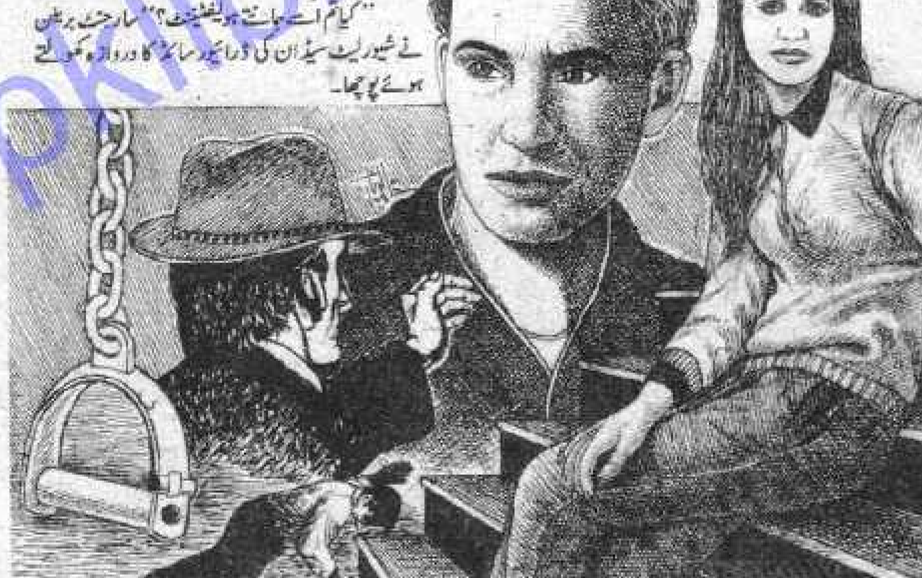
... سچ بولنے والے ایک وعدہ معاف گواہ کی

... سزا کا قصہ

"اوہ گاڈ، اینڈریو! تم یہاں کیسے پہنچ گئے؟"

اینڈریو مینجیٹی نے جواب نہیں دیا۔ ایک گولی اس کے سینے پر بائیں جانب لگی تھی اور دوسری گولی سے اس کی کھوپڑی کا کچھ حصہ اڑ گیا تھا۔ ایسے میں وہ جواب دیتا تو یہ ایک معجزہ ہی ہوتا۔ دل کے ساتھ ساتھ دماغ پر بھی ایک شاٹ... کسی قاتل اس کے بچنے کا ایک فیصد چانس بھی باقی نہیں رہنے دینا چاہتا تھا۔

"کیا تم اسے جانتے ہو لیفٹیننٹ؟" سارجنٹ برٹس نے شیورلیٹ سیڈان کی ڈرائیونگ سائیڈ کا دروازہ کھولتے ہوئے پوچھا۔



مینجینی پسنجر سیٹ پر تھا۔ اس کا سر کھڑکی کی طرف جھکا ہوا تھا۔

''اگر تم نارتھ اینڈ میں جوا کھیلنا چاہتے ہو تو تم اینڈ ینو مینجینی کو ضرور جانتے ہو گے۔'' لیفٹیننٹ ڈینئل بوبل نے فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر سڑک کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

نومبر کی اس سرد صبح میں وہ جس جگہ موجود تھے وہاں ایک طرف پارک اور دوسری طرف اپارٹمنٹس کی ایک قطار تھی جن کی کچھ کھڑکیوں پر لگے بلیو اسٹار سروس کے بینرز بتا رہے تھے کہ خاندان کا ایک رکن فعال فوجی سروس میں ہے۔ کچھ پر گولڈ اسٹار تھے جس کا مطلب تھا کہ اس گھر کا کوئی فرد کبھی گھر نہیں آسکے گا۔

برشن گاڑی کی تلاشی لینے لگا۔ گھٹنے ٹیکتے ہوئے سیٹوں کے نیچے دیکھنے کے لیے جھکا۔ ڈینئل نے اپنے فیڈورا ہیٹ کو ماتھے پر جھکایا اور اپنے ٹرینچ کوٹ کا کالر اونچا کیا۔ وہ حیران تھا کہ اینڈ ینو جیسا ایک چھوٹا سا غنڈا یہاں مٹاپن میں کیوں آپہنچا جو اس کے معمول کے اسٹیٹنگ گراؤنڈ سے دس میل دور ہے۔

''یہ دیکھو لیفٹیننٹ۔'' برشن نے کہا۔ اس نے اپنے دستانے والے ہاتھ کی دو انگلیوں سے ایک ریوالور پکڑ رکھا تھا۔ ''یہ ڈرائیونگ سیٹ کے نیچے سے ملا۔''

''تو مطلب یہ کوئی سیدھا سادہ قتل نہیں۔'' ڈینئل بڑبڑایا۔ ''کسی نے اینڈ ینو کو صرف مارنے کے لیے یہاں بلایا اور پھر آلۂ قتل بھی یہیں چھوڑ دیا جس کا مطلب ہے کہ کوئی پرنٹ نہیں ہو گا۔''

''کسی پروفیشنل کا کام لگتا ہے۔'' برشن نے کہا۔

''گزشتہ رات کافی سردی تھی۔ اگر قاتل نے دستانے پہنے تھے تو مینجینی کو اس پر شک نہیں ہوا ہو گا۔''

''لیکن یہاں کیوں؟'' برشن نے کہا۔

''پرسکون گلی ایک طرف پارک ہے۔''

''ٹرالی بس تھوڑی ہی دوری پر ہے اس لیے قاتل کو نکلنے میں کوئی مشکل نہیں ہوئی ہو گی۔''

''یا کسی نے اسے پک کیا ہو۔'' ڈینئل نے کہا۔

''لاش کو پہلے کس نے دیکھا؟''

''ایک لڑکا جو اپنے کتے کے ساتھ مارننگ واک پر نکلا تھا۔'' برشن نے کہا۔ ''اس نے ساڑھے چھ بجے کے قریب فون کیا۔''

ڈینئل نے کہا۔ ''کیا جسم اکڑا ہوا ہے؟''

''ہاں لیکن اس سرد موسم میں یہ ہمیں زیادہ کچھ نہیں بتاتا۔ گولی آدھی رات کے قریب ماری گئی ہے، جہاں تک میرا اندازہ ہے۔'' برشن نے کہا۔

''تم یہیں رہو اور ایمبولینس کا انتظار کرو۔'' ڈینئل نے کہا۔ ''اور یقینی بناؤ کہ اس گاڑی کے گیراج میں آتے ہی اس کے فنگر پرنٹس لے لیے جائیں...... سمجھے؟''

''میں روٹین جانتا ہوں، لیفٹیننٹ۔'' برشن نے کہا۔ ''تمہیں لگتا ہے کہ کوئی گینگ وار شروع ہو گئی ہے؟''

''اینڈ ینو اتنا اہم گینگسٹر نہیں تھا کہ اس کی موت سے کوئی گینگ وار چھڑ سکے لیکن یوں لگ رہا ہے جیسے اس کے ہاتھ کچھ بڑا لگا تھا۔ اتنا بڑا کہ اسے اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔'' ڈینئل ٹھوڑی سہلاتے ہوئے پرسوچ لہجے میں بولا۔

''تمہارا مطلب بینک ٹرک ڈکیتی ہے؟'' برشن نے کہا۔ اس کی آواز تقریباً ایک سرگوشی جیسی تھی حالانکہ آس پاس کوئی نہیں تھا۔

یہ سارا ہفتہ بڑی خبر رہی، یہاں تک کہ جنگ کی خبروں کو بھی صفحۂ اول سے دور کر دیا۔ آج کو ریج ختم ہو گئی تھی۔ یونان سے جرمن پسپائی کے ساتھ ساتھ جنگی جہاز Tirpitz کے ڈوبنے کی بڑی خبر آئی تھی۔

''میرا مطلب کچھ نہیں ہے۔ ہاں، میری چھٹی حس کسی گڑبڑ کا اشارہ کر رہی ہے۔'' ڈینئل نے کہا۔

''لیکن یہ ایک لیڈ بھی ہو سکتی ہے، ہے نا؟ اگر اس قتل کا اس ڈکیتی سے کوئی تعلق ہوا تو۔'' برشن کی آواز پرجوش ہوئی۔

''ممکن ہے۔'' ڈینئل نے کہا۔ ''اگر ایسا ہے تو ہمیں جلد ہی مزید لاشیں ملیں گی۔''

''لو طبی عملہ بھی پہنچ گیا۔'' برشن نے پولیس ڈیپارٹمنٹ کی وین کی سمت دیکھتے ہوئے سر ہلایا۔ ''تم ان سے بات کرنا چاہو گے؟''

''نہیں۔ مجھے ایف بی آئی کے ساتھ ناشتا کرنا ہے۔ دیر ہو رہی ہے۔'' ڈینئل نے کہا۔

''نہیں، اس کے بجائے میں سردی میں یہاں کھڑا رہنا پسند کروں گا۔'' برشن نے کہا۔ ''ویسے یہ کینیڈے چاہتے کیا ہیں؟''

ڈینئل نے کہا۔ ''یہ سلیوان ہے...... اور مجھے ابھی خود بھی نہیں پتا کہ وہ کس کے پیچھے ہے۔''

''ٹھیک ہے، پھر بھی دھیان رکھنا۔ سب لو اور کچھ نہ دو...... یہی ان کا موٹو ہے۔'' برشن نے وین کے قریب پہنچتے ہی کہا۔

ڈینئل نے صبح کی ٹریفک میں اپنے بلیک اینڈ وائٹ

فورڈ کو دس منٹ تاخیر سے ساؤتھ اینڈ ڈائنر تک پہنچایا۔ باہر نکل کر اس نے اٹلانٹک ایونیو کو ساؤتھ اسٹیشن پر ٹرالی اسٹاپ تک دیکھا۔ کیا قاتل نے یہ راستہ اختیار کیا ہوگا؟ چائنا ٹاؤن تھوڑی ہی دوری پر تھا۔ ساؤتھ بوسٹن تھوڑا اور دور تھا لیکن یہاں ایک آئرش باشندے کے چھپنے کے لیے بہت سی جگہیں تھیں۔ نارتھ بوسٹن بھی قریب تھا۔

اس نے ڈائنر کا دروازہ کھولا تو سگریٹ کے دھوئیں، کافی اور بیکن کی گرم خوشبو نے اسے خوش آمدید کہا۔

''لیفٹیننٹ بوکل!'' گاہکوں کی چہچہاہٹ کے درمیان کسی نے اس کا نام پکارا۔ یہ آواز آخری بوتھ سے آئی تھی جہاں ایک ایف بی آئی ایجنٹ اپنے ہاتھوں کے درمیان کافی کا کپ لے کر بیٹھا تھا۔ کڑکڑاتی سفید شرٹ پر نیلے رنگ کا سوٹ اور نفاست سے ٹائی باندھے۔ اس کے بال کریو کٹ اسٹائل میں تھے۔

''اسپیشل ایجنٹ سلیوان۔'' ڈینئل نے بوتھ میں گھستے ہوئے اور اپنا کوٹ اتارتے ہوئے کہا۔ اس کی قمیص پر شکنیں پڑی ہوئی تھیں اور اسے آج صبح شیو کرنے کا بھی وقت نہیں ملا تھا۔ ''ایف بی آئی کو انتظار کروانے کے لیے معذرت۔''

''ٹھیک ہے ڈینی! تم تو ایسے لگ رہے ہو جیسے تم ساری رات جاگتے رہے ہو۔'' سلیوان نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''اور تم ایسے لگ رہے ہو جیسے ساری رات اس شرٹ کو استری کرتے رہے ہو۔'' ڈینئل نے بھی جوابی وار کیا اور ویٹریس کو دیکھ کر آنکھ ماری جو مسکراتے ہوئے اس کے سامنے بلیک کافی کا کپ رکھ رہی تھی۔

جان سلیوان اور ڈینئل بوکل کافی عرصے سے دوست تھے۔ ایف بی آئی کا فیلڈ آفس بوسٹن میں تھا۔ اگرچہ بوسٹن پی ڈی اور ایف بی آئی میں زیادہ ہم آہنگی نہیں تھی لیکن دونوں ایجنسیاں قطعی طور پر دشمن بھی نہیں تھیں۔ لہٰذا جب معلومات کو بے ضرر طریقے سے شیئر کرنے کی ضرورت پڑتی تو اس کے لیے وہ ہمیشہ ساؤتھ اینڈ ڈائنر کو منتخب کرتے۔

''بلیک ٹرک ڈکیتی والے کیس کا کام کیسا چل رہا ہے؟'' جانی نے کافی کا گھونٹ بھرتے ہوئے پوچھا۔

''صرف بوچھ رہا ہوں۔ اسٹیٹ لائن کو پار کرنے کے کوئی سائن نہیں ملے اور بینک فیڈرل ریزرو کا حصہ بھی نہیں، تو یہ کیس تمہارا ہی ہے۔''

''یہ میری کا شعبہ ہے۔ اس کے پاس ڈکیتی یونٹ ہے۔'' ونسلو لیفٹیننٹ ٹیرنس بوکل ڈینئل کا بھائی تھا۔

''آل رائٹ۔ میری کا بیٹا کیسا ہے؟ کیا اس کی کوئی خبر ملی؟''

''ملی؟ یقیناً۔ اس کی ماں کو ابھی ابھی فرانس کے جنوب میں واقع ایک خوبصورت ہوٹل سے ایک پوسٹ کارڈ ملا ہے۔ بیٹا جانتا ہے کہ جنگ کیسے لڑتا ہے۔ وہ بہادر ہے۔ میں بس اس کے لیے یہ کہوں گا۔'' ڈینئل جانتا تھا کہ کہنے کے لیے اور بھی بہت کچھ ہے لیکن اسے پُراُمید رہنا پسند تھا۔

''تو تمہارے پاس ڈکیتی کے بارے میں کہنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔'' جانی نے کہا۔ ''میرا تو خیال تھا کہ یہ آج کل یہاں ہاٹ ٹاپک ہوگا۔''

''ہاں، ہے تو سہی۔'' ڈینئل نے کہا۔

ویٹریس واپس آئی، کافی کے کپ اٹھائے اور ان کا آرڈر لے لیا۔

''اور مجھے شبہ ہے کہ اس کے اثرات میرے بیلی وک تک بھی پہنچ گئے ہیں۔''

''ہومی سائڈ؟''

''ہاں۔ اسی وجہ سے میں نے دیر کر دی۔ ایڈ ینگ مینٹی ایک نچلے درجے کا جواری، مٹاپن میں ایک کار میں مردہ پایا گیا۔ ایک گولی سینے میں، ایک سر میں اور ریوالور سیٹ کے نیچے سے ملا۔''

''کنٹریکٹ کلنگ۔'' جانی نے کہا۔ ''اسی لیے تم ٹرالی کی سمت دیکھ رہے تھے؟''

''میں قاتل کے ذہن سے سوچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ بظاہر آسان اور سادہ لگتا ہے لیکن میرے لیے پریشانی کی بات یہ ہے کہ ایڈ ینگ کو اتنی توجہ کیوں دی گئی؟ وہ ایک کِکی تھا۔ بنیادی طور پر بے ضرر۔''

''تم اسے جانتے ہو؟'' سلیوان نے پوچھا۔

''میں نے اس کے ساتھ کچھ شرطیں لگائی تھیں۔ سوچا کہ اگر مجھے کبھی معلومات کی ضرورت پڑی تو اس سے مدد لے لوں گا۔'' ڈینئل نے کہا۔ ''یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ میں کتنا جیتا۔ تو اب تم بتاؤ کہ ہم واقعی یہاں کیوں ہیں؟''

''ہمیں دو آدمیوں کی تلاش ہے۔'' جانی نے اطراف میں دیکھتے ہوئے اپنی آواز نیچی کی۔ ''جرمن ایجنٹس۔ انہیں مین کے ساحل سے شمال کی طرف اتارا گیا۔ دونوں ساحل کے قریب چلتے ہوئے، سوٹ کیس لے کر جاتے نظر آئے۔ برفانی طوفان میں وہ بنا کسی جیکٹ اور ہیٹ کے تھے۔ مین میں یہ رویہ مشکوک ہے۔ ایک دو لوگ جنہوں نے انہیں دیکھا، انہوں نے شیرف کو فون کیا مگر وہ شکار پر نکل چکا تھا اور

جب وہ واپس آیا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔

”تو تمہارا خیال ہے کہ وہ بوسٹن آئے ہوں گے؟“ وینٹل نے سوالیہ انداز میں ابرو اچکائے۔

”شاید۔۔۔ خوش قسمتی سے ہمیں ایک کیب ڈرائیور ملا جو بنگر جا رہا تھا۔ انہوں نے اسے روٹ ون سے جانے کا کہا اور وہ انہیں اس راستے سے لے گیا۔“ جانی نے بتایا۔ ”ان کی کہانی یہ تھی کہ ان کے دوست کی کار اچانک خراب ہو گئی تھی اور انہیں صبح کی ٹرین پکڑنے کے لیے بنگر جانا تھا۔ انہوں نے ریلوے اسٹیشن کے قریب ایک اچھے ہوٹل میں لے جانے کے لیے کہا اور کیب ڈرائیور کو بہت زیادہ ٹپ دی۔ اس نے اسے ٹرنک میں تو ڈالا لیکن اس نے خود سے تب تک منہ نہیں کھولا جب تک ہم اس سے پوچھ گچھ کرنے نہیں گئے۔“

”اور پھر تمہیں ہوٹل ڈھونڈنے میں بھی بہت دیر ہو گئی؟“ وینٹل نے پہلے ہی سمجھ لیا۔

”میں۔۔۔ ہاں۔“ سلیوان نے کسی قدر شرمندگی سے اعتراف کیا۔ ”لیکن ہم نے ہوٹل اور اسٹیشن کے درمیان کے راستے کا جائزہ لیا۔ ایک جگہ ریڈیو کی مرمت کی دکان تھی۔ پتا چلا کہ ان میں سے ایک نے ایک ٹی ایپ میٹر، ایک ملٹی میٹر، لوفز اور تانبے کے تار کا ایک رول خریدا ہے۔“

”میں نہیں جانتا کہ وہ میٹر کی چیزیں کیا ہیں لیکن میں فرض کرتا ہوں کہ یہ سب ایک ریڈیو بنانے کے لیے ہے۔“ وینٹل نے کہا۔

ویٹریس انڈوں اور بیکن سے لدی پلیٹیں لے کر آئی۔ انہوں نے لمحاتی توقف کیا۔

”بالکل ٹھیک۔“ سلیوان، ویٹریس کے جانے کے بعد گویا ہوا۔ ”وہ جہاں بھی جا رہے ہیں، جب وہاں پہنچیں گے تو وہ ایک ریڈیو خرید کر اسے ٹرانسمیٹر میں ڈھال سکتے ہیں۔ تو ہمارے ماہرین مجھے بتاتے ہیں۔“ اس نے کہا۔

”کیا یہ دونوں اچھی انگریزی بولتے ہیں؟“ وینٹل نے پوچھا۔

”کیب ڈرائیور اور ریڈیو دکان کے مالک کے مطابق ایک اچھی انگریزی بولتا ہے جبکہ دوسرا ساتھی خاموش رہتا ہے۔ تو کہہ سکتے ہیں کہ اس کی انگلش اچھی نہیں ہو گی۔“ جانی نے کہا۔

”تمہیں لگتا ہے کہ وہ اب بوسٹن میں ہیں؟“ وینٹل نے ایک بار پھر یہ سوال کیا۔

”انہوں نے بنگر سے یکطرفہ ٹکٹ خریدے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ شہر میں ہی ہیں۔ وہ دوسری ٹرین لے سکتے تھے یا کار چوری کر سکتے تھے لیکن یہاں تمام نیوی اہداف کے ساتھ بوسٹن ان کا اڈا ہو سکتا ہے۔“

”ہاں۔۔۔ اور بوسٹن نیول یارڈ تباہ کن جہازوں سے بھرا ہوا ہے اور دوسرے جہاز مرمت کے لیے ہیں۔“ وینٹل نے کہا۔ ”یہ بالکل دریائے چارلس کے پار ہے۔“

”اب تم جانتے ہو کہ ہم کس چیز کے پیچھے ہیں۔“ جانی نے کہا۔ ”لیکن ہم انہیں ہوشیار نہیں کرنا چاہتے۔ جرمن یا اطالوی ان کی مدد کر سکتے ہیں۔ ہمیں خاموشی سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔“

”اگلی اب ہماری طرف ہے، جانی! ہم کوشش کر سکتے ہو۔“

”اگر انہوں نے جنگ سے پہلے یہاں کوئی جاسوس لگایا تھا تو ان کی وفاداریاں سولینی کے ساتھ ہی ہوں گی اور یہاں ہر جگہ جرمنوں کی بہتات ہے۔“ جانی نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ کم از کم ہم سب تو یہاں وفادار امریکی ہیں۔“ وینٹل نے اپنا کپ اٹھاتے ہوئے کہا۔

”اور اچھے آئرش باشندے بھی۔“ سلیوان نے لقمہ دیا۔

☆☆☆

”سنا ہے ایف بی آئی کے ساتھ دعوت اڑا کر آ رہے ہو۔“ ٹیرنس بوتھ نے کہا، جب وینٹل پولیس ہیڈ کوارٹر میں اپنے دفتر میں داخل ہوا۔

”تمہارے مخبر ہر جگہ موجود ہیں، ٹیری!“ وینٹل نے اپنے چھوٹے بھائی کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”کیا انہوں نے تمہیں ہمارے درمیان موجود نازی جاسوسوں کے بارے میں بتایا؟“

”یہ کیا قصہ ہے؟“ ٹیرنس سیدھا ہو کر بیٹھا۔

وینٹل نے اسے ایک تحریری تفصیل سونپی جو ایف بی آئی ایجنٹ نے اسے دی تھی۔ دو آدمی جن کے بال ہلکے اور سیاہ ہیں۔ ایک تیس کی دہائی کے وسط میں، دوسرا تیس کی دہائی کے وسط میں۔ نوجوان آدمی اچھی انگریزی بولتا ہے۔

”گریٹ، اس سے مشتبہ افراد کی تعداد کو ایک لاکھ یا اس سے زیادہ رکھنا چاہیے۔“ ٹیرنس نے کہا۔ ”وہ کہیں بھی ہو سکتے ہیں۔ اس ٹرین ٹکٹ کا مطلب یہ نہیں کہ بوسٹن ان کا آخری اسٹاپ تھا۔“

”نہیں، لیکن ہم کوشش کر سکتے ہیں۔“ وینٹل نے کہا۔ ”وہ دکانیں جو ریڈیو بیچتی ہیں یا مرمت کرتی ہیں۔ یہ ایک اچھی شروعات ہو گی۔“

"ہاں۔ یہ بہتر لگتا ہے۔" ٹیرنس نے اتفاق کیا۔ "اب بتاؤ اینڈریو نے اپنی خصوصی توجہ پانے کے لیے کیا کیا؟"

"تمہارے پاس بینک ٹرک ڈکیتی کی کوئی لیڈ ہے؟" وینڈل اپنی کرسی پر آگے جھکا۔

"اینڈریو مینجینی؟ تمہارے خیال میں وہ اس میں ملوث تھا؟ وہ ایک بک میکر تھا۔ بس، پچھلے نمبر چلاتا تھا اور یہ ایک باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ کی گئی ڈکیتی ہے۔ شراب کی دکان کی کوئی لوٹ مار نہیں۔"

یہ یقیناً ماہرانہ منصوبہ بندی کے ساتھ کیا گیا جرم ہے۔ وینڈل نے سوچا۔

ایک پرائیویٹ ٹرکنگ فرم کی طرف سے ڈرہم ویسٹ کمپنی کو ہفتے میں دو بار نقدی اور سکوں کی ترسیل لائی جاتی تھی۔ کل تقریباً ستر ہزار ڈالرز۔ ایک اپ ٹیوپیلو ریل روڈ بینک سے اسٹیشن پر پہنچی۔ ڈرائیور پھر پیسوں کے تھیلے بینک کی طرف لے جاتا جو تین بلاک سے بھی کم فاصلے پر تھا۔ ایک ہفتہ پہلے وہ وقت پر نہیں پہنچ پایا کیونکہ وہ پیچھے سیڈان کی پچھلی سیٹ پر ملا، بندھا ہوا، آنکھوں پر پٹی اور منہ میں کپڑا ٹھونسا ہوا اور اس کا ٹرک ایک بلاک کے فاصلے پر لاوارث اور خالی پایا گیا۔ وہ کوئی تفصیل فراہم نہیں کرسکا کیونکہ حملہ آوروں نے چہرے ڈھکے ہوئے تھے اور اسے بس کچھ ہی سیکنڈز میں باندھ کر چلے گئے۔

"میرے خیال میں اس ٹرک کی اچھی طرح سے نگرانی کی گئی ہوگی۔ شاید ہفتوں تک۔ راستے اور وقت کو یقینی بنانے کے لیے۔" وینڈل نے کہا۔ "اور اس میں کسی مقامی کو شامل کرنے کی ضرورت آئی ہوگی۔ اینڈریو اس کے لیے پرفیکٹ ہوتا۔ اگر ہم مزید لاشیں دیکھیں تو مجھے حیرت نہیں ہوگی۔"

"یعنی وہ لوگ اب اس ڈکیتی میں شامل مقامی لوگوں سے چھٹکارا پا رہے ہیں؟ سمجھ میں آتا ہے۔" ٹیرنس نے سر ہلایا۔ "یہ ایک پیشہ ور گروپ ہے کیونکہ لوٹ سب ترتیب وار تھے اور ان میں سے ایک بھی ابھی تک منظر عام پر نہیں آیا۔ یہ لوگ جانتے ہیں کہ مصیبت سے کیسے بچنا ہے۔"

"تمہیں مقامی لوگوں میں سے کس پر شک ہے؟" وینڈل نے سوال کیا۔

"ہم مانیگ سوپی کو دیکھ رہے ہیں اور گسٹن گینگ۔" ٹیرنس نے کہا۔ "لیکن مجھے نہیں لگتا کہ وہ بغیر اجازت کے اس طرح کی کوئی بڑی حرکت کریں گے۔"

"آہ، کیا وقت آگیا ہے۔ اب آئرش باشندوں کو بھی بینک لوٹنے کے لیے اطالویوں سے اجازت لینی پڑے گی۔" وینڈل نے مصنوعی تاسف سے ایک آہ بھری۔ "اور جب سے چارلی سلومون کو ختم کیا گیا ہے، جیوش بوائز بھی ڈھیلے پڑ گئے ہیں۔"

"ہاں..... اور باقی بچا نک بروکولا۔ جہاں تک میں جانتا ہوں، ان دنوں اطالویوں کا گینگ غالب ہے۔ اس لیے فیٹ نک امیر الانداز ہے۔ ہم نے کچھ ڈوریاں ہلائیں لیکن کوئی بھی کچھ نہیں جانتا۔" ٹیرنس نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں تمہیں بتاؤں گا کہ اگر ہمیں اینڈریو کے قاتل کے بارے میں کوئی لیڈ ملتی ہے تو۔" وینڈل نے اپنی نشست سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "اور اپنے لڑکوں کو گراؤنس کے بارے میں بھی جلد ہی بتاؤں گا جو بھی ہم سر جوڑ کر بیٹھیں گے۔"

"لیفٹیننٹ بوگل؟" سارجنٹ بریشن نے کھلے دروازے پر دستک دیتے ہوئے کہا۔

"ہمیں ایک اور مشکل درپیش ہے۔ ڈیلی ایوانسٹن اسٹریٹ پر ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔" بریشن نے کہا۔

"گاڈ..... بریشن! ٹریفک ڈویژن کو بتاؤ۔ مجھے کیوں بتا رہے ہو؟" وینڈل جھلا گیا۔

سارجنٹ نے کہا۔ "یہ صرف چھوٹا سا ایکسیڈنٹ تھا مگر معاملہ کچھ اور ہی ہے۔"

"مجھے مت بتاؤ۔" وینڈل نے تھکے تھکے انداز میں آنکھیں رگڑتے ہوئے کہا۔

"اس کے مردہ اور ان میں کوئی لٹکنے کے بارے میں؟" بریشن کا انداز سوالیہ تھا۔ "ٹھیک ہے، مجھے بتاؤ۔ ویل، ہمیں جلدی کرنا ہوگی ورنہ یہاں کی ٹریفک کسی جہنم سے کم نہیں۔" وہ اپنی بات پوری کرکے پلٹ گیا۔

بریشن نے ہیڈکوارٹر سے نکلتے ہی لائٹ اور سائرن آن کردیے تھے۔ یولسٹن زیادہ دور نہیں تھا۔ انہوں نے ٹریفک جام دیکھا۔ حادثے کا شکار دونوں گاڑیاں ایک طرف کی گئی تھیں اور ایک پیٹرول مین اپنے ارد گرد ٹریفک کی روانی بحال کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ان کے رکتے ہی ایک بلیوکوٹ قریب آیا۔

"کیا ملا؟" وینڈل نے گشتی کار سے چھلانگ لگاتے ہوئے پوچھا۔

"ایک کانپتی ہوئی خاتون ڈرائیور اور ایک لاش۔ اس نے کرائسلر کو پیچھے سے اتنی زور سے ہٹ کیا کہ ڈکی کھل گئی۔" پولیس والے نے کہا۔

"دوسرا ڈرائیور؟" ڈینئل نے جواب جان کر پوچھا۔

"پیدل گیا۔" پولیس والے نے کہا۔ "کئی گواہوں نے اسے کوپلی اسکوائر کی سمت مڑتے ہوئے دیکھا لیکن وہ خاتون کی چیخوں سے کافی پریشان ہو گئے تھے اس لیے حلیے پر زیادہ توجہ نہ دے سکے۔ ایک لمبا آدمی جو ہیٹ پہنے ہوئے تھا، بس اتنا ہی۔"

"آؤ دیکھیں، اس بار کون ہے۔" ڈینئل کو گواہوں کی حقیقت میں کچھ بھی دیکھنے کی نااہلی پر غصہ آ رہا تھا۔

"ویل...... ویل، یہ مجھے کبھی بھی اچھا نہیں لگا تھا۔" برینن جو تبھی ڈکی کے قریب پہنچا، بول اٹھا۔

"جمی والش۔" ڈینئل بڑبڑایا۔ "اسے جنٹلمین جمی بلایا جانا پسند تھا۔" اس کی نظریں جنٹلمین جمی والش کی لاش پر تھیں جسے ایک واٹر پروف ترپال پر ڈالا گیا تھا۔ اس کے ہاتھ پیٹھ کے پیچھے بندھے ہوئے تھے۔ اس کے سر کے بائیں جانب خون سے بھرا ہوا سیاہ سوراخ تھا۔ ایسا ہی ایک زخم اس کی قمیص کی جیب کی طرف بھی تھا۔ کار شہر سے باہر جا رہی تھی، شاید لاش ٹھکانے لگانے کے لیے۔ اینڈریو چھوٹا مہرہ تھا۔ کسی کو اس کی لاش چھپانے کی ضرورت نہیں تھی لیکن جنٹلمین جمی ایک اور کہانی تھی۔ اسے گہرائی میں دفن کرنے کی ضرورت تھی۔

ڈینئل نے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "گن ملی؟"

"ڈرائیونگ سیٹ کے نیچے۔" پولیس والے نے کہا۔

"سب نوز 38...... تو جمی کی کیا کہانی ہے؟"

"ایک زمانے میں وہ شراب کا اسمگلر تھا۔ بڑے آئرش آپریٹروں میں سے ایک۔" ڈینئل نے کہا۔ "اس نے پابندی کے دوران اپنا مارک بنایا اور پھر آنے والے اطالوی گینگ سے دوستی کی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ آئرش گینگ کے پرانے دن گزر چکے اس لیے اس نے اپنا پیسا ادھر ادھر پھیلا دیا۔"

"یہ دوستی اس نے فیٹ ٹنگ بردگولا سے کی تھی نا؟" برینن نے کہا۔

"ہاں بالکل...... اور دیکھو کہ یہ غلطی اسے کہاں لے آئی۔ تم یہیں رہو گے سارجنٹ؟" ڈینئل نے کہا۔

"ہاں۔ ایمبولینس کا انتظار کروں گا۔ اور مجھے امید ہے کہ تم نے پیٹ بھر کر ناشتا کیا ہوگا کیونکہ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ ہوشیار رہنا، ڈینی اور فیٹ ٹنگ سے بات مت کرنا...... کم از کم اکیلے تو نہیں۔"

"نہیں، وہ میں ابھی نہیں کروں گا۔ مجھے کہیں اور جانا ہے سارجنٹ۔"

"ٹھیک ہے، لیکن مجھے بتا کر جاؤ کہ تم کہاں جا رہے ہو۔ اگر تم کبھی واپس نہ آئے تو؟" برینن کے انداز میں فکرمندی نہیں تھی۔

"میں جوئی فشر کو ڈھونڈنے جا رہا ہوں، اگر وہ ابھی تک زندہ ہوا۔" ڈینئل نے گشتی کار کی طرف واپس جاتے ہوئے کہا۔ سائرن اور ٹریفک کو ہدایت دینے والے پولیس والوں کے درمیان ٹریفک منٹوں میں چھٹ گئی۔

جوئی فشر ایک اور کہانی تھا۔ وہ اور اینڈریو ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ جوئی ساؤتھ میں کام کرتا تھا اس لیے وہ حریف نہیں تھے۔

جوئی نے جنٹلمین جمی کے لیے کچھ کام بھی کیے، یا افواہوں کے مطابق۔ ہلکی پھلکی چیزیں، کچھ بھی پرتشدد نہیں۔ اس کے بارے میں تازہ ترین جو خبر ڈینئل کو معلوم تھی، جوئی جنوبی بوسٹن کی ویسٹ فورتھ اسٹریٹ پر ایک لنچونیٹ میں کام کر رہا تھا۔ اس کے پاس اوپر ایک کمرا تھا۔ وہ شرط لگاتا اور پیچھے والے بوتھ سے نمبر چلاتا تھا۔ جمی والش اس جگہ کا مالک تھا۔ جمی کے لیے یہ آسان ہوتا کہ وہ ٹرک کی نگرانی اور ڈرائیور کا پیٹرن معلوم کرنے کے لیے جوئی کو آگے کرتا۔ اس طرح کے کام میں کافی وقت لگتا ہے حالانکہ یہ جمی کا انداز نہیں تھا۔ وہ ایک ذہین آدمی تھا۔ اس نے ہواؤں کا بدلتا رخ محسوس کر لیا تھا اور جانتا تھا کہ جرائم کی دنیا میں آنے والا وقت سسلین کا ہے۔ اس کے پاس اس ڈکیتی کو کرنے کے لیے دماغ تھا لیکن پھنسا وہ جب فیٹ ٹنگ نے ایسے لوگوں کو رستے سے ہٹانا شروع کیا جن کے ساتھ وہ لوٹ کے مال کو تقسیم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کوئی بھی شخص جو مافیا کا حصہ نہ ہو وہ مختصر زندگی کی توقع کر سکتا ہے۔

ڈینئل نے اپنی بلیک اینڈ وائٹ چند بلاک دور پارک کی۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ وہ جوئی کے لنچونیٹ کی طرف چلتے ہوئے اس علاقے سے باہر نکل رہا ہے۔ جوائنٹ کونے پر تھا جس کے دروازے کے دونوں طرف چوڑی کھڑکیاں تھیں۔ ڈینئل کھڑکیوں سے دور رہتے ہوئے اینٹوں کی تین منزلہ عمارت کے عقب میں آیا اور آرام سے پچھلا دروازہ کھول کر کچن میں قدم رکھا۔ داغدار سفید ایپرن میں ایک باورچی نے اپنی گرل سے اوپر دیکھا اور پھر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ یہ جمی والش کے لیے اضطراری حرکت تھی۔ کام کرنے والے، پچھلے دروازے سے آنے والے فیڈورا ہیٹ پہنے مردوں کی آمد کے عادی تھے۔ وہ کچن سے نکل کر

جھولتے ہوئے دروازوں سے لیونیٹ میں آیا۔

جوئی کا بوتھ خالی تھا۔

"جوئی کہاں ہے؟" ڈینئل نے کاؤنٹر مین سے پوچھا۔ وہ لڑکوں نے اوپر دیکھا اور جلدی سے اپنی نظریں ہٹا لیں۔

"وہ میرا استروش ہے۔"

"پتا نہیں۔" کاؤنٹر مین نے کہا۔ "کیا کچھ پینا چاہو گے؟"

"ہاں، میں ایک کپ کافی پیوں گا۔" ڈینئل نے کہا۔ "لیکن پہلے مجھے ٹوائلٹ یوز کرنا ہے۔ اس طرف؟"

"ہاں، دائیں طرف۔" کاؤنٹر مین نے اپنا انگوٹھا کچن کی عمومی سمت میں ٹیڑھا کرتے ہوئے کہا۔

ڈینئل جھولتے ہوئے دروازے سے واپس تو گیا لیکن ٹوائلٹ جانے کے بجائے بائیں جانب مڑ گیا۔ یہاں اوپری منزل کو جاتی ہوئی سیڑھیاں تھیں۔ ایک وقت میں دو دو سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے وہ دوسری منزل کی لینڈنگ پر ہی اپنی سانس بحال کرنے کو رکا۔ سامنے ایک دروازہ تھا۔ اس نے اندر کی آوازیں سننے کی کوشش کی۔ وہ پیچھے سے بھی غافل نہیں تھا مگر گہری خاموشی طاری تھی۔ اس نے دروازے کی ناب پر ہاتھ رکھا اور اسے گھمایا۔ یہ مقفل تھا۔ اس نے چند لمحے سوچنے کی نذر کر دیے اور پھر ایک نتیجے پر پہنچ کر پیچھے ہٹا۔ حالانکہ چھوٹی لینڈنگ دوڑ شروع کرنے کے لیے ناکافی تھی مگر اس سے پہلے کہ وہ دروازے کو اپنے جسم کی طاقت کا نشانہ بناتا، اندر سے قدموں کی آہٹ قریب آئی۔ دروازہ کھلا۔ ڈینئل لپک کر جوئی فشر کو دھکیلتا اندر داخل ہوا۔ جوئی نے ٹھوکر کھائی اور ہاتھ میں پکڑا سوٹ کیس ایک طرف جا گرا۔

"تم ابھی تک زندہ ہو، یہ دیکھ کر خوشی ہوئی لڑکے!" ڈینئل نے کہا۔ "سامان چھوڑ دو اور چلو بات کرتے ہیں۔"

"گاڈ لیفٹیننٹ! مجھے دیر ہو رہی ہے۔" جوئی کا منہ یوں بنا جیسے وہ رونے ہی والا ہو۔ "کیا تم انتظار نہیں کر سکتے؟"

"نہیں...... پیچھے مڑو۔" ڈینئل نے کہا۔

جوئی نے تعمیل کی۔

"تمہاری جیب میں گن نہیں ہو گی نا؟"

"ارے، تم مجھے جانتے ہو۔ میں یہ چیزیں نہیں رکھتا۔" جوئی نے کہا۔

"اپنے کوٹ کے بٹن کھولو۔" وہ اس کی تلاشی لینے لگا۔ اس نے کوٹ کو کھینچا، جوئی کے بازوؤں کو پکڑا اور اس کے سوٹ کی جیبیں چیک کیں۔ "اچھا سوئچ بلیڈ ہے۔"

ڈینئل اس کی تیز دھار کا جائزہ لے رہا تھا۔

"تم کیا چاہتے ہو لیفٹیننٹ؟ میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا۔"

"میں چاہتا ہوں کہ تم بیٹھو۔" ڈینئل نے جوئی کا ہیٹ اس کے سر سے کھینچا اور اس کی گردن سے اس کا اونی اسکارف بھی کھینچتے ہوئے کہا۔ "اس کوٹ کو اتارو اور میں تمہیں بتاؤں گا کہ میں تمہاری جان کیسے بچاؤں گا۔"

جوئی اپنا کوٹ صوفے پر پھینکتے ہوئے بیٹھ گیا۔ ڈینئل ماسک کی طرح چہرے کے گرد اسکارف لپیٹ کر کھڑا ہو گیا۔

"سردیوں کے دنوں میں یہ اسکارف کافی کارآمد ہوتا ہے کیونکہ اس میں سردی نہیں لگتی اور چہرہ بھی اچھی طرح چھپ سکتا ہے۔ پچھلے ہفتے بہت سردی تھی، ہے نا؟"

"میرا تو خیال ہے آج زیادہ سردی ہے۔" جوئی غائب دماغی کے سے عالم میں تھا۔

"مگر جنٹلمین جمی کو مزید سردی نہیں لگے گی۔" ڈینئل نے اسکارف اتار کر جوئی کی طرف پھینکتے ہوئے کہا۔ "یا شاید لگ رہی ہو قبر کی سردی۔ مجھے بتاؤ جوئی اس نے ایسا کیا کیا جس نے فیٹ مک کو اتنا غصہ دلا دیا؟"

"کیا...... کیا ہوا؟" جوئی بوکھلا گیا۔ "جمی آج صبح ٹھیک تھا۔"

"اوہ، تب سے اب تک بہت کچھ ہو چکا۔" ڈینئل نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے جوئی کے خوفزدہ چہرے کو گھورتے ہوئے کہا۔ "ایک گولی اس کا بھیجا اڑا گئی اور دوسری دل کو چیر گئی۔ بالکل جب اینڈ یونی کی طرح۔"

"اوہ نہیں...... ڈینو نہیں...... او میرے خدا کیا ہو رہا ہے؟" جوئی کی آواز کانپنے لگی۔

"وہ پیشہ ور تھے اور ٹاؤن سے باہر کے آدمی تھے۔ مجھے ایسا ہی لگتا ہے۔" ڈینئل نے کہا۔ "تم اور اینڈ یونو، جمی کے لیے کام کر رہے تھے۔ تم نے ڈرائیور، اس کے راستے، پک اپ کی فریکوئنسی کا پتا لگاتے ہوئے تمام محنت کی۔ ایک کار بھی چوری کی شاید فرار کے لیے۔"

"میں نے کبھی کوئی کار نہیں چرائی، لیفٹیننٹ۔"

"سنتے رہو، لڑکے! میں یہاں صرف وہ کہانی گھما رہا ہوں جس سے تم اپنے حالات کو بہتر طور پر سمجھو گے۔ سب کچھ گھڑی کے کانٹوں کے مطابق انجام پایا۔ ویسے ڈرائیور کے ساتھ بھی سب کچھ ٹھیک رہا۔ اسے کوئی چوٹ نہیں آئی۔ اس نے کچھ دیکھا بھی نہیں۔ تم نے یہ کام کر دکھایا۔ جنہوں نے مال لوٹا اور اسے فیٹ مک تک پہنچایا،

وہ نیو پارک یا جہاں سے بھی وہ آئے تھے واپس چلے گئے مگر تم لوگ یہیں رہے۔"

"اینڈ یو؟ کیا وہ واقعی؟"

"کہتے ہوئے افسوس ہو رہا ہے، جوئی! لیکن ہاں۔ وہ برا نہیں تھا۔ تم دونوں اچھے دوست تھے، میں جانتا ہوں۔"

"ہم دوست تھے۔" جوئی نے سر اپنے ہاتھوں میں رکھتے ہوئے کہا۔ "میں اس پر یقین نہیں کر سکتا۔ اینڈ یو اور جمی؟"

"سنو، جوئی اور کان کھول کر سنو کیونکہ میں دہرانے والا نہیں ہوں۔ وہ دونوں مر چکے ہیں اور اگلی باری تمہاری ہے۔ اب تم مجھے بتاؤ کہ یہ اچانک سفر کی خواہش کیوں؟"

"جمی نے مجھ سے کہا کہ میں کچھ عرصے کے لیے غائب ہو جاؤں۔" جوئی نے کہا۔ "وہ آج صبح ہی آیا تھا۔ کہا کہ وہ اسے مارنے کا پلان بنا رہے ہیں اور شاید مجھے بھی۔"

"اس نے اینڈ یو کے بارے میں کیا کہا؟"

"کچھ نہیں۔ اس نے کہا وہ خود بھی شہر چھوڑ رہا ہے۔"

جوئی نے کہا۔ "تم میرے ساتھ کیا کرنے جا رہے ہو؟"

"تم میرے ساتھ آرہے ہو لڑکے۔" ڈینئل نے کہا۔ "سوٹ کیس یہیں چھوڑ دو۔ پولیس تمہیں ہر وہ چیز فراہم کرے گی جس کی تمہیں ضرورت ہے۔ ہم ہیڈ کوارٹر جا کر بات کریں گے۔ جتنا زیادہ بتاؤ گے، اتنی ہی تمہارے لیے آسانی ہوگی۔"

"تم مجھے یوں گرفتار نہیں کر سکتے۔" جوئی نے سخت رہنے کی کوشش کی۔

"میں تمہیں پوچھ گچھ کے لیے تو لے جا ہی سکتا ہوں جس کی وجہ سے تمہاری ٹرین چھوٹ جائے گی اور فیڈ تک بھی یہ خبر پہنچ ہی جائے گی کہ تم ہم سے بات کر رہے ہو پھر تمہارے ساتھ کیا ہو سکتا ہے، یہ سوچا ہے؟"

"میں نے کچھ بھی تسلیم نہیں کیا۔" جوئی کراہا۔ وہ سمجھ گیا تھا دونوں صورتوں میں وہ پھنس چکا ہے۔

"ہم..... بس، گپ شپ ہوگئی۔ اب اپنا کوٹ پہن لو، ہم جا رہے ہیں۔" ڈینئل نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ جوئی نے بادل ناخواستہ اپنا اوور کوٹ کندھے پر ڈالا اور اس کی تقلید کی۔

"اور کوئی بے وقوفی مت کرنا، اسی میں تمہاری بہتری ہے۔"

"مجھے لگتا ہے میں پہلے ہی بے وقوفی کر چکا ہوں۔" جوئی نے ایک تلخ ہنسی نکالتے ہوئے کہا۔

"ہم یہ مسئلہ حل کر لیں گے، فکر نہ کرو۔ تمہیں سچ بولنے اور ڈیل کرنے کا موقع ملے گا۔" ڈینئل نے کہا۔ "ویسے تم کہاں جا رہے تھے؟" وہ دوسری منزل کی لینڈنگ پر اترے۔

"واروک۔ وہاں میرا ایک کزن ہے۔" جوئی نے کہا۔

"تم نے کہا تھا کہ تمہاری ٹرین چھوٹ جائے گی۔ اسٹیشن تک کیسے جانے والے تھے؟"

"کیب بلائی تھی۔" جوئی نے کہا۔ "دراصل لوئی نے میرے لیے بلائی۔ میرے پاس سیل فون نہیں ہے۔"

"لوئی؟ وہ کاؤنٹر مین؟"

"ہاں۔ وہ جمی کے لیے یہ جگہ چلاتا ہے۔"

وہ نیچے کچن میں پہنچ گئے تھے جب اچانک ڈینئل کو سب کچھ سمجھ آنے لگا۔ جمی آج صبح سویرے یہاں آیا تھا پھر وہ ایک کار میں ڈکی میں مردہ ملا۔ کس نے اس کی مخبری کی تھی؟ جوئی نہیں۔

"رکو، جوئی!" ڈینئل نے اسے بازو سے پکڑتے ہوئے کھینچا جب اس نے عقبی دروازہ کھولا۔

"کیب پیچھے ہوگی؟"

"ہاں۔ لوئی نے کہا ہے کہ یہ زیادہ محفوظ ہوگا اگر کوئی یہاں نگرانی کر رہا ہو۔"

"چلو۔" ڈینئل اپنا پستول نکالتے ہوئے جوئی کو اپنے ساتھ گھسیٹتے ہوئے گلی کی طرف جانے کے بجائے عمارتوں کے پیچھے والی گلی میں دائیں طرف آیا۔

"کہاں..... وہ انتظار کر رہا ہوگا۔ تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟" جوئی نے روتے ہوئے بازو ڈینئل کی گرفت سے کھینچ لیا۔ وہ خوفزدہ نظر آرہا تھا۔ اس کی آنکھیں پھیلنے لگیں جب اس کی نظریں ڈینئل کے ہاتھ میں دبے پستول پر پڑیں۔

"نہیں۔" خوف، غلط فہمی اور فرار ہونے کی اچانک خواہش کے باعث جوئی بدکے ہوئے جانور کی طرح سڑک کی طرف بھاگ نکلا۔

ڈینئل چیختے ہوئے اس کے پیچھے بھاگا لیکن جوئی کی رفتار اس سے اچھی تھی اور وہ بیس سال چھوٹا بھی تھا۔ ایک کالی گاڑی سڑک پر تیز رفتاری سے چلی آرہی تھی۔ جوئی کے اچانک سامنے آنے پر بریک چیخے۔ اس نے بازو لہرا کر توازن برقرار رکھنے کی کوشش کی تب ہی عقبی کھڑکی سے آنے والی تین گولیوں نے اس کے توازن کا مسئلہ ہی ختم کر دیا۔

"نہیں۔" ڈینئل چیخا۔ غصے اور مایوسی سے اس نے دوڑتے ہوئے گاڑی پر کئی گولیاں چلائیں مگر تب تک وہ سڑک کا موڑ مڑ چکی تھی۔ ڈینئل نے پلٹ کر دیکھا۔ جوئی کے اردگرد خون کا تالاب بنا تھا۔

"جوئی......!" ڈینئل گھٹنوں کے بل اس کے قریب بیٹھا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ پے در پے لگنے والی تین گولیوں نے موقع پر ہی اس کا کام تمام کر دیا تھا۔

"میں پولیس کو کال کر رہا ہوں۔" لوئی نے دروازے میں کھڑے ہو کر اپنے ہاتھ ایک گندے تولیے سے صاف کرتے ہوئے کہا۔

"یو باسٹرڈ!" ڈینئل غصے اور بے بسی کی ملی جلی کیفیت میں صرف بڑبڑا کر رہ گیا۔

دس منٹ بعد چمکتی ہوئی لائٹس اور سائرن کی آوازوں سے گلی گونج رہی تھی۔

"میں جانتا تھا کہ مجھے تمہارے ساتھ آنا چاہیے۔" سارجنٹ برینن تین پولیس اہلکاروں کو سوئی کے اندر جانے اور بیانات لینے کا حکم دیتے ہوئے خود ڈینئل کے ساتھ جوئی کے بے جان جسم کے پاس کھڑا ہوا۔ "تم ٹھیک ہو ڈینی؟"

ڈینئل نے جواب دیا۔ "میں ٹھیک ہوں۔ بس تھوڑا سا ہلا ہوا ہوں۔ میرے خیال میں لوئی فیٹ نک کے پے رول پر ہو سکتا ہے۔" اس نے برینن کو مختصراً جوئی سے حاصل ہونے والی تازہ ترین معلومات بتائیں۔

"او، ہم اس پر کوئی کارروائی نہیں کر سکتے۔" برینن نے کہا۔ "فون کال کرنے کے خلاف کوئی قانون نہیں۔ کیا میں اسے پوچھ گچھ کے لیے لے جاؤں؟"

"ہاں۔ اسے پسینا آنے سے تکلیف نہیں ہو سکتی اور ہیلتھ انسپکٹر کو بھی بلاؤ۔ اس جگہ کو تھوڑی دیر کے لیے بند کر دینا اچھا ہوگا۔" ڈینئل نے کہا۔

"ضرور، لیکن اس سے کیا فائدہ ہوگا؟" برینن نے سوال کیا۔

"پتا نہیں۔" ڈینئل نے پُرسوچ انداز میں اپنے جبڑے کو رگڑتے ہوئے کہا۔ "لیکن میں سوچ رہا ہوں کہ لوئی، فیٹ نک کا حکم کیوں بجا لا رہا ہے۔ شاید جمی کو بک میکنگ اور لنچونیٹ کے کاروبار سے باہر کر دیا گیا تھا۔ سوچ رہا ہوں کہ پراپرٹی کے ریکارڈ کی جانچ پڑتال کروں۔ کیا پتا کچھ کام کی بات ہاتھ لگ جائے۔"

"یہ سب تمہیں فیٹ نک کا سکون غارت کرنے کے لیے ہے؟ وہ آپ کو پسو کی طرح بھگا دے گا، لیفٹیننٹ!" برینن مسکرایا۔

"شاید ایسا ہی ہو۔ ہمیں جوئی کے اپارٹمنٹ کو سرچ کے لیے کھنگالنا چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ حال ہی میں کون اس سے ملنے آیا ہے۔ چلو، چار بجے ہیڈ کوارٹر میں واپس ملتے ہیں۔" ڈینئل نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔

☆☆☆

بوگل برادران نے ڈکیتی اور ہوبی سائمنڈ کے ڈیٹیلز کو تازہ ترین پیش رفت سے آگاہ کیا۔ ٹیرنس نے تازیوں کے دو جاسوسوں کی تفصیل بیان کی اور سب کو ہدایت کی کہ وہ اپنی آنکھیں کھلی اور منہ بند رکھیں۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان تک ان کی تلاش کی کسی سرگرمی کی خبر پہنچے اور وہ بچ نکلنے کی کوئی تدبیر کر لیں۔

سارجنٹ برینن دیر سے آیا مگر اس کے چہرے پر بڑی جاندار مسکراہٹ تھی۔ "ہمیں کچھ مل گیا۔"

"جلدی سے اگل دو۔" ٹیرنس نے کہا۔

"چار سو ڈالرز کے نوٹوں میں ترتیب وار سیریل نمبرز۔" برینن نے کہا۔ "سیریل نمبرز اس نقدی سے ہیں جو بینک ٹرک ڈکیتی میں لوٹی گئی تھی۔ جوئی نشر کے کوٹ کے اندر سلائی ہوئی۔"

"آہا..... گڈ جاب۔" ڈینئل نے کہا۔ "اب ہم جانتے ہیں کہ جوئی اس میں ملوث تھا۔ میں شرط لگا سکتا ہوں کہ چلتین جمی نے اسے شہر سے باہر جانے کے لیے رقم دی۔"

"جمی کی بے وقوفی۔" ٹیرنس نے کہا۔ "میں سوچ رہا ہوں کیا اسی وجہ سے فیٹ نک نے انہیں مارا ہے۔ لیکن کیا ہمارے پاس ان ہلاکتوں سے فیٹ نک کو براہ راست جوڑنے کے لیے کچھ ہے؟"

تب ہی ایک کلرک نے کاغذ کی شیٹ لہراتے ہوئے اپنا سر کمرے میں گھسایا۔

ڈینئل نے اسے لیا، پڑھا اور پھر مسکرانے لگا۔ "سوئی کا لنچونیٹ جس عمارت میں واقع ہے، وہ پانچ دن پہلے کیپیری امپورٹس کی ملکیت میں منتقل کر دی گئی تھی۔"

"یہ فیٹ نک برو کولا کے سامنے ہے۔" ٹیرنس نے کہا۔

"اور خریداری کی قیمت اس کی قیمت سے پانچ گنا زیادہ تھی۔" ڈینئل نے دستاویز پڑھتے ہوئے مزید کہا۔

"میں ایک ڈالر کی ڈونٹس کی شرط لگاؤں گا۔ معاہدہ مہینوں بلکہ شاید سالوں میں ادائیگیوں کو پھیلانے کے لیے تھا۔" برینن نے کہا۔ "فیٹ نک نے اس کی پراپرٹی تو اپنے نام کی ہی، ساتھ ہی ایک ممکنہ پولیس مخبر کو بھی راستے سے ہٹا دیا۔"

"یہ سمجھ میں آتا ہے۔" ڈینئل نے سر ہلایا۔ "جمی خود کو ہوشیار سمجھنے کی بے وقوفی میں مارا گیا جیسے کہ سارے مجرم کرتے ہیں۔"

"اگر جمی کی پراپرٹی کا کوئی امیدوار ہے بھی تو وہ فی

الحال سامنے نہیں آئے گا۔''

''ہاں۔ چلو، کل فیٹ ٹمک سے ملنے چلیں۔'' ڈینئل نے کہا۔ ''اب ہمارے پاس کافی مواد ہے اور مجھ سے اور صبر نہیں ہو رہا۔''

☆☆☆

ڈینئل اور ٹیرنس ساڑھے چھ بجے کے کریبز تورن میں اپنے مخصوص بوتھ میں گھس گئے اور چند ہی منٹوں میں گینز کے دو گلاس ان کے سامنے تھے۔

''یہ تمہارے نام میرے بھائی!'' ٹیرنس نے اپنا گلاس اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''خوشی ہے کہ تم سلامت ہو۔''

''ہاں...... اور یہ جوئی کے نام۔ بے چارہ لڑکا۔'' ڈینئل نے جام اس کے جام سے ٹکرایا۔ ''وہ اتنے بُرے انجام کا مستحق نہیں تھا۔''

''اور اس سے بھی بدقسمتی کی بات یہ کہ ہمیں اس سے بات کرنے کا موقع نہیں ملا۔ شاید تم نے اسے منہ کھولنے پر راضی کر لیا تھا۔'' ٹیرنس نے کہا۔

''وہ جانتا تھا... اور کوئی چارہ نہیں ہے۔'' ڈینئل نے کندھے اچکائے۔ ''اس نے ویسے تو آواز بلند کسی بھی چیز کا اعتراف نہیں کیا تھا لیکن وہ کر لیتا۔ مجھے یقین ہے۔''

''زیادہ افسوس کی بات ہے۔'' ٹیرنس نے تاسف سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

ڈینئل نے اپنا گلاس اپنے ہونٹوں سے لگایا پھر اسے نیچے رکھا۔ ''ایک منٹ ٹھہرو۔'' اس نے کہا۔ ''یہ عجیب بات ہے اب جب میں اس بارے میں سوچتا ہوں۔''

''کیا؟'' ٹیرنس چونکا۔

''جوئی نے مکمل طور پر منہ بند کیے رکھا جو کہ سمجھ میں آتا ہے۔ انکار اس نے صرف ایک چیز کا کیا......''

ٹیرنس نے اس کی بات کاٹی۔ ''تمہیں اس میں عجیب کیا لگا؟''

''وہ ڈکیتی کی ہر چیز پر خاموش رہا۔'' ڈینئل نے لکڑی کی میز پر انگلی پھیرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اس نے استعمال ہونے والی کار چوری کرنے سے انکار کیا اور تب اس کے انداز میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں تھی۔''

''تو وہ سچ کہہ رہا تھا؟''

''میں ایسا ہی کہوں گا۔'' ڈینئل سیدھا ہوا۔ ''اس نے صرف ایک چیز سے انکار کرنے میں اتنی توانائی کیوں لگائی؟''

''وہ ہمیشہ کہتا تھا کہ تم ہوشیار ہو، ڈینئل۔'' ٹیرنس کا انداز توصیفی تھا۔ ''ایسا لگتا ہے کہ ہمیں آرش ٹومی کے ساتھ بات کرنے کی ضرورت ہے۔''

''فیٹ ٹمک سے ملنے کے فوراً بعد۔'' ڈینئل نے کہا۔

''لگتا ہے یہ ایک دلچسپ صبح ثابت ہوگی۔''

''آرش ٹومی ایک مجرم تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں لیکن وہ ڈکیتیوں میں ملوث نہیں ہوتا تھا، کم از کم براہِ راست نہیں اور وہ قتل سے دور رہنے کے لیے بھی جانا جاتا تھا۔ ایسے قتل جن کی پہلے سے منصوبہ بندی کی گئی ہو۔''

''وہ اب بھی شہر میں ہے؟'' ڈینئل نے پوچھا۔

''وہیں ہے۔ پولش ٹومی کو دل کا دورہ پڑنے کے بعد کوئی بھی اس کی جگہ لینے کے لیے نہیں بڑھا۔''

ایک ہی سروس فراہم کرنے والے دو لڑکے تھے۔ دونوں لڑکوں کا نام ٹومی تھا اس لیے ان کی عرفیت ان کے ملک کے نام پر رکھی گئی، جس سے وہ آئے تھے۔ ہر پولیس اہلکار اور مجرم انہیں اسی طرح جانتے تھے۔ پولش ٹومی اور آرش ٹومی۔ دونوں ٹومیز سزائے موت کے ساتھ ممکنہ معیت سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے آتشیں اسلحے سے دور رہتے تھے۔ باقی سب کچھ دستیاب تھا۔ جعلی شناخت، غیر موجود لوگوں کے لیے رجسٹر شدہ کاریں، مکان یا اپارٹمنٹ کے کرائے پر کھانے پینے کا مکمل ذخیرہ، پولیس کی وردی، گواہ جو کسی مقررہ وقت پر ریسٹورنٹ یا بال پارک میں فلاں فلاں کو دیکھنے کی قسم کھاتے۔ کوئی پولیس والا کبھی ان کے خلاف کچھ ثابت نہیں کر سکا تھا۔ اب بھی جس وقت ڈکیتی ہوئی، آرش ٹومی کہیں اور تھا۔ یہ ایک مسئلہ تھا لیکن یہ کل صبح کا مسئلہ تھا۔ ٹیرنس نے اپنا مشروب ختم کیا اور رات کے کھانے کے لیے گھر چلا گیا۔ ڈینئل وہیں بیٹھا سوچوں کے گھوڑے دوڑاتا رہا۔

اگلی صبح وہ اور سارجنٹ برٹن، ایک اور افسر کے ساتھ اورینٹ ہائٹس میں فیٹ ٹمک بروکولا کے گھر پہنچے۔ وہ پیٹرول کار میں تھے جبکہ دو پولیس اہلکار موٹر سائیکل پر۔

''کیا بات ہے؟'' فیٹ ٹمک اپنے وکٹورین گھر کے چوڑے پورچ پر کھڑے ہو کر انہیں گھور رہا تھا۔

سارجنٹ برٹن نے گشتی کار سے ٹیک لگا کر دیکھا جب ٹیرنس اور ڈینئل اس کے گھر کے سامنے کے چھوٹے فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے گئے۔ موٹر سائیکل سوار اہلکاروں نے انجن بند نہیں کیے تھے۔

''تم جانتے ہو کہ میں کہاں کام کرتا ہوں۔'' اسے یقیناً اپنے گھر کے سامنے پولیس کی موجودگی پسند نہیں آئی تھی۔

''ہم یہاں امپورٹڈ زیتون کے قتل کے بارے میں

بات کرنے نہیں آئے ہیں، مسٹر بروکولا!" ٹیرنس نے سیڑھیوں سے پہلے رکتے ہوئے اور فیٹ تنگ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

گینگسٹر نے جھنجھلاہٹ کی۔ اس کا چوڑا چہرہ گوشت سے پُر تھا۔ اس کا منہ اس طرح کھلا ہوا تھا جیسے مچھلی ہوا کے لیے ہانپ رہی ہو۔ اس نے نیلے رنگ کا دھاری دار تھری پیس سوٹ پہن رکھا تھا جو اس کے چھ فٹ کے جسم کی لمبائی سے نیچے آنے والے گوشت کو چھپانے میں ناکام تھا۔

"پھر کیا؟" موٹے تنگ نے پوچھا۔ اس کی آنکھیں گلی میں موجود پولیس والوں اور اس کے تجسس پڑوسیوں کے درمیان چکرا رہی تھیں۔

"کیا ہم گپ شپ کے لیے اندر آسکتے ہیں؟" ڈینئل نے ہاتھ آپس میں رگڑے۔ "یہاں کافی سردی ہے۔"

"پورچ میں آؤ۔" فیٹ تنگ نے کہا۔ "اور اپنے لڑکوں سے کہو کہ زیادہ غل غپاڑا نہ کریں ورنہ میں پولیس کو بلا لوں گا۔" اس نے اپنے مذاق پر خود ہی قہقہہ لگایا اور چند بھاری قدم اٹھاتے ہوئے ایک کرسی کی طرف بڑھا جو اس کے بھاری بھرکم جسم کے دب کر قابلِ رحم حالت میں لگ رہی تھی۔ اس نے مبہم انداز میں دوسری دو کرسیوں کی طرف اشارہ کیا۔

"تم نے جی واش کے بارے میں سنا ہے؟" ڈینئل نے بیٹھتے ہی کہا۔

"اڑتی اڑتی خبریں سنی ہیں۔" فیٹ تنگ نے کہا۔

"تو کیا تم اس لیے یہاں ہو؟"

"تم زیادہ پریشان نہیں لگ رہے۔" ٹیرنس اسے جانچتی نظروں سے گھور رہا تھا۔ "کیا وہ تمہارا دوست نہیں تھا؟"

"ہمارے کچھ کاروباری معاملات تھے۔" فیٹ تنگ نے کہا پھر کچھ سوچ کر بولا۔ "اسے یاد رکھا جائے گا۔"

"ہم تمہارے کاروبار کے بارے میں سب جانتے ہیں۔" ڈینئل نے اپنی کرسی سے آگے جھکتے ہوئے کہا۔ "ہم چینی ٹرک ڈکیتی کے بارے میں بھی جانتے ہیں اور اینڈریو شیلبی کو کیسے معاوضہ ملا۔"

"جوئی فشر بھی، کمینے۔" ٹیرنس نے کہا۔ "وہ تو تقریباً بھاگنے ہی والا تھا۔"

"میں نہیں جانتا کہ تم دونوں کس چیز کے بارے میں بات کر رہے ہو اور مجھے پروا بھی نہیں ہے۔" فیٹ تنگ کے پُرسکون لہجے کے پیچھے چھپی تلملاہٹ وہ بہ خوبی محسوس کر رہے تھے۔ "اب بتاؤ میرے پورچ سے کیسے نکلو گے؟"

"مجھے تمہیں کچھ ضروری بات بتانا ہے پھر ہم چلے جائیں گے۔" ڈینئل نے فیٹ تنگ کے سامنے ایک نوٹ کارڈ رکھا جس میں سیریل نمبر کی ترتیب جوئی کے بٹوے میں سے ایک نوٹ سے لی گئی تھی۔

"میں نے اسے لکھ لیا ہے اگر تمہیں یاد نہ ہے تو۔"

وہی نوٹ اب ٹیرنس کے ہاتھ میں تھا جسے وہ فیٹ تنگ کی آنکھوں کے سامنے لہرا رہا تھا۔

"ہم واپس آئیں گے۔" ٹیرنس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"اگلی بار وارنٹ لے کر آنا۔" فیٹ تنگ کے پھولے ہوئے گال سرخ ہو گئے تھے۔

"تمہیں اس کی شکل دیکھنی چاہیے تھی۔ وہ کیسے پھاڑ کھانے والی نظروں سے تم دونوں کو گھور رہا تھا۔" برینن گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے فیٹ تنگ کی صورت یاد کر کے ہنسا۔

"وہ پریشان تو ہوگا۔" ڈینئل نے کہا۔ "لیکن جب ہم وارنٹ لے کر واپس نہیں آئیں گے تو وہ سمجھ جائے گا کہ ہم ہوا میں تیر چلا رہے تھے۔"

"ہاں، جج چاہے نشے میں ہی کیوں نہ ہو، محض اندازے کی بنیاد پر ہمیں وارنٹ نہیں دے گا۔" ٹیرنس نے کہا۔ "لیکن ہمیں بس فیٹ تنگ کے ایک یا دو گھنٹے کی ضرورت ہے کہ تمام کام مکمل ہو جائیں۔"

"روکسبری تک آدھے گھنٹے کی ڈرائیو ہے۔" برینن نے کہا۔ "جب ہم وہاں پہنچیں گے تو آرشی ٹوبی ہمیں دیکھ کر خوفزدہ ہو جائے گا۔"

"اگر ہم آرشی ٹوبی کے بارے میں درست ہیں۔" ڈینئل نے کہا۔

آرشی ٹوبی، گیلاگر نامی استعمال شدہ فرنیچر کی دکان سے اپنا آؤٹ فٹ ریکٹ چلا رہا تھا۔ کسی کو یاد نہیں تھا کہ گیلاگر کون تھا لیکن یہ ایک محفوظ جگہ تھی تب جب سیف ہاؤسز کو فرنیچر کی ضرورت ہوتی۔

"شو ٹائم۔" برینن نے کہا، جب وہ گیلاگر کے سامنے پہنچے۔ ایک بے نشان سیاہ ٹرک کے بالکل پیچھے۔ اسٹور فرنٹ میں داخلی دروازے کے ساتھ دو پلیٹ شیشے کی کھڑکیاں تھیں۔ صوفے، کرسیاں اور میزیں ایک عام فرنیچر کی دکان کی طرح ڈھیلے پڑے تھیں۔ روکسبری کاروبار کے لیے ایک اچھی جگہ تھی۔

"پیچھے دیکھو۔" ٹیرنس نے سارجنٹ برینن کو پیچھے جانے کا اشارہ کیا۔ ڈرائیور گاڑی کے ساتھ رہا جبکہ وہ دونوں نئے اور استعمال شدہ فرنیچر میں اپنا راستہ بناتے اندر

داخل ہوئے۔ انہوں نے ایک وسیع کاؤنٹر کے پیچھے ایک میز پر آرش ٹوبی کو دیکھا۔ وہ ٹیلی فون پر تھا اور خوش نظر نہیں آ رہا تھا۔

"دیکھو، وہ ابھی تک زندہ ہے۔" ڈینئل نے تیز آواز میں کہا۔ "میں نے تم سے کہا تھا کہ وہ ابھی اس تک نہیں پہنچے ہوں گے۔"

"آہا پولیس برادران!" آرش ٹوبی نے کہا۔ "آپ دونوں کو دیکھ کر خوشی ہوئی۔" وہ مسکرا رہا تھا لیکن اس کے ماتھے پر پسینے کی چمک اشارہ کر رہی تھی کہ اس کے دماغ میں کیا چل رہا ہے۔

"ہمیں بات کرنا ہے ٹوبی!" ڈینئل نے کاؤنٹر پر اپنی کہنیاں ٹیکتے ہوئے کہا۔

"میرے پاس کہنے کو کچھ نہیں۔"

"کس بارے میں؟" تیرنس نے پوچھا۔

"کچھ بھی۔" اس نے کندھے جھٹکے۔

"تمہارے کیا چانسز ہیں ٹوبی؟" ڈینئل نے کہا۔

"فیٹ تک مقامی کی طرح ہے۔ بینک ڈکیتی میں شامل کوئی بھی مقامی محفوظ نہیں۔"

"میں نے اس کے بارے میں سنا۔" ٹوبی نے اپنی میز سے اٹھتے ہوئے کہا۔ وہ لمبا تھا، چوڑے کندھے اور سیاہ بال پیچھے کیے ہوئے تھے۔ "لیکن اس کا مجھ سے کیا تعلق؟"

"تم جانتے ہو ٹوبی!" تیرنس نے کہا۔ "ہم ابھی فیٹ تک سے بات کر کے آئے ہیں۔ ہمارے پاس وہ نقد رقم ہے جو جولی فشر کے پاس تھی جب اس نے سینے پر گولی کھائی۔ ایک برا انجام۔ مجھے اس کے لیے افسوس ہے۔"

"وہ بھاگ سکتا تھا لیکن وہ بھاگ کر جاتا کہاں؟ اس کا منصوبہ وارک میں اپنے ایک کزن کے ساتھ چھپنے کا تھا۔ فیٹ تک کے آدمی آدھے دن میں ہی وہ بل ڈھونڈ نکالتے۔ پھر تم کہاں جا رہے ہو ٹوبی؟" ڈینئل نے کاؤنٹر پر انگلیاں بجائیں۔

"میں کہیں بھی کیوں جاؤں گا؟ جیسا کہ میں نے کہا، میں نے یہ سب سنا ہے لیکن میں اس میں ملوث نہیں ہوں۔" آرش ٹوبی کا انداز سخت تھا مگر آواز کی ہلکی سی لرزش نے پول کھول دی۔ "تم لوگ یہاں کیوں آئے ہو؟"

"تمہیں ایک موقع دینے کے لیے۔" تیرنس اسے گھور رہا تھا۔ "یہ پہلے ایک ڈکیتی تھی لیکن اب ہمارے پاس تین لاشیں ہیں۔ اس کا مطلب جانتے ہو ٹوبی؟"

"فیٹ تک کو معلوم ہے کہ ہم یہاں ہیں۔" ڈینئل نے کہا۔ "وہ تمہیں منہ کھولنے نہیں دے سکتا۔"

"میں کیوں منہ کھولوں گا؟" آرش ٹوبی نے پوچھا۔

"میرا مطلب ہے، مجھے کچھ نہیں پتا۔"

"سنو، ہمیں اسے ہیڈ کوارٹرز لے جانا چاہیے باقاعدہ پوچھ گچھ کے لیے۔ کیا کہتے ہو ڈینی؟" تیرنس نے اس کی جانب رخ موڑا۔

"ہاں، اچھا خیال ہے، لیفٹیننٹ پول!" ڈینئل نے سر ہلایا۔ "ہم ٹوبی کو کلین ہونے کا موقع دیں گے۔ ہم بتائیں گے، ایک اعترافی بیان پر دستخط کرو۔ یقیناً ڈسٹرکٹ اٹارنی اس طرح کے تعاون کی صورت میں الزامات عائد کرنے سے انکار کر دیں گے۔"

"یقیناً۔" تیرنس نے آرش ٹوبی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ "لیکن اگر اس نے تعاون کرنے سے انکار کیا تو پھر ہم کیا کریں؟"

"آسان ہے۔" ڈینئل نے کہا۔ "ہم اس کی مدد کے لیے اس کا شکریہ ادا کریں گے پھر اسے واپس یہاں چھوڑ دیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ پھر ہم فیٹ تک کو پوچھ گچھ کے لیے لائیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اور اس کے آدمی کوئی نتیجہ اخذ نہیں کر پائیں گے کہ ٹوبی نے ہم سے کن معلومات کا تبادلہ کیا۔" تیرنس اب ٹوبی کی اترتی ہوئی شکل دیکھ کر لطف لے رہا تھا۔

"تم لوگ مجھے نہیں پھنسا سکتے۔" آرش ٹوبی نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ "میں ایک ایماندار تاجر ہوں۔ کسی ڈکیتی یا قتل کے بارے میں نہیں جانتا۔"

"اب یہ مضحکہ خیز بات ہے۔" اسی وقت سارجنٹ بریڈن اسٹور کے عقب سے نمودار ہوا تھا۔ "تم یقین نہیں کرو گے کہ میں نے اسے کچرے کے ڈبوں کے پاس زمین پر پڑا ہوا پایا۔"

"کیا تمہارے پاس وارنٹ ہے؟" آرش ٹوبی کی آواز بلند ہوئی۔

"مجھے کوڑا اٹھانے کے لیے وارنٹ کی ضرورت نہیں ہے۔" بریڈن کے انداز میں اطمینان تھا۔ "لگ تو یوں رہا ہے جیسے تم شاید کسی آرڈیننس کی خلاف ورزی کر رہے تھے جس طرح سے تم نے ردی کا ڈھیر پیچھے پھینکا ہے۔ یہ دیکھو ذرا۔"

ڈینئل نے اس سے وہ تڑا مڑا کاغذ لیا اور فہرست پڑھنے لگا۔ یہ تین پرچے تھے۔ ہر ایک پر ایک نام تھا۔ یہ ڈکیتی کے دو دن بعد کی تاریخ تھی اور ساتھ فرنیچر اٹھانے کا نوٹیشن تھا۔

"اب کیا کہتے ہو ٹونی؟" ڈینئل نے کاؤنٹر پر کاغذ کو ہموار کرتے ہوئے اپنی انگلی اس پر تھپتھپائی۔ "اگر میں شرط لگانے والا آدمی ہوتا اور اگر اینڈریو کینیڈی یا جونی فشر میں سے کوئی بھی شرط لگانے کے لیے زندہ ہوتے، تو میں شرط لگا سکتا تھا کہ یہ وہ سیف ہاؤسز تھے جن کا تم نے فیلڈنگ کی ڈکیتی کے لیے بندوبست کیا تھا۔ کیا میں ٹھیک ہوں، ٹونی؟"

آرش ٹونی نے جواب نہیں دیا۔ اس کا چہرہ سفید پڑ چکا تھا۔

"اور تمہیں اتنا اچھا فرنیچر چھوڑنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آئی۔" میرتس نے کہا۔ "تو تم نے اپنے آدمیوں کو اسے اٹھانے کے لیے بھیجا۔ یا تو اس لیے کہ وہ اسے وہاں سے اٹھا کر اس کے ایک ہزار ٹکڑے کردیں، اور یا پھر......"

میرتس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"یا پھر کیا؟" آرش ٹونی کی بہت دھیمی سی بڑبڑاہٹ نکلی تھی۔

"یا پھر وہ فرنیچر اس اسٹور میں کہیں موجود ہے۔" ڈینئل نے کہا۔ "وہ فنگر پرنٹس والا فرنیچر کیونکہ مجھے نہیں لگتا کہ تم نے اسے مٹانے کی زحمت کی ہوگی۔ کیوں، ایسا ہی ہے نا؟"

ٹونی اپنی کرسی پر گر پڑا۔ "مجھے ضمانت چاہیے، تحریری طور پر۔"

وہ بات چیت کرنے اسے ہیڈ کوارٹر لے آئے تھے۔

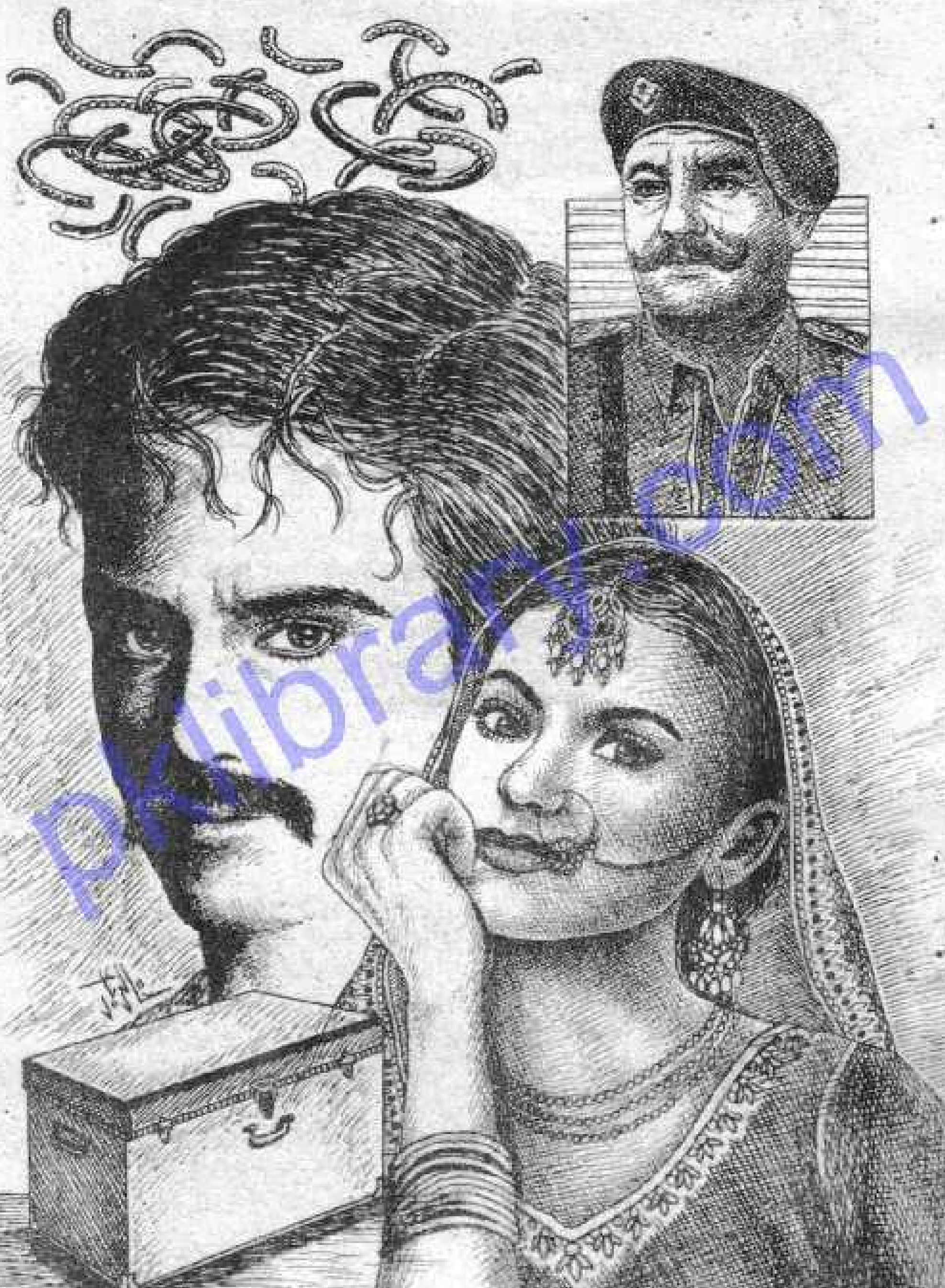
ٹونی نے کافی شرافت کا مظاہرہ کیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے پاس وہ ہے جو پولیس چاہتی ہے اور وہ اسے اپنے بہترین فائدے کے لیے استعمال کر سکتا ہے۔

"تم نہیں جانتے ہو ٹونی، ہم اپنی بات پر قرار رکھتے ہیں۔"

"یہ تم دونوں نہیں ہو جس کی مجھے فکر ہے۔ میں تمہیں اس وقت تک کچھ نہیں بتا سکتا جب تک کہ ڈی اے اس بات پر اتفاق نہ کرے کہ مجھے استغاثہ سے استثنیٰ حاصل ہے۔"

ٹونی نے پیچھے ٹیک لگاتے ہوئے اور بازو اپنے سینے پر باندھتے ہوئے کہا۔

"یہ کیسے کام کرے گا۔" ڈینئل نے کہا۔ "ہمیں یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ تمہیں کس چیز سے استثنیٰ چاہیے۔ ہمیں تم سے جاننا ہے بینک ٹرک ڈکیتی میں تمہارا کیا کردار تھا۔ تم نے فیلڈنگ کے لیے کیا کیا۔ تمہارا اس سے کیا رابطہ تھا۔ تب ہم تمہارے استثنیٰ پر بات کریں گے جس کا دائرہ تینوں مرڈرز تک بھی ہوگا۔ مجھے یقین ہے تم ان الزامات میں نہیں پھنسنا چاہو گے۔"



"تھانیدار صاحب!" اس کی آواز غم سے بوجھل تھی۔

"یہ میرے بیٹے اکبر کی لاش ہے۔ مجھ میں نہیں آرہا کہ اکبر اس صندوق میں کیسے پہنچ گیا۔ یہ تو کل اپنے ماما سے ملنے شیخ پور گیا تھا۔"

"تمہارا نام کیا ہے؟" میں نے مردہ شخص کے دکھی باپ سے پوچھا۔

"مجھے رفیق کھوکھر کہتے ہیں جناب!" وہ گلوگیر آواز میں اپنا تعارف کراتے ہوئے بولا۔ "میں ادھر عزیز آباد ہی میں رہتا ہوں اور کاشت کاری کرتا ہوں۔"

میں نے رفیق کھوکھر کا نام سنا ہوا تھا لیکن ملاقات آج پہلی مرتبہ ہو رہی تھی۔ وہ ایک چھوٹا زمیندار تھا۔ میری معلومات کے مطابق وہ دس بیس ایکڑ زرعی اراضی کا مالک تھا۔

"رفیق کھوکھر!" میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔ "میں سب پتا کرلوں گا۔ تم تھوڑی دیر کے لیے صبر کرکے ایک طرف کھڑے ہوجاؤ۔ میں کرمو سے پوچھ تاچھ کرلوں پھر تم سے بات کرتا ہوں۔"

وہ "اچھا جی" کہتے ہوئے ایک طرف ہٹ گیا۔ وہاں پر کم و بیش درجن بھر افراد جمع تھے۔ میں نے سب کو نظر انداز کرکے کرمو پر توجہ مرکوز کردی پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں، اب بتاؤ...... میں سب جاننا چاہتا ہوں۔"

"سرکار! میرا تعلق عزیز آباد ہی سے ہے اور میں ایک غریب مچھیرا ہوں۔" وہ لجاجت بھرے انداز میں بولا۔ "میں اکثر دریا پر مچھلیاں پکڑنے آتا ہوں۔ میرا طریقہ یہ ہے کہ میں رات میں اپنا جال دریا میں ان جھاڑیوں کے نزدیک ڈال کر گھر چلا جاتا ہوں اور اگلی صبح یہاں آکر اپنے جال کو چیک کرتا ہوں۔" بات کو ادھورا چھوڑ کر اس نے جھاڑیوں کی جانب اشارہ کیا۔

مذکورہ جھاڑیاں دریا کے کنارے کے ساتھ دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ اتنی گھنی تھیں کہ ان کا ایک گنجان آباد حصہ چند فٹ تک دریا کے اندر چلا گیا تھا جس کے باعث پانی کے بہاؤ میں کٹاؤ ایسی کیفیت نمودار ہوگئی تھی۔ ان دنوں دریا میں اچھا خاصا پانی موجود تھا لہٰذا مذکورہ بالا کٹاؤ واضح نظر آرہا تھا۔

"تو آج صبح تم اپنے جال کو چیک کرنے یہاں پہنچے تھے؟" میں نے کرمو کی جانب دیکھتے ہوئے ٹٹولنے والے انداز میں کہا۔ "اس کے بعد کیا ہوا؟"

"میں جال کو کھینچنے کے لیے جیسے ہی دریا میں اترا، اس صندوق پر میری نظر پڑی۔" وہ مذکورہ صندوق کو دیکھتے ہوئے بتانے لگا۔ "مجھے یہ بہت عجیب سا لگا۔ آج سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ صندوق جھاڑیوں کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ میں نے پانی کے اندر اتر کر صندوق کو اپنی طرف کھینچا تو اس میں حرکت پیدا ہوئی یعنی یہ پانی کی سطح پر تیرتے ہوئے میری سمت بڑھنے لگا۔ میں جال کو سمیٹنا بھول گیا اور اس صندوق کو کسی طرح کھینچ دھکیل کر کنارے تک لے آیا، پھر......"

وہ بولتے بولتے اچانک رکا تو میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔ "پھر کیا کرمو چاچا؟"

"اس صندوق کا ڈھکنا بند تھا مگر اس کی کنڈی میں کوئی تالا وغیرہ نہیں لگا ہوا تھا۔" وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ "صندوق کو پانی سے باہر لاتے ہوئے مجھے محسوس ہوگیا تھا کہ اس کے اندر کوئی وزنی شے موجود ہے لیکن میں بند صندوق کے اندر اس شے کے بارے میں کوئی اندازہ نہ لگا سکا جس کی وجہ سے مجھے خاصی بے چینی اور تجسس محسوس ہونے لگا۔ بس، پھر میں نے اپنے دماغ کی تسکین کے لیے اس کا ڈھکنا اٹھا کر اندر جھانکا۔" بات ادھوری چھوڑ کر کرمو نے ایک جھرجھری لی پھر لمحاتی توقف کے بعد اپنے بیان میں بتایا۔

"صندوق کے اندر رفیق کھوکھر کے بڑے بیٹے اکبر کھوکھر کو بے ہوش پڑے دیکھ کر میرے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا اور میں نے تیز چال کر آس پاس کے کھیتوں میں کام کرنے والے لوگوں کو یہاں بلا لیا۔ پھر سب نے باری باری تیز آواز میں پکار کر اکبر کو جگانے کی کوشش کی لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ اس کی گہری اور پراسرار خاموشی نے ہمیں تشویش میں ڈال دیا۔ اس کے بعد کچھ لوگ اکبر کے گھر والوں کو بتانے چلے گئے اور دو افراد نے آپ کو اطلاع دینے کے لیے تھانے کا رخ کیا۔ بس سرکار! میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں جانتا۔"

"ٹھیک ہے۔" کرمو کے خاموش ہونے پر میں نے معتدل انداز میں کہا۔ "میں نے تمہاری بات سن لی اور اسے اپنے دماغ میں بھی بٹھا لیا ہے لیکن تحریری بیان ریکارڈ کروانے (لکھوانے) کے لیے آج کسی وقت میرے پاس تھانے آنا ہوگا۔"

"سر کے بل آؤں گا مائی باپ!" وہ فدویانہ لہجے میں بولا۔ "آپ جب حکم کریں گے، میں حاضر ہوجاؤں گا۔"

"چلو، اب تم اپنے جال کے ساتھ مصروف ہو جاؤ۔" میں نے سرسری انداز میں کہا۔ "یہ نہ ہو کہ یہاں کی صورت حال سے پریشان ہو کر تمہارے جال میں پھنسی ہوئی مچھلیاں واپس دریا کی موجوں میں شامل ہو جائیں۔"

وہ میری بات کو سمجھ پایا یا نہیں، بہرحال اثبات میں گردن ہلانے کے بعد وہ دریا کے اندر اتر گیا۔ میں دوبارہ اس چوبی صندوق اور اس کے اندر رکھی ہوئی اکبر کھوکھر کی لاش کی طرف متوجہ ہو گیا۔

وقوعہ پر پہنچنے کے بعد سے اب تک میں نے اکبر کھوکھر کے بے حس و حرکت جسم کے لیے "لاش" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ میری پیشہ ورانہ مہارت اور سالہا سال کے تجربے کا نتیجہ ہے کہ میں نے پہلی ہی نظر میں اس کی موت کا اندازہ لگا لیا تھا تاہم اس تفتیشی عمل کو اندازوں سے آگے بڑھانا ضروری تھا۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے میں نے صندوق میں موجود اکبر کے جسم کو باہر نکلوایا اور بغور اس کا جائزہ لینے لگا۔

اکبر کا جسم بری طرح اکڑا ہوا تھا اور بدن کے کسی بھی حصے پر مجھے کوئی زخم یا اندرونی چوٹ کا نشان نظر نہ آیا۔ میں نے اس کی گردن کا بھی باریک بینی سے جائزہ لیا۔ وہاں بھی مجھے ایسے آثار دکھائی نہ دیے جن کی بنا پر سمجھا جاتا کہ کسی شقی القلب شخص نے گلا دبا کر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا ہوگا۔ اکبر کھوکھر کی موت کا درست وقت تو پوسٹ مارٹم کے بعد ہی معلوم ہو سکتا تھا مگر اس کے جسم کی حالت اور اکڑاؤ کے پیش نظر میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ اسے اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئے کم از کم بارہ گھنٹے اور زیادہ سے زیادہ ایک پورا دن گزر چکا تھا اور سردست میں اس کی موت کے حوالے سے بھی دو اندازے لگانے کی پوزیشن میں تھا۔ نمبر ایک، اس کی موت کے پیچھے کسی سریع الاثر زہر کا ہاتھ تھا کیونکہ میں نے اس کی جلد کی رنگت میں ایک مخصوص تبدیلی نوٹ کی تھی اور نمبر دو، وہ طبعی موت مرا تھا۔

اکبر کھوکھر کی موت طبعی تھی یا کسی دشمن نے اسے موت کے منہ میں دھکیل دیا تھا، یہ راز زیادہ دیر تک مجھ سے چھپا نہیں رہ سکتا تھا۔ فی الحال ایک چوبی صندوق کے اندر سے اس کی لاش کا برآمد ہونا مجھے کئی زاویوں پر سوچنے کے لیے مجبور کر رہا تھا۔ یہ سب جس نے بھی کیا تھا، اس تک پہنچنا بہت ضروری تھا۔ اس کے بعد ہی اس کیس کو حل کیا جا سکتا تھا۔ ایک بات کا ذکر کرنا میں بھول گیا۔ مقتول اور مرحوم اکبر کھوکھر کے لباس کی تلاشی لیتے ہوئے دیگر چیزوں کے علاوہ اچھی خاصی رقم بھی میرے ہاتھ لگی تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ کسی ڈاکو نے لوٹنے کے لیے اسے قتل نہیں کیا تھا ورنہ وہ چھ سات سو روپے کے کرنسی نوٹ اس کی تین مختلف جیبوں میں یونہی چھوڑ کر نہ چلا جاتا۔

میں نے چھ سات سو روپوں کے لیے "اچھی خاصی رقم" کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اس پر حیران ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ واقعہ آج سے چونسٹھ، پینسٹھ سال پہلے کا ہے۔ موجودہ دور میں آپ اسے لاکھوں روپے سمجھ سکتے ہیں۔

وقوعہ کی ضروری کارروائی نمٹانے کے بعد میں نے کانسٹیبل شوکت علی کی نگرانی میں اکبر کھوکھر کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے ضلعی اسپتال روانہ کر دیا۔

اس کے بعد میں نے وہاں موجود افراد میں سے چند ایک کو اپنے سوالات سے گزار کر یہ جاننے کی کوشش کی کہ شاید وہ کچھ ایسا بتا سکیں جس سے اس پراسرار واقعے پر روشنی پڑ سکے مگر ان میں سے کوئی بھی کرمو مچھیرے سے زیادہ نہیں جانتا تھا۔ وہ سب تو کرمو کی پکار پر ہی وہاں پہنچے تھے۔

جس صندوق کے اندر سے اکبر کھوکھر کی لاش برآمد ہوئی تھی، اس کی لمبائی چھ فٹ، چوڑائی دو فٹ اور گہرائی ڈیڑھ فٹ تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا وہ صندوق خاص طور پر اسی مقصد کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ صندوق دریا کے کنارے جس مقام پر جھاڑیوں میں پھنسا ہوا پایا گیا تھا، وہ علاقہ موضع عزیز آباد کا تھا۔ دریا کا بہاؤ مشرق سے مغرب کی سمت تھا اور عزیز آباد سے مشرق میں پہلا گاؤں جو آتا تھا اس کا نام موضع فتح پور تھا لہٰذا یہ سمجھنے میں کوئی قباحت نہیں تھی کہ مذکورہ صندوق چار میل کا آبی سفر کر کے فتح پور سے عزیز آباد پہنچا ہوگا۔

اور اکبر کھوکھر کے باپ نے مجھے بتایا تھا کہ اس کا بیٹا گزشتہ روز اپنے ماما سے ملنے فتح پور گیا تھا۔

☆☆☆

وہ دوپہر کا وقت تھا اور میں مقتول اکبر کھوکھر کے گھر میں بیٹھا ہوا تھا۔ مقتول کا باپ رفیق کھوکھر اور ماں بشریٰ بھی میرے سامنے موجود تھے۔ ان کا چھوٹا بیٹا اصغر کھوکھر نظر نہیں آ رہا تھا۔ جائے واردات پر مجھے اچھی خاصی دیر ہو گئی تھی اس لیے میں رفیق کے ہمراہ اس کے گھر آ گیا تھا۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ وہ دونوں میاں بیوی اپنے جوان بیٹے کی حسرت ناک موت پر بے حد غمزدہ تھے۔

''رفیق! تم نے ادھر دریا کے کنارے مجھے بتایا تھا کہ اکبر کل فتح پور اپنے ماما سے ملنے گیا تھا۔'' میں نے دھیمے لہجے میں پوچھ تاچھ کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ کتنے بجے گھر سے نکلا تھا؟''

''فتح پور میں بشریٰ کا بڑا بھائی ملک خدا بخش رہتا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''اکبر کل صبح آٹھ بجے گھر سے نکلا تھا۔ وہ مہینے میں ایک دو بار ادھر کا چکر لگاتا رہتا ہے۔''

''میں اپنے بھائی کی بیٹی فرزانہ سے اکبر کی شادی کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔'' بشریٰ نے کہا۔ ''رشتے کی بات تو چل رہی ہے مگر بھابی شبنم نے روک لگا رکھی ہے اس لیے معاملہ ابھی تک کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔ میں اپنے بھائی کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ اکبر سے بہت محبت کرتا ہے۔ ایک نہ ایک دن شبنم کو گھٹنے ٹیکنے ہی پڑیں گے۔''

''کیا اکبر نے اپنی واپسی کے بارے میں کچھ بتایا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''جی تھانیدار صاحب!'' رفیق اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اس نے کہا تھا کہ شام تک وہ واپس لوٹ آئے گا لیکن جب کل اس کی واپسی نہیں ہوئی تو ہم نے یہی سمجھا کہ وہ رات وہیں رک گیا ہوگا، صبح کسی وقت آجائے گا اور.....'' وہ لمحے بھر کو تھما پھر روہانسی آواز میں بولا۔

''تھانیدار صاحب! آج وہ جس حالت میں لوٹا ہے، وہ آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے۔''

''پتا نہیں، کس دشمن کی ظالم نظر میرے جوان جہان بیٹے کو کھا گئی ہے۔'' بشریٰ نے دردناک لہجے میں کہا۔

''یقیناً یہ کسی جانی دشمن ہی کا کام ہو سکتا ہے کیونکہ دوست اس طرح کسی کو صندوق میں بند کر کے دریا برد نہیں کرتے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اکبر کل صبح فتح پور گیا تھا اور پھر زندہ واپس نہیں آیا۔ جس دریا سے اس کی صندوق بند لاش برآمد ہوئی ہے، اس کا بہاؤ فتح پور سے عزیز آباد کی جانب ہے جس سے فوری طور پر ذہن میں یہی آتا ہے کہ کسی نے ادھر فتح پور ہی میں اکبر کو موت کے گھاٹ اتارا اور پھر اس کی لاش کو ایک چوبی صندوق میں رکھ کر دریا کی موجوں کے حوالے کر دیا۔ میں جاننا چاہوں گا کہ ادھر فتح پور میں آپ کی کسی سے دشمنی وغیرہ تو نہیں ہے؟''

اس انتہائی سنجیدہ اور گمبھیر گفتگو کے دوران میں، میں اہم نکات کو اپنی ڈائری میں نوٹ بھی کرتا جا رہا تھا تا کہ یادداشت سے اتر جانے کے باوجود بھی ڈائری کے صفحات پر محفوظ رہیں اور بوقتِ ضرورت کام آئیں۔

''ہماری تو کسی سے دشمنی نہیں ہے تھانیدار صاحب!'' رفیق نے معتدل انداز میں جواب دیا۔ ''نہ عزیز آباد میں اور نہ ہی فتح پور میں۔ مجھے بالکل اندازہ نہیں کہ اکبر کی موت کا ذمے دار کون ہو سکتا ہے۔''

''بھابی شبنم مجھے پسند کرتی ہے اور نہ ہی رفیق کو۔'' بشریٰ نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''اور ہمارے دونوں بیٹوں سے بھی کبھی اس نے محبت یا اپنائیت کا اظہار نہیں کیا لیکن میں سمجھتی ہوں یہ کوئی ایسی بات نہیں کہ وہ عورت میرے بچوں کی جان کی دشمن بن جائے۔ شبنم مزاج کی تیز ضرور ہے لیکن وہ بھائی کے آگے زبان چلانے کی جرأت نہیں رکھتی۔ جب وہ اپنی اوقات سے باہر آنے لگتی ہے تو بھائی خدا بخش ایک دبکا مار کر اسے چپ کرا دیتے ہیں۔''

''بیٹوں کے ذکر پر یاد آیا کہ تمہارا چھوٹا بیٹا اصغر مجھے کہیں نظر نہیں آیا۔'' میں نے باری باری ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''نہ ادھر دریا کنارے اور نہ ہی گھر میں۔ کیا وہ گاؤں سے باہر گیا ہوا ہے؟''

''اصغر کو میں نے آج ہی فتح پور روانہ کیا ہے۔'' رفیق نے بتایا۔ ''جب مجھے پتا چلا کہ دریا میں سے اکبر کی لاش ملی ہے تو ہم دونوں باپ بیٹا دریا کی طرف گئے تھے اور آپ کی آمد سے قبل میں نے اصغر کو فتح پور بھیج دیا تا کہ وہ پتا چلائے کہ وہاں اکبر کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہے۔''

''فتح پور اور عزیز آباد میں لگ بھگ چار میل کی مسافت ہے۔'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''پیدل سفر کرنے والا کوئی بھی بندہ ایک گھنٹے میں یہ فاصلہ طے کر سکتا ہے۔ اس حساب سے اصغر کو شام سے پہلے وہاں کی مکمل جانکاری لے کر واپس آجانا چاہیے۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں تھانیدار صاحب!'' رفیق ٹھہرے ہوئے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں نے اصغر کو تاکید کی ہے کہ جتنی جلدی ممکن ہو، وہ واپس آکر مجھے بتائے کہ وہاں اکبر پر کیا بیتی ہے۔''

''میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔'' بشریٰ نے بھیگی ہوئی آواز میں کہا۔ ''اکبر تو ہمیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ کہیں اصغر کے ساتھ بھی کچھ ایسا ویسا نہ ہو جائے۔ تین چار ماہ کے بعد تو اس کی شادی بھی طے تھی۔''

''خود کو سنبھالو بشریٰ!'' رفیق نے تسلی بھرے انداز میں کہا۔ ''اللہ خیر کرے گا۔ اصغر کو کچھ نہیں ہوگا۔ وہ تھوڑی دیر میں فتح پور سے واپس آجائے گا۔ اگر تم اسی طرح بار بار روتی رہیں تو میں بھی حوصلہ ہار جاؤں گا۔'' بات کے اختتام

"پھر رفیق کی آواز میں نمی اتر آئی تھی۔

یہ کیس بظاہر ایک سیدھی سادی قتل کی واردات نظر آتا تھا لیکن اس کے اندر پیچ در پیچ بہت کچھ چھپا ہوا تھا۔ یہ راہزنی کا واقعہ بھی نہیں تھا۔ اگر یہ کسی لٹیرے یا ڈاکو کی کارروائی ہوتی تو وہ ایک بڑی رقم اکبر کھوکھر کی جیبوں میں چھوڑ کر نہ جاتا۔ پھر صندوق کے اندر لاش کو رکھ کر اسے دریا میں بہا دینا بھی سوچ میں الجھن کا جال پھیلا دیتا تھا اور اب اصغر کی شادی کا ذکر.....!

"اصغر کی شادی کب ہو رہی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اگلے سال کے تیسرے مہینے میں جناب!" رفیق نے بتایا۔ "میں نے اصغر کا رشتہ اپنے بڑے بھائی صدیق کھوکھر کی بیٹی فوزیہ کے ساتھ طے کر رکھا ہے۔ وہ لوگ بھی ادھر عزیز آباد ہی میں رہتے ہیں۔"

"اچھا تو یہ بات ہے۔" میں نے متاسفانہ انداز میں کہا پھر کریدنے والے انداز میں پوچھا۔ "یہ کچھ عجیب سا نہیں ہے۔ بڑے بھائی کا رشتہ ابھی پکا نہیں ہوا تھا اور چھوٹے بھائی کی شادی سر پر آگئی ہے؟"

"بشریٰ کے اپنے بھائی ملک خدا بخش سے مذاکرات جاری تھے تھانیدار صاحب!" رفیق نے بتایا۔ "امید تھی کہ خدا بخش اپنی گھر والی کو اس رشتے کے لیے راضی کر لے گا۔ میری خواہش تھی کہ دونوں بھائیوں کی شادی ایک ساتھ مارچ ہی میں ہو۔ آگے جو مرضی میرے سوہنے رب کی۔"

"میں نے اپنے بیٹے کو ہر قیمت پر اپنے بھائی کے گھر سے بیاہنے کا خواب دیکھ رکھا تھا۔" بشریٰ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "اور بھائی خدا بخش نے میرا یہ خواب پورا کرنے کا مجھے یقین بھی دلایا تھا مگر وہی بات کہ اللہ کو یہ منظور نہیں تھا۔ اس نے میرے نصیب میں اکبر کے سہرے کے نہیں، اس کی تربت کے پھول دیکھنا لکھ رکھا تھا۔" بات ختم کرتے ہی وہ بلک بلک کر رونے لگی۔

وہ میت والا گھر تھا اس لیے وہاں لوگوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا جن میں زیادہ تر رفیق کھوکھر کے نزدیکی رشتے دار تھے۔ میں نے ان میاں بیوی کو زیادہ مصروف رکھنا مناسب نہ سمجھا اور یہ کہتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"میں اب چلتا ہوں۔ تم لوگ گھر میں تعزیت کے لیے آنے والوں کو دیکھو۔ جب اصغر گوجرہ سے واپس آجائے اور وہ جو بھی کہانی سنائے، اس کے بارے میں

فوری طور پر مجھے بتاتا ہے۔''

''جو حکم سرکار!'' رفیق کھوکھر نے فرماں برداری سے کہا۔

''بلکہ تم اصغر کو میرے پاس تھانے بھیج دینا۔'' میں نے ایک فوری خیال کے تحت کہا۔ ''میں خود اس سے پوچھ تاچھ کروں گا۔''

''جی... ٹھیک ہے۔'' رفیق نے اثبات میں جواب دیا۔

''تھانیدار صاحب!'' بشریٰ نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔ ''اکبر کی لاش ہمیں کب تک مل جائے گی؟''

''میرے محتاط اندازے کے مطابق کل شام سے پہلے کسی بھی وقت تمہارے بیٹے کی لاش اسپتال سے تھانے پہنچا دی جائے گی۔'' میں نے اسے بتایا۔ ''لاش جیسے ہی میری تحویل میں آئے گی، میں تم لوگوں کو اطلاع دے دوں گا۔''

ان غمزدہ میاں بیوی کو تسلی دلاسا دے کر جب میں گھر سے نکلا تو دو افراد سے میرا سامنا ہو گیا۔ یقیناً وہ لوگ بھی اکبر کھوکھر کی المناک موت پر رفیق اور اس کی بیوی بشریٰ کو پرسا دینے آئے ہوں گے۔ ان میں سے ایک جوان العمر اور دوسرا ادھیڑ عمر ہی دکھائی دیتا تھا۔

''السلام علیکم تھانیدار صاحب!'' سن رسیدہ شخص نے مجھے سلام کیا۔

میں نے اس کے سلام کا جواب دیا تو اس کے ساتھی جوان نے بڑے کڑوے لہجے میں مجھ سے ایک غیر متوقع سوال کر دیا۔

''تھانیدار صاحب! آپ نے اکبر کی لاش کو اسپتال بھجواتے میں کچھ زیادہ ہی جلدی نہیں دکھا دی؟''

''تم کون ہو؟'' میں نے اکھڑے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''میرا نام قادر ہے۔'' وہ اپنا تعارف کراتے ہوئے بولا۔ ''اور یہ میرے ابا جی ہیں، صدیق کھوکھر!'' وہ اپنے ساتھی کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ہمیں جب اس واقعے کی اطلاع ملی تو ہم فوراً دریا کے کنارے پہنچ گئے تھے لیکن تب تک آپ اکبر کی لاش کو وہاں سے روانہ کر چکے تھے۔ ہم اکبر کا منہ بھی نہیں دیکھ سکے۔''

قادر کے نام سے تعارف کرانے والے اس نوجوان کی عمر اٹھارہ کے اریب قریب تھی۔ وہ مزاج کا تیز اور خاصا پرغرور نظر آتا تھا۔ اس کی بے وقوفانہ بات پر مجھے غصہ بھی آیا اور ہنسی بھی تاہم وہ ایسا موقع نہیں تھا کہ میں حماقت کے اس مظاہرے پر اس کی ''مزاج پرسی'' کرواتا۔ سو، میں نے معتدل انداز میں کہا۔

''برخوردار! میں نے اپنا فرض نبھاتے ہوئے قانون کے تقاضوں کو پورا کیا ہے۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ کل کسی وقت تمہیں اکبر کھوکھر کا منہ دیکھنے کا پورا موقع ملے گا کیونکہ...'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک آسودہ سانس خارج کی پھر ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

''کیونکہ میں نے اکبر کھوکھر کی لاش کو تدفین کے لیے قبرستان نہیں بلکہ پوسٹ مارٹم کے لیے سرکاری اسپتال بھیجا ہے جہاں سے وہ کل میرے تھانے واپس آ جائے گی۔''

قادر لاجواب سا ہو کر مجھے تکنے لگا۔ میں نے اس کا شانہ تھپتھپایا اور آگے بڑھ گیا۔ وہ دونوں باپ بیٹا میت والے گھر میں داخل ہو گئے۔

رفیق کھوکھر اور اس کی بیوی بشریٰ سے بات چیت کے دوران میں مجھے یہ تو معلوم ہو چکا تھا کہ انہوں نے اپنے چھوٹے بیٹے اصغر کا رشتہ صدیق کھوکھر کی بیٹی فوزیہ سے طے کر رکھا تھا اور آئندہ سال مارچ میں ان کی شادی ہونے والی تھی لیکن بدقسمتی اکبر کا معاملہ کھٹائی میں بلکہ اندھی کھائی میں جا گرا تھا۔ پتا نہیں اس میں اکبر کی سماجی حیثیت کی کوئی بدخواہی تھی یا اس کے نصیب میں کاتب تقدیر نے کنوارا مرنا ہی لکھا ہوا تھا۔

میں صدیق کھوکھر اور اس کی فیملی کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا لیکن رفیق کھوکھر کے گھر سے نکلتے ہوئے صدیق کھوکھر اور اس کے جوان سال بیٹے قادر سے جو میری مختصر سی ملاقات ہوئی تھی اس نے مجھے بتا دیا تھا کہ قادر ایک نامعقول اور غصیلا لڑکا تھا جبکہ صدیق کھوکھر اولاد سے دبنے والا ایک مجبور باپ۔

☆☆☆

آج بارہ نومبر، جمعرات کا دن تھا۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق اکبر کھوکھر کی موت گزشتہ روز کسی وقت واقع ہوئی تھی۔ اکبر کی لاش نے مجھے کئی زاویوں سے الجھن میں ڈال رکھا تھا اور میں تھانے میں بیٹھا مسلسل اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

شام سے تھوڑی دیر پہلے کانسٹیبل اکرام شاہ نے آکر مجھے اطلاع دی کہ اکبر کا چھوٹا بھائی اصغر مجھ سے ملنے آیا ہے۔ اکرام شاہ کا تعلق موضع عزیز آباد سے تھا اسی لیے وہ وہاں کے تمام دیہاتیوں کو اچھی طرح جانتا تھا۔

''اسے فوراً میرے پاس بھیجو۔'' میں نے کانسٹیبل سے کہا۔

دن میں جب میں مقتول کے گھر میں بیٹھا اس کے

والدین سے بات چیت کر رہا تھا تو رفیق کھوکھر نے مجھے بتایا تھا کہ اس نے اپنے چھوٹے بیٹے اصغر کھوکھر کو معلومات حاصل کرنے فتح پور بھیجا ہوا ہے۔ میں نے اسے اصغر کو تھانے بھیجنے کے لیے کہہ دیا تھا اور اب اصغر مجھ سے ملنے آ گیا تھا۔

اصغر کھوکھر کی عمر بائیس سال رہی ہوگی۔ وہ ایک دراز قامت اور متناسب البدن نوجوان تھا۔ وہ میرے سامنے آ کر کھڑا ہوا تو میں نے اسے کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا۔

''تھانیدار صاحب!'' مجھے سلام کرنے کے بعد اس نے کہا۔ ''اباجی نے مجھ سے کہا کہ آپ سے جا کر ملوں۔ میں اسی لیے تھانے آیا ہوں۔''

اس کی آواز سے گہرے رنج و غم کا اظہار ہوتا تھا۔ اس کے بڑے بھائی کی موت واقع ہو چکی تھی۔ ظاہر ہے ان حالات میں اسے رنجیدہ اور دکھی ہی ہونا چاہیے تھا۔

''اصغر! مجھے تمہارے بھائی کے ساتھ پیش آنے والے حادثے کا سخت افسوس ہے۔'' میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ ''میرا تم سے وعدہ ہے کہ جب تک میں اکبر کھوکھر کے قاتل کو کڑی سے کڑی سزا نہ دلوا دوں، چین سے نہیں بیٹھوں گا۔''

''بہت شکریہ تھانیدار صاحب!'' وہ بجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''لیکن سزا دلوانے سے پہلے آپ کو اسے پکڑنا ہوگا اور فی الحال تو آپ اس کمینے شخص کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں نا؟''

''تم بڑی حد تک ٹھیک کہہ رہے ہو اصغر!'' میں نے نرم لہجے میں کہا۔ ''لیکن میری یہ بے خبری زیادہ عرصے تک نہیں رہے گی۔ میں بہت جلد اکبر کے قاتل کی گردن دبوچنے میں کامیاب ہو جاؤں گا اور اس نیک مقصد کو حاصل کرنے میں تم میری مدد کرو گے۔''

''میں؟'' وہ چونکی ہوئی نظر سے مجھے تکنے لگا۔

''جس چوبی صندوق میں سے تمہارے بھائی کی لاش برآمد ہوئی ہے، وہ فتح پور سے دریا کے پانی میں بہتے ہوئے عزیز آباد پہنچا ہے۔ میں یہ بات دریا کے بہاؤ کی سمت کے پیش نظر کہہ رہا ہوں۔'' میں نے اصغر کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا بھائی اپنے ماما ملک خدا بخش سے ملنے کل صبح فتح پور گیا تھا لہٰذا اس بات کا قوی امکان ہے کہ اکبر کو پیش آنے والے جان لیوا حادثے کا تعلق فتح پور ہی سے ہے اور تم میری مدد کچھ اس طرح کرو گے کہ......'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر اصغر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

''تم ابھی فتح پور سے ہو کر آئے ہو۔ مجھے وہاں کے حالات کے بارے میں بتاؤ تاکہ میں اپنی تفتیش کو آگے بڑھا سکوں۔''

''آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ اکبر بھائی کل فتح پور گیا ہی نہیں تھا۔'' وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔

میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ''یہ تم کیا کہہ رہے ہو اصغر؟''

''میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں تھانیدار صاحب!'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''میں یہاں سے سیدھا اپنے ماما کے گھر گیا تھا۔ ان لوگوں نے مجھے بتایا کہ اکبر بھائی ان کے پاس نہیں پہنچا تھا۔ فتح پور میں کسی اور شخص نے بھی کل اکبر کو نہیں دیکھا۔ اکبر کی موت کی خبر سن کر ماما کے گھر میں تو کہرام مچ گیا تھا۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اکبر بھائی کے ساتھ آخر ہوا کیا ہے؟''

''تم نے جو کچھ بتایا ہے، اس نے صورت حال کو پہلے سے کہیں زیادہ پیچیدہ اور گمبھیر بنا دیا ہے اصغر!'' میں نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ ''اکبر کل صبح فتح پور جانے کے لیے اپنے گھر سے روانہ ہوا تھا لیکن تمہارے ماما یعنی ملک خدا بخش کے بیان کے مطابق وہ ان کے پاس نہیں پہنچا پھر آج صبح عزیز آباد کی حدود میں اس کی اکڑی ہوئی لاش ایک چوبی صندوق کے اندر بند دریا کے پانی میں، جھاڑیوں میں پھنسی ملتی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تمہارے بھائی کی موت کا ذمے دار کون ہے؟ اسے کب اور کہاں قتل کے گھاٹ اتارا گیا اور صندوق میں اس کی لاش کو بند کرنے سے قاتل کا مقصد کیا تھا؟''

''ان تمام سوالات کے جوابات آپ کو تلاش کرنا ہیں تھانیدار صاحب!'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''میرا دماغ تو بالکل کام نہیں کر رہا۔''

''میں تمہاری ذہنی کیفیت کو اچھی طرح سمجھ رہا ہوں اصغر!'' میں نے رسانیت بھرے لہجے میں کہا۔ ''ابھی تم گھر جاؤ اور اس نقطے پر مسلسل غور کرتے رہو کہ اکبر کا ایسا کون سا دشمن تھا جس نے اس کی زندگی کا چراغ گل کر دیا۔ تم کل دن میں کسی وقت میرے پاس آؤ پھر ہم اس موضوع پر دوبارہ بات کریں گے۔''

''ٹھیک ہے جناب!'' وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولا۔ ''اس وقت تو میں خود کو بات کرنے کے قابل بھی نہیں پا رہا ہوں۔ آپ کے حکم کے مطابق میں کل دوپہر کے بعد دوبارہ یہاں آ جاؤں گا۔ ویسے بھائی کی لاش کب تک

اسپتال سے آجائے گی؟"

"امید ہے کل دوپہر تک اکبر کھوکھر کی لاش پوسٹ مارٹم رپورٹ کے ساتھ تھانے پہنچ جائے گی۔" میں نے کہا۔ "کاغذی کارروائی کے بعد میں لاش کو تمہارے حوالے کر دوں گا۔"

وہ میرا شکریہ ادا کر کے جانے لگا تو میں نے تاکیدی لہجے میں کہا۔ "اصغر! تم نے اکبر کے کسی دشمن کے بارے میں سوچنے کے علاوہ ایک اور اہم کام بھی کرنا ہے۔"

اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔ میں نے اپنی بات مکمل کر دی۔ "جس صندوق کے اندر سے تمہارے بھائی کی لاش برآمد ہوئی ہے، اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنا بھی ضروری ہے۔ اگر ہم اس صندوق کے مالک تک پہنچ جائیں تو پھر ہمارا اگلا ہاتھ قاتل کی گردن پر ہوگا۔"

"میں سمجھ گیا تھانیدار صاحب!" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "ویسے میں نے اس صندوق کو پہلے کبھی نہیں دیکھا لیکن پھر بھی میں اس بات کو ذہن میں رکھوں گا۔"

وہ مجھے سلام کر کے رخصت ہو گیا تو میں نے حوالدار انور علی کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ جب میں رفیق کھوکھر کے گھر سے واپس آیا تھا تو اس وقت بھی حوالدار سے میری تفصیلی بات ہوئی تھی۔ وہ سلام کرنے کے بعد میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ تو میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"انور علی اس کیس میں ایک خطرناک موڑ آ گیا ہے۔"

"آپ کس موڑ کی بات کر رہے ہیں ملک صاحب؟" وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "کیا اس صندوق کے مالک کا پتا چل گیا ہے؟"

"ایسی بات نہیں ہے انور علی!" میں نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "میں نے جس خطرناک موڑ کا تذکرہ کیا ہے، اس کا تعلق مقتول اکبر کے فتح پور نہ پہنچنے سے ہے۔"

"اس کا کیا مطلب ہوا ملک صاحب؟" حوالدار کی آنکھوں میں الجھن بھری حیرت نمودار ہوئی۔ "آپ نے بتایا تھا کہ مقتول کے باپ کے بیان کے مطابق وہ کل صبح آٹھ بجے فتح پور جانے کے لیے اپنے گھر سے نکلا تھا؟"

"رفیق کھوکھر نے غلط بیانی نہیں کی تھی۔" میں نے متحمل انداز میں کہا۔ "لیکن اصغر فتح پور کا چکر لگا کر آیا ہے اور یہ بڑے دعوے سے کہہ رہا ہے کہ اکبر کھوکھر کل اپنے ماما ملک خدا بخش کے گھر پہنچا تھا اور نہ ہی فتح پور میں کسی شخص نے اسے دیکھا ہے۔"

"اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ قاتل جو کوئی بھی ہے وہ مقتول کے فتح پور جانے والے پروگرام سے واقف تھا۔" حوالدار سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔ "اس نے راستے ہی میں کسی مقام پر اکبر کو گھیر کر موت کے گھاٹ اتار دیا اور پھر اس کی لاش کو ایک صندوق میں بند کر کے بہا دیا۔ میں یہاں پر ایک بات کہنا چاہوں گا ملک صاحب!"

"ہاں، کیوں نہیں...... ضرور!" میں نے جلدی سے کہا۔ "بات چیت ہی سے تو معاملات آگے بڑھتے ہیں اور انسان کسی نتیجے پر پہنچ پاتا ہے۔"

"مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ قاتل کوئی نہایت ہی شاطر اور چالباز شخص ہے۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "وہ پولیس کی تفتیش کو کسی اور رخ پر ڈالنا چاہتا ہے تاکہ ہم بھی اس تک رسائی حاصل نہ کر سکیں۔"

"تمہاری بات میں وزن ہے انور علی!" میں نے توصیفی نظر سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ "بتاؤ اس حوالے سے تمہارے ذہن میں اس وقت کیا چل رہا ہے؟"

"دیکھیں جناب!" وہ ٹھہرے ہوئے انداز میں بولا۔ "یہ تو ثابت ہو چکا کہ مقتول کل فتح پور نہیں پہنچ سکا تھا۔ عزیز آباد سے فتح پور کے درمیان صرف چار میل کا فاصلہ ہے اور اسی راستے پر قاتل گھات لگائے اس کے انتظار میں بیٹھا ہوا تھا۔ قاتل نے کسی طرح مقتول پر قابو پا کر اسے موت کے گھاٹ اتارا اور پھر اس کی لاش کو چوبی صندوق میں رکھ کر دریا میں بہا دیا تاکہ ایسا لگے کہ مقتول کی لاش فتح پور سے عزیز آباد پہنچی ہے۔ قاتل اس کیس میں واردات کا سارا ملبا فتح پور پر ڈالنا چاہتا ہے۔"

"انور علی! تمہاری تھیوری کا ایک حصہ تو با آسانی میری سمجھ میں آ رہا ہے۔" میں نے رسانیت بھرے لہجے میں کہا۔ "لیکن بعض حقائق کہیں بھی فٹ نہیں بیٹھ رہے۔"

"مثلاً کون سے حقائق ملک صاحب؟" وہ استفساریہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

"یہ طے ہو گیا کہ اکبر کھوکھر کل فتح پور نہیں پہنچ سکا تھا۔" میں نے جواب دیا۔ "آج کل دریا کی رفتار چار سے پانچ میل فی گھنٹا ہے۔ یعنی اگر اس صندوق کو فتح پور سے دریا کی موجوں کے حوالے کیا گیا ہوتا تو اسے ایک گھنٹے میں عزیز آباد کی حدود میں پہنچ جانا چاہیے تھا لیکن......" لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی اور پھر اپنی بات پوری کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن کرمو مچھیرے نے مجھے بتایا ہے کہ گزشتہ روز شام میں اس نے اپنا جال دریا میں پھینک دیا تھا اور اس وقت وہاں یہ صندوق نہیں تھا۔ مذکورہ چوبی صندوق رات کے کسی حصے میں وہاں پہنچ کر جھاڑیوں میں پھنس گیا تھا اور اکبر کھوکھر کی اکڑی ہوئی لاش ہمیں بتاتی ہے کہ اسے کل دن میں کسی وقت سپردِ موت کیا گیا تھا۔"

"سمجھ گیا ملک صاحب!" حوالدار نے قدرے جوشیلے لہجے میں کہا۔ "قاتل ہمارے دھیان کو بھٹکا کر فتح پور کی طرف لے جانا چاہتا ہے لیکن ہمیں اپنی توجہ عزیز آباد اور اس کے گرد و نواح پر مرکوز کرنا ہوگی۔"

"میں تمہاری بات سے مکمل اتفاق کرتا ہوں۔" میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "لیکن ہم فتح پور کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ کل صبح تم فتح پور روانہ ہو جاؤ۔ وہاں کی تفتیش اور تحقیق میں تمہیں سونپ دی ہے۔ یہاں کے معاملات کو میں خود دیکھ لوں گا۔ امید ہے، ایک آدھ روز میں ہم لوگ قاتل کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔"

"ان شاءاللہ!" اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔

اسی وقت کانسٹیبل اکرام شاہ کمرے میں داخل ہوا اور میری طرف دیکھتے ہوئے منت ریز لہجے میں بولا۔ "ملک صاحب! آج میں ذرا جلدی گھر جانا چاہتا ہوں۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو۔"

"ادھر تھانے میں ہنگامی حالات چل رہے ہیں اور تمہیں گھر جانے کی پڑی ہوئی ہے۔" میں نے اسے تیز نظر سے گھورا۔

"میرے بچے کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے ملک صاحب!" وہ لجاجت بھرے انداز میں بولا۔ "کل صبح میں جلدی ڈیوٹی پر حاضر ہو جاؤں گا۔"

کانسٹیبل اکرام شاہ کا تعلق موضع عزیز آباد سے تھا اور وہ ایک محنتی پولیس اہلکار تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے، تم بے شک گھر جاؤ اور صبح جلدی آنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ میں تمہیں تھوڑا ہوم ورک دے رہا ہوں۔ وہ مکمل کرنے کے بعد ہی لوٹنا۔"

"ہوم ورک؟" اس نے متذبذب نظر سے مجھے دیکھا۔

"تم عزیز آباد کے رہنے والے ہو۔" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "یہاں کے دیہاتیوں اور ان کے معاملات سے تمہیں اچھی طرح آگاہی ہوگی۔ میں چاہتا ہوں کہ تم پتا لگانے کی کوشش کرو، اکبر کھوکھر کی موت میں کس کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔"

"سمجھ گیا ملک صاحب!" وہ فرمانبرداری سے گردن کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ "میں یہ بھی جاننے کی کوشش کروں گا کہ وہ چوبی صندوق کس شخص کی ملکیت ہے۔"

"شاباش!" میں نے ستائشی نظر سے اسے دیکھا اور کہا۔ "اب تم اپنے گھر روانہ ہو جاؤ۔"

کانسٹیبل اکرام شاہ کے جانے کے بعد میں اور حوالدار انور علی آئندہ روز کا لائحہ عمل تیار کرنے میں مصروف ہو گئے۔

☆☆☆

تیرہ نومبر بروز جمعہ دوپہر کے وقت پوسٹ مارٹم کی ابتدائی رپورٹ کے ساتھ اکبر کھوکھر کی لاش تھانے پہنچا دی گئی اور اس رپورٹ نے میرے دماغ میں ہلچل مچا دی تھی۔

مذکورہ رپورٹ کے مطابق مقتول اکبر کھوکھر کی موت گیارہ نومبر کی صبح آٹھ اور دس بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی اور اس کی موت کا سبب تھا زہر خورانی۔ گویا جب کرمو مچھیرے نے صندوق میں رکھی لاش کو دیکھا تو اکبر کھوکھر کو اس دنیا سے رخصت ہوئے چوبیس گھنٹے گزر چکے تھے۔ میں نے اس اکڑی ہوئی لاش کو دیکھنے کے بعد دو اندازے قائم کیے تھے۔ یا تو وہ موت طبعی تھی اور یا پھر اسے زہر دے کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ میرا یہ دوسرا اندازہ سولہ آنے سچ نکلا تھا۔

یہاں پر کئی ایک سنسنی خیز سوالات سر اٹھاتے تھے۔ اکبر کھوکھر گیارہ نومبر بدھ کی صبح آٹھ بجے اپنے گھر سے نکلا تھا۔ اسے فتح پور کا سفر درپیش تھا لیکن پوسٹ مارٹم کی رپورٹ اس کی موت کا وقت اسی روز آٹھ اور دس بجے کے بیچ بتا رہی تھی گویا یہ کہا جا سکتا تھا کہ گھر سے روانہ ہونے کے بعد اس کی موت واقع ہوئی تھی۔ یہ اسی صورت ممکن تھا کہ گھر سے نکلنے کے فوراً بعد اسے کسی نے سریع الاثر زہر کھلا دیا ہو اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وقوعہ کے روز اس نے جو ناشتا کیا، وہ زہریلا ہو۔ اس بات کو چیک کیا جا سکتا تھا کہ ناشتے میں کھائی جانے والی خوراک نارمل تھی یا زہر آلود اور اگر اسے گھر سے نکلنے کے بعد زہر دیا گیا تھا تو پھر یہ سوچنے کی ضرورت تھی کہ اس کی جان کا دشمن کون تھا؟ علاوہ ازیں اکبر کھوکھر کی اکڑی ہوئی لاش بھی بہت کچھ سوچنے کا تقاضا کر رہی تھی۔ یہ بات کسی معمے سے کم نہیں تھی کہ قاتل نے مقتول کی لاش کو پورا دن صندوق کے اندر کس مقصد سے

چھپائے رکھا تھا؟ ان تازہ ترین حالات میں یہی سمجھ میں آرہا تھا کہ مقتول گھر سے تو نکلا مگر اسے اپنے ماما ملک خدا بخش کے پاس پہنچنا نصیب نہیں ہوا تھا اور قاتل نے چوبی صندوق کو دریا میں پھینک کر ایسی سازش بنی تھی کہ مقتول کی موت کی ذمے داری تیغ پور والوں کے حصے میں آجائے۔

شروع میں یہ کیس جتنا سادہ محسوس ہوا تھا درحقیقت ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔ ہر قدم پر اس کیس کا زاویہ تبدیل ہوتا جارہا تھا جس کی وجہ سے صورتِ حال بری طرح الجھ کر رہ گئی تھی۔

دوپہر کے بعد مقتول کا چھوٹا بھائی اصغر کھوکھر حسبِ وعدہ مجھ سے ملنے تھانے آیا تو مقتول کی لاش اس کے حوالے کرنے سے پہلے میں نے چند اہم سوال کیے۔

"اصغر! مجھے بتاؤ وقوعہ کے روز تمہارے گھر میں کیا ہوا تھا؟"

"ہمیں پتا چلا تھا کہ کرموچھیرے نے دریا سے کوئی صندوق نکالا ہے جس کے اندر اکبر بھائی کی لاش رکھی ہوئی ہے۔" وہ میرے سوال کے جواب میں بولا۔ "میں ابا جی کے ساتھ دریا کی طرف چلا گیا تھا اور پھر ابا جی نے مجھے تیغ پور روانہ کردیا تھا۔"

"میں کل صبح کی نہیں، پرسوں صبح گیارہ نومبر بروز بدھ کی بات کررہا ہوں۔" میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر سپاٹ آواز میں کہا۔ "پوسٹ مارٹم رپورٹ میں تمہارے بھائی کی موت کا وقت گیارہ نومبر صبح آٹھ سے دس بجے کے درمیان کا لکھا ہوا ہے یعنی جب وہ تیغ پور جانے کے لیے اپنے گھر سے روانہ ہوا تو اس کے تھوڑی دیر بعد ہی اس کی موت واقع ہوگئی تھی۔"

"اوہ...... تو یہ بات ہے۔" وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

"ہاں، بات تو یہی ہے مگر اسے معمولی یا حقیر نہیں سمجھنا۔" میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔ "مجھے بتاؤ، جب اکبر گھر سے نکلا تو تم کہاں تھے؟"

"میں اس وقت گھر ہی میں تھا جناب!" اس نے بتایا۔

"اس روز اکبر نے ناشتے میں کیا کھایا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"دیسی گھی کا پراٹھا، آم لیموں مرچی کا اچار اور اس کے بعد لسی۔" اس نے جواب دیا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے استفسار کیا۔ "اور تم نے؟"

"وہی سب کچھ جو اکبر بھائی نے کھایا تھا۔" وہ معتدل انداز میں بولا۔ "ہم دونوں بھائیوں نے ایک ساتھ بیٹھ کر ناشتا کیا تھا۔ امی پراٹھے بنا رہی تھیں اور ابا جان ہم سے پہلے ناشتا کرچکے تھے۔"

"کتنی عجیب بات ہے اصغر!" میں نے معنی خیز آواز میں کہا۔ "گیارہ نومبر کی صبح تم دونوں بھائیوں اور تمہارے ماں باپ نے ایک جیسا ناشتا کیا تھا لیکن تم تینوں بالکل ٹھیک ٹھاک ہو اور تمہارا بھائی موت کے منہ میں جاچکا ہے۔"

"اکبر بھائی کی موت کا ناشتے سے کیا تعلق ہے تھانیدار صاحب؟" وہ سراسیمہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے مستفسر ہوا۔

"بہت گہرا اور خطرناک تعلق ہے اصغر کھوکھر!" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "تمہارے بھائی کی موت زہرخورانی سے ہوئی ہے اور یہ بات پوسٹ مارٹم رپورٹ میں بڑے واضح انداز میں لکھی ہوئی ہے۔"

"اوہ!" وہ ایک بوجھل سانس خارج کرکے رہ گیا۔

"مقتول کے معدے کے تجزیے سے بھی یہی پتا چلا ہے کہ تمہارے بھائی کی موت کا سبب ایک مہلک زہر ہی ہے۔" میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"اگر یہ بات سچ ہے تو پھر میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ گھر سے روانہ ہونے کے بعد کسی نے بھائی کو کوئی زہریلی چیز کھلائی ہوگی۔" وہ پُرسوچ انداز میں بولا۔ "کیونکہ اگر اس روز والا ناشتا زہریلا ہوتا تو اس وقت ہم چاروں میں سے کوئی ایک بھی زندہ نہ ہوتا۔"

"منطقی طور پر تمہاری بات درست ہے اصغر!" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "لیکن میری کھوپڑی میں ایک پولیس افسر کا ذہن ہے جو سامنے نظر آنے والی حقیقت اور اس کے پیچھے جھلکتی منطق کو بھی بعض اوقات نظرانداز کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ ایسی صورت میں ہم لوگ بالکل الو کے انداز میں سوچتے ہیں اور بالآخر کسی نتیجے پر پہنچ ہی جاتے ہیں۔ یہ جان کر تمہیں حیرت ہوگی کہ اگر ہم نے کسی گمشدہ گھوڑے کو تلاش کرنا ہو تو خود بھی گھوڑا بن جاتے ہیں۔"

"آپ کی یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھانیدار صاحب!" وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا۔ "کوئی انسان بھلا گھوڑا کیسے بن سکتا ہے؟"

"سوچ کی حد تک ضرور بن سکتا ہے۔" میں نے معتدل انداز میں کہا۔ "ہم لاپتا گھوڑے کا سراغ لگانے

کے لیے کسی گھوڑے کی طرح سوچتے ہیں کہ ہمیں ایسی صورت حال میں کہاں ہونا چاہیے؟ پھر حالات و واقعات اور حاصل معلومات کی روشنی میں ہم چل پڑتے ہیں اور بہت جلد ہم اس جگہ پر پہنچ جاتے ہیں جہاں وہ گمشدہ گھوڑا موجود ہوتا ہے۔''

''تھانیدار صاحب!'' وہ بیزاری سے بولا۔ ''آپ کی تفتیش کے اس انوکھے طریقے کو سمجھنا میرے بس کی بات نہیں۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو میں اکبر بھائی کی لاش کو گھر لے جاؤں؟''

''ضرور لے جاؤ۔'' میں نے کہا۔ ''اور اس کی تجہیز و تکفین کا اچھے سے بندوبست کرو۔ اس کے ساتھ ہی رفیق کھوکھر کے کان میں اکبر کی موت کا سبب بھی ڈال دینا۔ میں کل کسی وقت تمہارے ماں باپ سے ملنے گھر آؤں گا۔''

اس نے میری ہدایات پر عمل کرنے کا یقین دلایا اور میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد اپنے بھائی کی لاش کے ساتھ تھانے سے رخصت ہو گیا۔

وہ جمعے کا دن تھا لہٰذا میں نماز کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔ نماز کے بعد میں جیسے ہی دوپہر کے کھانے سے فارغ ہوا، کانسٹیبل اکرام شاہ میرے پاس آ گیا۔ میں نے اس پر نگاہ پڑتے ہی استفسار کیا۔

''شاہ جی! عزیز آباد سے کیا خبریں لائے ہو؟''

''اس منحوس صندوق کے بارے میں تو کسی کو کچھ بھی پتا نہیں۔'' وہ مایوسی سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ادھر دریا کے کنارے گاؤں کے کئی افراد نے اس صندوق کو دیکھا تھا۔ باقی میں نے گاؤں کے اندر بھی لگ بھگ دو درجن لوگوں سے پوچھ تاچھ کی ہے مگر ہر طرف سے ایک ہی جواب آیا ہے کہ ایسا صندوق پہلے کسی نے نہیں دیکھا۔ اب یہی سمجھ میں آ رہا ہے کہ یہ صندوق عزیز آباد کے کسی وسنیک کی ملکیت نہیں ورنہ کوئی ایک تو اس سے اپنی شناسائی ظاہر کرتا۔''

''اس کے علاوہ کوئی خاص بات پتا چلی؟'' میں نے سوالیہ نظر سے کانسٹیبل کی طرف دیکھا۔ ''جس سے اس کیس کو حل کرنے میں مدد مل سکے۔''

''ایک بات ہے تو سہی۔'' وہ متذبذب انداز میں بولا۔ ''مگر میں وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ اس کا ہمارے موجودہ کیس سے کوئی واسطہ ہے یا نہیں۔''

''تعلق اور واسطہ میں خود نکال لوں گا شاہ جی!'' میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''تم مجھے اپنی سناؤ۔''

''مجھے پتا چلا ہے کہ کل رات دونوں بھائیوں میں اچھی خاصی تلخ کلامی ہوئی تھی۔'' کانسٹیبل نے بتایا۔ ''میرا مطلب ہے رفیق اور صدیق کھوکھر کے درمیان!''

''جب کل میں رفیق کھوکھر کے گھر سے نکلا تو میں نے صدیق کھوکھر اور اس کے بیٹے قادر کھوکھر کو دیکھا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''میری ان سے مختصر سی بات چیت بھی ہوئی تھی۔ صدیق تو مجھے سیدھا سادہ ہی لگا لیکن قادر کے مزاج اور اطوار میں کئی ایک ٹیڑھ میں ہیں جو دور ہی سے نظر آ جاتی ہیں۔''

''قادر ایک بگڑا ہوا نوجوان ہے ملک صاحب!'' اکرام شاہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''اس سے بڑی دو بہنیں جالیہ اور فوزیہ ہیں۔ صدیق کھوکھر کو اولاد نرینہ کی بڑی خواہش تھی چنانچہ جب دو بہنوں کے بعد قادر پیدا ہوا تو اس کے باپ کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ بیٹے کی پرورش کرنے کے دوران میں باپ اس کی تربیت کرنے سے غافل ہو گیا اور اس غفلت کی وجہ سے قادر بگڑتا چلا گیا۔ صدیق کھوکھر، قادر کی ہر جائز اور ناجائز بات مانتا چلا گیا جس کی وجہ سے وہ ضدی، خودسر اور من مانی کرنے والا بن گیا۔ جب باپ کو ہوش آیا تو پانی سر کے اوپر سے گزرنے لگا تھا لہٰذا اب وہ قادر کے سامنے بے بس اور لاچار نظر آتا ہے۔''

''ہاں، میں نے بھی کچھ ایسا ہی محسوس کیا ہے۔'' اس کی طویل وضاحت کے بعد میں نے کہا پھر پوچھا۔ ''کیا کل رات والی دونوں بھائیوں کی لڑائی کا سبب بھی قادر ہی تھا؟''

''نہیں ملک صاحب!'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''وہ دونوں اکبر کی حسرت ناک موت اور اس کا رشتہ ٹوٹنے کو لے کر کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گئے تھے۔ گرما گرمی اتنی زیادہ بڑھی کہ وہ تلخ کلامی پر اتر آئے۔''

''ایک منٹ شاہ جی!'' میں نے ہاتھ کے اشارے سے اکرام شاہ کو مزید بولنے سے روک دیا اور پوچھا۔ ''تم کس کا رشتہ ٹوٹنے کی بات کر رہے ہو؟''

''مقتول اکبر کھوکھر کا رشتہ ملک صاحب!''

''مگر مجھے تو رفیق کھوکھر نے بتایا تھا کہ اس نے اپنے چھوٹے بیٹے اصغر کا رشتہ صدیق کھوکھر کی چھوٹی بیٹی فوزیہ سے طے کر رکھا ہے اور اگلے سال کے تیسرے مہینے میں ان کی شادی ہونے والی ہے۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''مقتول کے رشتے کی بات تو ادھر فتح پور میں چل رہی تھی۔ اس کے ماما ملک خدابخش کی اکلوتی بیٹی فرزانہ سے۔ یہ بات کل مقتول کی ماں بشریٰ نے خود مجھے بتائی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ خدابخش تو اس رشتے کے لیے راضی ہے لیکن اس

کی بیوی شبنم نے اودھم مچا رکھا ہے۔"

"آپ سے رفیق نے کچھ غلط کہا اور نہ ہی اس کی بیوی نے کوئی جھوٹ بولا ہے ملک صاحب!" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "یہ تو تازہ ترین صورت حال ہے لیکن اس کے پس منظر میں ایک اور کہانی بھی چھپی ہوئی ہے۔"

"میں پہلی فرصت میں وہ کہانی سننا چاہوں گا شاہ جی!" میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

"کچھ عرصہ پہلے رفیق کھوکھر نے اپنے دونوں بیٹوں کے رشتے صدیق کھوکھر کی دو بیٹیوں سے طے کر دیے تھے یعنی اکبر سے عالیہ کا اور اصغر سے فوزیہ کا رشتہ۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "یہ دونوں شادیاں اگلے سال کے تیسرے مہینے میں ایک ساتھ ہونے والی تھیں پھر بیچ میں گڑبڑ ہوگئی۔ فوزیہ، عالیہ کی بہ نسبت زیادہ خوبصورت ہے۔ اس کی جوڑی اصغر کے ساتھ ہی ٹھیک لگتی تھی۔ اسی طرح عالیہ اور اکبر کا ملاپ بھی ہر لحاظ سے موزوں اور مناسب ہی تھا لیکن بشریٰ نے اکبر کے کان بھرنا شروع کر دیے کہ اس کے بھائی خدا بخش کی اکلوتی بیٹی فرزانہ ان دونوں بہنوں سے زیادہ حسین بلکہ حسن کی حور ہے اور اس کی یہ خواہش ہے کہ وہ اکبر کی شادی ہر قیمت پر فرزانہ ہی سے کرائے۔ اگرچہ اکبر کا رشتہ عالیہ کے ساتھ طے ہو چکا تھا لیکن ماں کی روزانہ کی "ٹیں ٹیں" نے اکبر کا دماغ خراب کر دیا اور اس نے دوٹوک انداز میں اپنے باپ رفیق کھوکھر سے کہہ دیا کہ وہ عالیہ سے ہرگز شادی نہیں کرے گا۔ رفیق اپنے بھائی صدیق کو زبان دے چکا تھا لیکن اکبر کی خواہ مخواہ کی ضد نے دونوں خاندانوں کے حالات و معاملات کو کشیدہ کر دیا جس کے نتیجے میں مقتول اکبر کھوکھر اور عالیہ کا رشتہ ٹوٹ گیا اور بشریٰ نے اکبر کو اپنے بھائی ملک خدا بخش کے گھر سے بیاہنے کی کوشش شروع کر دی۔ یہ ہے کُل کہانی ملک صاحب!"

"کہانی خاصی دلچسپ اور سنسنی خیز ہے شاہ جی!" میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔ "اب دیکھنا یہ ہے کہ تمہاری سنائی ہوئی کہانی موجودہ کیس پر اثرانداز ہوتی ہے یا نہیں اور اگر اثرانداز ہوتی ہے تو کس حد تک۔" میں نے ذرا دیر کو رک کر ایک آسودہ سانس خارج کی پھر بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"اتنا سب کچھ ہو جانے کے باوجود بھی صدیق کھوکھر نے فوزیہ اور اصغر کے رشتے کو نہ صرف بحال رکھا ہوا ہے بلکہ شادی کی طے شدہ تاریخ میں بھی کوئی ردوبدل نہیں کیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک عالی ظرف اور بردبار شخص ہے۔"

"یہ دونوں بھائی بہت اچھے انسان ہیں ملک صاحب! اسی لیے تمام تر بدمزگی اور رنجش کے باوجود بھی کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا ورنہ ایسے معاملات میں تو بعض اوقات خون کی ندیاں بہہ جاتی ہیں۔" کانسٹیبل نے ٹھوس انداز میں کہا۔

"رفیق کی بیوی بشریٰ اس پر حاوی ہے۔ اسی کی نامعقولیت کے باعث اکبر اور عالیہ کا رشتہ ٹوٹ گیا تھا اور صدیق کے بیٹے قادر نے اس کا ناک میں دم کر رکھا ہے۔"

"اور صدیق کھوکھر کی بیوی؟" میں نے سوالیہ نظر سے کانسٹیبل کی طرف دیکھا۔

"اسے اس دنیا سے رخصت ہوئے کم و بیش تین سال ہو گئے ہیں۔" اکرام شاہ نے بوجھل آواز میں کہا۔ "نور جہاں مرحومہ بہت ہی نیک اور خوش اخلاق عورت تھی۔"

"ٹھیک ہے شاہ جی! میں کل رات والی تیغ کلامی کے بارے میں ان دونوں بھائیوں سے الگ الگ پوچھوں گا۔" میں نے معتدل انداز میں کہا۔ "تم نے اس کیس کے حوالے سے ہر لمحہ اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھنا ہیں۔ جیسے ہی تمہیں کوئی بھی کام کی بات پتا چلے، تم فوراً مجھے بتاؤ گے۔ سمجھ گئے نا؟"

"اچھی طرح سمجھ گیا ملک صاحب!" وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

میں نے پوچھا۔ "تمہارے بچے کی طبیعت کیسی ہے؟"

"وہ اب ٹھیک ہے ملک صاحب!" اس نے جواب دیا۔ "موسم سرما کا آغاز ہو چکا ہے۔ ہر گھر میں ایک آدھ بچہ نزلہ، کھانسی اور بخار میں مبتلا نظر آتا ہے۔"

"ہاں، یہ تو ہے۔" میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ "آتی ہوئی سردیاں کسی زہریلی وبا سے کم نہیں ہوتیں اور جاتی ہوئی سردیاں بھی شکر کی طرح کام کرتی ہیں۔"

اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور مجھے سلام کرنے کے بعد وہ میرے کمرے سے نکل گیا۔

☆☆☆

حوالدار انور علی اسی شام شیخوپورہ سے لوٹ آیا تھا اور وہ اپنے ساتھ سنسنی خیز معلومات کا ذخیرہ بھی لایا تھا۔ میں اس وقت تھانے سے اٹھنے ہی والا تھا مگر انور علی کی آمد نے مجھے مزید ایک گھنٹے تک اپنے کمرے میں بیٹھنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"ملک صاحب!" وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولا۔ "اس امر کی تصدیق ہو گئی ہے کہ مقتول اکبر کھوکھر گیارہ نومبر کو شیخوپورہ نہیں پہنچا تھا۔"

"اس میں کچھ بھی نیا نہیں ہے۔" میں نے بیزاری سے کہا۔ "اصغر کھوکھر مجھے اس بارے میں سب بتا چکا ہے۔"

"کیا.....!" وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ "میں نے اس پراسرار صندوق کا سراغ لگالیا ہے جس کے اندر مقتول اکبر کی لاش برآمد ہوئی تھی۔"

"اوہ۔" میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور اضطراری انداز میں پوچھا۔ "اس حوالے سے کیا تفصیلات ہیں؟"

"وہ صندوق نذیر حسین نامی ایک شخص کی ملکیت ہے۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "نذیر حسین فتح پور ہی کا وسنیک ہے اور پیشے کے اعتبار سے وہ ایک ترکھان ہے۔ اس نے مجھے بتایا ہے کہ کوئی ہفتہ بھر پہلے کسی نے اس کی بڑھئی والی دکان میں سے مذکورہ صندوق چرالیا تھا یعنی وقوعہ سے تین چار روز قبل۔" وہ سانس ہموار کرنے کے لیے ٹھہرا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"نذیر حسین اس صندوق کے اندر اپنے اوزار اور قیمتی لکڑی وغیرہ سنبھال کر رکھتا تھا۔ اس مخصوص سائز کا صندوق نذیر حسین نے اپنی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے خود ہی تیار کیا تھا۔ اس کے بیان کے مطابق صندوق چور نے اس کے اندر کے تمام سامان کو دکان کے ایک کونے میں ڈھیر کر دیا تھا اور صرف اس صندوق کو لے کر غائب ہو گیا تھا۔ نذیر حسین نے اپنے گمشدہ صندوق کو فتح پور میں ڈھونڈنے کی حتی الامکان کوشش کی مگر اسے کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ تھک ہار کر اس نے صبر کرلیا اور اب اپنے اوزاروں کے لیے ایک نیا صندوق بنانے میں مصروف ہے۔"

"اکبر کھوکھر کا قاتل میری توقع سے زیادہ ہوشیار اور منصوبہ ساز ثابت ہو رہا ہے۔" میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اس نے مقتول کی جیبوں میں موجود رقم کو ہاتھ بھی نہیں لگایا اور نذیر حسین کے اوزاروں کے ساتھ بھی کسی قسم کی چھیڑ چھاڑ نہیں کی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اسے مقتول کی لاش کو حوالۂ دریا کرنے کے لیے ایک مخصوص صندوق کی ضرورت تھی اور اس نے اپنی یہ ضرورت نہایت ہی صفائی کے ساتھ پوری کرلی۔"

"ملک صاحب! نذیر حسین کا چوبی صندوق چرانے سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ قاتل نے مذکورہ صندوق پر گہری نگاہ رکھی ہوئی تھی اور وہ فتح پور ہی کا رہنے والا کوئی بندہ ہے۔ اس نے اپنی پلاننگ کے مطابق وہ صندوق چرا کر کسی جگہ چھپا دیا پھر گیارہ نومبر کی صبح اس نے زہر کھلا کر اکبر کھوکھر کو موت کی نیند سلایا اور اس کی لاش کو صندوق میں رکھ کر دریا کی موجوں کے حوالے کر دیا۔"

اکبر کھوکھر کی پوسٹ مارٹم شدہ لاش اور اس کی موت سے متعلق رپورٹ حوالدار انور علی کی غیر موجودگی میں آئی تھی تاہم اس گفتگو سے پہلے میں نے انور علی سے ان چیزوں کا تذکرہ کر دیا تھا اسی لیے وہ مقتول کی موت کے دن، وقت اور سبب کا حوالہ بڑے اعتماد کے ساتھ دے رہا تھا۔

"ایسا ہو سکتا ہے کہ تمہارا یہ اندازہ صد فیصد درست ہو۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن جب تک قاتل ہمارے ہاتھ نہیں لگ جاتا، کوئی بھی بات وثوق سے نہیں کہی جاسکتی کیونکہ ابھی تک ہمارے ایسے کئی اندازے غلط ثابت ہو چکے ہیں۔"

"یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں ملک صاحب!" وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "عین ممکن ہے کہ قاتل کا فتح پور سے کوئی تعلق، واسطہ نہ ہو اور اس نے اس گاؤں کو یعنی وہاں رہنے والوں کو اکبر کھوکھر کی موت کا ذمے دار ٹھہرانے کی غرض سے اتنا لمبا چوڑا چکر چلایا ہو۔"

"تمہاری اس بات میں مجھے وزن نظر آرہا ہے انور علی!" میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ "لیکن تاحال میں خود کو اندھیرے میں ٹکراتا محسوس کر رہا ہوں۔ تم مجھے مقتول کے ماما ملک خدا بخش سے اپنی ملاقات کے بارے میں بتاؤ۔ وہ اس سلسلے میں کیا رائے رکھتا ہے؟"

"ملک صاحب! خدا بخش کی فیملی میں صرف تین افراد ہیں یعنی خدا بخش، اس کی بیوی شبنم اور ان کی اکلوتی بیٹی فرزانہ۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "میں نے خدا بخش اور شبنم سے تفصیلی بات چیت کی ہے۔ خدا بخش ایک سلجھا ہوا اور معقول انسان ہے جبکہ اس کی بیوی شبنم زبان کی کافی تیز ہے۔ خدا بخش کو اپنے بھانجے کی موت کا بڑا دکھ ہے۔ دکھ تو مجھے شبنم کے چہرے پر بھی دکھائی دیا تھا لیکن اس میں مصنوعی پن صاف نظر آرہا تھا۔ ان دونوں کے بیان کے مطابق فتح پور میں مقتول کا ایسا کوئی دشمن موجود نہیں جو اس کو ایک بھیانک موت کے منہ میں دھکیل دے۔ جب میں وہاں پہنچا تو وہ دونوں میاں بیوی ادھر عزیز آباد آنے کی تیاری کر رہے تھے اس لیے میں نے ان کا زیادہ وقت نہیں لیا اور صرف ضروری سوالات تک ہی محدود رہا اور انہی سوالات کے نتیجے میں مجھے ایک اہم بات پتا چلی ہے۔" لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک مضمحل سی سانس خارج کی پھر سنسنی خیز انداز میں سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

"شبنم اپنی اکلوتی بیٹی فرزانہ کی شادی مہر سکندر نامی ایک لڑکے سے کرنے کی خواہش مند ہے۔ مہر سکندر اس کی چھوٹی بہن جمیلہ کا اکلوتا بیٹا ہے۔ جمیلہ کے خاوند کا نام مہر نواز ہے۔ وہ لوگ بھی ادھر فتح پور ہی میں رہتے ہیں۔ فرزانہ اس گاؤں کی سب سے زیادہ حسین اور خوبصورت لڑکی ہے۔ مہر سکندر ایک غصیلا اور جھگڑالو نوجوان ہے۔ جب سے مقتول نے اس نیت سے فتح پور کے چکر لگانا شروع کیے تھے کہ ماما خدا بخش، فرزانہ سے اس کی شادی کروا دے گا، مہر سکندر کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بج اٹھی تھی۔ وہ مقتول کو پہلے بھی کچھ خاص پسند نہیں کرتا تھا لیکن اب تو وہ اس امید میں فتح پور جانے لگا تھا کہ فرزانہ سے اس کی شادی ہوجائے۔ اس نئی کروٹ نے مقتول کے لیے مہر سکندر کی ناپسندیدگی کو کھلی نفرت میں بدل دیا تھا۔ مجھے ادھر اُدھر سے کچھ ایسی خبریں بھی ملی ہیں کہ مہر سکندر یہ کہتے ہوئے سنا گیا ہے کہ اگر مقتول نے اپنے دل سے فرزانہ سے شادی کا خیال نہیں نکالا تو وہ اس کی گردن توڑ ڈالے گا۔"

"یہ واقعی بہت ہی اہم اطلاع ہے انور علی!" میں نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ "اپنی تفتیش کو آگے بڑھانے کے لیے ہم مہر سکندر کو مقتول کے دشمنوں کی فہرست میں رکھ سکتے ہیں۔ خیر..." میں نے بھرپور انداز میں ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

"انور علی! میں اب اپنے کوارٹر میں جا رہا ہوں۔ تم بھی آرام کرو۔ آج دن بھر ہم دونوں نے بڑی مشقت کی ہے اور میں سمجھتا ہوں کل کا دن آج سے زیادہ مشکل اور صبر آزما ثابت ہونے والا ہے۔"

حوالدار مجھے سلام کرکے رخصت ہوگیا۔ چند منٹ کے بعد میں بھی کمرے سے نکل کر اپنے سرکاری کوارٹر کی سمت بڑھ گیا جو تھانے کے عقبی حصے ہی میں بنا ہوا تھا۔

اس رات جب میں سونے کے لیے بستر پر لیٹا تو میرے دماغ میں اسی کیس کی کھچڑی پک رہی تھی۔ حوالدار کی ایک اطلاع نے مجھے بہت دور تک سوچنے کے لیے مجبور کردیا تھا اور وہ اطلاع تھی مہر سکندر کے غیر محتاط نفرت بھرے بیان کی جس میں اس غصیلے نوجوان نے مقتول کی گردن توڑنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔

واقعات کے مطابق مقتول کی ماں بشریٰ اس کی شادی اپنے بھائی ملک خدا بخش کی بیٹی فرزانہ سے کرنا چاہتی تھی اور اپنی اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے اس نے مقتول سے اس کی تایازاد عالیہ کی طے شدہ شادی کو تڑوا دیا تھا لیکن دوسری جانب دال گل کر نہیں دے رہی تھی کیونکہ فرزانہ کی ماں شبنم اس کی شادی مقتول کے بجائے اپنی بہن کے بیٹے مہر سکندر سے کرنے کی خواہاں تھی۔ رشتوں کی یہ عجیب سی کشمکش جاری ہی تھی کہ مقتول کی موت واقع ہوگئی۔ ان حالات و واقعات میں مہر سکندر کا "مقتول کی گردن توڑ ڈالنے" والا بیان خود بخود خطرناک اہمیت اختیار کر جاتا تھا۔ جوان خون میں غصہ، گرمی اور کچھ کر گزرنے کا جنون لامحدود ہوتا ہے لہٰذا میں مہر سکندر کو کسی بھی قیمت پر نظر انداز نہیں کرسکتا تھا۔

میں انہی سوچوں کے ساتھ دنگل میں مصروف تھا کہ کوارٹر کے بیرونی دروازے پر ہونے والی دستک نے مجھے چونکنے پر مجبور کردیا۔ جب میں اپنے کوارٹر میں آجاتا تھا تو تھانے کا کوئی بھی شخص مجھے بے آرام کرنے ادھر کا رخ نہیں کیا کرتا تھا، الّا یہ کہ کوئی ہنگامی صورت حال سامنے نہ آجائے۔

میں نے گرم بستر کو چھوڑا اور صحن سے گزر کر کوارٹر کے داخلی دروازے پر پہنچ گیا۔ پھر جب میں نے دروازہ کھولا تو سامنے کانسٹیبل شوکت علی کو کھڑے پایا۔ شوکت علی گزشتہ روز جائے وقوعہ پر میرے ساتھ تھا اور میں نے اسی کی نگرانی میں مقتول اکبر کھوکھر کی لاش کو سرکاری اسپتال بھجوایا تھا۔

"شوکت علی! تم اس وقت یہاں؟" میں نے حیرت بھرے لہجے میں سوال کیا۔ "سب خیریت تو ہے نا؟"

"ملک صاحب!" وہ جھجک آمیز انداز میں بولا۔ "مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنا ہے بلکہ میں اس وقت آپ سے معافی مانگنے آیا ہوں۔"

"تم بھی عجیب انسان ہو۔" میں نے قدرے جھنجلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں پورا دن تھانے میں موجود تھا۔ تمہیں جو بھی ضروری بات مجھ سے کرنا تھی، کسی بھی وقت کرسکتے تھے۔ خیر..." میں نے اس کے لیے راستہ چھوڑتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کردیا۔ "اندر آجاؤ پھر بات کرتے ہیں۔"

ایک منٹ کے بعد ہم کمرے میں روبرو بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے تیز سوالیہ نظر سے اسے گھورا تو وہ معذرت اور منت کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ گویا ہوا۔

"ملک صاحب! کل صبح ادھر دریا کے کنارے جب ہم وقوعہ کا جائزہ لے رہے تھے تو مجھے وہاں سے ایک چیز ملی تھی جسے میں نے اس وقت اپنی جیب میں رکھ لیا تھا اور یہی سوچا تھا کہ جب آپ مقتول کی لاش کے معائنے سے فارغ ہوجائیں گے تو اس سلسلے میں آپ سے بات کروں گا پھر

میرے ذہن سے نکل گیا اور آپ نے مجھے لاش کے ساتھ اسپتال روانہ کردیا۔ آج دن میں کئی بار مجھے یاد آیا مگر......''

''اتنی لمبی چوڑی تمہید کی ضرورت نہیں ہے شوکت علی!'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے سپاٹ آواز میں کہا۔ ''مجھے بتاؤ، کیا وہ چیز جو تمہیں جائے واردات سے ملی، اس کیس سے کسی قسم کا تعلق رکھتی ہے؟''

''اس بارے میں، میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' وہ بے بسی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔ ''وہ چیز اس وقت کہاں ہے شوکت علی؟''

اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر درمیانے سائز کی ایک پڑیا برآمد کی پھر اسے میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''وہ چیز اس پڑیا میں ہے ملک صاحب!''

میں نے اس کے ہاتھ سے مذکورہ پڑیا لے لی۔ ایسی پڑیاں اس زمانے میں عموماً چون فروش، پنساری اور طبیب حضرات باندھا کرتے تھے۔ آج کل تو ٹیکنیکل دور ہے۔ ہر شے پیکنگ میں دستیاب ہے۔

میں نے کانسٹیبل شوکت علی کی دی ہوئی پڑیا کو کھول کر دیکھا تو اس کے اندر سے ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے نصف درجن کے قریب چھوٹے بڑے ہر سائز کے ٹکڑے برآمد ہوئے۔ وہ ایک ہی رنگ و نسل کی ہلکی سبز چوڑیوں کے ٹکڑے تھے۔

''یہ دھانی بانگیں تمہیں کہاں سے ملی تھیں؟'' میں نے تیز آواز میں استفسار کیا۔

وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکتے ہوئے بولا۔ ''دھانی بانگیں؟''

شاید وہ میری اردو کو اچھے سے سمجھ نہیں پایا تھا۔

''ہاں!'' میں نے چوڑیوں کے ٹکڑے اسے دکھاتے ہوئے وضاحت کرنے والے انداز میں کہا۔ ''دھانی بانگیں، مطلب یہ کہ ہلکے سبز رنگ کی چوڑیاں۔''

''اوہ، اچھا۔'' وہ ایک سکون بھری سانس خارج کرتے ہوئے بولا پھر مجھے ان ٹکڑوں کی ہسٹری اور مسٹری سے آگاہ کرنے میں مصروف ہوگیا۔

گزشتہ روز جس وقت میں اکبر کھوکھر کی لاش کو صندوق میں سے باہر نکلوا کر اس کے تفصیلی معائنے میں مصروف تھا، اسی دوران میں شوکت علی گھوم پھر کر جائے

قابلِ غور

☆ جو مائیں اپنی اولاد کی دیکھ بھال کا وقت سونے میں گنوا دیتی ہیں، وہ اولاد کے لیے بری ہوتی ہیں۔

☆ جس کو غصے کا سانپ ڈس لے، اس کی رگ رگ میں بے غیرتی کا زہر اتر جاتا ہے۔

☆ اچھی اور پُرامید سوچ سے بھی انسان کی کیفیت میں مثبت تبدیلی آجاتی ہے۔

☆ بے بسی کی انتہا بددعائیں اور کوسنے ہوتے ہیں۔

☆ انسان کی سب سے بڑی طاقت اس کا بیدار ذہن ہوتا ہے۔

☆ بُرا ہمیشہ دوسروں کی بُرائیوں سے خود کو دھارس دیتا رہتا ہے کہ وہ اکیلا نہیں ہے۔ ایسا تو سب کرتے ہیں۔

☆ اگر ایک انسان کو اپنے فرائض کا احساس نہیں تو اسے اپنے حقوق کا شعور بھی نہیں ہونا چاہیے۔

☆ اگر دشمن پر حاوی ہونا چاہتے ہو تو اس پر تیر، تلواروں، گولیوں اور بموں سے فتح حاصل نہ کرسکو گے۔ اگر جیت چاہتے ہو تو اپنی زبان کو اچھی طرح استعمال کرو۔ یہ چھوٹی سی زبان بڑے سے بڑے دشمن کو جھکنے پر مجبور کردے گی۔

☆ مصیبت کی شکایت سے پرہیز کرو کیونکہ اس سے اللہ تعالیٰ ناراض، دشمن خوش اور دوست غمگین ہوتا ہے۔

(مرسلہ: محمد انور ندیم، حویلی لکھا، اوکاڑہ)

وقوعہ کا جائزہ لے رہا تھا اور دھانی بانگوں کے وہ ٹکڑے اسے دریا کے کنارے لگے ہوئے ٹبلی کے ایک درخت کے نیچے پڑے ملے تھے۔ ٹبلی کے اس قدآور درخت پر میری بھی نظر پڑی تھی۔ وہ درخت ان جھاڑیوں کے بہت نزدیک تھا جہاں اکبر کھوکھر کی صندوق بند لاش پائی گئی تھی جسے کرمو مچھیرے نے دوسرے دیہاتیوں کی مدد سے باہر نکال کر دریا کے کنارے پہنچایا تھا۔

''ظاہر ہے یہ چوڑیاں کسی عورت کی کلائی ہی سے ٹوٹ کر جائے وقوعہ پر گری ہوں گی۔'' میں نے گہری

سنجیدگی سے کہا۔ ''اور اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عورت ادھر دریا کے کنارے پر موجود تھی۔ اگر ہم کسی طرح مذکورہ عورت کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو زیرِ تفتیش کیس کو حل کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔''

''لیکن آپ جس عورت کی بات کر رہے ہیں ملک صاحب، اسے ڈھونڈنا کوئی آسان کام نہیں ہوگا۔'' شوکت علی نے متذبذب انداز میں کہا۔ ''عزیز آباد کی آبادی لگ بھگ ساڑھے آٹھ سو افراد پر مشتمل ہے۔''

''ہاں، میں یہ بات جانتا ہوں!'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''عزیز آباد کی آبادی بے شک آٹھ سو پچاس افراد ہوگی لیکن اس آبادی میں بچے، بوڑھے، جوان سب شامل ہیں۔ اگر ہم بچوں کو نکال دیں تو باقی مرد و زن تین سو کے آس پاس رہ جائیں گے۔ ان میں سے سو مردوں کو بھی الگ کر دیں تو ہمارے پاس زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سے دو سو عورتیں بچیں گی۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

''آپ کا حساب تو میری سمجھ میں آ رہا ہے ملک صاحب! لیکن......'' وہ بولتے بولتے رک گیا تو میں نے پوچھا۔

''لیکن کیا؟''

''دو سو عورتوں میں سے کسی ایک عورت کو ہم کیسے تلاش کریں گے؟'' اس نے جواب میں اپنی پریشانی بیان کر دی۔ ''یہ بھی کچھ کم مشکل کام نہیں ہوگا۔''

''ایک بات اچھی طرح اپنے بھیجے میں بٹھا لو شوکت علی!'' میں نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔ ''پولیس ڈیپارٹمنٹ میں اگر آگے بڑھنا ہے اور ترقی کرنا ہے تو مشکل اور آسان کے فرق کو بھلانا ہوگا۔ ہمارے سامنے آنے والا کوئی بھی مسئلہ کسی حلوے کے مانند نرم اور میٹھا نہیں ہوتا جسے ہم اٹھا کر منہ میں رکھ لیں گے اور بس ہو گیا کام۔''

لمحاتی توقف کرکے میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''ہمیں درپیش کوئی بھی معاملہ عام لوگوں کے بس کا نہیں ہوتا اسی لیے وہ اس سے نمٹنے کے لیے امداد طلب نظر سے ہماری طرف دیکھتے ہیں اور ہم پر لازم ہے کہ مشکل سے مشکل کام کو بھی آسان بنا کر عوام کی زندگی میں آرام و سکون بھر دیں۔ اب جہاں تک ان دھانی ہاتھوں کی مالکن کو تلاش کرنے کی بات ہے تو اس سلسلے میں میرے پاس ایک آئیڈیا ہے جو یقیناً ہمیں کامیابی......!''

میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ بول اٹھا۔

''کیسا آئیڈیا ملک صاحب؟''

''میں اسی طرف آ رہا تھا۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''اگر تمہاری اجازت ہو تو آ جاؤں؟''

وہ ندامت آمیز لہجے میں بولا۔ ''سوری ملک صاحب! آپ کی بات میں اتنا زیادہ تجسس تھا کہ میں خود پر قابو نہیں رکھ سکا اور وہ سوال میرے ہونٹوں سے پھسل گیا۔''

''دوسروں کو اپنے قابو میں کرنا اتنا مشکل ثابت نہیں ہوتا جتنا کہ خود اپنی ذات کو لگام ڈالنا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اور یاد رکھو، جو بات زبان سے نکل گئی، اسے واپس نہیں لایا جا سکتا اس لیے بولنے سے پہلے اپنے الفاظ کو تولنا بہت ضروری ہے۔''

''میں آئندہ اس بات کا خیال رکھوں گا ملک صاحب!'' وہ پشیمان نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

''شاباش!'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔

''اب میری بات دھیان سے سنو۔''

وہ ہمہ تن گوش ہو گیا۔

''ہم بات کر رہے تھے زیادہ سے زیادہ دو سو عورتوں کی۔'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے رسانیت بھرے لہجے میں کہا۔ ''ان میں سے اگر بالفرض آدھی عورتوں نے بھی ہلکے سبز رنگ کی چوڑیاں پہن رکھی ہوں تو یہ بات روزِ روشن کے مانند عیاں ہے کہ کسی دو چار کی چوڑیاں ہی ٹوٹی ہوں گی اور چوڑیوں نے ٹوٹتے وقت ان کی کلائیوں کو لازمی زخمی کیا ہوگا۔ بات سمجھ میں آ رہی ہے نا شوکت علی!''

اس کے چہرے اور آنکھوں میں حیرت اور دلچسپی کے کئی رنگ ایک ساتھ نمودار ہوئے۔ چند لمحات کی متعجب خیز خاموشی کے بعد اس نے مسرور آواز میں کہا۔

''جی...... میں سمجھ گیا...... ملک صاحب!''

''سمجھ گئے ہو تو واپس جاؤ اور رات کا بقیہ حصہ آرام سے سو کر گزارو۔'' میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''کل صبح تم میرے ساتھ عزیز آباد چلو گے۔ ہم دونوں مل کر گاؤں کی تمام عورتوں کی کلائیوں کو چیک کریں گے اور ان میں سے زخمی کلائیوں والی عورتوں کو الگ کرکے میں ان سے پوچھ تاچھ کروں گا۔''

''ٹھیک ہے ملک صاحب!'' وہ فرماں برداری سے بولا۔

میں نے پوچھا۔ ''آج کل نظام دین کھوجی کہاں ہے؟''

''مجھے اندازہ نہیں ملک صاحب!'' اس نے جواب دیا۔ ''اس کا زیادہ میل جول حوالدار صاحب کے ساتھ ہے۔ تین دن پہلے وہ انور علی سے ملنے تھانے آیا تھا۔''

"تم ابھی تھانے جا کر حوالدار کو میرا یہ پیغام پہنچا دو کہ کل صبح جب میں اپنے کمرے میں آؤں تو تب تک نظام دین کو وہاں بلانے کا بندوبست کرلے۔" میں نے تاکیدی انداز میں کہا۔

"جو حکم ملک صاحب!" وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "میں ابھی حوالدار صاحب کو بتا دیتا ہوں۔"

نظام دین کی عمر ساٹھ سے متجاوز تھی اور "ساٹھا پاٹھا" کی ترکیب اس پر جچتی تھی۔ اس کی نگاہ اس عمر میں بھی کسی عقاب کے مانند تھی۔ میں نے کئی ایک مقدمات میں اس کے پیشہ ورانہ تجربے سے فائدہ اٹھایا تھا۔ نظام دین بلاشبہ ایک ماہر اور لائق اعتبار کھوجی تھا۔

☆☆☆

میں عموماً فجر کی اذان کے ساتھ بیدار ہو جاتا ہوں لیکن اس روز رات کے آخری پہر اچانک میری آنکھ کھل گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک مخصوص آواز بھی میری سماعت تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی اور وہ آواز تھی، تیز بارش کے برسنے کی۔

میں نے میز پر رکھی ہوئی رسٹ واچ کو اٹھا کر اس میں وقت دیکھا۔ تاریکی کے باوجود بھی مجھے کسی دقت یا دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ میری ریڈیم ڈائل والی "ویسٹ اینڈ واچ" کمپنی کی تیار کردہ گھڑی نے مجھے بتایا کہ اس وقت صبح کے تین بجے تھے۔ میں نے گرم بستر کو چھوڑا اور صحن میں آکر صورت حال کا جائزہ لینے لگا۔

بارش موسلا دھار تو نہیں مگر لگاتار ضرور تھی اور موجودہ آثار بتاتے تھے کہ یہ سلسلہ پچھلے ایک گھنٹے سے جاری و ساری تھا۔ موسم سرما کی اس برسات نے دو کام ایک ساتھ کر ڈالے تھے۔ نمبر ایک، اس کی وجہ سے فضا کی خنکی باقاعدہ ٹھنڈ میں بدل گئی تھی بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ ٹھیک ٹھاک سردی کا آغاز ہو گیا تھا۔ نمبر دو، اس نے میرے آئندہ روز والے منصوبے کا سوا ستیاناس مار کر رکھ دیا تھا۔

میں نے پچھلے روز یعنی اس رات کے ابتدائی حصے میں کانسٹیبل شوکت علی کے ساتھ اگلی صبح دریا کی طرف جانے کا پروگرام ترتیب دیا تھا۔ کھوجی بابا نظام دین کو بھی ہم نے اپنے ہمراہ لے کر جانا تھا تاکہ وہ پتا چلا سکے کہ جہاں پر شوکت علی کو دھانی بانگوں کے وہ چند ٹکڑے ملے تھے، اس مقام پر کون آیا تھا۔ نظام دین بآسانی اس عورت کا کھرا نکال سکتا تھا جس کی کلائی پر موجود وہ دھانی بانگیں ٹوٹ کر کیکر کے درخت کے نیچے گری تھیں مگر اس بارش نے میرے کھوج والے اس منصوبے پر پانی پھیر دیا تھا۔ بہرحال، عزیز آباد کا دورہ کرنے کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔

میں نے بارش رکنے کا انتظار نہیں کیا اور جیسے ہی اس کی شدت میں قدرے کمی واقع ہوئی، میں کانسٹیبل شوکت علی کے ساتھ عزیز آباد کی جانب روانہ ہو گیا۔ مذکورہ گاؤں میرے تھانے سے محض دو فرلانگ کے فاصلے پر واقع تھا لہٰذا ہمیں وہاں پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ اتفاق دیکھیں کہ جب ہم نے گاؤں کے اندر قدم رکھا تو بارش بھی تھم گئی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ بارش صرف میرا کام خراب کرنے کے لیے ہی آسمان سے نازل ہوئی تھی اور میرے کھرے والے منصوبے کو زیر آب لانے کے بعد اس طرح شانت ہو گئی تھی جیسے اس نے کچھ کیا ہی نہ ہو۔

اس وقت چودہ نومبر بروز ہفتہ کی صبح کے دس بج رہے تھے۔ کم و بیش آٹھ گھنٹے ہونے والی اس بارش نے زمین کو اچھا خاصا سیراب کر دیا تھا اور گاؤں کی گلیوں میں جابجا کیچڑ دیکھی جا سکتی تھی۔ بہرحال، بہر شکل اور پریشانی کی پروا کیے بغیر ہم نے اپنا کام شروع کر دیا۔

عزیز آباد میں کل ایک سو پچاس عورتیں تھیں جن میں سے پینتیس کی کلائیاں خالی تھیں۔ یعنی انہوں نے کسی بھی قسم کی چوڑیاں نہیں پہن رکھی تھیں۔ دس عورتوں کی کلائیوں میں اکا دکا کڑے اور گجرے دکھائی دیے جو کہ کانچ کے نہیں تھے۔ باقی ایک سو پانچ عورتوں میں سے صرف چالیس کی کلائیوں میں دھانی بانگیں نظر آئیں۔ میں نے ان ہی چالیس کی کلائیوں کو بغور دیکھا اور ان میں سے پانچ کو الگ کر لیا۔

یہ ایسی پانچ عورتیں تھیں جنہوں نے ہلکے سبز رنگ کی چوڑیاں پہن رکھی تھیں اور ان کی کلائیوں پر کسی نہ کسی نوعیت کا زخم بھی موجود تھا لیکن میرا ٹارگٹ ایک مخصوص قسم کا زخم تھا لہٰذا میں نے ان پانچ عورتوں میں سے بھی چار کو خارج از تفتیش کر دیا کیونکہ ان کے زخم چوڑیوں کے ٹوٹنے سے لگنے والے نہیں تھے۔ کسی کی کلائی روٹی بناتے ہوئے گرم توے سے لگ گئی تھی اور کسی نے گرم دیگچی سے اپنی کلائی کو جھلسا اور جلا لیا تھا۔ الغرض چار گھنٹے کی اس تحقیق و تفتیش میں صرف ایک عورت مجھے ایسی ملی جو ہر لحاظ سے میری تلاش کے معیار پر پوری اترتی تھی۔

وہ عورت نہیں بلکہ ایک جوان لڑکی تھی جس کی عمر بیس اور اکیس کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ ایک خوبصورت اور پرکشش لڑکی تھی۔ اس نے اپنی کلائیوں میں دھانی بانگیں پہن رکھی تھیں اور اس کی ایک کلائی پر مجھے زخموں کے

نشانات بھی نظر آئے۔ اس لڑکی کا نام تھا فوزیہ! مقتول کے چھوٹے بھائی کی ہونے والی بیوی اور صدیق کھوکھر کی چھوٹی بیٹی فوزیہ!

میں اس وقت صدیق کھوکھر کے گھر ہی میں بیٹھا ہوا تھا۔ صدیق بھی وہاں موجود تھا مگر اس کا اکھڑ مزاج بیٹا قادر مجھے کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا اور فوزیہ کی بڑی بہن عالیہ اگر گھر میں تھی تو وہ میرے سامنے نہیں آئی تھی۔ اپنی کلائیاں "چیک" کرانے کے بعد وہ کہیں ادھر اُدھر ہوگئی تھی۔

فوزیہ کی کلائی پر نظر آنے والا زخم دو تین دن پرانا لگتا تھا اور اس پر ہلکا سا کھرنڈ بھی آچکا تھا۔ میں نے گھر گھر جا کر اپنی "چیکنگ" کا یہ عمل مکمل کیا تھا اور جیسا کہ میں نے بتایا، اب میں صدیق کھوکھر کے گھر میں موجود تھا۔

"فوزیہ! تمہارے چچا زاد اکبر کو کسی شقی القلب شخص نے زہر دے کر موت کے منہ میں دھکیل دیا ہے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔ "میں اکبر کھوکھر کے قاتل تک پہنچنے کے لیے سرتوڑ کوشش کر رہا ہوں۔ امید ہے تم اس سلسلے میں میری مدد ضرور کرو گی۔ وہ تمہارا ہونے والا جیون ساتھی بھی تھا۔"

"میری معصوم بچی بھلا آپ کی کیا مدد کر سکتی ہے تھانیدار صاحب؟" صدیق کھوکھر نے فوزیہ کے بولنے سے پہلے ہی مجھ سے کہا۔ "ہم سب اکبر کی المناک موت پر بہت دکھی ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں، آپ عزیز آباد کی عورتوں کی کلائیاں چیک کر رہے ہیں اور اسی سلسلے میں اب آپ ہمارے گھر میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس تفتیش کا آخر مقصد کیا ہے؟"

"تفتیش کا مقصد صرف ایک ہی ہے صدیق کھوکھر!" میں نے معتدل انداز میں کہا۔ "میں جلد از جلد اکبر کے قاتل تک پہنچنے اور اسے عبرتناک سزا دلوانے کا خواہاں ہوں اور مجھے یقین ہے کہ تم بھی ایسا ہی چاہو گے؟"

"بے شک!" وہ دوٹوک انداز میں بولا۔ "اکبر میرا بھتیجا تھا۔ اس کی موت کے ذمے دار شخص کو سخت سے سخت سزا ملنا ہی چاہیے۔"

"تو پھر تم مجھ سے تعاون کرو، اعتراض نہیں۔" میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر قدرے سخت لہجے میں کہا۔

"میں اعتراض کر رہا ہوں اور نہ ہی آپ کی تفتیش میں کسی قسم کی رکاوٹ ڈالنے کا میرا کوئی ارادہ ہے۔" وہ جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "میں تو بس یہ جاننا چاہ رہا تھا کہ سبز رنگ کی چوڑیوں والی عورتوں کا اکبر کی موت سے کیا تعلق ہے؟"

"ساری بات تمہاری سمجھ میں آجائے گی۔" میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ "میں تمہارے سامنے ہی فوزیہ سے پوچھ تاچھ کر رہا ہوں نا۔"

"جی ٹھیک ہے۔" وہ تعاون آمیز لہجے میں بولا۔ "اب میں بیچ میں نہیں بولوں گا تھانیدار صاحب!"

"شاباش۔" میں نے تعریفی نظر سے صدیق کھوکھر کو دیکھا پھر اس کی بیٹی کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے سوال کیا۔ "فوزیہ بیٹی! تمہاری کلائی پر نظر آنے والے زخم کا یہ نشان کیسا ہے۔ میرا مطلب ہے تمہیں یہ چوٹ کیسے لگی تھی؟"

شروع میں فوزیہ خاصی گھبرائی ہوئی نظر آرہی تھی۔ پولیس اور سانپ کا ایک اپنا خوف اور دہشت ہوتی ہے جس کے سامنے بڑے بڑے طرم خانوں کی سٹی گم ہو جاتی ہے۔ فوزیہ تو پھر بھی ایک بھولی بھالی اور معصوم نوعمر لڑکی تھی۔ اس کا خوفزدہ ہو جانا کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ بہرحال، میرے بیٹی کہنے سے اس کی حالت میں مثبت تبدیلی آئی تھی۔

"وہ جی....." وہ میرے سوال کے جواب میں بولی۔ "چند روز پہلے میری چوڑیاں ٹوٹ گئی تھیں اور کانچ کے کچھ ٹکڑے اس کلائی میں چبھ گئے تھے۔ اب تو یہ زخم بھرنے لگا ہے۔"

"ٹوٹنے والی وہ چوڑیاں ایسی ہی تھیں جیسی اس وقت تمہاری کلائی میں موجود ہیں؟" میں نے اس کی دھانی چوڑیوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "میرا مطلب ہے، یہ بھی سبز رنگ کی تھیں؟"

"جی، جی۔" وہ سر کو اثبات میں جنبش دیتے ہوئے جلدی سے بولی۔ "یہ بھی چوڑیوں میں سے دو تین ٹوٹ گئی تھیں۔"

"یہ کب کی بات ہے؟" میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

"یہی کوئی دو یا تین دن پہلے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے بدستور اس کے چہرے پر نگاہ جمائے ہوئے استفسار کیا۔ "ان ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے ٹکڑوں کا تم نے کیا کیا تھا؟"

اس کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے تذبذب بھری الجھن تیر گئی پھر سنبھل کر اس نے جواب دیا۔ "میں نے ان ٹکڑوں کو گھر کے کوڑے میں پھینک دیا تھا۔"

"وہ کوڑا جو روزانہ گھر میں جھاڑو وغیرہ دینے کے بعد نکلتا ہے؟" میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

"جی، جی..... وہی۔" وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

"گھر سے نکلنے والا کوڑا کرکٹ تم لوگ کہاں پھینکتے ہو؟" میں نے اپنے سوالات میں تیزی لاتے ہوئے پوچھا۔

"ہماری گلی کے کونے پر ایک گڑھا ہے۔" فوزیہ نے بتایا۔ "ہم ہر فضول اور ناکارہ چیز کو اسی میں پھینکتے ہیں۔"

"ٹھیک ہو گیا۔" میں نے کہا۔ "کیا تمہیں یقین ہے کہ ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے وہ ٹکڑے ابھی تک اسی گڑھے میں پڑے ہوں گے؟"

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ شکست زدہ لہجے میں جواب دیتے ہوئے بولی۔ "جی..... بالکل..... اس گڑھے میں جو چیز بھی پھینکی جائے، وہ ادھر ہی رہتی ہے۔ اسے کوئی وہاں سے نہیں نکالتا کیونکہ وہ کسی کے کام کی نہیں ہوتی۔"

"لیکن بعض ناکارہ اور فضول چیزیں بھی کھوٹے سکے کی طرح اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "لوگ کسی خاص مقصد کی خاطر انہیں کچرے کے ڈھیر پر سے اٹھانے کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں جیسا کہ تمہاری ٹوٹی ہوئی سبز چوڑیوں کے وہ چند ٹکڑے۔"

ہماری اس گفتگو کے دوران میں صدیق کھوکھر چپ چاپ بیٹھا تماشا دیکھ رہا تھا۔ اپنے وعدے کے مطابق اس نے بیچ میں مداخلت کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میرے سوال نے فوزیہ کو کافی بے چین کر دیا تھا۔

"وہ بے قیمت کانچ کے ٹکڑے بھلا کسی کے لیے کیسے اہم ہو سکتے ہیں؟" اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ "وہ اس وقت بھی دوسری الا بلا چیزوں کے نیچے گڑھے میں کہیں دبے ہوئے ہوں گے۔"

"اگر واقعی ایسا ہوتا تو پھر مجھے عزیز آباد کے گھر گھر جا کر عورتوں کی کلائیاں چیک نہ کرنا پڑتیں۔" میں نے قدرے تیکھے لہجے میں کہا۔ "تم نے اپنی ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے جو ٹکڑے کچرے والے گڑھے میں پھینکے تھے، اب وہ وہاں موجود نہیں ہیں۔"

وہ اضطراری لہجے میں مستفسر ہوئی۔ "تو پھر وہ کہاں ہیں؟"

میں نے اس کے اضطرار اور اضطراب کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے سپاٹ آواز میں سوال کیا۔ "فوزیہ! کیا تم اپنی ٹوٹی ہوئی ہلکے سبز رنگ کی چوڑیوں کے ٹکڑوں کو پہچان سکتی ہو؟"

"جی..... بالکل..... وہ ایسی ہی چوڑیاں تھیں۔" وہ اپنی کلائیوں میں موجود دھانی بانکوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

میں نے اپنی جیب میں سے کانسٹیبل شوکت علی کی فراہم کردہ پڑیا نکال لی اور اسے کھولنے کے بعد فوزیہ کے سامنے رکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

"ان کانچ کے ٹکڑوں کے بارے میں تم کیا کہو گی؟"

ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے ٹکڑوں کو دیکھ کر اس کے چہرے اور آنکھوں میں حد درجہ پریشانی نمودار ہوئی۔ وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولی۔

"یہ تو..... وہی ٹکڑے ہیں..... جو میں نے گڑھے میں پھینکے تھے۔"

"آپ کو یہ ٹکڑے کہاں سے ملے ہیں تھانیدار صاحب؟" صدیق کھوکھر بے ساختہ بول اٹھا۔

اب کی بار میں نے اسے روکنے یا ڈانٹنے کی کوشش نہیں کی اور متحمل انداز میں جواب دیا۔ "دریا کے کنارے پر، جھاڑیوں کے نزدیک ٹلی کا ایک قد آور درخت کھڑا ہے۔ اس درخت سے چند فٹ کے فاصلے پر کرمو مچھیرے نے مچھلیاں پکڑنے کا بندوبست کر رکھا ہے۔ یہ کانچ کے ٹکڑے ہمیں اسی ٹلی کے درخت کے نیچے پڑے ملے تھے۔"

"مگر یہ ٹکڑے گڑھے کے اندر سے وہاں کیسے پہنچ گئے؟" صدیق کھوکھر کا حیرت اور الجھن میں گندھا ہوا استفسار میری سماعت تک پہنچا۔

"میں یہی جاننے کی کوشش میں لگا ہوا ہوں صدیق کھوکھر!" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "ان کانچ کے ٹکڑوں کا ایک ایسے مقام کے قریب پایا جانا جہاں سے اکبر کھوکھر کی صندوقچی بندھی ملی تھی، اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ قتل کی اس واردات کے ساتھ ان ٹکڑوں کا کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہے۔ باقی ان کا گڑھے سے نکل کر وہاں پہنچنے کا جو معاملہ ہے تو....." سانس ہموار کرنے کی غرض سے میں نے لمحاتی توقف کیا پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"میں اسی سلسلے میں یہ ساری تفتیش کر رہا ہوں۔ یہ چند بے وقعت کانچ کے ٹکڑے مجھے تمہاری چھوٹی بیٹی تک لے آئے ہیں۔ اس سے آگے کی راہنمائی بھی فوزیہ ہی کرے گی۔"

"میں..... کیسے..... آپ کی راہنمائی کر سکتی ہوں تھانیدار جی؟" وہ بوکھلاہٹ آمیز لہجے میں بولی۔ "میں نے تو انہیں گلی والے گڑھے میں پھینک دیا تھا..... مجھے اور کچھ بھی پتا نہیں....."

"تھانیدار صاحب! ہم پہلے ہی بہت پریشان ہیں۔" صدیق کھوکھر نے منت بھرے انداز میں کہا۔ "اکبر کی موت نے دونوں گھروں کی خوشیوں کا بیڑا غرق کر دیا ہے۔ اگلے سال کے تیسرے مہینے میں فوزیہ اور اصغر کی شادی طے ہے۔ پتا نہیں یہ حادثہ فوزیہ کی شادی پر کیا اثرات ڈالے گا۔ میں آپ سے ہاتھ جوڑ کر خوشامد کرتا ہوں کہ میری بچی کو اپنی تفتیش سے دور ہی رکھیں۔ بڑی مہربانی ہوگی جناب کی۔"

"صدیق! میں بھی ایک بیٹی کا باپ ہوں اس لیے باپ کی مجبوریوں کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہوں۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں تمہاری بیٹی فوزیہ کو شامل تفتیش نہیں کر رہا۔ یہ تو میری تفتیش مجھے فوزیہ تک لے آئی ہے۔ میں اس کے جواب سے مطمئن ہوں۔ اس نے یقیناً وقوعہ کے روز گلی والے گڑھے ہی میں پھینکے ہوں گے لیکن میرے لیے یہ جاننا بہت ضروری ہے کہ گڑھے کے اندر سے نکل کر چوڑیوں کے یہ ٹکڑے، دریا کے کنارے کھڑے ایک درخت کے نیچے کیسے پہنچ گئے تھے۔ یہ کام خود بخود تو نہیں ہو سکتا۔ کسی نہ کسی انسان نے تو یہ کام کیا ہوگا اور ممکن ہے، یہ اکبر کے قاتل ہی کا کیا دھرا ہو۔ اس کی اس حرکت نے فوزیہ کی ذات کو شک کے دائرے کے اندر کھڑا کر دیا ہے۔ کہیں قاتل تمہاری بیٹی کو اکبر کی موت کا ذمے دار ٹھہرانے کی کوشش تو نہیں کر رہا؟"

"تھانیدار صاحب! آپ ڈرانے والی باتیں تو نہ کریں۔" وہ پریشانی سے لبریز لہجے میں بولا۔

"میں تمہیں ڈرانے یا دھمکانے کی بات نہیں کر رہا صدیق۔" میں نے واشگاف الفاظ میں کہا۔ "اگر تمہاری یا فوزیہ کی یہاں پر کسی سے کوئی دشمنی ہے تو مجھ سے کچھ بھی چھپانے کی کوشش نہ کرو۔ میں یہ سب آپ لوگوں کی خیر خواہی کی غرض سے کہہ رہا ہوں۔"

"عزیز آباد میں کوئی ایک بھی شخص ہمارا دشمن نہیں ہے۔" وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔

میں نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔ "اور ادھر فتح پور میں؟"

"فتح پور.....؟" وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

"ہاں۔" میں نے سر کو اثباتی جنبش دی اور کہا۔ "فتح پور کے وسنیک نذیر حسین ترکھان کا اوزاروں والا چوبی صندوق اس واقعے سے چند روز پہلے کسی نے اس کی دکان کے اندر سے چرا لیا تھا۔ یہ وہی صندوق ہے جس کے اندر تمہارے بھتیجے اکبر کھوکھر کی لاش بند تھی۔ قاتل اتنا چالاک اور عیار ہے کہ وہ اپنے کالے کرتوت کو عزیز آباد اور فتح پور سے ایک ساتھ جوڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔ مجھے اس کیس کے ہر زاویے کو گہری نظر سے دیکھنا ہے صدیق! اسی لیے میں تم لوگوں سے کہہ رہا ہوں......!" میں لمحے بھر کو رکا پھر پوچھا۔ "وہ تمہارا بھتیجے کا تیز بیٹا کہاں ہے؟"

"قادر، رفیق کے گھر گیا ہوا ہے۔" اس نے بتایا۔ "اکبر کی تدفین کل رات ہی میں کر دی گئی تھی لیکن رات کے پچھلے پہر اچانک بارش شروع ہو گئی جس کی وجہ سے قبر کی مٹی اپنی جگہ پر نہیں رہی۔ میں نے ہی قادر کو ادھر بھیجا ہے تاکہ وہ اصغر اور رفیق کی مدد کرے۔ میرے خیال میں وہ لوگ اس وقت قبرستان میں ہوں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "اگر تم میں سے کسی کو بھی اکبر کے قتل کے حوالے سے کوئی اہم بات پتا چلے تو فوراً مجھے بتاؤ گے۔"

"جی ضرور..... کیوں نہیں۔" صدیق نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

یہ بات میں نے ان دونوں باپ بیٹی کی طرف دیکھتے ہوئے کہی تھی لہٰذا فوزیہ بھی دبی دبی زبان میں بولی۔ "جی اچھا۔"

"فوزیہ! تم اندر جاؤ۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے تمہارے باپ سے چند اہم باتیں کرنا ہیں۔"

فوزیہ نے پہلے صدیق کھوکھر کی جانب سوالیہ نظر سے دیکھا۔ مجھے اس کی آنکھوں میں کوئی گمبھیر الجھن تیرتی ہوئی دکھائی دی تھی تاہم اس نے اپنی زبان سے کچھ نہیں کہا اور چپ چاپ وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔ پتا نہیں کیوں مجھے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے وہ اس کمرے میں رکنا چاہتی ہو۔ کوئی اندرونی سوچ یا پھر کوئی بیرونی قوت اسے جانے سے روک رہی تھی۔

"تمہارے چھوٹے بھائی رفیق کھوکھر اور اس کے گھر والوں پر اس وقت ایک قیامت گزر رہی ہے۔" فوزیہ کے جانے کے بعد میں نے صدیق کھوکھر کی طرف دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "اس لیے میں ان لوگوں پر زیادہ جرح نہیں کرنا چاہتا۔ ویسے تو رفیق سے میری تفصیلی ملاقات ہو چکی ہے لیکن اس ملاقات کے بعد کچھ ایسی چیزیں سامنے آئی ہیں جن کی تصدیق یا تردید بہت ضروری ہے کیونکہ اس سے موجودہ کیس کو حل کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔

"مجھے اس سلسلے میں تمہارا تعاون چاہیے، صدیق!"

"میں ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہوں جناب!" وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ "آپ پوچھیں، کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟"

میں نے پوچھا۔ "مجھے پتا چلا ہے مقتول اکبر کا رشتہ پہلے تمہاری بڑی بیٹی عالیہ کے ساتھ طے تھا پھر ان لوگوں نے اس رشتے کو ختم کردیا۔ کیا اس کا کوئی خاص سبب تھا؟"

"ان لوگوں نے نہیں بلکہ اس رشتے کو توڑنے میں صرف اور صرف میری نامعقول بھابی بشریٰ کا ہاتھ ہے۔" وہ تلخی بھرے لہجے میں بولا۔ "ہم دونوں بھائیوں نے بہت سوچ سمجھ کر اپنے بچوں کے رشتے طے کیے تھے۔ عمر اور ظاہری و باطنی خوبیوں اور خامیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے عالیہ کے لیے اکبر کو اور فوزیہ کے لیے اصغر کو منتخب کیا گیا تھا لیکن تھوڑے عرصے کے بعد اس فسادی عورت نے رخنہ ڈال دیا۔ اس نے اکبر کے کان بھرنا شروع کیے کہ عالیہ شکل صورت کی اچھی نہیں ہے۔ اگر وہ اس رشتے سے انکار کردے تو وہ اس کی شادی اپنے بھائی ملک خدابخش کی اکلوتی بیٹی فرزانہ سے کروا دے گی۔ فرزانہ تو وہ آسمان سے اتری ہوئی کوئی حور اور پری جیسی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ فرزانہ، عالیہ کے مقابلے میں زیادہ حسین و جمیل لڑکی ہے لیکن یہ کوئی طریقہ نہیں ہوتا جناب! بشریٰ پہلے بھی کئی بار خدابخش سے رشتے کا تقاضا کرچکی ہے اور ہر مرتبہ وہاں سے اسے نہ ہی سننے کو ملی ہے۔"

"ہاں، مجھے پتا چلا ہے، فرزانہ کی ماں شبنم اس کی شادی اپنی چھوٹی بہن جمیلہ کے اکلوتے بیٹے مہر سکندر سے کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔" میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ "اور خدابخش اپنی بیوی کے سامنے دم مارنے کی جرأت نہیں رکھتا اس لیے وہاں سے کوئی مثبت جواب موصول نہیں ہو رہا۔"

"ہم نے بھی کچھ ایسا ہی سنا ہے لیکن اصول اور اخلاق بھی کوئی شے ہوتی ہے تھانیدار صاحب!" وہ کڑوے لہجے میں بولا۔ "بشریٰ جہاں چاہے اپنے بیٹے کی شادی کے لیے جوتیاں گھساتی اور سر پٹختی مگر عالیہ سے اس کا رشتہ طے ہوجانے سے پہلے۔ جب عالیہ اور اکبر کی شادی کا معاملہ پکا ہوگیا تو پھر پیچھے ہٹنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی مگر بشریٰ نے تو تمام اخلاقی اور معاشرتی حدود کو پھلانگ ڈالا تھا۔"

لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر مزید دو تین گہری سانسیں لینے کے بعد برہمی بھرے لہجے میں گویا ہوا۔

"بشریٰ نے اکبر کی سماعت میں جو زہر انڈیلا، اس کے نہایت ہی خطرناک اثرات مرتب ہوئے تھے۔ پہلے تو اکبر اس ضد پر اتر آیا کہ وہ عالیہ کے بجائے فوزیہ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اس کی یہ احمقانہ خواہش کسی بھی طور پوری نہیں کی جاسکتی تھی۔ اپنی ناکامی کو اس نے انا کا مسئلہ بنالیا۔ دوسری جانب بشریٰ مسلسل اس کے کانوں میں ددھیال کے خلاف زہر انڈیل کر اکبر کو اپنی بھتیجی کے حصول کے سہانے خواب دکھا رہی تھی۔ دو تین ماہ تک یہ واہیات صورت حال ادھر سے اُدھر حرکت کرتی رہی اور پھر یہ رشتہ ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا۔"

"جو ہوا، بہت ہی برا ہوا۔" صدیق کے خاموش ہونے پر میں نے کہا۔

"اب تو ہو چکا تھانیدار صاحب!" وہ قدرے تیز لہجے میں بولا۔ "اگر میں بھی بشریٰ کی طرح کمینگی اور کم ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فوزیہ اور اصغر کا رشتہ بھی توڑ دیتا تو ہم دونوں بھائیوں میں ہمیشہ کے لیے تعلقات ختم ہوجاتے تھے۔ میں نے صبر اور برداشت سے کام لیا اس لیے ہمارے بیچ نفاق پیدا نہیں ہوسکا۔"

"تم نے اپنے عقل مند ہونے کا ثبوت دیا ہے صدیق!" میں نے اس کے چہرے پر نگاہ گاڑ کر کہا۔ "لیکن مجھے پتا چلا ہے کہ گزشتہ روز تم بھائیوں میں اچھی خاصی تلخ کلامی ہوگئی تھی؟"

"اس بدمزگی کا سبب بھی وہی فتنہ پرور عورت بشریٰ ہی تھی۔" وہ معتدل انداز میں بولا۔ "گھر ماتم کدہ بنا ہوا ہے مگر اس کی زبان شر انگیزی سے باز نہیں آرہی۔ بس، اس کی کڑوی اور کسیلی باتوں نے ہم بھائیوں کے دماغ تھوڑی دیر کے لیے گرم کردیے تھے لیکن فوراً ہی ہم لوگوں نے اپنے جذبات پر قابو پالیا اور معاملہ رفع دفع ہوگیا۔"

میں نے مزید پندرہ بیس منٹ صدیق کھوکھر کے ساتھ بات چیت میں گزارے پھر کانسٹیبل شوکت علی کے ہمراہ واپس تھانے آگیا۔ جب ہم تھانے پہنچے تو مغرب کی اذان ہو رہی تھی اور بارش کو بھی دوبارہ ہوش آگیا تھا۔

☆☆☆

گزشتہ شام شروع ہونے والی بارش اگلی صبح کا سورج طلوع ہونے سے پہلے رخصت ہوگئی تھی۔ اتوار پندرہ نومبر کے دن کا آغاز ہوا تو مطلع صاف تھا تاہم سردی کی شدت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ میں حسب معمول تیار ہوکر تھانے پہنچا تو کانسٹیبل اکرام شاہ میرے کمرے میں آگیا۔

"شاہ جی! آج تو اتوار ہے۔" میں نے اس پر نگاہ

پڑتے ہی کہا۔ ''تم گھر کا چکر لگانے نہیں گئے؟''

اکرام شاہ کی رہائش ادھر عزیز آباد ہی میں تھی اور وہ اتوار کا دن اکثر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ گزارا کرتا تھا۔ اس نے مجھ سے اجازت لینے کے بعد ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''ملک صاحب! میں اس ہفتے میں دو، تین بار جلدی چھٹی لے کر گھر جا چکا ہوں اس لیے میں نے سوچا کہ یہ اتوار میں آپ کے ساتھ تھانے میں گزاروں گا اور...... مجھے آپ سے ایک ضروری بات بھی کرنا ہے۔''

اس نے آخری جملہ کچھ ایسے انداز میں ادا کیا تھا کہ میں چونکے بنا نہ رہ سکا۔ ''کون سی ضروری بات؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا اس بات کا تعلق موجودہ کیس سے ہے؟''

اکبر کھوکھر مرڈر کیس نے ان دنوں میرا دماغ گھما کر رکھا ہوا تھا اور میں دن رات اسی کے بارے میں سوچتا رہتا تھا۔ کئی ایک زاویے واضح بھی ہو چکے تھے مگر ابھی تک میں کسی حتمی نتیجے تک نہیں پہنچ پایا تھا۔

''جی ملک صاحب!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں نے ایک ایسا بندہ ڈھونڈ نکالا ہے جس نے وقوعہ سے چند روز قبل مقتول اور صدیق کھوکھر کی چھوٹی بیٹی فوزیہ کو اسی ٹاہلی کے درخت کے نیچے جھگڑا کرتے دیکھا تھا جہاں سے شوکت علی کو سبز چوڑیوں کے ٹکڑے ملے تھے۔''

''وہ بندہ کون ہے؟'' اکرام شاہ کی ضروری بات نے میرے دماغ میں ہلچل مچا دی تھی۔ میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔ ''اس وقت وہ کہاں ہے؟''

''اس کا نام غفور احمد ہے ملک صاحب! اور وہ بھی عزیز آباد ہی کا رہنے والا ہے۔'' اس نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ''وہ اس وقت باہر برآمدے میں بیٹھا ہوا ہے۔''

''تو اسے فوراً اندر بلاؤ۔'' میں نے کہا۔

جب میں اپنے کمرے کی طرف آ رہا تھا تو میں نے برآمدے میں ایک پستہ قامت درمیانی عمر کے شخص کو بیٹھے دیکھا تھا لیکن میں نے اس پر دھیان نہیں دیا تھا۔ اس وقت میں نے یہی سوچا تھا کہ وہ معمول کا کوئی فریادی ہوگا۔

چند لمحات کے بعد اکرام شاہ، غفور احمد کو میرے پاس لے آیا۔ غفور پیشے کے اعتبار سے کمہار تھا اور مٹی کی تلاش میں اس کا اکثر دریا کی جانب جانا ہوتا رہتا تھا۔

''اکرام شاہ نے مجھے جو کچھ بتایا ہے، اگر اس میں ایک بھی بات غلط ثابت ہوئی تو میں تمہارا بہت برا حشر کروں گا غفور!'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ گاڑ کر سپاٹ آواز میں کہا۔ ''کیونکہ یہ معاملہ نہایت ہی حساس اور خاص نوعیت کا ہے۔''

''میں جھوٹ کیوں بولوں گا سرکار!'' وہ لجاجت آمیز لہجے میں بولا۔ ''میں نے جو دیکھا، وہی شاہ جی کو بتایا ہے۔''

''مجھے بھی بتاؤ۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''سب کچھ سچ اور صد فیصد کھرا۔''

''میں حسب ضرورت مٹی لینے دریا کی طرف جا رہا تھا تو میں نے رفیق کھوکھر کے بڑے بیٹے اور صدیق کھوکھر کی چھوٹی بیٹی فوزیہ کو آپس میں جھگڑا کرتے دیکھا تھا۔ اکبر نے فوزیہ کی کلائی تھام رکھی تھی اور فوزیہ اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے ان کے معاملات میں مداخلت کرنا مناسب نہ سمجھا اور آگے بڑھ گیا لیکن جب میں واپس آیا تو وہ دونوں مجھے کہیں نظر نہ آئے۔ میں انہیں ذہن سے نکال کر اپنے گھر آ گیا تھا۔''

فوزیہ کی چوڑیاں ٹوٹنے اور ان کے ٹکڑے ٹاہلی کے درخت تلے پائے جانے کا راز کھل گیا تھا۔ میں نے غفور سے سوال کیا۔

''یہ کتنے دن پہلے کا واقعہ ہے؟''

''یہی کوئی پانچ چھ دن پہلے کا سرکار!'' اس نے بتایا۔ ''اس روز پیر کا دن تھا۔''

میرے اور غفور احمد کے درمیان یہ گفتگو پندرہ نومبر بروز اتوار کی صبح ہو رہی تھی۔ اس سے پہلے پیر کا دن نو نومبر کو پڑا تھا۔ میں نے غفور سے پوچھا۔

''اس واقعے کے بارے میں تم نے اور کس کس کو بتایا ہے؟''

''کسی کو بھی نہیں سرکار!'' وہ رونی صورت بنا کر بولا۔

میں نے تاکیدی لہجے میں کہا۔ ''اور کسی کو بتانا بھی نہیں۔''

''جو آپ کا حکم تھانیدار صاحب!'' وہ سراپا فرمانبرداری بنتے ہوئے بولا۔ ''میں تو اس واقعے کو بھول ہی گیا تھا۔ انسان کی زندگی میں اپنے دکھ ہی اتنے زیادہ ہوتے ہیں کہ وہ دوسروں کے معاملات کو کہاں یاد رکھ سکتا ہے۔''

''اگر تم چاہتے ہو کہ میں تمہارے دکھوں میں اضافہ نہ کروں تو اپنی زبان پر تالا ڈال کر رکھنا۔'' میں نے تنبیہی انداز میں کہا۔ ''کم از کم اس وقت تک تمہیں خاموش رہنا ہے جب تک اکبر کھوکھر کا قاتل میری گرفت میں نہیں آ جاتا۔ میری بات سمجھ میں آ رہی ہے نا؟''

''جی سرکار!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے

بولا۔ ”آپ نے جو کہا ہے، میں بالکل ویسا ہی کروں گا۔“

”ٹھیک ہے۔ اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا پھر ایک فوری خیال کے تحت پوچھ لیا۔ ”کیا اس روز تم نے مقتول اور نوزیہ کو صرف جھگڑتے ہوئے ہی دیکھا تھا یا ان کی باتیں بھی سنی تھیں؟“

”نہیں سرکار!“ وہ سر کو دائیں بائیں جھٹکتے ہوئے بولا۔ ”۔۔۔۔ایک تو میں نے انہیں کافی فاصلے سے دیکھا تھا، دوسرے میں نے ان کی باتوں پر توجہ بھی نہیں دی تھی۔ وہ بحث و تکرار میں ایک دوسرے سے کیا کہہ رہے تھے، میں اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔“

مزید دو چار متعلقہ سوالات کے بعد میں نے غفور کمہار کو ضروری ہدایات کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی۔ وہ مجھے سلام کر کے رخصت ہو گیا تو میں نے حوالدار انور علی کو اپنے پاس بلا لیا۔

انور علی اس کیس کے ایک ایک پہلو سے آگاہ تھا۔ میں نے اسے تازہ ترین صورت حال کے بارے میں مختصراً بتایا اور گہری سنجیدگی سے کہا۔

”انور علی! تم کسی کو اپنے ساتھ لے جاؤ اور صدیق کمہار کی چھوٹی بیٹی نوزیہ کو یہاں لے آؤ۔“

”صرف نوزیہ کو؟“ اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

”ہاں، مجھے صرف اسی کی ضرورت ہے۔“ میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔

”اگر اس کے باپ نے کوئی روک ڈالی تو؟“

”انور علی! کیا تم نہیں جانتے کہ کارِ سرکار میں روک ڈالنا ایک سنگین جرم ہے۔“ میں نے واشگاف الفاظ میں کہا۔ ”جو بھی شخص تمہیں اس کارروائی سے روکنے کی کوشش کرے، تم اسے بھی ساتھ تھانے لے آؤ۔۔۔۔۔ آزاد یا ہتھکڑی کی کلائیوں کے ساتھ۔۔۔۔۔ یہ سب تمہاری صوابدید پر منحصر ہے۔ میری جانب سے تمہیں ہر ایکشن کی کھلی اجازت ہے۔“

”سمجھ گیا ملک صاحب!“ وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ ”آپ فکر نہ کریں۔ ایک دو گھنٹے کے اندر نوزیہ آپ کے سامنے حاضر ہو جائے گی۔ یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔“

میں نے ستائشی نظر سے حوالدار کو دیکھا۔ وہ مجھے سیلیوٹ مارنے کے بعد کمرے سے نکل گیا۔ جانے سے قبل اس نے اکرم شاہ کو اپنے ساتھ لے جانے کی خواہش ظاہر کی تھی لیکن میں نے اس کی مخالفت کر دی تھی۔ اکرام شاہ عزیز آباد کا رہنے والا تھا اور اس کیس کے نمٹ جانے کے بعد بھی اس کے بیوی بچوں کو اسی گاؤں میں رہنا تھا لہٰذا اس ہنگامی

نوعیت کی کارروائی میں اس کا شریک ہونا بعض حوالوں سے مجھے اچھا نہیں لگا تھا اس لیے میں نے اسے جانے سے روک دیا تھا۔

☆☆☆

حوالدار نے غلط نہیں کہا تھا۔ اپنے وعدے کے مطابق اس نے ایک گھنٹے میں فوزیہ کو لاکر میرے سامنے کھڑا کردیا تھا۔ یہ الگ بات کہ اس کے ساتھ ہی قادر اور صدیق کھوکھر بھی تھانے پہنچ گئے تھے۔ وہ باپ بیٹا اس وقت باہر برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے۔

میں نے فوزیہ کو اپنے سامنے بیٹھنے کے لیے کہا اور نرم خوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے چند منٹ کی گفتگو کے ذریعے اس کے اندر سے ڈر اور خوف کو نکالنے اور کم کرنے کی کوشش کی۔

”دیکھو فوزیہ!“ وہ قدرے نارمل ہوگئی تو میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اس روز اپنے گھر میں، سبز چوڑیوں کے ٹکڑوں کے حوالے سے تم نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔ میں تمہاری اس غلطی کو معاف کردوں گا لیکن تمہیں مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا......!“

میں نے گہری نظر سے اسے گھورا۔ وہ اضطراری انداز میں تھوک نگلتے ہوئے کمزور سے لہجے میں مستفسر ہوئی۔ ”کیا وعدہ تھانیدار صاحب؟“

”یہ وعدہ کہ......!“ میں نے اس کے چہرے پر نمودار ہونے والے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ”اب میں تم سے جو بھی سوال کروں، اس کا تم نے سولہ آنے درست جواب دینا ہے۔ میری بات سمجھ رہی ہونا؟“

وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے دھیرے سے بولی۔ ”جی۔“

”اب غلطی کی گنجائش باقی نہیں رہی فوزیہ!“ میں نے گمبھیر انداز میں اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”تم نے اگر دوبارہ مجھے چکر دینے کی کوشش کی تو میں بھول جاؤں گا کہ تم ایک نوعمر لڑکی ہو۔ پھر تم مجھ سے کسی رورعایت کی توقع نہ رکھنا۔“

”میں اس جھمیلے سے تنگ آگئی ہوں تھانیدار صاحب!“ وہ پھٹ پڑی۔ ”آپ مجھ سے پوچھیں۔ میں آپ کو سب سچ سچ بتادوں گی۔“

”آج سے چھ دن پہلے یعنی نو نومبر بروز پیر تم اور مقتول اکبر دریا کے کنارے جنگل کے ایک درخت کے پیچھے کھڑے آپس میں جھگڑا کررہے تھے۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اس واقعے کا میرے پاس ایک عینی شاہد بھی موجود ہے۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ مقتول نے تمہیں کلائی سے کیوں پکڑ رکھا تھا اور تم دونوں کس بات پر جھگڑا کررہے تھے؟ اسی کھینچا تانی میں تمہاری چند چوڑیاں بھی ٹوٹ گئی تھیں جن سے تمہاری کلائی زخمی ہوگئی۔“

بات کے اختتام پر میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا تو اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ چند لمحات کے تذبذب کے بعد اس نے ہمت پکڑی اور اپنا وعدہ پورا کرتے ہوئے صد درجہ زہریلے لہجے میں بولی۔

”وہ اکبر کی بدتمیزی کا کوئی پہلا واقعہ نہیں تھا تھانیدار صاحب! وہ اس سے پہلے بھی کئی بار ایسی گھٹیا حرکتیں کرچکا تھا۔ عالیہ باجی سے رشتہ ختم کرنے کے بعد وہ ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گیا تھا۔ مجھے جہاں بھی اکیلے دیکھتا، زور زبردستی کی کوشش کرنے لگتا تھا۔ اس دن جنگل کے پیچھے بھی اس نے مجھے گھیر لیا تھا۔“

فوزیہ کے انکشاف نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے پوچھا۔ ”مقتول کا تمہارے ساتھ اس قسم کا برتاؤ کیوں تھا؟“

”بعض لوگوں کی سوچ غلیظ ہوتی ہے۔“ وہ نفرت بھرے لہجے میں بولی۔ ”اکبر بھی بری نیت رکھنے والا بندہ تھا۔ جب عالیہ باجی سے اس کا رشتہ ٹوٹا تو میں نے شکر ادا کیا تھا لیکن مجھے کیا پتا تھا کہ اس کے بعد وہ میرے پیچھے لگ جائے گا۔ اس کی ماں بیچ بچ میں اس کی شادی کرانے کی کوشش کررہی تھی اور وہ...... آپ میں کیا کہوں تھانیدار صاحب! آپ سیانے ہیں، میری بات تو سمجھ ہی گئے ہوں گے۔“

فوزیہ کے چہرے سے جھلکنے والے کرب نے مجھے اس کے دل پر گزرنے والی قیامت کے بارے میں بڑی تفصیل سے بتادیا تھا۔ میں نے نرم لہجے میں سوال کیا۔

”تم نے مقتول کی بدتمیزیوں کے بارے میں اپنے بھائی یا باپ کو بتایا کیوں نہیں؟“

”جب سے امی کا انتقال ہوا ہے، ابو بجھ کر رہ گئے ہیں۔“ وہ بوجھل آواز میں بولی۔ ”عالیہ کا رشتہ ٹوٹنے کے بعد ان کی حالت اور بھی بری ہوگئی ہے اس لیے میں نے ان سے ذکر نہیں کیا اور قادر...... وہ تو آگ کا گولا ہے تھانیدار صاحب اس سے بات کرنے کا مطلب ہے کسی بڑے فساد کو دعوت دینا۔ ہاں، میں اصغر سے گاہے بگاہے تذکرہ کرتی رہتی تھی۔“

”اچھا......!“ میں نے معتدل انداز میں کہا اور پوچھا۔ ”اصغر کا ردعمل کیا تھا؟“

"وہ پوری توجہ سے میری بات سننے کے بعد کہتا تھا۔ فوزیہ! صبر اور برداشت سے کام لو۔ اگر کوئی ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا تو ہماری شادی بھی کھٹائی میں پڑ جائے گی اور میں کسی بھی قیمت پر تمہیں کھونا نہیں چاہتا۔ تم فکر نہ کرو۔ میں جلد ہی اس مسئلے کا کوئی حل نکال لوں گا..... لیکن وہ کوئی حل نہ نکال سکا پھر جب میری کلائی زخمی ہوئی تو میں نے اس سے کہہ دیا..... "اصغر! پانی سر سے اونچا ہو رہا ہے۔ میں اکبر کو اپنی عزت کے لیے ایک سنگین خطرہ محسوس کر رہی ہوں۔" وہ چند لمحات تک گہری سوچ میں غرق رہا تھا اور پھر اس نے مجھے یہ جواب دیا تھا..... "لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک طویل سانس خارج کی پھر اصغر کھوکھر کے الفاظ کو من و عن میری سماعت میں انڈیل دیا۔

"مجھے ایک ہفتے کی مہلت دو فوزیہ! میں اکبر کا ایسا پکا بندوبست کر دوں گا کہ بدتمیزی تو در کنار، وہ تمہیں چھونے کے قابل بھی نہیں رہے گا۔"

"اور پھر اس کے تین روز بعد بارہ نومبر کی صبح اکبر کی صندوق بند لاش دریا سے برآمد ہوئی ہے۔" میں نے ٹٹولنے والی نظر سے فوزیہ کو دیکھا۔ "یعنی اصغر نے اکبر کا بندوبست کر دیا، ہیں نا؟؟"

"میں اکبر کی موت کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھانیدار صاحب!" وہ رحم طلب نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ "آپ میری بات کا یقین کریں۔"

"مجھے تمہاری بات کا تو یقین ہے فوزیہ!" میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ "لیکن تم نے جو کہانی سنائی ہے، اس نے اصغر کی ذات کو شک کے دائرے میں لاکھڑا کیا ہے۔ کیا اکبر کو پیش آنے والے واقعے پر اصغر سے تمہاری کوئی بات ہوئی تھی؟"

"میں نے اصغر سے پوچھا تھا کہ اکبر کو کس نے قتل کیا ہے؟ تو اس نے جواب دیا تھا کہ "قدرت کے کام ایسے ہی نرالے اور انوکھے ہوتے ہیں۔ شکر کرو کہ اس بدبخت سے تمہاری جان چھوٹ گئی۔"

"میں اصغر کو کڑی تفتیش سے گزارنے پر مجبور ہوں فوزیہ!" میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ "تمہیں کچھ کہنا ہے؟"

"ابو کو یہ پتا نہ چلے کہ میں چھپ چھپ کر اصغر سے ملتی رہتی ہوں۔" وہ محتاط اور منت بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ "وہ پہلے ہی بہت زیادہ دکھی اور پریشان ہیں۔ میں ان کی اذیت کو بڑھانا نہیں چاہتی۔"

"ٹھیک ہے۔ میں تمہارا پردہ رکھ لوں گا۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "لیکن تمہاری ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کا معاملہ حل کرنے کے لیے مجھے اکبر کی بدتمیزیوں کے بارے میں صدیق کھوکھر کو بتانا پڑے گا۔"

اس نے گردن جھکا کر اپنی رضامندی ظاہر کر دی۔

میں نے قادر اور صدیق کو بھی اپنے کمرے میں بلا لیا۔ وہ فوزیہ کو صحیح سلامت دیکھ کر مطمئن تو ہو گئے تھے تاہم ان کی سوالیہ نظریں مجھ پر گڑی ہوئی تھیں۔

میں نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں..... اور فوزیہ کی خواہش کی روشنی میں ان باپ بیٹے کو صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ ادھر میری بات ختم ہوئی، ادھر قادر نے فوزیہ کی طرف دیکھتے ہوئے غصیلے لہجے میں کہا۔

"تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ میں اس منحوس اکبر کی گردن کاٹ کر الگ کر دیتا۔"

"تم نے بہت دیر کر دی قادر!" میں نے اس خرد ماغ نوجوان کی احمقانہ بات کے جواب میں طنزیہ لہجے میں کہا۔ "یہ سعادت تمہیں کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ تم نے اپنے ہاتھوں سے اکبر کی لاش کو لحد میں اتارا ہے۔ اب تم صرف جھنجلاہٹ میں اپنی انگلیوں کے کڑاکے ہی نکال سکتے ہو۔"

"اصل سے دغا نہیں اور کم نسل سے وفا نہیں۔" صدیق کھوکھر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "گندا انڈا اور گندا خون دونوں ایک دن ضرور اپنا رنگ دکھا کر رہتا ہے۔"

صدیق کھوکھر کی بات نے میرے دماغ کو الجھا دیا۔ میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ "صدیق! ابھی تم نے کم نسل، گندا انڈا اور غلیظ خون کے الفاظ کس کے لیے استعمال کیے ہیں؟"

"اسی مردود اور لعین کے لیے جس نے میری عالیہ کو ٹھکرا دیا تھا۔" وہ نفرت آمیز لہجے میں بولا۔ "اور اب وہ خبیث منوں مٹی کے نیچے دفن ہو چکا ہے۔"

"اکبر کھوکھر تمہارے چھوٹے بھائی رفیق کھوکھر کا بیٹا تھا۔" میں نے خفگی بھرے انداز میں کہا۔ "اپنی نسل اور خون کے لیے ایسی ہلکی اور عامیانہ باتیں نہیں کرنا چاہئیں صدیق!"

"یہ حقیقت نہیں ہے تھانیدار صاحب!" وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ "اکبر دراصل بشریٰ کے پہلے شوہر سلطان کی اولاد ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ وہ بشریٰ کے ساتھ جہیز کے طور پر آیا تھا۔ آپ ذرا ہمارا ظرف ملاحظہ کریں کہ رفیق نے اسے اپنے سگے بیٹے کا درجہ دیا اور اس کے نام کے ساتھ اپنی ذات "کھوکھر" کو بھی ٹانک دیا۔ میں نے اسے اپنے جگر کا ٹکڑا عالیہ کی شکل میں دے دیا اور اس بدذات نے کیا کیا..... یہ تمام تر گند خانہ آپ کے سامنے ہے جناب!"

"یہ سب سن کر مجھے حیرت کے ساتھ ہی بے حد افسوس بھی ہوا ہے۔" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دو ٹوک الفاظ میں کہا۔ "لیکن اس ذہنی حقیقت کو نہیں بدلا جاسکتا کہ اکبر کا قتل ہوا ہے اور اس کا قاتل ابھی آزاد گھوم رہا ہے۔"

"آپ قانون کے رکھوالے ہیں تھانیدار صاحب اور قانون کی پکڑ بڑی مضبوط ہوتی ہے۔" صدیق نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ "آپ قانون کو حرکت میں لا کر اکبر کے قاتل کو آہنی گرفت میں لے آئیں اور ہمیں جانے دیں یہاں سے۔"

"میں وہی کرنے جا رہا ہوں۔" میں نے بڑے عزم سے کہا۔

قادر نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔ "تو پھر ہمیں اجازت ہے؟"

ہمیں مزید تھانے میں روکنے کا جواز فی الحال باقی نہیں رہا تھا لہٰذا میں نے قادر کے استفسار کے جواب میں اپنے سر کو اثبات میں جنبش دینے پر اکتفا کیا۔

☆☆☆

تفتیش کی گاڑی کو آگے بڑھانے کے لیے مجھے ایک راستہ مل گیا تھا۔ اگلے روز میں نے اصغر کھوکھر کو گرفتار کرکے حوالات میں پہنچا دیا۔ فوزیہ سے حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں اکبر کو موت کے گھاٹ اتارنے میں اصغر کا ہاتھ ہو سکتا تھا۔ اگر صدیق کھوکھر نے مجھے اکبر کے ماضی کے بارے میں نہ بتایا ہوتا تو اصغر کو شاید میں اکبر کے قتل میں ملوث نہ سمجھتا مگر اب تو صورتِ حال ہی بدل گئی تھی لیکن جب میں اصغر کی زبان کھلوانے کے لیے اس پر دباؤ ڈال رہا تھا تو اس کا باپ رفیق کھوکھر ایک نئی اور سنسنی خیز کہانی کے ساتھ میرے پاس پہنچ گیا۔

"اکبر کی موت کا میں ذمے دار ہوں تھانیدار صاحب!" رفیق نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔ "آپ اصغر کو چھوڑ دیں۔ میں نے اس شیطان کی اولاد اکبر کو ختم کرکے اپنی ماضی کی غلطیوں کی تلافی کرنے کی کوشش کی ہے۔ آپ مجھے گرفتار کرلیں۔ میں کڑی سے کڑی سزا پانے کو تیار ہوں۔"

اس کے بعد رفیق کھوکھر نے اپنا جو بیان حلفی نوٹ کرایا، اس کا خلاصہ کچھ اس طرح تھا۔

"میں تمام حالات سے پوری طرح واقف ہو چکا تھا۔ اکبر جیسے موذی انسان کو موت کی نیند سلانے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ میں نے فتح پور کے ایک ترکھان کا چوبی صندوق چرانے کے لیے کرائے کے ایک چور سے مدد لی اور مذکورہ صندوق کو ادھر عزیز آباد ہی میں دریا کے نزدیک بنے ہوئے غلے کے گودام میں چھپا دیا۔ جب اکبر فتح پور جانے کے لیے گھر سے نکلا تو میں نے اسے ایک لسی کا لڈو کھلا دیا۔ لسی کے لڈو اکبر کی کمزوری تھے لیکن میں نے وقوعہ کی صبح اسے لسی کا جو لڈو اپنے ہاتھ سے کھلایا اس کے اندر ایک خاص قسم کا زہر ملا ہوا تھا۔ وہ زہر اس کے خون میں شامل ہو کر اسے پندرہ بیس منٹ میں اس دنیا سے اس دنیا میں پہنچا دیتا۔ جب اکبر غلے والے گودام کے نزدیک پہنچا تو زہر نے اپنا کام دکھا دیا۔ میں تھوڑا فاصلہ رکھ کر اس کا تعاقب کررہا تھا۔ میں اس کی لاش کو گھسیٹ کر گودام میں لے گیا اور اسی رات جب کرمو جھیرا اپنا کام نمٹا کر واپس چلا گیا تو میں نے پہلے صندوق کو اور پھر اکبر کی لاش کو گھسیٹ کر دریا کے کنارے پہنچا دیا۔ اس کے بعد کا کام میرے لیے مشکل ثابت نہیں ہوا تھا۔"

"صندوق کو فتح پور سے چوری کروانا اور عزیز آباد کے علاقے میں دریائی جھاڑیوں میں پھنسا کر تم یہ تاثر دینا چاہتے تھے کہ اکبر کا قتل ادھر فتح پور میں ہوا ہے؟" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"آپ کا اندازہ درست ہے ملک صاحب!" وہ بے خوف لہجے میں بولا۔ "میری خواہش تھی کہ اس قتل کا الزام ملک اعظم یا شمشیر کے بھتیجے جہانگیر پر آئے لیکن ان لوگوں کی خوش قسمتی اور میری بدقسمتی سے ایسا نہیں ہو پایا۔"

"یہ خوش قسمتی اور بدقسمتی کا معاملہ نہیں بلکہ دوغلی کا کھیل ہے رفیق کھوکھر!" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کرخت لہجے میں کہا۔

"دوغلی کا کھیل؟" اس نے حیرت اور الجھن کی ملی جلی کیفیت کے درمیان پوچھا۔ "یہ دوغلی کیا ہوتی ہے تھانیدار صاحب؟"

"جب کسی گھر میں یا کسی ملک میں بیک وقت دو افراد کی حکمرانی ہو تو بدانتظامی اور انتشار عروج کو پہنچ جاتا ہے۔" میں نے سپاٹ آواز میں کہا۔ "ایسی ہی صورتِ حال کو دوغلی کہا جاتا ہے۔ اس کی تفصیل اور وضاحت جیل کی دیواروں کے پیچھے گاہے بگاہے تمہیں حاصل ہوتی رہے گی۔"

وہ ایک نظر سے مجھے دیکھنے لگا جیسے میں نے اسے ڈرانے کے لیے کوئی خوفناک لطیفہ سنا دیا ہو۔ میری بیان کردہ حقیقت اس کے لیے ایک لطیفہ، ایک سنگین مذاق ہی تھی۔

(تحریر: حسام بٹ)

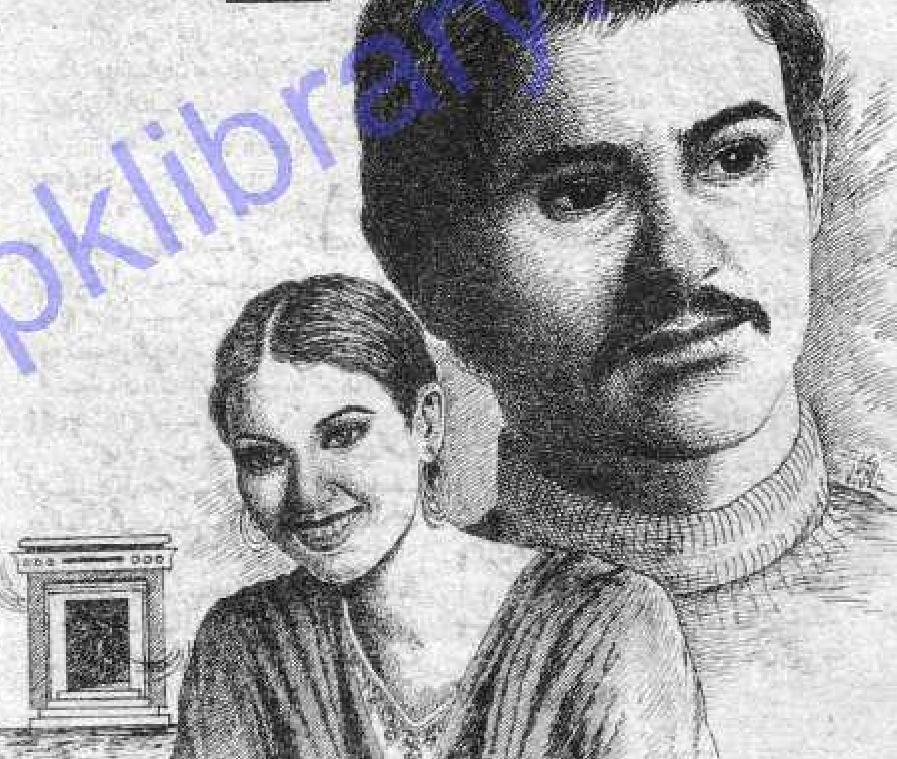
"امی جان آپ یہاں کیوں بیٹھی ہیں۔ باہر پھپھو
آئی ہیں۔ آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔" صفیہ بی بی کسی
سوچ میں گم بیٹھی تھی۔ جب اس کی بیٹی نے آ کر خبر دی۔ نند
کے آنے کی خبر سن کر ان کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔
وہ جتنا اپنے سسرال سے دور بھاگتی تھی' وہ اتنا ہی
اس کے قریب آنے کی کوشش کرتے تھے۔ سسرال والوں
کی وجہ سے وہ اپنے بچوں کے بچپن سے ہی انہیں لے کر شہر
آ گئی۔ شوہر کے جانے کے بعد سسرال والوں نے اس کا

زندگی کے اہم معاملات میں زبان سے مکر جانے والوں کا انجام.....

وعدہ کوئی بھی ہو اس کی اہمیت ایک جیسی ہوتی ہے تحریری اور دوسرا زبانی... بعض لوگوں کی زبان پتھر پر لکیر کے مانند فیصلہ کرتی اور منواتی ہے مگر جہاں زبان کی کوئی اہمیت نہ رہے وہاں رشتے بھی اپنی قدر کھو دیتے ہیں...

زبان

تسلیم شیخ



بہت دھیان رکھا لیکن وہ کہتے ہیں ناں زیادہ پیار بھی کچھ لڑکوں کو ہضم نہیں ہوتا۔ یہی حال صفیہ بی بی کا تھا۔ بچوں کو اچھی تعلیم کے بہانے وہ انہیں شہر لے آئی۔ چار بیٹیاں اور تین بیٹے تھے۔ سب کی شادیاں کر دیں۔ اب ایک آخری بیٹی رہ گئی تھی جس کا اس کے شوہر نے رشتہ اپنی بہن کی طرف کیا تھا... جو انہیں منظور نہیں تھا۔ اس کی بیٹی بارہ جماعتیں پاس تھی۔ جبکہ وہ لڑکا ان پڑھ گنوار تھا۔ گاؤں میں اپنی زمین تھی۔ جس پر وہ کھیتی باڑی کرتا تھا... اور اس کی بیٹی کو پانے کے لیے دن رات محنت کرتا تھا۔

ان کی نند ہر ہفتے رشتے کے لیے آتی تھی۔ ایک ہی تو اس کا بیٹا تھا۔ اس کی خوشی کی خاطر وہ بھابی کا در روز ہی کھٹکھٹانے آتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ بھابی آج پھر ٹال مٹول سے کام لے گی مگر پھر بھی وہ آگئی۔ ماں کو اولاد کی خوشی سے بڑھ کر کچھ بھی تو عزیز نہیں ہوتا۔

"اچھا تم چلو میں آتی ہوں۔" صفیہ بی بی نے بیٹی کو جانے کا کہا۔ انہیں چڑ آنے لگی، جب وہ اتنی بار ٹال مٹول کر چکی ہے تو پھر بار بار ان کا سر کھانے کیوں آجاتی ہے۔

وہ جلتی کڑھتی اٹھی اور نند کے پاس چلی آئی۔

"سلام بھابی۔" نند خوش اخلاقی سے بولی۔

"بیٹھی رہو۔" بھابی صاحبہ نے بے اعتنائی برتتے ہوئے کہا اور ایک طرف ہو کر بیٹھ گئی۔ نند جان گئی کہ بھابی کے تیور آج بھی خراب ہیں۔

"کیسی ہو؟ گھر میں سب کیسے ہیں؟" صفیہ بی بی نے سرد سا پوچھا۔

"اللہ کا شکر ہے بھابی سب ٹھیک ہیں۔ آپ نے کہا تھا کہ گاؤں میں کچے گھر ہوتے ہیں۔ عائشہ کیسے رہے گی تو میں بتانے آئی ہوں۔ ہم نے اپنی عائشہ کو لے جانے کے لیے پکا گھر بنایا ہے۔ پتھروں سے آراستہ خوبصورت اور دیدہ زیب، بالکل عائشہ بیٹی کے شایان شان ہے۔ کمرے میں ہی واش روم رکھا ہے۔" عائشہ اپنی پھپھو کی باتیں پورے انہماک سے سنتی رہی۔

"اچھا تو یہ سب بتانے آئی ہو۔ یعنی اپنے گھر کا رعب ڈالنے آئی ہو ہم پر۔" بھاوج نے اپنے تیور دکھائے۔ وہ تنگ آگئی تھی اس کے بار بار آنے سے، اس لیے وہ غصے سے بولی۔

"نہیں بھابی۔ آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔ میں تو بس اپنی امانت آپ سے لینے آئی ہوں۔ علی روز کہتا ہے کہ عائشہ کو اب اس کی دلہن بنا کر لے آئیں۔" نند ڈرتے ڈرتے بولی۔ عائشہ بات سن کر شرما گئی۔

"کون سی امانت؟ اور کس نے کہا کہ عائشہ امانت ہے تمہاری؟" بھاوج نے تیکھے لہجے میں استفسار کیا۔

"بھابی، عائشہ میرے بیٹے کی بچپن کی منگ ہے... اور یہ بات پورا گاؤں جانتا ہے۔" نند حیرت سے بولی۔

"گاؤں جانتا ہے، شہر نہیں جانتا... اور میری بیٹی شہر میں پلی بڑھی ہے۔ گاؤں کے ماحول میں نہیں رہ سکتی... اور میں نے ان دونوں کا رشتہ بھی کیا ہی نہیں تھا۔" بھابی صاحبہ کے تیور آج کھل کر سامنے آگئے تھے۔

"بھابی آپ نے اور بھائی نے زبان دی تھی۔" نند روہانسی ہو کر بولی۔

"کون سی زبان دی تھی۔ میں نے تو نہیں دی تھی۔" بھاوج نے آنکھیں دوسری طرف کرتے ہوئے جواب دیا۔

"جو لوگ جواب دیتے ہوئے آپ سے آنکھیں نہ ملانا چاہیں۔ سمجھ جائیں، وہ جھوٹ بول رہے ہیں۔ اپنی زبان سے مکر رہے ہیں۔"

جیسے عائشہ کی ماں مکر گئی تھی۔

"بھابی آپ کے کہنے پر میں نے اپنا سوچ کر گھر بنوایا ہے۔ اپنے بیٹے کی خواہش پوری کرنے کے لیے جدوجہد کی اور اب آپ اپنی زبان سے مکر رہی ہیں۔ اپنی زبان سے مکرنے والے کو اللہ پسند نہیں کرتا۔" اپنے آنسو پونچھتے ہوئے نند نے بھابی کو وارننگ دی تھی۔ جس کا اس پر تھوڑا بھی اثر ہونے والا نہیں تھا۔ اسے پریشانی ہو رہی تھی کہ جب اس کے بیٹے کو پتا چلے گا تو اس کا ردعمل کیا ہوگا۔ وہ تو جان چھڑکتا ہے ان کی بیٹی پر... دونوں ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں۔ سب اس شادی سے راضی تھے سوائے لڑکی کی ماں کے۔

"پھپھو، پانی۔" عائشہ کے چہرے پر بھی مایوسی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ جانتی تھی ایک نہ ایک دن اس کی ماں ایسا ضرور کرے گی تاکہ اچانک انہیں پریشانی میں مبتلا کرے۔

"رہنے دو بیٹا۔" پھپھو کہہ کر جلدی سے اپنا پرس پکڑے اور چادر کو سنبھالتی اٹھ کر چلی گئیں۔

"امی آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔" ان کے جانے کے بعد عائشہ ماں سے غصے میں بولی۔ وہ خود یہ شادی کرنا چاہتی تھی اور اس کی ماں ولن بنی ہوئی تھی۔

"ابھی تو کل کی پیدا اور مجھے بتائے گی کہ مجھے کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں۔" وہ عائشہ کو ایک تھپڑ رسید کرتے ہوئے بولی۔

"جی ہاں کیونکہ یہ میری زندگی ہے۔ میں بچپن سے

علی کی منگ ہوں۔ تو اس سے ہی شادی کرنا چاہوں گی۔“ عائشہ نے دوٹوک اپنا فیصلہ سنایا۔

”اور تو میرا بھی فیصلہ سن لے۔ تیری شادی اس سے نہیں ہوگی... اور ویسے بھی میں نے تیرے لیے ایک پڑھا لکھا اچھے گھر کا لڑکا دیکھا ہے جو کافی امیر ہے۔“ عائشہ کی ماں کی آنکھیں چمکیں۔

”علی میں کیا برائی ہے اماں؟“ وہ اپنی ماں کے پیروں میں بیٹھتے ہوئے لاچاری سے بولی۔

”اس میں اچھائی کیا ہے؟ گاؤں میں رہنے والا اجڈ گنوار... نہ پڑھا لکھا ہے اور نہ ہی پیسا ہے۔ تھوڑا بہت زمینوں سے ہی پیسا کماتا ہے بس۔ وہ بھی گزارے لائق... اور ویسے بھی میری ذمے داری ہے۔ میں تیرا مستقبل سنوار رہی ہوں۔ گاؤں میں کیسے رہے گی تو؟“ آخر میں ماں نے اسے اپنے پیروں سے اٹھا کر اپنے ساتھ پیار سے لگاتے ہوئے کہا۔

”بڑی دونوں بہنوں کی بھی تو گاؤں میں ہی ہوئی ہے نا... اور دونوں خوش بھی ہیں۔“ عائشہ بھولے پن سے بولی۔

”وہ تو خاندان والوں کی وجہ سے مجھے کرنا پڑا... اور اگر نہ کرتی تو وہ لوگ تمہیں تمہارے باپ کی زمین نہ دیتے۔ اب جب تمہارے معاملے میں ایسا کچھ نہیں ہے... تو بس تمہارا رشتہ میں خاندان میں کرنے والی نہیں...... اور پھر زبان سے پھرنے کا طعنہ دے کر چلی گئی۔“ انہوں نے آخر میں ایک موٹی گالی دی۔

”بات تو ٹھیک ہے اماں۔ آپ نے ہاں ہی کیوں کی تھی؟ اور پھر اتنے سالوں سے امید پر کیوں رکھا؟ اور آخر میں آپ اپنی زبان سے پھر گئیں۔“ عائشہ کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ وہ ماں کا جواب سنے بغیر ہی وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔

☆☆☆

”عائشہ...... عائشہ۔“ اگلے دن ہی علی ان کے گھر چلا گیا۔

”وہ گھر پر نہیں ہے۔“ عائشہ کی ماں نے روکھے لہجے میں کہا۔ وہ اسے اندر آتا دیکھ چکی تھیں۔

”وہ امی جی نے بتایا ہے کہ آپ نے رشتے سے انکار کر دیا ہے۔ میرے ابو کہتے تھے مجھے پہلے ہی پتا تھا کہ تمہاری ممانی ایسا ہی کرے گی۔ اس لیے میں تمہیں سمجھاتا ہوں کہ اس کا پیچھا چھوڑ دو۔ مگر میں مانتا نہیں تھا۔ بتائیں ممانی کیا آپ نے اور...... اور عائشہ نے بھی انکار کر دیا ہے۔“ وہ پاگلوں کی طرح بول رہا تھا۔ جیسے محبت والے محبت کے بچھڑ جانے سے ڈر جاتے ہیں... اور اگر سچ میں محبوب بچھڑ جائے تو زندہ رہتے ہوئے بھی زندہ لاش بن جاتے ہیں۔

اور ان میں سے ایک تو واقعی... زندہ لاش بننے والا تھا۔

”ارے نہیں۔ کب انکار کیا؟ بھلا میں اپنی زبان سے مکر تھوڑی سکتی ہوں۔“ پل میں ہی انہوں نے پینترا بدلا اور ان کے ذہن میں جھماکا ہوا۔

”تو پھر امی جی کیوں کہہ رہی تھیں؟“ اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔

”تمہاری ماں تو باؤلی ہے۔ میں کروں گی تمہاری اور عائشہ کی شادی۔ تم پریشان نہ ہو۔ یہاں بیٹھو سکون سے، اتنی گرمی میں آئے ہو۔ میں تمہارے لیے بوتل لاتی ہوں۔“ وہ تیزی سے اٹھ کر کچن میں گئیں۔ عائشہ کے آنے سے پہلے پہلے انہیں سب کرنا تھا۔

وہ کچن میں گئیں اور اس بوتل میں زہریلی گولیوں کو اچھے سے مکس کیا اور بہت میٹھے لہجے اور پیار بھرے انداز سے اپنے ہاتھوں سے بوتل پلائی۔ بوتل پلاتے ہی اس کی طبیعت بگڑ گئی۔ انہوں نے سکون سے بیٹھ کر سانس لی... اور اگلا لائحہ عمل ترتیب دیا۔

”بھائی صاحب...... میں...... میں عائشہ کی والدہ بات کر رہی ہوں۔ یہ آپ نے اپنے بیٹے کو کیا کہا کہ وہ لڑھکتے ہوئے میرے گھر آیا اور آپ کا نام لیتے لیتے آنکھیں بند کر دیں۔ کدھر ہیں آپ؟ جلدی سے سرکاری اسپتال پہنچ جائیں۔ میں اپنے علی کو وہیں لے کر جا رہی ہوں۔“ ان کے ہیلو کرتے ہی وہ ایک ہی سانس میں بولی اور کھٹ سے فون بند کر دیا اور ایمبولینس کو فون کھڑکا دیا۔ اور اسپتال ایمرجنسی میں لے گئیں۔ مگر ایمرجنسی میں جاتے جاتے وہ دم توڑ گیا۔

علی کے باپ نے جب ڈاکٹر سے وجہ پوچھی تو انہوں نے بتایا کہ شاید زہریلی گولیاں کھائی ہیں۔ یعنی خودکشی کی ہے۔

باپ نے لڑکھڑاتے ہوئے فرش پر بیٹھتے ہوئے اپنا سر پکڑ لیا۔

”اگر مجھے پتا ہوتا وہ ایسا کرے گا تو میں اسے کبھی غصے سے نہ بولتا۔“ وہ روتے ہوئے بولے۔

”بس بھائی صاحب، آج کل کے بچے بہت جذباتی ہیں۔ اپنے بڑوں کی باتوں کو مثبت لینے کے بجائے منفی لے کر زندگی کی بازی ہار جاتے ہیں اور حرام کو گلے لگا لیتے ہیں۔ آپ بس صبر کیجیے۔“ انہوں نے مگرمچھ کے آنسو بہاتے ہوئے جواب دیا۔

”میں کیا منہ دکھاؤں گا علی کی ماں کو۔ وہ تو مجھے

قصوروار سمجھے گی۔" انہوں نے روتے ہوئے کہا۔

"سمجھنا بھی چاہیے۔ ہمیشہ میرے خلاف خاندان میں باتیں کرتا تھا۔ اب اپنے کیے سے گا تو پتا چلے گا۔" وہ ہولے سے بڑبڑائیں۔

"کچھ کہا کیا بھابی آپ نے؟" انہیں لگا کہ بھابی کچھ بولی ہیں۔

"نہیں، نہیں۔ کچھ نہیں۔ میں عائشہ کو فون کر کے بتا دوں۔ پریشان ہو رہی ہو گی۔"

وہ کہہ کر چلی گئی۔

☆☆☆

"دفنا آئی ہیں اسے۔" وہ گھر میں داخل ہوئیں۔ تو عائشہ نے سوال کیا۔ وہ سر سے چادر اتار رہی تھیں۔ جب انہوں نے حیرت سے اپنی بیٹی کی طرف دیکھا۔ وہ بکھرے ہوئے حلیے میں تھی۔ آنکھوں میں وحشت تھی۔ وہ اسے دیکھ نہیں سکی۔ اس میں حوصلہ ہی نہیں تھا اس کا چہرہ دیکھنے کا۔ سب لوگ گاؤں گئے اور وہ اکیلی تن تنہا گھر میں تھی۔ سب نے کہا تھا ساتھ جانے کو۔ مگر وہ کیوں جاتی۔

"تمہیں لینے بھیجا تھا، تم کیوں نہیں آ گئیں۔ سب پوچھ رہے تھے۔" ماں نے بیٹی کے چہرے سے نظریں ہٹاتے ہوئے پوچھا۔

"کس منہ سے جاتی کہ میری ماں تمہاری قاتل ہے۔ اور میں اس قتل میں حصے دار۔" اس نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔

"کیا بکواس کر رہی ہو۔ میں نے کون سا قتل کیا ہے؟" انہوں نے غصے کا خول خود پر چڑھاتے ہوئے کہا۔

"آپ تو ہر بات سے مکر جاتی ہیں۔ اس سے بھی مکر جائیں۔" اس کے ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ تھی۔

"اپنا منہ بند رکھو۔ میں نے جو کیا تمہارے لیے کیا ہے۔" وہ سمجھ گئی کہ بیٹی سب جان گئی ہے۔ اب کچھ چھپانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

"آپ نے جو کیا، اپنی انا کے لیے کیا۔ میرے لیے اگر کرنا ہوتا۔ تو اس سے میری شادی کر دیتیں۔" اس نے چیختے ہوئے جواب دیا۔

انہوں نے بیٹی کا جواب سن کر اپنے دل پر ہاتھ رکھا۔ وہ دل کی مریضہ تھیں اور اسی کا انہوں نے فائدہ اٹھایا۔ اپنے دل کو تھام کر بیٹھ گئیں جیسے بہت درد ہو رہا ہو۔

"اماں..... اماں آپ ٹھیک تو ہیں؟" بیٹی تڑپ کر آگے بڑھی۔

"پیچھے ہٹ جاؤ۔ مرنے دو مجھے۔ تم بھی چاہتی ہو کہ میں مر جاؤں تو مرنے دو۔" انہوں نے جذباتی لہجے میں کہا۔

"نہیں نہیں اماں، میں آپ کو کھونا نہیں چاہتی۔" اس نے ماں کے ماتھے پر بوسہ لیا۔

"اچھا تو وعدہ کرو کسی کو کچھ نہیں بتاؤ گی۔ وہ کل سب آئیں گے تو تم خود کو نارمل رکھو گی۔" ماں نے وعدہ لینا چاہا۔

اور وہ ماں کے چہرے کی طرف تکنے لگی۔ اس کی ماں کا رنگ کالا تھا۔ اور وہ رنگ کی صاف اور پرکشش، جبکہ ماں کے نین نقش موٹے موٹے تھے۔ ہونٹ بھدے سے۔ ماں خوبصورت نہیں تھی۔ لیکن اسے اپنی ماں سے بے حد پیار تھا۔ وہ اپنی ماں کو کھونا نہیں چاہتی تھی۔

"وعدہ۔" وہ ماں کو دوائیاں دینے لگ گئی۔ اب اسے صبر سے کام لینا تھا۔ جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا تھا۔

اس نے علی کے سبھی تحفے پھینک دیے۔ وہ اس کی کوئی نشانی نہیں رکھنا چاہتی تھی اور دل پر پتھر رکھ لیا۔

اور پھر اس کی ماں نے اس کی شادی کر دی۔ ماں جیسی بھی ہو۔ اپنے بچوں کے لیے اچھا ہی چاہتی ہے۔ ان سب چکروں میں چاہے اولاد زندہ لاش بن جائے۔ عائشہ کی شادی دھوم دھام سے ہوئی۔ شادی سے پہلے وہ پھپھو کو سب بتا چکی تھی، وہ نہیں چاہتی تھی کہ پھپھو اپنے شوہر سے ناراض رہے۔ جو اولاد جذبات میں آ کر ایسا گھٹیا قدم نہیں اٹھاتی۔

شادی کے شروع کے دنوں میں شوہر نے خوش رکھا مگر پھر اسے بلاوجہ مارنا شروع کر دیا۔ وہ گھر میں کچھ نہ بتاتی۔ مگر ایک دن ماں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا اور بیٹی سے کہا۔ چلو یہاں سے۔ چھوڑ دو اسے تو بیٹی نے جواب دیا۔

"اماں جسے میں چاہتی تھی... اسے کم پڑھا لکھا ہونے کی وجہ سے آپ نے مسترد کر دیا اور جس سے آپ نے کی، وہ مجھے کہتا ہے تم کم پڑھی لکھی میرے متھے مار دی گئی ہو۔ اجڈ گنوار کہتا ہے۔ بدتہذیب کہتا ہے۔ عورت کی عزت نہیں کرتا۔ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا اماں میرے ساتھ۔ جو عورت کی عزت کرنے والا تھا۔ وہ ایک عورت کے ہاتھوں سے ہی مارا گیا۔" اس نے سسکاری بھری۔ ماں بھی رونے لگ گئی۔ بیٹی کو زندہ لاش بنانے میں اسی کا... تو ہاتھ تھا۔

وہ سچ ہی تو... کہہ رہی تھی۔ بیٹی کی قسمت خود برباد کی تھی اس نے۔

وہ بیٹی کو روتا ہوا چھوڑ کر خود روتے ہوئے چلی گئی۔ ابھی اسے اپنی نند سے معافی بھی مانگنا تھی۔

⌘⌘⌘

ابراہیم صاحب کا کہنا تھا کہ ان سے اچھی خریداری کوئی کر ہی نہیں سکتا۔ دکانداروں سے مول تول میں ان کا اپنا ہی طریقہ کار تھا۔ چیز اپنی مرضی کی لیتے اور دام بھی اپنی مرضی کا چکاتے۔ موزوں کا جوڑا خریدنا ہوتا تو دکاندار سے کہتے۔

"مناسب سا موزوں کا جوڑا دکھاؤ۔"

دکاندار ان کی بزرگی کا لحاظ رکھتے ہوئے دو تین جوڑے موزوں کے پیش کرتا۔ ابراہیم صاحب بھانپ لیتے کہ ان میں سے مناسب ترین کون سا تھا مگر اسے پرے ہٹاتے ہوئے کہتے۔ "یار اسے پرے کرو۔ کیا فضول چیز دکھا رہے ہو۔"

دکاندار حیران ہو کر سوچتا کہ یہ کیسا گاہک ہے جو نسبتاً ایک اچھی چیز کو فضول کہہ رہا ہے۔ ابراہیم صاحب اس کی حیرانی سے بظاہر بے نیاز باقی جوڑوں کی قیمت پوچھتے۔ دکاندار یہ سوچ کر کہ جب یہ شخص اچھی چیز کو قابل غور نہیں گردانتا تو کمتر کی قیمت کہاں چکائے گا۔ اپنی دانست میں قیمت کم بتاتا۔ ابراہیم صاحب کہتے۔ "بھائی مجھے تو کوئی سستا سا دکھاؤ۔ پانچ دس روپے والا۔"

دکاندار کا اوپر کا سانس اوپر، نیچے کا نیچے رہ جاتا۔

"بزرگو! کس زمانے کی بات کر رہے ہو۔ پانچ دس روپے والا زمانہ نہیں رہا۔"

ابراہیم صاحب دل ہی دل میں مسکراتے۔ "اچھا، ایک

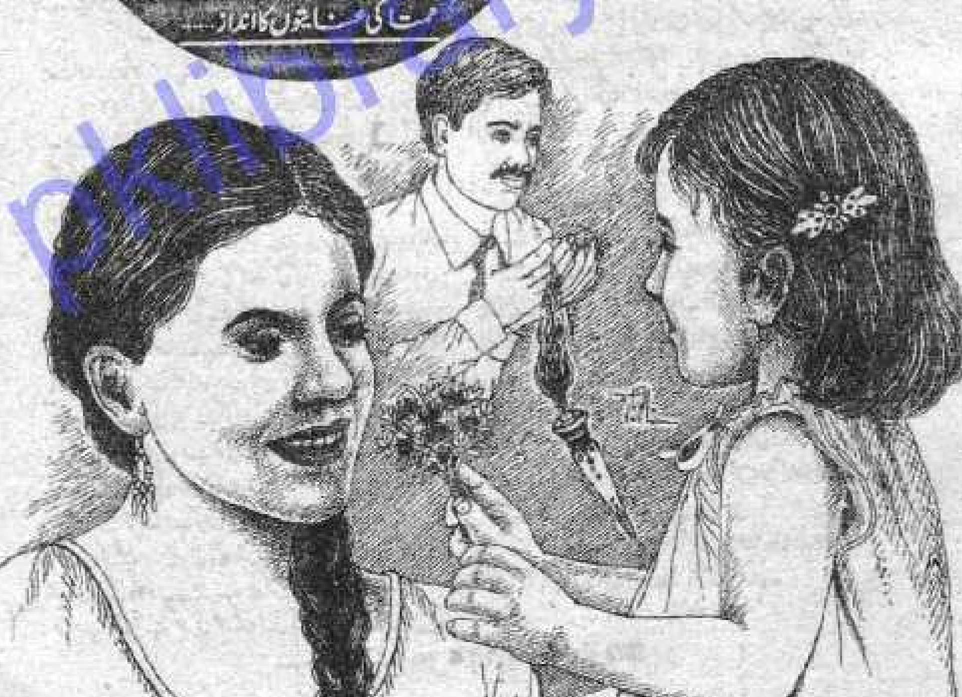
قدیم دور کی بعض جاہلانہ روایت کون کہتا ہے کہ مر گئیں... کہیں نہ کہیں... کسی نہ کسی حوالے سے آج بھی زندہ ہیں... جیسے کہ اللہ کی نعمتوں اور رحمتوں کے ملنے پر ناشکری اور نہ ملنے پر فساد پیدا کرنا... لیکن اس کی حکمت وہی جانے... چاہے کوئی ناشکری کرے یا فساد برپا... جسے جو دینا ہوتا ہے وہ دیتا ہے اور جہاں سے دینا چاہے عطا کرتا ہے...

مردود

ناہید سلطانہ اختر

...یا کی ماؤں سے ستر گنا زیادہ چاہنے والی

...ت کی رضا جوئی کا انداز.....



دو روپے اوپر سے لیتا۔"

دکاندار کہتا۔ "آپ کو ایک اور جوڑا دکھاتا ہوں۔"

ابراہیم صاحب سمجھ جاتے کہ اب دکاندار انہیں واقعی کوئی فضول سا جوڑا دکھائے گا۔

"رہنے دو یار! مجھے تو سستا سا چاہیے، گزارے لائق۔ اس کے کتنے پیسے لو گے؟" وہ فضول قرار دیے گئے جوڑے کی بابت پوچھتے۔ دکاندار کشمکش میں پڑ جاتا کہ جب یہ شخص پانچ دس روپے کی چیز طلب کر رہا ہے تو فضول قرار دی گئی چیز کی قیمت کب چکائے گا۔ وہ "فضول" چیز کی قیمت اپنی دانست میں نہایت کم بتاتا۔

"نہیں یار! کچھ کم کرو۔ پسند نہیں ہے مگر تمہارا دل رکھنے کو لے لوں گا۔"

دکاندار تاجرانہ کہتا۔ "ساٹھ کا ہے۔ آپ دس کم دے دینا۔"

ابراہیم صاحب کہتے۔ "چلو کہیں اور دیکھتا ہوں۔"

دکاندار منت بھرا کہتا۔ "آپ کتنا دو گے جی؟"

ابراہیم صاحب کہتے۔ "فقط تیس روپے۔"

دکاندار ناگواری سے کہتا۔ "اچھا، لاؤ تیس ہی دو۔ ہر سودا نفع کے لیے نہیں کیا جاتا۔ ایک آدھ نقصان میں گاہک رکھنے کے لیے بھی کیا جاتا ہے۔"

ابراہیم صاحب کہتے۔ "بیٹے! ہمارے لیے اپنا نقصان مت کرو۔ دعا تو ہم ویسے بھی دے دیں گے۔"

دکاندار موزے کی جوڑی تھیلی میں ڈال کر ابراہیم صاحب کی طرف بڑھاتے ہوئے کہتا۔ "لے جاؤ انکل! آپ بھی کیا یاد کرو گے۔" ابراہیم صاحب ادائیگی کرتے اور فاتحانہ اپنی راہ پکڑتے۔

برسہا برس سے دکانداروں سے خریداری کرتے ابراہیم صاحب کو یہ بات اچھی طرح سمجھ آ گئی تھی کہ اکثر دکاندار سو کی چیز دو سو بلکہ کبھی کبھی اس سے بھی زیادہ کی بتاتے تھے۔ علاوہ ازیں اصلی مال دکھانے سے پہلے دوسرے، تیسرے درجے کا مال دکھاتے۔ ابراہیم صاحب ان لوگوں میں سے تھے جو دوسرے درجے کی چیز سے بھی کام چلا لیتے ہیں۔ خریداری کے سلسلے میں ابراہیم صاحب کا ایک قاعدہ یہ بھی تھا کہ جس دکاندار سے ان کی بن جاتی، اسی کے ہو رہتے۔

ابراہیم صاحب کو ان مردوں سے بھی چڑ تھی جو اپنے گھر کی عورتوں کو تھیلے اور پرچیاں ہاتھ میں دے کر سبزی فروشوں، قصابوں اور کریانے کی دکانوں پر کھڑے دیکھ کر غیرت نہیں کھاتے۔ ابراہیم صاحب کے اپنے گھر کی عورتیں اپنی ذاتی ضرورت کی چیزیں خریدنے کے لیے کسی دکان پر یا شاپنگ مال میں چلی جاتی ہوں تو خیر مگر گھریلو سودا سلف ابراہیم صاحب خود ہی خریدتے یا ان کا بڑا بیٹا۔ چھوٹے کو اس سے کوئی سروکار نہ تھا۔

مرغی کا گوشت خریدنے کے لیے ابراہیم صاحب نے متواتر کئی سال ایک ہی دکاندار وقار سے بنائے رکھی۔ صافی چکن لیتے اور وہ بھی ٹھوک بھاؤ پر۔

ایک روز وقار بولا۔ "سرجی! اب ٹھوک ریٹ پر نہیں دوں گا۔"

"کیوں؟" ابراہیم صاحب نے پوچھا۔

"پڑتا نہیں سرجی! آپ تو گردن اور سینے کا پنجرہ بھی نکلوا دیتے ہو۔ مہنگائی بہت ہو گئی ہے۔"

"پڑتا نہیں تو رکھو اپنے پاس۔" ابراہیم صاحب ناراض ہو کر چکن خریدے بغیر واپس چلے گئے۔

ایک آدھ روز میں ابراہیم صاحب نے اپنی مرضی کا مرغی فروش ڈھونڈ لیا۔ نام اس کا بھی "و" سے شروع ہوتا تھا۔ وہ وقار تھا تو یہ وقاص۔ البتہ وہ ادھیڑ عمر تھا تو یہ نوجوان۔ طے پایا کہ وقاص صافی چکن بغیر گردن اور سینے کے پنجر ٹھوک بھاؤ پر ابراہیم صاحب کو دیا کرے گا۔

وقاص دبلا پتلا نوجوان تھا۔ فارغ ہوتا تو موبائل پر لگا رہتا۔ فارغ نہ بھی ہوتا تو موبائل اکثر اس کے کان اور کندھے کے درمیان دبا رہتا۔ کبھی کسی گاہک سے آرڈر، کبھی کسی یار سے گپ شپ، کبھی نسوانی آواز بھی آس پاس والوں تک پہنچتی جس سے وقاص کی کچھ ذاتی نوعیت کی بات چیت ہوتی۔ "اماں کیسی ہو؟ آج کیا پکایا؟" وغیرہ وغیرہ۔ ابراہیم صاحب تو یہی سمجھتے رہے کہ وقاص کی ابھی شادی نہ ہوئی ہوگی مگر دو تین دن دکان مسلسل بند رہنے پر انہوں نے آس پاس دکانداروں سے دکان بند رہنے کا سبب پوچھا تو پتا چلا وقاص کی بیوی کے ہاں دو جڑواں بچے پیدا ہوئے تھے۔ ایک لڑکا، ایک لڑکی۔ وقاص بیوی بچوں کی دیکھ بھال میں مصروف تھا۔ دو تین دن بعد وقاص نے دکان کھولی تو بہت خوش دکھائی دیا۔ ابراہیم صاحب نے اسے مبارک باد دی تو نہایت عجز سے دکان میں رکھا مٹھائی کا ڈبا ان کے سامنے کرتے ہوئے بولا۔

"سر! میری ماں مجھ سے بھی زیادہ خوش ہے۔ میں اپنی ماں کا ایک ہی بیٹا ہوں۔ ماں کہتی ہے پانچ سال بعد اللہ نے گھر میں اکٹھے دو بچوں کی آوازیں سنائی ہیں۔"

"اسے کہتے ہیں دوہری خوشی۔" ابراہیم صاحب بولے۔

"ہاں جی۔ ایسا ہی ہے۔" وقاص مسکرایا۔

☆☆☆

ہفتہ نہ گزرا تھا کہ ابراہیم صاحب پھر وقاص کی دکان پر گئے تو دکان پھر بند ملی۔ آس پاس دکانداروں سے پوچھا تو انہوں نے دکان بند ہونے کا سبب معلوم ہونے سے معذوری ظاہر کی۔

گھر کا سودا سلف خریدنے کے لیے ابراہیم صاحب کا روزانہ نہ سہی دوسرے تیسرے دن تو بازار آنا جانا رہتا ہی تھا۔ وقاص کی دکان دوبارہ کھلی تو معلوم ہوا کہ اس کے نوزائیدہ جڑواں بچوں میں سے ایک بچی یرقان کے باعث مر گئی تھی۔

وقاص بہت اداس تھا۔ ”سر جی! شادی کے تین سال بعد اللہ پاک نے اولاد دی تھی۔“

وقاص کو دل گرفتہ دیکھ کر ابراہیم صاحب نے اسے تسلی دی۔ ”اللہ کا مال تھا یار! وہی دیتا ہے اور لینے کا حق بھی رکھتا ہے۔ تمہاری عمر کے نوجوان تو چیل جھپٹے بچے پھرتے ہیں۔ فکر مت کرو۔ ان شاء اللہ وہ پھر دے گا۔“

وقاص نے اپنے بائیں ہاتھ کی پشت سے اپنی آنکھیں پونچھیں۔ کھونے کا حوصلہ عمر گزرنے کے ساتھ آتا ہے۔ وقاص کی عمر کے نوجوان تو پانے کی تمنا رکھتے ہیں۔

☆☆☆

وقاص کی نومولود بچی کو مرے چند ہفتے ہی گزرے ہوں گے کہ ابراہیم صاحب معمول کے مطابق سودا سلف خریدنے کے لیے اس کی دکان پر گئے تو وہ غیر معمولی خوش نظر آیا۔

”خیریت تو ہے وقاص میاں! آج بہت خوش نظر آ رہے ہو؟“ ابراہیم صاحب نے پوچھا۔

”سر جی! آپ کی بات پوری ہو گئی۔“ وقاص مسکراتے ہوئے بولا۔

”کون سی بات؟“ ابراہیم صاحب چونکے۔

”آپ نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا تھا...... اللہ کا مال تھا۔ وہی دیتا ہے اور وہی لیتا ہے۔ آپ نے مجھے یہ بھی بولا تھا وہ پھر دے گا۔ اللہ نے دے دی، سر جی!“

”کیا؟“ ابراہیم صاحب پہلے سے زیادہ چونکے۔

”بچی!“

ابراہیم صاحب ہکا بکا وقاص کا منہ دیکھنے لگے۔

وقاص مسکرایا پھر بولا۔ ”سر جی! میں جس مکان میں کرائے پر رہتا ہوں، اس کی دوسری منزل پر ایک اور میاں بیوی بھی رہتے ہیں۔ میاں بس ایویں سا آدمی ہے۔ تین بیٹیاں تھیں ان کی۔ کوئی ہفتہ پہلے اللہ نے ایک اور بچی دے دی انہیں۔ دو دن اسپتال میں رہنے کے بعد عورت گھر آئی تو میاں نے بہت سیاپا ڈالا کہ تین بیٹیاں پہلے ہی تھیں تو ایک اور پیدا کر بیٹھی۔ خیر، پچھلے روز صبح سویرے عورت بے چاری روتی پیٹتی اپنی بچی کو لے کر نیچے ہمارے گھر آ گئی اور اس نے میری اماں اور بیوی سے کہا کہ اس بچی کو تم لوگ رکھ لو۔ دونوں حیران ہو گئیں اور اس سے پوچھا کیوں؟ بولی تین بیٹیاں پہلے ہی تھیں۔ جب سے یہ چوتھی پیدا ہوئی، میرے خاوند نے کل کل ڈال رکھی تھی۔ پچھلی رات وہ اسے میرے پاس سے اٹھا کر لے جانے لگا تھا۔ میں سمجھ گئی کہ یا تو اسے مار کر ادھر ادھر پھینک دے گا یا زندہ کہیں ڈال آئے گا یا کسی کو دے دلا دے گا۔ میں اس کے پیروں میں پڑ گئی کہ اسے کہیں مت لے جاؤ۔ میں خود اسے کسی کو دے دوں گی۔ بہت منت سماجت کی، ہاتھ جوڑے، پیر پکڑے، تب اس نے بچی مجھے واپس دی۔ اسے تم لوگ رکھ لو۔ بہت ثواب ہو گا۔ ساری زندگی دعائیں دوں گی۔ کبھی واپس بھی نہیں مانگوں گی۔ صبح کا ٹائم تھا۔ میں ناشتا کر رہا تھا۔ اماں اور میری بیوی اس عورت کی بات سن کر میرے پاس آ گئیں اور ساری بات مجھے بتائی۔ مجھے فوراً آپ کی بات یاد آ گئی سر جی، کہ اللہ کا مال تھا۔ وہی دیتا ہے، وہی لیتا بھی ہے۔ آپ نے مجھے بولا تھا وہ پھر دے گا۔ میں نے اماں اور بیوی سے کہا، بسم اللہ کر کے لے لو۔ یوں وہ بچی ہمارے پاس آ گئی۔ سر! اماں اور میری بیوی مل جل کر دونوں بچوں کو پال رہی ہیں۔ میں، اماں اور میری بیوی تینوں بہت خوش ہیں۔ وہ عورت بھی خوش ہے کہ بچی بچ گئی۔“

”وقاص میاں! اچھی کی تم نے، تمہاری بیوی اور والدہ نے۔“ ابراہیم صاحب بولے۔

”سر! میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اللہ پاک اتنی جلدی اپنا مال پھر لوٹا دیں گے۔“

”یار! اس مالک کا ہاتھ بہت کھلا ہے۔ جب وہ دینے پر آئے تو اسے بس اتنا کہنا ہوتا ہے...... کن...... اور ہو جاتا ہے۔“

”ویسے سر! ایسے مرد کو جو بیٹی پیدا ہونے پر منہ بنائے، مرد نہیں، مردود بولنا چاہیے۔ کیا خیال ہے؟“

”ٹھیک خیال ہے۔“ ابراہیم صاحب نے مسکراتے ہوئے وقاص کی بات کی تائید کی۔

وقاص بھی مسکرا دیا۔

کچھ عرصہ ہی گزرا ہو گا کہ وقاص نے ابراہیم صاحب کو بتایا کہ اپنی بچی کو وقاص کی گھر والی کے سپرد کرنے والی عورت اور اس کا شوہر اپنی تین بچیوں کے ساتھ کہیں اور شفٹ ہو گئے تھے۔

مردودوں نے بچی کی پیدائش پر ماتم کرنے کی جاہلانہ روایت ترقی کے اس دور میں بھی زندہ رکھی ہوئی ہے۔

☒☒☒



محفلِ شعر و سخن

❁ مہتاب احمد ...... حیدر آباد
اس سے نبھے گا رشتہ سود و زیاں بھی کیا بھلا
میں ہوں بلا کا بد حساب اس کو حساب چاہیے

❁ انعم کمال ...... حیدر آباد
کوئی گماں بھی نہیں درمیاں گماں ہے یہی
اسی گماں کو بچالوں کہ درمیاں ہے یہی
کبھی کبھی جو نہ آؤ نظر تو سہہ لیں گے
نظر سے دور نہ ہونا کہ امتحاں ہے یہی

❁ سحرش ...... کراچی
میں سکون پاؤں گا یہ گماں بھی کیوں کیا تھا
اسے بھی ملال کیا کم کہ ملال اب نہیں ہے

❁ جنید ملک ...... کراچی
بھلا یہ غم میں بھولوں کہ تم بھی بھول جاتے ہو
مرے لمحوں نے کتنے غم بھلائے میں نہیں کہتا

❁ ناہید یوسف ...... اسلام آباد
وہ آئے ہیں پشیماں لاش پہ اب
تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے

❁ فیصل رحمٰن ...... بالاکوٹ
الجھا ہے پاؤں یار کا زلفِ دراز میں
لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا

❁ سعید شیخ ...... لاہور
میں نے تم کو دل دیا، تم نے مجھے رسوا کیا
میں نے تم سے کیا کیا اور تم نے مجھ سے کیا کیا

❁ اسد جمال ...... پشاور
کہتے ہیں تم کو ہوش نہیں اضطراب میں
سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں

❁ وقاص احمد ...... کراچی
بے دوستی تو جانبِ دشمن نہ دیکھنا
جادو بھرا ہوا ہے تمہاری نگاہ میں

❁ رؤف ملک ...... چکوال
دمِ حساب رہا روزِ حشر بھی یہی ذکر
ہمارے عشق کا چرچا کہاں کہاں نہ ہوا

❁ ذوالفقار حسین ...... کوہاٹ
وہ نئے گلے وہ شکایتیں، وہ مزے مزے کی حکایتیں
وہ ہر ایک بات پہ روٹھنا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

❁ عاصم سعید ...... مظفر گڑھ
دل کی تکلیف کم نہیں کرتے
اب کوئی شکوہ ہم نہیں کرتے
دوری یار کی ہوس ہے سو ہم
سر تسلیم خم نہیں کرتے

❁ نازیہ یٰسین ...... مری
ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم

❁ سنبل خان ...... کوئٹہ
سحر تک شام سے تجھ بن یہی حالت رہی دل نے
نہ مجھ کو چین دیتا تھا نہ آپ آرام لیتا تھا

❁ عمران احمد...... فیصل آباد

دل کتنا آباد ہوا جب دید کے گھر برباد ہوئے
وہ بچھڑا اور دھیان میں اس کے سو موسم ایجاد ہوئے
لاؤں کہاں سے بول رسیلے ہونٹوں کی ناداری میں
مجھ کو ایک زمانہ گزرا بوسوں کی امداد ہوئے

❁ شہزاد رضی...... نواب شاہ

لگتی ہیں گالیاں بھی ترے منہ سے کیا بھلی
قربان تیرے، پھر مجھے کہہ دے اسی طرح

❁ محمد بخش...... خانیوال

اب اور گردش تقدیر کیا ستائے گی
لٹا کے عشق میں نام و نشان بیٹھے ہیں

❁ کامران ظفر...... شیخوپورہ

ہوا احسان ہم فرماتے ہیں
اُن کے خط انہیں لوٹا رہے ہیں
نہیں تھی جن کو محبت پہ وہ راضی
قیامت ہے کہ ہم سمجھا رہے ہیں

❁ روبینہ اصغر...... کراچی

میں ہمسفروں کی گرد کے ہمراہ
اک خود سری کا قافلہ ہوں

❁ ملک وحید...... کراچی

نام پہ ہم قربان تھے اس کے لیکن پھر یہ طور ہوا
اس کو دیکھ کے رک جانا بھی سب سے بڑی قربانی تھی
مجھ سے بچھڑ کر بھی وہ لڑکی کتنی خوش خوش رہتی ہے
اس لڑکی نے مجھ سے بچھڑ کر مر جانے کی ٹھانی تھی

❁ آصف سلیم...... بنوں

تو کہاں جائے گی، کچھ اپنا ٹھکانا کر لے
ہم تو کل خواب عدم میں، شب ہجراں ہوں گے

❁ شمینہ فردوس...... خوشاب

پھر عیادت کو آئے وہ لیکن قضا کے ساتھ
دم ہی نکل گیا مرا آواز پا کے ساتھ

❁ زاہد حبیب...... سرگودھا

وہ سر جو کل ترے زانو پہ تھا سو آج اے ظالم
کبھی رہتا ہے پتھر پر کبھی رہتا زمیں پر ہے

❁ ناصر وقار...... چشتی

قہر ہے، موت ہے، قضا ہے عشق
سچ تو یہ ہے بُری بلا ہے عشق

❁ عظیم احمد...... جھنگ سٹی

غضب سے تیرے ڈرتا ہوں، رضا کی تیری خواہش ہے
نہ میں بیزار دوزخ سے، نہ میں مشتاق جنت کا

❁ اعظم مشوری...... صادق آباد

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

❁ ساجد علی...... کھوجی

مانا کریں گے اب سے دعا ہجر یار کی
آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ

❁ فضل جبار...... بلوچستان

جو بچے تھے درد بہار کے وہ خزاں نے آ کے مٹا دیے
مرے اشک تحفۂ یار تھے جو نظر میں، میں نے سجا دیے

❁ ڈاکٹر شاہد...... شانگلہ

رویا کریں گے آپ بھی پہروں اسی طرح
اٹکا کہیں جو آپ کا دل بھی مری طرح

❁ افضل وجیہہ...... بہاولپور

کوئی نہیں جو آ کر اے سب چوراہے خالی ہیں
چل کے ہر بازار میں جا کر بے خطرانہ رقص کریں

❁ شعیب انصاری...... سکھر

اپنے دل کی پناہ میں آ کر
زندگی بے پناہ کی جائے

❁ مرتضیٰ احمد...... دوبڑی

ہم سنے اور سنائے جاتے تھے
رات بھر کی کہانیاں تھے ہم

❁ میاں فضل...... رحیم یار خان

اک بات کہی ہے مجھے تجھ سے بس اک بات
اس شہر میں تو صرف گنوانے کے لیے ہے

❁ فیاض احمد...... اوکاڑہ

بہت ہی خوش ہے دل اپنے کیے پہ
زمانے بھر میں خواری ہوئی ہے

❁ حسنات احمد...... میرپور خاص

دل اس کے روبرو ہے اور گم
کوئی عرضی گزاری جا رہی ہے

❁ تنویر شاکر...... منڈی بہاؤالدین

جانے کس شوق میں رشتے بچھڑ کر رہ گئے
کام تو کوئی نہیں تھا پر ہمیں جانا بھی تھا

❁ رابعہ ایاز...... جہانیاں منڈی

میں جو کچھ بھی نہیں کرتا ہوں یہ ہے میرا سوال
اور سب لوگ جو کرتے ہیں وہ کیا کرتے ہیں

❁ گل ناز فاطمہ...... خانیوال

یہاں کبھی کوئی آیا نہیں مگر ہر شام
بس اک گمان سے دروازہ مست رہتا ہے

❁ احمد ضیا نعیم ...... پھالیہ

جس دن اُس سے بات ہوئی تھی اُس دن بھی بے کیف تھا میں
جس دن اُس کا خط آیا ہے اس دن بھی ویرانی تھی

❁ شاہد نسیم ...... مدین

وہ میری ذات کی بستی جو تھی میں اب وہاں کب ہوں
وہاں آباد تجھے کس کس کے سائے میں نہیں گنتا

❁ اعظم کھوکھر ...... گولاڑچی

کررہے ہیں یاد اسے ہم روز و شب
ہیں بھلانے کی اسے تیاریاں

❁ رانا اشرف ...... لاڑکانہ

گلہ تو یہ ہے تم آتے نہیں کبھی لیکن
جب آتے بھی ہو تو فوراً ہی جانے لگتے ہو

❁ ملک شفقت ...... تلہ گنگ

دل کے نگر میں عجب ایک قفس تھا یارو
سبھی کو چھوڑ کے رہنے لگا صیاد اس میں

❁ فردوس آفریدی ...... پشاور

دل میں ہے میرے کئی چہروں کی یاد
جانے میں کس سے ہوں روٹھا ہوا

❁ محمد اسحاق خان ...... ضلع ٹانک

کہاں گئے ہیں بھی ان کی خبر تو لے ظالم
وہ بے خبر جو تیری زندگی میں آئے تھے

❁ شوکت اللہ ...... سجاول

جب تیری خواہش کے بادل چھٹ گئے
ہم بھی اپنے سامنے سے ہٹ گئے

❁ کاشف جاوید ...... میاں چنوں

وہ ہماری طرف نہ دیکھ کے بھی
کوئی احسان دھر گیا ہوگا

❁ مہوش خان ...... اسلام آباد

چلو ہم بھی تو دیکھیں اس نشے میں ایسی مستی میں
کدھر کو جارہے ہیں روز و شب آہستہ آہستہ

❁ احسان اللہ ...... راولپنڈی

مدتوں کے بعد تم نے رخ کیا اس کی طرف
کیا یہی تھا آئینے کے ٹوٹ جانے کا سبب

❁ رباب ریاض ...... کراچی

اب تو کچھ غیر سا لگنے لگا تیرا غم بھی
دیکھ مایوس ہوئے جاتے ہیں کتنے ہم بھی

❁ فرحان لیاقت ...... ڈی جی خان

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا
درد کی دوا پائی درد لا دوا پایا

❁ وقار مدنی ...... ملتان

زندگی جبر ہے اور جبر کے آثار نہیں
ہائے اس قید کو زنجیر بھی درکار نہیں

❁ اشرف بلوچ ...... ضلع شیخوپورہ

وقت نے کیسی فصیلیں کھینچ دی ہیں درمیاں
لوگ تنہا ہیں مگر احساس تنہائی نہیں

❁ نرگس بھٹی ...... ساہیوال

یہ وقت ہی تو ہے وہ بلا کا ستم ظریف
سورج کو بھی جو رات کے قدموں میں ڈال دے

❁ عابد بخاری ...... بورے والا

آج سچ بولتے رہنا کوئی آسان نہیں
لوگ تو لوگ ہیں آئینے مکر جاتے ہیں

❁ کریم احمد شاہ ...... قصور

ہوئی جو شہر کے لوگوں سے کچھ شناسائی
تو ہم کو یاد بہت آئی اپنی تنہائی

❁ تیمور اقبال ...... وہاڑی

سوال یہ ہے کہ دل مضطرب کا کیا ہوگا
بدن تو ہجر کے موسموں میں جل جائے گا

❁ سرور گل ...... لیہ

دیکھ کر شہر کی یہ ویرانی
مجھ کو تو دشت بھی لگا آباد

❁ مزمل نیازی ...... بہاولنگر

نہ راس ہی ہمیں آتا ہے ہجر کا موسم
نہ راس ہی ہمیں رنگِ وصال آتا ہے

❁ اسماء حیات ...... حیدرآباد

یہ کیسی رُت پلٹ آئی ہے مجھ میں
کہ سب منظر بکھرتے جارہے ہیں

کوپن
جون
2023

نام: ....
پتا: ....

میرے بڑے چچا اور یا گیرسن ان لوگوں میں سے تھے جن کو کوئی ان کے مقصد سے نہیں ہٹا سکتا تھا۔ ان کے خوفناک سیاہ چہرے پر داڑھی، چمکتی آنکھیں، موٹی بھویں اور سر پر الجھے اور گھنے سیاہ بال تھے۔ وہ ہمیشہ اداس نظر آتے تھے۔ وہ میرے بچپن کے تمام ڈراؤنے خوابوں کے ایک مستقل اور بہت فعال شراکت دار تھے۔ میں نے انہیں بہت چھوٹی عمر میں دیکھا تھا۔ بعد میں ان کی اور میرے والد کی کسی بات پر چپقلش ہوگئی اور اس لڑائی کے

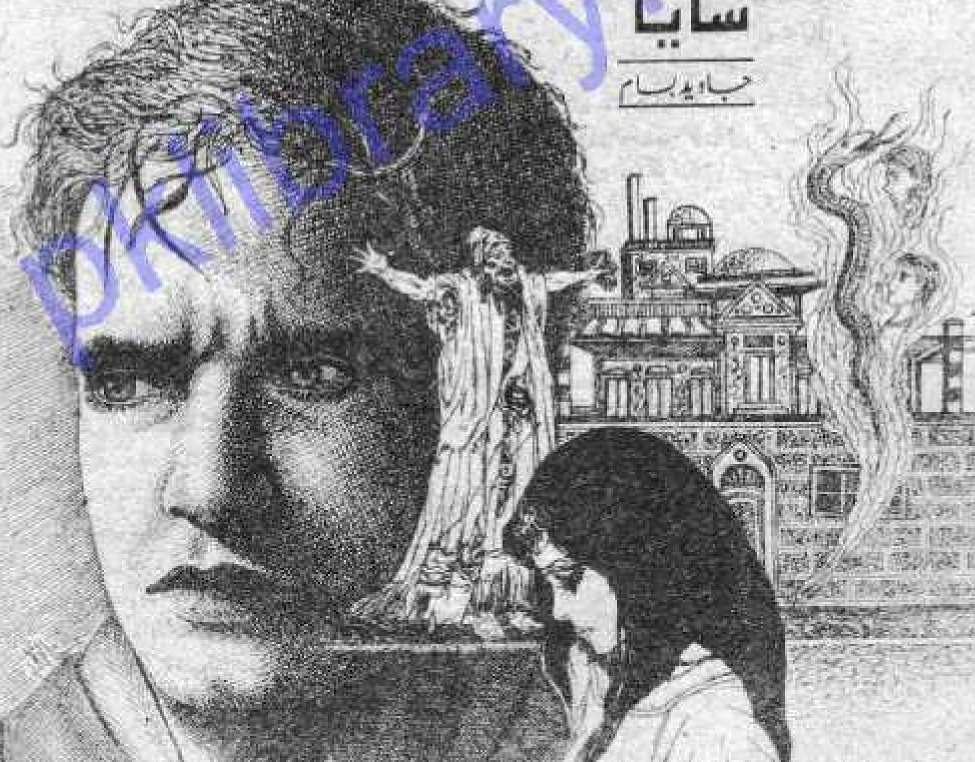
فوراً بعد اچانک اور عجیب طریقے سے میرے والد کی موت ہوگئی تھی۔ وہ ارقم سے سوتیلی دور میرے چچا کی آبائی حویلی میں اپنے بستر پر دم گھٹنے سے مر گئے تھے۔ میری خالہ صوفیہ نے بعد میں کھلم کھلا اس کا الزام میرے چچا پر لگایا اور اس کے بعد وہ بھی زیادہ دیر زندہ نہ رہیں۔ بے چاری خالہ کی نادیدہ رکاوٹ سے ٹھوکر کھا کر سیڑھیوں سے نیچے گر گئی تھیں۔ کون جانے کتنے دوسرے لوگوں نے اپنی غفلت کی اتنی ہی قیمت ادا کی ہو۔ میرے چچا تاریک پُراسرار قوتوں

بھید کوئی بھی ہو جب تک نہ کھلے... دل و دماغ میں جنگ جاری رہتی ہے... وہ بھی ایک ایسا ہی سایا تھا جو جانے کس کے تعاقب میں تھا... کوئی تو ایسا تھا جس کی اسے تلاش تھی اور جس کے نہ ملنے پر پورا گھر جلا کر خاکستر کر ڈالا تھا لیکن... اس کی حقیقت تلاش کرنے میں اگرچہ کچھ وقت تو لگا مگر سائے کی اصلیت کھل کر سامنے آگئی... یہ چالبازی سے جائداد پر قابض ہونے کے لیے بہت بہترین ڈراما تھا...

خاندانی ملکیت پر قبضہ کرنے کی ایک بھونڈی سازش کا احوال......

سایا

جاوید بسام



سے اچھی طرح واقف تھے۔ کئی کہانیاں مشہور تھیں۔ مجھے اس بات کا اندازہ نہیں ہے کہ وہ کہانیاں کس حد تک حقیقی بنیادوں پر اور کس حد تک محض قیاس آرائیوں اور الزام تراشیوں پر مبنی تھیں۔ ہمارے خاندان کے کسی فرد نے میرے والد کی موت کے بعد چچا کو نہیں دیکھا تھا اور میری والدہ نے اپنی زندگی کے اختتام تک ہمیشہ ان کے لیے شدید ناپسندیدگی، حتیٰ کہ نفرت کا اظہار کیا تھا لیکن وہ ان کے وجود کو کبھی نہیں بھولی تھیں۔ میں بھی انہیں نہیں بھولا تھا اور نہ ہی میں اس پرانی حویلی کو بھولا تھا جو ایلسبری اسٹیٹ میں دریا کے جنوبی کنارے پر ارخم کے اس حصے میں تھی جہاں صدیوں پرانا قبرستان تھا۔ اس پہاڑی سے نکلنے والی ندی میرے چچا کی زمینوں سے گزرتی تھی جس پر بہت وسیع جنگل پھیلا ہوا تھا۔

چچا اپنی وسیع و عریض جائداد میں اکیلے رہتے تھے۔ سوائے ایک عورت کے جو عام طور پر رات کو گھر کی صفائی کرتی تھی۔ مجھے ان کمروں کی اونچی چھتیں اور چھوٹی کھڑکیاں اچھی طرح یاد تھیں جہاں سے دور تک درخت اور گھنی جھاڑیاں نظر آتی تھیں۔ مجھے وہ گول کھڑکی بھی یاد ہے جو سامنے کے دروازے پر کھلتی تھی اور ہمیشہ بند رہنے والی اٹاری بھی جہاں میری دن کے وقت جانے کی ہمت بھی نہیں ہوتی تھی اور جہاں اندھیرے کے بعد چراغ یا شمع لے کر جانا سختی سے منع تھا۔ ایسے گھر بچے کے ذہن پر انمٹ نقوش چھوڑ دیتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ میں جب بھی کچھ دنوں کے لیے وہاں جاتا، مجھے عجیب و غریب خیالات آتے اور ڈراؤنے خواب نظر آتے تھے جن سے ڈر کر میں عموماً اپنی ماں کی خواب گاہ کی طرف بھاگ جاتا تھا۔

ان خوفناک راتوں میں ایک رات میں غلطی سے انجان راہداری میں جا نکلا اور وہاں اپنے چچا کی نوکرانی کو صفائی کرتے ہوئے دیکھا۔ وہ خاموشی سے مجھے گھور رہی تھی اور اس کے سپاٹ چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ وہ مجھے خلا میں کہیں دور لامتناہی فاصلے پر تکتا ہوا لگ رہا تھا۔ پہلے جھٹکے سے سنبھلنے کے بعد میں مڑا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ اس ٹکراؤ نے میرے ڈراؤنے خوابوں کو اور مہمیز کر دیا تھا۔ والد کی موت کے بعد میں نے چچا کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں ان سے زیادہ قریب نہیں تھا۔ ماضی میں جب ہم ان کے گھر میں جاتے تو میں ان سے ڈرا رہتا تھا۔ بعد میں ہمارے سالانہ دو مختصر رابطے ان کی سالگرہ اور کرسمس کے گریٹنگ کارڈ بھیجنے تک محدود تھے جس کا وہ کبھی جواب نہیں دیتے تھے۔

پھر ایک دن مجھے ان کے وکیل کی طرف سے یہ حیران کن پیغام ملا کہ چچا نے اپنی تمام جائداد اور وراثت میں بغیر کسی خاص شرط اور تحفظات کے میرے نام کر دی ہے۔ بس انہوں نے صرف ایک چھوٹی سی شرط رکھی تھی جس کے مطابق ان کی موت کے بعد پہلے سال آنے والے موسم گرما کے مہینے مجھے حویلی میں گزارنے تھے۔ مجھے اپنے خبطی چچا کی عجیب و غریب شرط نے زیادہ پریشان نہیں کیا۔ یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ انہوں نے گرمیوں کے مہینوں کا انتخاب سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ باقی وقت میں ارخم سے دور اپنے تدریسی کام میں مصروف ہوتا ہوں۔

میں نے اس خلاف توقع ملنے والی وراثت کے بارے میں اپنے حلقے میں سب کو خبر کر دی تھی تاکہ جائداد خریدنے کے خواہش مند افراد کے کانوں تک یہ خبر پہنچ جائے اور مجھے اچھی قیمت مل سکے۔ اس وقت تک ارخم کافی بڑھ چکا تھا اور شہر کی حدود جو کبھی چچا کے گھر سے دور تھیں، اب قریب آ گئی تھیں۔ مجھے ارخم سے زیادہ انسیت نہیں تھی۔ حالانکہ یہ میرے لیے قدیم فن تعمیر کی وجہ سے کچھ دلچسپی کا باعث تھا۔ وہاں وہ صدیوں پرانے نیو انگلینڈ کے افسانوی ماحول کو زندہ دیکھا جا سکتا تھا مگر کسی بھی صورت میں میرا وہاں زیادہ دیر رہنے کا ارادہ نہیں تھا لیکن اس سے پہلے کہ میں پرانی ایلسبری اسٹیٹ بیچ سکوں، مجھے اپنے چچا کی شرط کے مطابق گرمیوں کے تین مہینے وہاں گزارنے تھے۔ آخر میں جون میں اپنی والدہ کے احتجاج اور انتباہ کے باوجود جنہوں نے مجھے یقین دلایا تھا کہ اوریا ایلسبری اور اس کی تمام جائداد پر کوئی خوفناک لعنت منڈلا رہی ہے، میں ایلسبری اسٹیٹ کی پرانی حویلی میں چلا گیا۔

☆☆☆

مجھے سفر میں زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔ حویلی کو صاف ستھرا دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی۔ میرا خیال تھا کہ اس کی ہدایات وکیل کی طرف سے ملازمہ کو دی گئی ہوں گی۔ حویلی میں کچھ دیر ٹھہرنے کے بعد میں نے مسٹر سائمن اسٹال سے ملاقات کی تاکہ وصیت کی تمام تفصیلات جان سکوں۔ میں حویلی کی صفائی کروانے پر ان کا شکریہ بھی ادا کرنا چاہتا تھا۔ تاہم بزرگ وکیل جو آج بھی اونچے کالر اور سخت کالے سوٹ کے ساتھ اپنے پیشے سے وابستگی برقرار رکھے ہوئے تھے، انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

وہ بولے۔ ”مسٹر ایڈم! میں کافی عرصے سے اس گھر میں نہیں گیا۔ اگر آپ کے چچا نے گھر کو صاف رکھنے کا حکم

دیا تھا تو یہ میرے علم میں نہیں۔ میرے پاس صرف ایک چابی تھی جو میں نے آپ کو بھیجی تھی۔"

جہاں تک اوریا گیریسن کی آخری وصیت کا تعلق تھا، اس میں سب کچھ بالکل واضح تھا۔ اگر میں اپنے کام سے فارغ ہو کر پہلی جون کو بریل بورو میں جاتا تو مجھے تین مہینے جون، جولائی اور اگست یا اپنی آمد کے بعد نوے دن تک گھر پر رہنا پڑے گا۔ وصیت میں میری آزادی کو محدود کرنے والی کوئی شرط نہیں بتائی گئی تھی، بشمول پراسرار اٹاری پر جانے پر پابندی کے۔

"وہاں آپ کو اپنے پڑوسیوں سے کچھ پریشانی ہو سکتی ہے۔" مسٹر سالٹن اسٹال نے مجھے خبردار کیا۔ "آپ کے چچا میل جول والے آدمی نہیں تھے۔ وہ کسی کو گھر کے قریب آنے نہیں دیتے تھے اور حالیہ برسوں میں انہوں نے کہیں آنا جانا بالکل چھوڑ دیا تھا۔ سوائے پرانے قبرستان میں باقاعدہ پیدل جانے کے، وہ بہت کم جائداد سے باہر نکلتے تھے۔ کچھ سست لوگوں کا کہنا تھا کہ وہ مُردوں کی صحبت کو زندہ لوگوں کی صحبت پر ترجیح دیتے تھے۔"

"وہ حالیہ دنوں میں کیسے نظر آتے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"آپ جانتے ہیں، وہ بوڑھے تھے مگر ایک مضبوط اور توانا آدمی تھے لیکن جیسا کہ اکثر ہوتا ہے، ایک بار جب وہ بیمار ہوئے تو انہوں نے بہت جلد ہار مان لی اور ایک ہفتے بعد ان کی موت ہو گئی۔ مقامی ڈاکٹر نے موت کی وجہ بڑھاپا اخذ کی تھی۔"

"ان کی ذہنی کیفیت کیسی تھی؟"

سالٹن اسٹال کچھ دیر سوچتے رہے پھر بولے۔ "مسٹر ایڈمر ڈکسن! جہاں تک ان کی ذہنی کیفیت کی بات ہے تو آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ لوگوں کو ان کے بارے میں شدید شکوک و شبہات تھے لیکن چڑیلوں، جادو ٹونے اور دیگر شیطانی مشاغل میں انہیں ضرور دلچسپی تھی۔ وہ سیلم ڈائن پر تحقیق کر رہے تھے۔ تاہم جب آپ ان کی لائبریری دیکھیں گے تو آپ جان جائیں گے کہ وہ کس طرح کی کتابوں سے بھری ہوئی ہے لیکن دوسری طرف اگر آپ ان کی دلچسپیوں کو نظر انداز کر دیں تو وہ کافی معقول آدمی تھے، بلکہ میں، جہاں تک کہوں گا کہ وہ ایک ہوشیار شخص تھے۔"

اس تفصیل کو دیکھتے ہوئے میں کہہ سکتا تھا کہ چچا حالیہ برسوں میں بالکل بھی نہیں بدلے تھے۔ وہ ویسے ہی تھے جیسا میں نے انہیں بچپن میں دیکھا تھا۔ گھر بھی نہیں بدلا تھا۔ وہ پہلے کی طرح سڑک کے کنارے کھڑے تناؤ کا شکار ایک آدمی کی طرح لگ رہا تھا جو برساتی کوٹ میں لپٹا دور فاصلے کو دیکھ رہا ہو جہاں سے میل کوچ نمودار ہونے والی ہو کیونکہ نقل و حمل کے جدید ذرائع نہ ہونے کی وجہ سے ایک کوچ ہی دو سو سال پرانے گھر کو جدید دنیا سے منسلک کرنے کا واحد ذریعہ تھی۔ گھر میں بجلی کی روشنی اور پلمبنگ جیسی معمولی ضرورت کی چیزیں بھی موجود نہیں تھیں۔ فرنیچر اور کچھ بھاری نوادرات کے علاوہ پرانی عمارت کی کوئی قیمت نہیں تھی۔ بس یہ زمین تھی جس کی قدر میں اضافہ ہوا تھا کیونکہ ارخم شہر کے بلاکس اس کے قریب آ گئے تھے۔ چیری، اخروٹ اور مہاگنی لکڑی کا قدیم فرنیچر نسبتاً اچھی حالت میں تھا اور مجھے یقین تھا کہ میری منگیتر روڈا اسے ہمارے نئے گھر میں منتقل کرنے پر راضی ہو جائے گی جسے میں حویلی سے فروخت ہونے والی رقم سے بنانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میں انگریزی زبان اور ادب کی فیکلٹی میں کام کرتا تھا اور روڈا انالوجی اور آرکیالوجی پڑھاتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ ہماری مشترکہ آمدنی ایک مہذب گھر کو چلانے کے لیے کافی ہو گی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں تین ماہ تک بجلی اور پلمبنگ کے بغیر زندگی گزار سکتا ہوں مگر ٹیلی فون کے بغیر کام کرنا مشکل تھا۔ لہٰذا میں پہلے ہی دن ارخم گیا اور فوراً حویلی میں ٹیلی فون لائن لگنے کا بندوبست کیا پھر واپس آتے ہوئے راستے میں ٹیلی گراف آفس پر رکا اور اپنی والدہ اور روڈا کو پیغام بھیجا کہ میں گیریسن ہاؤس خیر و عافیت سے پہنچ گیا ہوں اور روڈا کو دعوت دی کہ وہ اپنی فرصت میں یہاں آ کر میری نئی جائداد کا معائنہ کرے۔ ریسٹورنٹ میں کھانا کھانے کے بعد میں نے کچھ ناشتے کی اشیا بھی خرید لیں۔ حالانکہ باورچی خانے میں پرانا کاسٹ آئرن چولہا موجود تھا لیکن میرا اسے روشن کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا پھر میں واپس اپنے عارضی ٹھکانے پر آ گیا۔

ان دنوں میں اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالے پر کام کر رہا تھا اور اپنے ساتھ ضروری کتابیں اور کاغذات لے گیا تھا۔ اس کے علاوہ یونیورسٹی آف مسکاٹونک کی لائبریری بھی میری پہنچ میں تھی۔ وہ اسٹیٹ سے صرف ایک میل کے فاصلے پر واقع تھی... جہاں میں تھامس ہارڈی اور اس کی ویسکس ٹپوگرافی کے بارے میں تمام گمشدہ معلومات حاصل کر سکتا تھا۔ شام کو دیر تک کام پر بیٹھنے کے بعد میں تھکاوٹ محسوس کر کے اپنے چچا کے بیڈ روم میں چلا گیا جو مہمان خانے کے اوپر دوسری منزل پر تھا۔ اس طرح حویلی میں میرے قیام کا پہلا دن مکمل ہوا۔

☆☆☆

روڈا نے اگلے ہی دن اپنی دوشیزوں والی گاڑی میں بغیر مطلع کیے حویلی میں پہنچ کر مجھے خوشگوار حیرت میں ڈال دیا۔ روڈا نام، ایسی خوش مزاج اور پرجوش لڑکی کے لیے مناسب نہیں تھا۔ میں نے انجن کا شور اور دروازہ کھلنے کی آواز نہیں سنی تھی۔ میں اس وقت حیرانی سے کانپ اٹھا جب ہال میں ایک جانی پہچانی آواز گونجی۔ ”ایڈم! تم کہاں ہو؟“

موسم ابر آلود تھا اور ہلکی گرج چمک کے ساتھ بارش بھی ہوئی تھی۔ اس وقت پھوار پڑ رہی تھی۔ میں چراغ روشن کیے مطالعہ گاہ میں کتابوں کے پاس بیٹھا تھا، فوراً اٹھ کر باہر آیا تو اسے دیکھا۔ بارش کے قطرے اس کے کندھوں تک کے سنہری بالوں میں چمک رہے تھے۔ آدھے کھلے ہونٹ اور نیلی آنکھیں تجسس سے گھر کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اسے گلے لگاتے ہوئے میں نے اس کے جسم میں ہلکی سی لرزش محسوس کی۔

”کیا تمہیں واقعی اس گھر میں تین مہینے رہنا پڑے گا؟“ وہ چلائی۔

”ہاں، ایسا لگتا ہے لیکن گھر خاص طور پر روڈا اکثر بہت کے ستانے مجھے کے لیے نہیں بنایا گیا ہے۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔ ”یہاں کوئی مجھے پریشان نہیں کرے گا۔“ میں نے کہا۔

”لیکن یہ گھر مجھے پریشان کر رہا ہے۔“ روڈا نے غیر معمولی سنجیدگی سے کہا۔ ”یہ بہت اداس ہے۔“

”یہاں جو کچھ بھیانک تھا، وہ اب ختم ہو چکا ہے۔ میں اپنے چچا کی بات کر رہا ہوں۔ جب وہ زندہ تھے تو یہ گھر واقعی کچھ خطرناک تھا۔“

”یہ اب بھی ایسا ہی لگتا ہے۔“ وہ بولی۔

”کیا تم واقعی بھوتوں پر یقین رکھتی ہو؟“

وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن میں نے فوراً موضوع بدل دیا۔ ”تم رات کے کھانے کے لیے ٹھیک وقت پر پہنچی ہو۔ ہم ارتم چلتے ہیں۔ وہاں پرانے زمانے کا ایک عمدہ ریستوران ہے۔ وہ فرنچ ہل سے زیادہ دور نہیں ہے۔“

اس نے کچھ نہیں کہا حالانکہ اس کی بھوری بھویں سکڑی ہوئی تھیں جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہو۔ رات کے کھانے پر اس کا موڈ بہتر ہو گیا اور ہم دو گھنٹے تک ریستوران میں بیٹھ کر کام اور مستقبل کے منصوبوں کے بارے میں بات کرتے رہے۔ جاگیر میں واپس آ کر میں نے روڈا کے سونے کے لیے مہمان خانہ کھول دیا جو میری خواب گاہ کے عین نیچے تھا تاکہ ضرورت کے وقت وہ مجھے آواز دے سکے۔

میں نے مذاقاً کہا۔ ”شاید رات میں تمہیں بھوت پریشان کریں۔“

یہ مذاق ایک طرف لیکن میں واقعی محسوس کر رہا تھا کہ میری منگیتر کے آنے کے بعد گھر کے ماحول میں کچھ تناؤ پیدا ہو گیا ہے۔ ایسا لگتا تھا کہ گھر اپنی سرمائی نیند سے بیدار ہو گیا ہے اور اب میری ہر حرکت کو قریب سے دیکھ رہا ہے۔ جیسے وہ میرے چچا کی جائیداد کو بیچنے کے ارادے سے واقف ہو اور اس معاملے میں خطرے کا اندازہ لگا رہا ہو۔ کیونکہ نیا مالک یقینی طور پر اسے انہدام کا حکم دیتا۔ اس احساس نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ شام کو یہ سوچ اور شدت اختیار کر گئی۔ تاہم اگر اس بارے میں غور کیا جائے تو وہاں کوئی عجیب چیز نہیں تھی۔ میرا خیال تھا کہ کوئی بھی گھر سالوں میں ایک قسم کی توانائی جمع کرتا رہتا ہے جو اسے ان لوگوں سے حاصل ہوتی ہے جو نسل در نسل اس کی دیواروں کے اندر رہتے اور مرتے ہیں۔ اس کے مطابق گھر جتنا پرانا ہوگا، اس کی توانائی کا میدان اتنا ہی مضبوط اور وسیع ہوگا۔ ارتم میں ایسے گھروں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ ان گھروں کی قدامت ہی ارتم کو منفرد ماحول فراہم کرتی ہے۔

اس لمحے میرے خیالات نے ایک مختلف موڑ لیا۔ شاید یہ محض ایسا تھا کہ جو خیالات مجھے پریشان کر رہے ہیں، وہ گھر اور اس صورت حال پر روڈا کے زبردست ردعمل اور اس کے یہاں ظاہر ہونے کی وجہ سے ہیں۔ اس کی آمد نے واقعات کی ترتیب کو بگاڑ دیا تھا۔ ورنہ کسی صورت میں بتدریج دھیرے دھیرے اور غیر محسوس طریقے سے ایسا ہو رہا تھا۔

ہم جلد ہی اپنے کمروں میں چلے گئے۔ میں فوراً ہی سونے کے لیے لیٹ گیا کیونکہ میں تھکا ہوا تھا۔ جہاں تک میں نے محسوس کیا، گھر سڑک سے دور واقع تھا۔ اس کے علاوہ وہاں کوئی سرسراہٹ یا چرچراہٹ کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی جیسا کہ اکثر پرانے گھروں میں عام طور پر آتی ہے۔ نیند آنے سے پہلے میں نے روڈا کو نیچے کمرے میں بے چینی سے گھومتے ہوئے سنا۔ روڈا ابھی تک بستر پر نہیں گئی تھی۔

آدھی رات گزری تھی کہ اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ کچھ دیر تک میں خاموش لیٹا یہ سمجھنے کی کوشش کرتا رہا کہ میری بیداری کی وجہ کیا ہے۔ میری اپنی سانسوں کی آوازیں یا کسی ان دیکھے وجود کی موجودگی یا دونوں ایک ساتھ؟

میں نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور فوراً کھینچ لیا۔ مجھ سے کوئی غلطی نہیں ہوئی تھی۔ میرے بستر پر کوئی عورت موجود تھی۔

اسی وقت میں نے گرم اور ناہموار سانسوں کی آواز سنی اور دوسرے ہی لمحے بستر خالی تھا۔ میں نے کسی کے دروازہ کھولنے اور اپنے کمرے سے باہر نکلنے کی آہٹ سنی۔

آخرکار میں نے چادر اتار پھینکی۔ رات ٹھنڈی اور نم تھی اور میں کمبل کے بغیر سو گیا تھا۔ میں بستر سے باہر نکلا، لیمپ جلایا اور کافی دیر تک کھڑا سوچتا رہا کہ اب آگے کیا کرنا چاہیے۔ مجھے روڈا کا خیال آیا کہ وہ میرے بستر پر ڈر کر چلی آئی تھی مگر پھر وہ واپس کیوں چلی گئی؟

آخر میں چراغ ہاتھ میں لے کر گھر کی تلاشی لینے کے ارادے سے کمرے سے نکلا۔ اسی لمحے جب میں نیچے مرکزی ہال میں پہنچا تو کہیں گھر کے باہر سے کسی عورت کی دل دہلا دینے والی بہت تیز چیخ سنائی دی۔ اس میں درد اور خوف صاف محسوس ہو رہا تھا۔ اس آواز کی بازگشت دھیرے دھیرے زمین سے اٹھ کر گھر پر تیرتی ہوئی آسمان میں گم ہو گئی۔ یہ سب کچھ تیس سیکنڈ سے زیادہ نہیں چلا۔ اس دوران میں بالکل ساکت کھڑا رہا اور پھر مڑ کر روڈا کی خواب گاہ میں جھانکا۔ وہ گہری نیند سو رہی تھی۔ میں آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ کر اپنے بیڈروم میں چلا آیا۔ مجھے دوبارہ نیند آنے میں تقریباً ایک گھنٹا لگا تھا اور جب میں صبح سویرے بیدار ہوا تو رات کے واقعات کی یادیں خوابوں کے ٹکڑوں کے ساتھ میرے دماغ میں ایسی گھل مل گئی تھیں کہ میں ان کی حقیقت پر شک کرنے لگا تھا۔

تاہم جب میں کچن میں گیا جہاں روڈا ناشتا بنانے میں مصروف تھی، میں نے اس کے چہرے کے تاثرات سے فوراً اندازہ لگایا کہ یہاں سب کچھ ٹھیک نہیں ہے۔

"کل رات گھر میں ایک عجیب عورت موجود تھی۔" اس نے میرے سلام کا جواب دیے بغیر کہا۔

"تو میں نے خواب نہیں دیکھا تھا۔" میں نے کہا۔

"وہ کون ہے؟" روڈا نے مجھے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے کوئی اندازہ نہیں ہے۔"

"آدھی رات کو گھر کی صفائی کرنے کا کیا مقصد ہے؟ وہ عورت......"

"تو تم نے اسے دیکھا تھا؟" میں چلایا۔

"ہاں، میں نے اسے دیکھا تھا۔ اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟"

"وہ کیسی لگ رہی تھی؟"

"میرا پہلا تاثر یہ تھا کہ وہ جوان لڑکی ہے لیکن غور کیا تو وہ ایک ادھیڑ عمر عورت تھی۔ اس کا چہرہ ہر قسم کے تاثرات سے عاری تھا جیسے وہ ڈری ہوئی ہو۔ صرف اس کی آنکھیں

زندہ دکھائی دے رہی تھیں۔"

"کیا اس نے تم پر توجہ دی تھی؟"

"یہ کہنا مشکل ہے۔ مجھے اس بارے میں یقین نہیں ہے۔"

"وہ میرے چچا کی نوکرانی ہوگی۔ جب میں یہاں آیا تو گھر صاف تھا۔ دھول کا ایک ذرہ بھی نہیں تھا۔ وہ چچا کے حکم پر عمل کر رہی ہے۔ چچا نے اسے نوکری سے سبکدوش نہیں کیا ہوگا۔ وہ ہر رات یہاں آتی ہے۔ میں نے اسے بچپن میں بھی ایک بار دیکھا تھا۔"

"کیوں اس، اور یا گیریسن کا انتقال مارچ میں یعنی تین ماہ پہلے ہوا تھا۔ کون احمق نوکرانی ہوگی جو مالک کے مرنے کے بعد بھی اپنا کام کر رہی ہے۔ آخر اسے تنخواہ کون ادا کرتا ہے؟"

بہرحال میں نے روڈا کو رات کے مزید واقعات نہیں بتائے بلکہ اسے یقین دلانے کی کوشش کی کہ میں نے اس عورت کو پہلی بار اپنے بچپن میں دیکھا تھا جب میں غلطی سے ایک راہداری میں جا نکلا تھا جہاں وہ صفائی کر رہی تھی۔ مجھے اچھی طرح سے وہ شکل اور باتیں یاد ہیں۔ خاص طور پر اس کا بے تاثر چہرہ جس کے بارے میں، میں نے ابھی بتایا ہے۔

"ایڈم! یہ بیس سال پہلے کی بات ہے۔" روڈا نے کہا۔ "یہ ممکن نہیں ہے کہ میں نے اور تم نے ایک ہی عورت کو دیکھا ہو۔"

"کیوں نہیں؟ میں کسی بھی صورت میں اس امکان کو رد نہیں کر سکتا۔ گھر کی چابیاں اس کے پاس ہیں اور مسٹر سالٹن اسٹال نے مجھے بتایا ہے کہ انہوں نے کسی عورت کو بطور ملازمہ ذمے داری نہیں سونپی۔"

"اچھا، تم صرف ایک دن پہلے یہاں پہنچے ہو اور تم کو ملازمہ کی خدمات حاصل کرنے کا وقت نہیں ملا ہوگا؟"

"ہاں، ویسے میں نے کوشش بھی نہیں کی۔"

"مجھے اس پر یقین ہے۔ تم دھول ہٹانے کے لیے ایک انگلی بھی نہیں ہلاؤ گے۔ چاہے اس میں اپنے کانوں تک ڈوب جاؤ۔"

میں نے کندھے اچکائے۔

"خیر، ایڈم! یہ عورت کون ہے اس کا پتا لگانا اور اسے یہاں آنے سے منع کرنا ضروری ہے۔ ورنہ لوگوں کو گپ شپ کے لیے ایک بات مل جائے گی۔" وہ بولی۔

اس موضوع کو ختم کرنے کے بعد ہم ناشتا کرنے کے لیے بیٹھ گئے جس کے بعد روڈا کو واپسی کے سفر پر روانہ ہونا تھا۔

ہم نے ناشتے پر زیادہ بات چیت نہیں کی۔ روڈا کسی سوچ میں گم دکھائی دے رہی تھی اور میرے سوالوں کے جواب میں صرف ایک آدھ لفظ ہی بول رہی تھی پھر بغیر کسی وجہ کے اچانک وہ بولی۔ "ایڈم! کیا تم محسوس نہیں کر رہے کہ یہ گھر تم پر قبضہ کرنا چاہتا ہے؟ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ تمہارے لیے نہیں ہے بلکہ تم اس کے لیے ہو۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ تم کو دیکھ رہا ہے۔"

ایک لمحے کی ہچکچاہٹ کے بعد میں نے انتہائی سنجیدگی سے اسے سمجھانا شروع کیا کہ گھر ایک بے جان چیز ہے اور یہاں میرے اور چوہوں کے علاوہ کوئی بھی جاندار موجود نہیں ہے۔

مگر میرے الفاظ اسے قائل نہ کر سکے۔ ایک گھنٹے بعد جب وہ وہاں سے جانے والی تھی تو اس نے اچانک التجا کی۔ "ایڈم! چلو ابھی ایک ساتھ چلتے ہیں۔"

"تم چاہتی ہو کہ میں صرف اس وہم کی وجہ سے خوش قسمتی سے ملنے والی وراثت سے محروم ہو جاؤں؟"

"ایڈم! یہ کوئی وہم نہیں ہے۔ احتیاط ضروری ہے۔"

اس پر ہم دونوں میں پھر بحث ہوئی لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ روڈا نے رخصت ہوتے ہوئے روزانہ مجھ سے فون کرنے کا وعدہ لیا تاکہ وہ یہاں ہونے والی ہر نئی بات سے آگاہ ہو سکے۔

☆☆☆

رات کے واقعات نے میرے بچپن کے دور کی یادیں تازہ کر دی تھیں۔ میں نے پھر چچا اوریا کی خوفناک اور اس شکل کا تصور کیا اور اپنے بچپن کے تصورات اور خوف کو ایک مضبوطی سے بند اٹاری سے منسلک پایا جہاں سوائے میرے چچا کے ہمارے خاندان میں سے کوئی بھی جانے کی ہمت نہیں کرتا تھا۔ آخر میں نے فیصلہ کیا کہ اب وقت آگیا ہے کہ میں اٹاری میں جاؤں اور اس کے تمام رازوں کو جانوں۔

گزشتہ دن کے ابر آلود موسم کے بعد آج آسمان پر روشن سورج دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی روشنی گھر کی کھڑکیوں سے اندر آ کر اندرونی حصے کو روشن کر رہی تھی اور میرے تصور میں بسی کل کے خوفناک خاکوں سے آج کے دن میں کوئی مماثلت نہیں تھی۔ یہ دن گویا خاص طور پر ماضی کے تاریک اسرار کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کے لیے بنایا گیا تھا۔

دوسری بار سوچے بغیر میں نے مسٹر سالٹن اسٹال سے لی گئی چابیوں کا گچھا لیا اور مٹی کے تیل کا لیمپ ساتھ لے کر سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ کیونکہ کھڑکی کھولے بغیر اٹاری میں قدرتی روشنی نہیں ہوتی تھی مگر چابی کی ضرورت نہیں پڑی

کیونکہ اٹاری کو تالا نہیں لگا ہوا تھا۔ میں نے دہلیز پر قدم رکھتے ہی چاروں طرف دیکھا۔ اٹاری میں کچھ نہیں تھا۔ تاہم وہ مکمل طور پر خالی نہیں تھی۔ کمرے کے وسط میں ایک کرسی پر مجھے خواتین کی کچھ اشیا رکھی نظر آئیں۔ چراغ کو فرش پر رکھ کر میں ان چیزوں کو دیکھنے کے لیے قریب پہنچا۔ کرسی پر سوتی کپڑے سے بنا ایک سادہ زنانہ لباس پڑا تھا جس میں سرمئی اور گہرے رنگوں کا غلبہ تھا۔ اس کے علاوہ ایک ایپرن، ربڑ کے دستانے کا ایک جوڑا، جرابیں، چپل اور ایک ماسک بھی تھا۔ مؤخرالذکر کے ساتھ ایک وگ بھی منسلک تھی جو ایک غیر معمولی بات تھی۔ وہ کپڑے غالباً پپا کی گھریلو ملازمہ کے تھے جو شاید اٹاری کو بطور ڈریسنگ روم استعمال کررہی تھی لیکن اگر یہ بات پپا کے علم میں تھی تو مجھے سمجھ نہیں آئی کہ اس نے صفائی کرنے والی خاتون کو اتنی آسانی سے اٹاری میں داخل ہونے کی اجازت کیسے دے رکھی تھی؟ جبکہ ان کے قریبی رشتے داروں کے لیے بھی یہ ممنوعہ جگہ تھی۔ ماسک کی وہاں موجودگی بھی ایک سوالیہ نشان تھی۔ اس بات کا کوئی امکان نہیں تھا کہ وہ اتفاق سے یہاں پڑا تھا۔

میں نے ربڑ کو چھو کر دیکھا۔ وہ سخت نہیں بلکہ نرم اور لچکدار تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اسے حال ہی میں استعمال کیا گیا ہے۔ میں نے اپنا ہاتھ فرش پر پھیرا۔ اٹاری کا فرش بھی پورے گھر کی طرح بالکل صاف تھا۔ کپڑوں کا جائزہ لینے کے بعد میں نے لیمپ کو اونچا کیا اور اچانک اپنے سائے کے ساتھ ہی ایک اور بڑا سایہ دیکھا جس نے دیوار کی پوری اونچائی اور اٹاری کی ڈھلوان چھت کے کچھ حصے کو ڈھانپ رکھا تھا۔

میرا فوری ردِعمل گھوم کر دیکھنا تھا کہ کیا میرے پیچھے کوئی موجود ہے لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں دوبارہ دیوار کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ سایہ ایک سیاہ دھندلا سا دھبا لگتا تھا جیسے تیز تابکاری شعلوں سے جل رہا ہو۔ میں نے غور سے دیکھا تو مجھے اس کے خاکے میں انسانی شکل نظر آئی یا یوں کہیے کہ ایک بدصورت بگڑی ہوئی انسانی شکل، کیونکہ اس کے سر کی جگہ ایک طرح کا غیر متناسب چھوٹا سا بے شکل دھبا تھا۔ جب میں دیوار کے قریب گیا تو سایہ دھندلا ہو کر غائب ہو گیا۔ آخر میں نے چند قدم پیچھے ہٹ کر سائے کے زاویے کا اندازہ لگایا اور ایک سادہ سا حساب لگا کر اس نتیجے پر پہنچا کہ سائے کا منبع فرش کی سطح پر کہیں ہونا چاہیے۔

میں نے مڑ کر کمرے کی مخالف سمت کا بغور جائزہ لیا اور مطلوبہ مقام پر سائے کے بالکل سامنے جہاں اٹاری کا فرش ڈھلوان چھت سے ملتا تھا، ایک چھوٹا سا سوراخ

در جواب آں غزل

امریکیوں میں بھی شیخی خورے پائے جاتے ہیں۔ کراچی کے ایک بزنس مین کے ہاں بھی ایک شیخی خورا امریکی مہمان آٹھہرا۔ دوسرے دن میزبان اسے اپنی گاڑی میں شہر کی سیر کرانے نکلا تو شاہراہ فیصل پر ایک عمارت دیکھ کر امریکی نے پوچھا۔ ”یہ کون سی عمارت ہے؟“

”یہ سی بریز ہے۔ بیس منزلہ ہے۔“ پاکستانی بزنس مین نے قدرے فخر سے بتایا۔

”اوہ!“ امریکی منہ بنا کر بولا۔ ”بہت معمولی عمارت ہے۔ ایسی عمارتیں تو امریکا میں بیس دن میں بن جاتی ہیں۔“

کچھ آگے آکر اس نے دوسری عمارت کے بارے میں پوچھا۔ پاکستانی بزنس مین نے بتایا۔ ”یہ کاشف سینٹر ہے۔ یہ بھی بیس منزلہ ہے۔“

”اوہ! معمولی عمارت ہے۔ ایسی عمارتیں تو امریکا میں پندرہ دن میں بن جاتی ہیں۔“ امریکی نے منہ بنا کر تبصرہ کیا۔

گاڑی آئی آئی چندریگر روڈ پر پہنچی تو امریکی نے چونتیس منزلہ حبیب بینک پلازا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”اور یہ کون سی عمارت ہے؟“

پاکستانی بزنس مین نے آنکھیں سکیڑ کر پلازا کی طرف دیکھتے ہوئے الجھن آمیز لہجے میں جواب دیا۔ ”معلوم نہیں۔ صبح تک تو یہ یہاں نہیں تھی۔“

(مرسلہ: امبر ناز، [illegible])

☆☆☆

خاتون کا تفصیلی معائنہ کرنے کے بعد ڈاکٹر نے نسخہ لکھ کر دیتے ہوئے کہا۔ ”ان میں جو گولیاں پیلے رنگ کی ہوں گی، ان میں سے ایک آپ کو صبح ایک گلاس پانی کے ساتھ کھانا ہے۔ سبز گولیوں میں سے ایک دوپہر کو ایک گلاس پانی کے ساتھ کھانا ہے۔ ایک نارنجی گولی شام کو پانی کے ساتھ کھانا ہے۔ ایک سرخ گولی رات کو پانی کے ساتھ کھانا ہے۔“

”لیکن ڈاکٹر صاحب! مجھے بیماری کیا ہے؟“ خاتون نے پریشان ہو کر پوچھا۔

”آپ کے جسم میں پانی کی کمی ہے۔“ ڈاکٹر نے جواب دیا۔

(مرسلہ: عاصم علی، ملتان)

دیکھا۔ وہ ایک عام چوہے کے بل جیسا تھا پھر مجھے فرش پر سرخ چاک یا آئل پینٹ سے کھینچی گئی کچھ عجیب جیومیٹری کی اشکال نظر آگئیں جو اس ترتیب سے بنائی گئی تھیں کہ چوہے کا بل ان کے مرکز میں آگیا تھا۔ مجھے اپنے متوفی چچا اور کالا جادو یاد آیا۔ افواہوں کے مطابق میرے چچا کو ان چیزوں سے بہت دلچسپی تھی لیکن ان اشکال میں پانچ کونوں والا ستارہ، مخروطی مثلث اور دائرے جیسی کوئی چیز نہیں تھی جو میرے ذہن میں جادو کے مختلف اعمال سے جڑی ہوئی تھیں بلکہ اس کے برعکس کچھ عجیب سی شکلیں تھیں۔ میں اس بات کا تعین نہیں کرسکا کہ یہ اشکال کب بنائی گئی تھیں۔ تیس یا شاید سو سال پہلے۔ وہ بہت قدیم لگتی تھیں۔ اس دوران جب میں نے بڑے سائے کو دیکھا پھر چوہے کا بل اور فرش پر پراسرار لکیروں کو دریافت کیا۔

میں آہستہ آہستہ تناؤ کو بڑھتے ہوئے محسوس کررہا تھا جو ہر طرف سے آتا دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے یہ تاثر مل رہا تھا کہ اٹاری جیسا کہ عجیب لگتا ہے میری حرکتوں کو دیکھ کر سانس روکے ہوئے ہے۔ چراغ کی لو کا شعلہ کانپنے اور دھواں چھوڑنے لگا تھا۔ اس کے اردگرد غیر نمایاں طور پر گہرا ہوگیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میں نے اپنے آپ کو خلا کی اتھاہ گہرائیوں میں لٹکا ہوا اور زمین کو مخالف سمت میں کھسکتا ہوا محسوس کیا جو کہیں نیچے پاتال میں غائب ہورہی تھی لیکن یہ لمحہ جلد ہی گزر گیا۔ زمین کی معمول کی گردش بحال ہوئی۔ کمرا پھر سے روشن ہوگیا۔ اب لو روشن اور ہموار جل رہی تھی۔ اٹاری میں میری گھبراہٹ کی وجہ شاید یہ بھی تھی کہ میرے بچپن کے ڈراؤنے خوابوں کے بھوت میری یادوں میں دوبارہ زندہ ہوگئے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ میرا پیچھا کررہے ہیں۔ میں پلٹا اور اٹاری سے باہر نکل آیا۔ میرے ماتھے اور چہرے پر ٹھنڈے پسینے کے قطرے نمودار ہوگئے تھے۔

میں نے چراغ بجھایا اور آہستہ آہستہ سنبھلتے ہوئے نیچے اترنے لگا۔ مجھے اپنی منگیتر کی پریشان کن پیشگوئی... بلاسبب نہیں لگ رہی تھی۔ اس کے باوجود میرا اپنے چچا کی وراثت سے دستبردار ہونے کا کوئی ارادہ نہیں تھا اور اس کے لیے مجھے گرمیوں کے تین مہینے پرانے گھر میں گزارنے ضروری تھے، چاہے اس کے لیے مجھے کتنی ہی پریشانی اور خوف کا سامنا کرنا پڑتا۔ مجھے اپنے طریقہ کار پر بلاوجہ فخر نہیں تھا۔ کبھی کبھی روز مذاق میں مجھے چھوٹا منطقی کہتی تھی۔ عام طور پر کتابوں، مصنفین اور ادبی زندگی کے پہلوؤں اور حالات کے بارے میں حقائق کے درست تجزیے اور اظہار کے لیے مجھے قابلِ اعتماد سمجھا جاتا تھا۔ اس دوران اگر میں کسی چیز کو لے کر اٹک جاتا تو اس وقت تک پرسکون نہیں ہوتا تھا جب تک کہ میں اسے انجام تک نہ پہنچادوں اور اب میرے سامنے کام یہ تھا کہ میں رات کے واقعے کی معقول وضاحت تلاش کروں اور جو کچھ میں نے اٹاری میں دیکھا اور تجربہ کیا ہے، اس کو جانچوں کہ وہ کیا تھا؟ کیا میں دونوں مواقع پر فریب نظری کا شکار ہوا تھا؟ اس مسئلے سے نمٹنے کے لیے سب سے پہلے اس بارے میں معلومات جمع کرنا ضروری تھا۔

☆☆☆

مگر مسز سالمن اسٹال کے ساتھ ٹیلی فون پر ہونے والی بات چیت سے معاملے کی وضاحت نہیں ہوئی۔ اس نے صرف اس بات کی تصدیق کی جو اس نے ایک دن پہلے بتائی تھی کہ اس نے بھی نہیں سنا تھا کہ اوریا گیرٹین نے گھر کی دیکھ بھال کے لیے کسی کو نوکری پر رکھا تھا اور وہ دوسری چابی کے وجود کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔

”لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہیے، مسٹر وکنس؟“

اس نے آخر میں کہا۔ ”کہ آپ کے چچا بہت الگ تھلگ رہنے والے اور بہت کم گو آدمی تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ لوگ ان کے معاملات کے بارے میں جانیں۔ اگر آپ یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ کوئی ملازمہ وہاں آرہی ہے تو آپ اپنے پڑوسیوں سے کیوں نہیں پوچھتے؟ میں گھر میں زیادہ نہیں جاتا تھا جبکہ پڑوسی سالوں سے وہاں ساتھ رہتے آئے ہیں اور آپ جانتے ہیں پڑوسی عام طور پر تجسس لوگ ہوتے ہیں۔ ان سے پوچھنے میں کوئی حرج نہیں۔“

اس کے مشورے کا شکریہ ادا کرتے ہوئے میں نے الوداع کہا اور فون بند کردیا۔

پڑوسیوں کے ساتھ معاملات اتنے آسان نہیں تھے۔ ان سے بات کرنے کے لیے ایک خاص طریقہ تلاش کرنا تھا۔ گیرٹین کی جائیداد مضافات میں تھی۔ میں پہلے ہی نوٹ کرچکا تھا کہ قریب ترین گھر سو میٹر کے فاصلے پر ہے اور پہلے تو مجھے بالکل غیر آباد لگا تھا۔ تاہم اس بار کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے میں نے ایک آدمی کو اپنے پورچ پر دھوپ میں ٹہلتے دیکھا پھر وہ جھولنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ لہٰذا واقفیت کے لیے کسی مناسب موقع کے انتظار کے بارے میں سوچے بغیر میں نے بات کو دوٹوک انداز میں کرنے کا فیصلہ کیا۔ گھر سے نکل کر میں نے جلدی سے لان عبور کیا جو دونوں جائیدادوں کو الگ کرتا تھا۔ راکنگ چیئر پر بیٹھا آدمی بہت

بوڑھا تھا۔
"صبح بخیر جناب!" میں نے اسے سیلوٹ کیا۔ "کیا آپ ایک سوال میں میری مدد کر سکتے ہیں؟"
"تم کون ہو؟" اس نے جواب میں آواز لگائی۔
میں نے یہ بتاتے ہوئے اپنا تعارف کرایا کہ میں مسٹر گیریسن کا وارث ہوں۔
میرا مخاطب فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ "ایڈم! اس نے کبھی آپ کا ذکر نہیں کیا اور سچ بتاؤں تو میں نے اتنے سالوں میں اس سے صرف آٹھ دس بار بات کی ہوگی۔ میں کیسے آپ کی مدد کر سکتا ہوں؟"
"میں اس عورت کو تلاش کرنا چاہتا ہوں جو گھر میں صفائی کا کام کرتی تھی۔"
اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔
"نوجوان! مجھے خود بھی تجسس کی وجہ سے اسے قریب سے دیکھنے میں کوئی اعتراض نہیں ہوگا مگر وہ آپ کے دادا کے گھر کے علاوہ کہیں نظر نہیں آتی۔"
"کیا آپ نے اسے کبھی آتے جاتے نہیں دیکھا؟"
"نہیں، میں نے اسے صرف رات کو کھڑکی میں دیکھا ہے۔"
"اور وہ گھر سے کب نکلتی ہے؟"
"میں نہیں جانتا۔ شاید وہ اندر ہی کہیں رہتی ہے۔"
اس کی باتوں نے مجھے پریشان کر دیا۔ پہلے میں نے سوچا کہ بوڑھا جان بوجھ کر مجھے گمراہ کر رہا ہے لیکن جلد ہی میں نے اس کے خلوص کا یقین کرتے ہوئے اس خیال کو رد کر دیا۔
"ایڈم! کیا آپ نے گھر میں نیلی روشنی دیکھی ہے؟"
"نہیں؟"
"کیا کچھ عجیب آوازیں سنی ہیں؟"
میں جواب دینے میں ہچکچانے لگا۔
"تو آپ نے سنی ہیں۔" بوڑھے نے مسکرا کر کہا۔ "دراصل آپ کے چچا کو ان خرافات سے بہت دلچسپی تھی۔"
"میرے چچا کا مارچ میں انتقال ہو گیا تھا۔" میں نے انہیں یاد دلایا۔
"آپ یہ کیسے ثابت کر سکتے ہیں؟ میں نے بھی تابوت کو گھر سے نکال کر قبرستان لے جاتے دیکھا تھا لیکن میں نہیں جانتا کہ تابوت میں کون پڑا تھا۔" وہ بولا۔
بوڑھا اسی لہجے میں بولتا رہا لیکن اپنی قیاس آرائیوں اور شکوک کے علاوہ وہ کوئی ٹھوس جواب نہ دے سکا۔ اس نے جو بتایا، وہ میں پہلے سے جانتا تھا۔ مثلاً میرے چچا کی غیر ملنساری کے بارے میں، شیطانی کاموں میں ملوث ہونے کے بارے میں اور یہ کہ مردہ اور یا گیریسن زندہ سے کہیں بہتر ہے۔ کاش وہ واقعی مر گیا ہو۔ بوڑھے آدمی نے چچا کی جاگیر کو "بری جگہ" کہا اور یہ تسلیم کرتے ہوئے نتیجہ اخذ کیا کہ اگر اس کے مالک کو تنہا چھوڑ دیا جائے تو اس نے پڑوسیوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ بس جب بوڑھی مسز برٹن نے ایک بار اس کے گھر جانے اور ایک عورت کو لوگوں سے چھپائے رکھنے پر اسے ڈانٹنے کا فیصلہ کیا تب وہ اگلی صبح اپنے سونے کے کمرے میں مردہ پائی گئیں۔ خوف سے ان کا دل پھٹ گیا تھا۔
اس گفتگو سے مجھے یقین ہو گیا کہ پڑوسیوں سے معلومات لینے کا کوئی فائدہ نہیں۔ بس اب ایک ذریعہ باقی رہ گیا تھا۔ میرے مرحوم چچا کی ذاتی لائبریری..... جہاں مجھے قدیم اور جدید کتابوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ملا جو سب کسی نہ کسی طرح کالے جادو اور جادو ٹونے سے جڑی ہوئی تھیں۔ ان کے عنوانات مختلف تھے۔ حقیقت یہ تھی کہ میرے چچا نے ان تمام کتابوں کو غور سے پڑھا تھا۔ اس کا ثبوت ان کے ہاتھ سے حاشیے میں لکھے گئے لاتعداد نوٹ اور ریمارکس سے ملتا تھا۔ کچھ پیراگرافس کو نشان زدہ کیا گیا تھا۔ میں مشکل سے شکستہ رسم الخط پڑھ پا رہا تھا لیکن بنیادی بات واضح تھی۔ اور یا گیریسن کو نہ صرف شیطانیات اور جادو ٹونے میں دلچسپی تھی بلکہ روحانیت، آواگون اور ہمزاد میں بھی دلچسپی تھی۔ بہت سے نوٹ جادوئی فارمولوں اور منتروں پر مشتمل تھے جن کے ذریعے مرحوم مقاصد میں کامیابی حاصل کی جا سکتی تھی۔ جوں جوں میں آگے پڑھتا گیا، میں نے دھیرے دھیرے متن پر توجہ دینا چھوڑ دیا۔ صرف نوٹس پر توجہ مرکوز کی جو ایک ہی موضوع کا احاطہ کرتے تھے۔ وہ سب روحوں، آواگون اور ہمزاد سے متعلق تھے۔ خاص طور پر انسانی روح کے ایک نئے جسمانی خول کے حصول کے امکان کے بارے میں۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں چچا کی تحریروں کو چھان پھٹک کر بہت حیران ہوا تھا۔ آپ بھی جانتے ہیں کہ ایک بوڑھے تنہا شخص کے لیے اور کیا دلچسپی کی بات ہو سکتی ہے جو موت کی دہلیز پر کھڑا ہو۔
میں ابھی کتابوں میں سر کھپا رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ وہ روڈا تھی۔ اس نے بوسٹن سے فون کیا۔ "تم ابھی تک بوسٹن میں ہو؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔
"ہاں، میں یہاں رک گئی تھی تاکہ لائبریری کی

آرکائیوز میں کچھ نایاب کتابوں کو تلاش کر سکوں جو تمہارے متوفی رشتے دار کی دلچسپی سے متعلق ہوں۔" وہ بولی۔

"کتابیں؟ شاید جادو ٹونے کے بارے میں؟" میں نے اندازہ لگایا۔

"جی ہاں ایڈم! میرے خیال میں تمہارے لیے یہ گھر چھوڑ دینا ہی بہتر ہے۔"

"اچھا، وراثت حاصل کیے بغیر چھوڑ دوں؟ تمہارے مشورے کا شکریہ۔" میں نے طنزاً کہا۔

"ایسی حماقت مت کرو۔ میں نے یہاں تھوڑی تحقیق کی اور بہت کچھ پتا چلا ہے۔ میری بات خاموشی اور سنجیدگی سے سنو۔ تمہارے چچا نے ایک خاص وجہ سے ایسی شرط رکھی تھی۔ انہیں کسی خاص مقصد کے تحت تمہاری ضرورت ہے۔ خیر تم کیسے ہو؟ تم نے وہاں کوئی تبدیلی محسوس کی ہے؟"

"میں ٹھیک ہوں۔" میں نے کہا پھر اس دن کے تمام واقعات تفصیل سے بیان کیا۔ اس نے خاموشی سے میری بات سنی۔

جب میں چپ ہوا تو وہ بولی۔ "یعنی میرا اندیشہ درست ہے۔ ایڈم! تمہیں فوراً اس گھر سے نکلنا ہوگا۔"

جوں جوں وہ بولتی رہی میری جھنجلاہٹ بڑھتی گئی۔ وہ مجھ پر حاوی ہو رہی تھی اور چاہتی تھی کہ میں اس کے اشاروں پر چلوں۔ اسے سنجیدگی سے یقین تھا کہ وہ مجھ سے بہتر جانتی ہے کہ میرے لیے کیا اچھا ہے اور کیا برا۔ یہ بہت زیادہ ہو گیا تھا۔ مجھے اپنی زندگی میں کسی کا اتنا عمل دخل پسند نہیں تھا۔

"میں یہیں رہوں گا۔" میں نے سختی سے کہا۔

"ایڈم! اٹاری میں سایہ ہے۔ کیا تم نہیں سمجھتے؟ اس سوراخ سے کوئی نامعلوم اور خوفناک چیز ظاہر ہو رہی ہے جس کا سایہ تم نے دیوار پر دیکھا ہے۔"

میں نے اس کی بات کو اہمیت نہیں دی، بس ہنس دیا۔ میں ہمیشہ کہتا تھا کہ خواتین بے عقل مخلوق ہیں۔

"ایڈم! رات والی ملازمہ انسان نہیں ہے۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"میرے پاس آجاؤ اور ڈرو نہیں۔ میں تمہاری حفاظت کروں گا۔" میں نے کہا۔

اس نے فون بند کر دیا۔

☆☆☆

اگلی رات جب میں بستر پر لیٹا گزشتہ شب کے پُراسرار واقعات پر غور کر رہا تھا تو اچانک مجھے سیڑھیوں پر قدموں کی آواز سنائی دی۔ میں کچھ لمحوں تک سنتا رہا پھر اٹھ کر احتیاط سے دروازے کی طرف بڑھا اور تھوڑا سا کھول کر باہر دیکھا۔ وہ پراسرار ملازمہ ابھی میرے دروازے کے آگے سے گزر کر نچلی منزل کی سیڑھیوں تک پہنچی تھی۔ میں پلٹا اور جلدی سے اپنے سوٹ کیس سے ڈریسنگ گاؤن نکال کر پہنا اور اس امید پر دبے قدموں اس کے پیچھے چل دیا کہ اسے کام کرتے ہوئے دیکھوں۔

میں نے ممکن حد تک کوشش کی تھی کہ کوئی آہٹ پیدا نہ ہو۔ میں نے چراغ بھی نہیں لیا تھا لیکن کھڑکیوں سے آنے والی چاندنی کی روشنی اندھیرے کو جزوی طور پر دور کر رہی تھی۔ میں دھیرے دھیرے چلتا ہوا ابھی آدھے راستے پر پہنچا تھا کہ مجھے احساس ہوا کہ کوئی مجھے دیکھ رہا ہے۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ میرے پیچھے اندھیرے میں اٹاری میں جانے والی سیڑھیوں کے خلا میں اوریا گیرتین کا بھوت بے حرکت لٹکا ہوا تھا۔ ہاں...... وہی ڈاڑھی والا خوفناک چہرہ، انگاروں کی طرح چمکتی ہوئی آنکھیں، سر پر گھنے بالوں کا گچھا، گالوں کی ہڈیاں سخت اور ابھری ہوئیں۔ غلطی کرنا ناممکن تھا۔ ہم ایک منٹ تک خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے پھر نظارہ غائب ہو گیا۔ وہ ایک غبارے کی طرح سکڑ گیا جیسے ہوا نکل گئی ہو۔ بس کچھ سیاہ مادے کا صرف ایک چیتھڑا بچ رہ گیا تھا جو سانپ کی طرح لرزتا سیڑھیوں سے نیچے تیرتا ہوا آیا اور جہاں میں کھڑا تھا، اس سے چند میٹر کے فاصلے پر آ کر ہوا میں تحلیل ہو گیا۔

اس نظارے کی دہشت سے نکل کر میں نے عقلی طور پر سوچنے کی کوشش کی کہ وہ کیا تھا اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ فریب نظر کچھ غیر متوقع نہیں تھا کیونکہ سارا دن میری سوچیں کسی نہ کسی طرح اپنے چچا اور ان کی جادوگری کی طرف ہو رہی تھیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ بھوت مجھے حقیقت میں نظر آیا تھا یا اب بھی خواب تھا؟ میں کافی دیر تک سوچتا رہا کہ میں سیڑھیوں پر کیسے اور کیوں آیا ہوں۔ آخر کار مجھے رات والی عورت یاد آ گئی۔ مجھے اس کا سراغ لگانا تھا۔ میں ہمت جمع کرتے ہوئے سیڑھیوں سے نیچے اترا۔ باورچی خانہ روشن تھا۔ شاید چراغ جل رہا تھا لیکن روشنی مدھم تھی اور ہلکی مہک آ رہی تھی۔ میں دروازے کی طرف لپکا اور اندر جھانکا۔

وہ عورت وہاں موجود تھی اور ہمیشہ کی طرح صفائی کر رہی تھی۔ اب وقت آ گیا ہے کہ اس سے دو ٹوک بات کی جائے اور وضاحت طلب کی جائے۔

میں بولنے کے لیے اپنا منہ کھولنے ہی والا تھا کہ اچانک کسی چیز نے مجھے روک لیا۔ اس عورت سے میرے

اندر ایک فطری نفرت پیدا ہونے لگی تھی۔ مجھے اچانک وہ سابق نوکرانی یاد آگئی جس سے میں بچپن میں ایک بار ملا تھا اور قریب سے دیکھ کر میں نے موجودہ خاتون کو پہچان لیا تھا۔ وہ وہی تھی۔ اس کا بے حرکت اور بے تاثر چہرہ پچھلے تیس سالوں میں بالکل بھی نہیں بدلا تھا۔ اس کی حرکات و سکنات بالکل یکساں تھیں۔ یہاں تک کہ اس کا لباس بھی مجھے ویسا ہی لگتا تھا۔ مجھے اب کوئی شک نہیں رہا تھا کہ یہ وہی ہے جو کل رات میرے بستر پر تھی۔ میں نے بیزاری پر قابو پاتے ہوئے دہلیز پر قدم رکھا۔ میں غصے سے چیخنے والا تھا کہ آواز میرے ہونٹوں پر دم توڑ گئی۔

اس نے دھیرے سے اپنا سر موڑا اور چند لمحوں کے لیے ہماری نظریں ٹکرا گئیں۔ میں نے اس کی آنکھوں میں

ایک خوفناک آتشیں کھائی کو دیکھا۔ ایسی آنکھیں جن کا انسانوں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ سب ناقابل بیان تھا۔ بھوک اور ہوس، ناقابل تصور ہر طرح کا غصہ اس کی آنکھوں میں چل رہا تھا۔ دو مختصر لمحوں میں اس ملاقات نے بالکل وہی تاثر دیا تھا جو مجھے بچپن سے یاد تھا۔ عورت مکمل طور پر خاموش کھڑی تھی۔ اس کے چہرے سے اس کی آنکھوں کے علاوہ معمولی سا بھی جذبات کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔ میں اس نظر کو مزید برداشت کرنے سے قاصر تھا۔ آخر میں دہلیز سے واپس ہال کے اندھیرے کی طرف پلٹا اور ایک ہی سانس میں سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف دوڑا۔ کمرے میں داخل ہوکر میں نے اپنے پیچھے دروازہ بند کر دیا اور دروازے سے ٹیک لگا کر ہانپنے لگا۔ میرے چہرے پر پسینا بہہ رہا تھا اور میں خوفناک خیالات میں الجھا ہوا تھا۔ ہاں، یقیناً وہ مخلوق کوئی عام عورت نہیں ہوسکتی تھی۔ اس کے اور میرے مرحوم چچا کے درمیان ایک خاص تعلق تھا جس کی وجہ سے وہ آج بھی ہر رات گھر آتی تھی اور میکانکی طریقے سے اپنا کام کرتی تھی لیکن وہ کہاں سے آتی ہے یہ بات معمائی ہوئی تھی۔

میں ابھی دروازے سے لگا کھڑا تھا کہ سیڑھیوں پر قدموں کی آواز آئی۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ وہ پھر سے کل رات کی طرح میرے سونے کے کمرے میں آرہی ہے اور میں خوف سے ٹھنڈا ہوگیا لیکن اس کے قدم دوسری منزل سے گزر کر اٹاری کی طرف جانے والی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ جیسے ہی وہ دور ہوئی، میرا سابقہ عزم مجھ میں لوٹ آیا۔ آخرکار میں نے دروازہ کھول کر باہر دیکھا۔ ہر طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا لیکن نہیں..... اوپر جہاں سیڑھیاں ختم ہوتی

اطلاعاً عرض ہے

"اس وقت آپ شہر کے مشہور ترین نفسیاتی اسپتال کی ہاٹ لائن کا نمبر ملا چکے ہیں۔ خوش آمدید! اگر آپ تصدیق شدہ خبطی یا سنکی ہیں تو براہ کرم اب اپنے فون کا "نمبر ایک" دبایئے۔ اگر آپ معذور ہیں تو کسی سے درخواست کیجیے کہ وہ آپ کے لیے نمبر دبا دے لیکن اس صورت میں آپ نمبر ایک نہیں بلکہ نمبر دو دبائیں گے۔ اگر آپ کو ہشت پہلو شخصیت کا مالک ہونے کا عارضہ لاحق ہے تو پھر نمبر تین، چار، پانچ اور چھ دبایئے۔ اگر آپ کو خواہ مخواہ دوسروں کو تنگ کرنے کی نفسیاتی بیماری ہے تو ہم سمجھ گئے ہیں کہ آپ کون ہیں۔ آپ ذرا ہولڈ کیجیے۔ ہم ابھی معلوم کر لیتے ہیں کہ آپ کس نمبر سے بول رہے ہیں۔ اگر آپ کو یادداشت کھو جانے کی بیماری ہے تو ہمارا یہ ریکارڈ شدہ پیغام ختم ہونے کے بعد چند سیکنڈ انتظار کیجیے۔ ایک دوسری آواز آپ کو بتائے گی کہ آپ کو کون سا نمبر پریس کرنا چاہیے۔ اگر آپ ڈپریشن میں مبتلا رہنے والے جنونی ہیں تو پھر خواہ کوئی سا بھی نمبر دباتے رہیے، کوئی جواب نہیں ملے گا۔"

(مرسلہ: عنبر ناز، سکھر)

تھیں، اٹاری کے دروازے کے نیچے سے ایک نیلی چمک دار روشنی باہر آرہی تھی۔ میں دھیرے دھیرے چلتا اوپر چلا گیا۔ میرے ہر قدم کے ساتھ چمک کمزور ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔ جب میں اٹاری کے دروازے پر پہنچا تو میں نے اس سے اپنا کان لگا دیا لیکن اندر کوئی آواز نہیں تھی۔ میں نے جھٹکے سے دروازہ کھولا۔ کمرے میں کوئی عورت نہیں تھی۔ صرف اس جگہ جہاں فرش اٹاری کی چھت سے مل رہا تھا، وہاں نیلی روشنی کا ایک دھبا نظر آرہا تھا جو کہ سنک میں بہتے پانی کی طرح تیزی سے چوہے کے بل میں جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے اردگرد موجود خفیہ شیطانی نقال خود سے چمک اٹھی تھیں پھر ان کی روشنی بھی آہستہ آہستہ ختم ہوگئی۔

میں نے ماچس جلائی اور ادھر اُدھر دیکھا۔ عورت کا

لباس پچھلی بار کی طرح کرسی پر پڑا تھا اور ایک ماسک بھی تھا۔ میں نے اپنے ہاتھ سے ماسک کو چھوا۔ وہ ابھی تک گرم تھا۔ ماچس کی تیلی جلتے ہوئے میری انگلیوں تک پہنچ گئی تھی۔ میں نے تیلی پھینک دی۔ اب میں اندھیرے کی ایک مضبوط دیوار میں گھرا ہوا تھا لیکن جس طرف چوبے کا عمل واقع تھا، وہاں سے ایک ناقابلِ فہم کشش مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ وہ واقعی طاقتور تھی کہ میں نے غیر ارادی طور پر گھٹنے ٹیک دیے اور تقریباً غائب ہونے والی نیلی چمک کے پیچھے لپکا۔ ایک بار پھر زمین نے میرے نیچے گھومنا بند کر دیا۔ وقت رک گیا اور ایک وحشی اور پاگل خوف نے میرے جسم کو مکمل طور پر مفلوج کر دیا اور جیسے میں جم گیا۔

میں حرکت کرنے سے قاصر تھا اور پھر بل کی گہرائی سے چمکدار نیلی روشنی کی ایک ندی دوبارہ کمرے میں امڈ آئی۔ اس روشنی کے ساتھ میں نے فوری طور پر اپنے آپ کو ان غیر مرئی بیڑیوں سے آزاد کر لیا جنہوں نے مجھے چاروں جانب سے جکڑ رکھا تھا۔ میں اٹھ کر اناری سے باہر نکلنے کے لیے بڑھا۔ دروازے پر پہنچ کر میں نے مڑ کر دیکھا کہ کوئی مافوق الفطرت ہستی میرا پیچھا تو نہیں کر رہی لیکن میرے پیچھے صرف ناقابلِ تسخیر اندھیرا تھا۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر میں بستر پر گر گیا اور سامنے اندھیرے خلا میں گھورتا رہا۔ میں اس انتظار میں تھا کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔ میں سمجھ گیا تھا کہ روڈا ٹھیک کہہ رہی تھی۔ مجھے یہ گھر چھوڑ دینا چاہیے تھا لیکن اسی وقت میرے اندر کسی چیز نے جانے کی مزاحمت کی تھی۔ اب یہ صرف وراثت کے کھونے کا خوف نہیں تھا بلکہ کچھ اور بھی تھا۔ ایک قسم کا خوفناک تعلق جو میرے اور اس گھر کے درمیان پیدا ہو گیا تھا۔

گھڑی کی سوئیاں دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہی تھیں۔ گھر میں مکمل خاموشی تھی۔ بس کبھی کبھار دیواروں سے باہر ہوا کا شور اور پرانے قبرستان میں کہیں بولنے والے الو کی کرخت آواز سنائی دیتی تھی۔ آخرکار مجھے نیند آ گئی۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک نیلی چمکدار روشنی پھر اناری میں بھر رہی ہے پھر وہ اناری کی سیڑھیوں سے بہتی ہوئی نیچے آنے لگی اور میرے سونے کے کمرے کے دروازے کے نیچے سے اندر گھس رہی ہے۔ میں نے پھر اناری کے روشن کمرے کو دیکھا جہاں چوبے کے سوراخ سے نیلی روشنی میں اس گھر کی ملازمہ کا ہیولا نکل رہا تھا۔ اس نے مختلف شکلیں اختیار کی تھیں۔ پہلے چہرے پر ایک نقاب، پھر ایک بدصورت بوڑھی عورت، پھر ایک مکمل جوان اور خوبصورت لڑکی اور اس کے بعد میرے بڑے چچا اوریا گیریسن کے روپ میں۔ نیلی روشنی نے اناری کو زینے اور اناری کو اور آخرکار میرے کمرے کو پورا بھر دیا تھا۔

میں رات کے اختتام پر حویلی کے بیرونی دروازے پر زوردار دستک سے بیدار ہوا۔ میں خود کو تھکا ہوا محسوس کر رہا تھا اور ٹھنڈے پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ کھڑکیوں کے باہر آسمان روشن ہونے لگا تھا۔ میں اٹھ کر بمشکل سیڑھیاں اترا اور بیرونی دروازہ کھولا۔

روڈا دروازے کے سامنے پورچ پر کھڑی تھی۔

"ایڈم! کیا ہوا؟ تم بہت خوفناک لگ رہے ہو۔" وہ چلائی۔

"چلی جاؤ۔ مجھے تمہاری ضرورت نہیں ہے۔" میں نے بھی چلا کر کہا۔

پہلے تو میں خود اپنی بات پر حیران ہوا لیکن میں واقعی اس کی وہاں بے وقت آمد پر برہم تھا۔ شاید اس نے سوچا ہوگا کہ میں اس کی احمقانہ نصیحتوں کے بغیر نہیں رہ سکتا۔

"تو مجھے دیر ہو گئی ہے۔" اس نے آہ بھری۔

"باہر نکلو۔ مجھے اکیلا چھوڑ دو۔" میں چلایا۔

لیکن وہ مجھے دھکا دے کر گھر میں داخل ہو گئی۔ میں اس کے پیچھے چل پڑا۔

وہ سیدھی میرے کمرے میں گئی اور فوراً ہی میری ڈائری اور تھامس ہارڈی پر مقالہ لے کر باہر آ گئی۔ "تم کو اب اس کی ضرورت تو نہیں ہے؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں۔ اسے لے جاؤ۔" میں غصے سے بولا۔

وہ دروازے تک گئی۔ "الوداع ایڈم!"

"الوداع روڈا۔"

مجھے حیرت ہوئی کہ روڈا بغیر کسی شکایت کے وہاں سے چلی گئی۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں اس کے جانے سے بالکل نہیں گھبرایا تھا لیکن اپنی روح کی گہرائیوں میں کہیں میں نے اطمینان محسوس کیا۔ معاملات کا یہ موڑ میرے لیے موزوں تھا۔

☆☆☆

میں نے دن کا بیشتر حصہ مکمل بے عملی میں گزارا اور رات ہونے کا بے تابی سے انتظار کرتا رہا۔ اب مجھے اپنی حالت بیان کرنا مشکل لگتا ہے۔ کوئی ڈر بالکل نہیں تھا۔ صرف تجسس اور نئی ملاقات کی پرجوش خواہش باقی تھی۔ دن بہت لمبا تھا اور وقت دھیرے دھیرے گزر رہا تھا۔ میں اس کے بیچ میں سو گیا۔ میں نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ مجھ میں ایک مختلف قسم کی بھوک ابھر رہی تھی لیکن اس صورت حال

نے مجھے بالکل پریشان نہیں کیا تھا۔

آخر رات آ گئی۔ میں مستقبل میں ہونے والے واقعات کا اندازہ لگا رہا تھا اور سکون سے بیٹھنے سے قاصر تھا۔ میں کئی بار پہلی منزل کی طرف بڑھا اور اوپر جانے والی سیڑھیوں پر ایک نظر ڈالتا رہا۔ یہاں تک کہ مجھے احساس ہوا کہ مجھے اپنے چچا کے کمرے میں ہونا چاہیے اور وہاں رات کے مہمانوں کی آمد کا انتظار کرنا چاہیے۔

وقت گزرتا رہا۔ ہال کی گھڑی میں نو، دس پھر گیارہ بج گئے۔ میں بیٹھا انتظار کرتا رہا۔ آخر میں نے سیڑھیوں پر قدموں کی آواز سنی۔ ایک عورت کے قدم جس کو میں جانتا تھا کہ وہ للتھ (خوبصورت شکل میں بدروح) ہے۔ پہلے ایک نیلی چمک اٹھی۔ اس نے دروازے کے نیچے کی درز سے گزر کر میرے کمرے کو روشن کر دیا جیسا کہ خواب میں ہوا تھا لیکن اس بار مجھے نیند نہیں آئی۔ میرے حواس حد درجہ تیز ہو چکے تھے۔ نیلی روشنی کی چمک بڑھتے ہوئے میری آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی اور میں بمشکل ایک عورت کا ہیولا دیکھ پا رہا تھا جو کمرے کے بیچ میں نمودار ہو رہا تھا۔ اس کے آگے میرے چچا کی جانی پہچانی شکل تھی جیسے ایک سیاہ سانپ دھیرے دھیرے بل کھاتے ہوئے میرے بستر کی طرف بڑھ رہا ہو...... لیکن اچانک میری وحشت اور مایوسی کا سلسلہ رک گیا۔ مجھے دھوئیں کی بو آئی پھر جلتی ہوئی لکڑیوں کے کڑکنے کی آوازیں آنے لگیں۔

اچانک میں نے ایک جانی پہچانی آواز سنی۔ ”ایڈم...... ایڈم!“ روڈا بیرونی دروازے پر کھڑی چلا رہی تھی۔

وہ نظارہ میری آنکھوں کے سامنے بکھرنے لگا۔ آخری چیز جو میں نے دیکھی وہ چچا کے بھوت کے چہرے پر شدید غصے کی جھلک تھی۔ وہ ایک دلکش لڑکی سے ایک لمحے میں غصہ ور بوڑھے مخرے میں بدل گیا تھا لیکن اب میں اس کے چنگل میں نہیں رہا تھا۔ میں کھڑکی کی طرف بھاگا اور اسے کھول کر اپنی پوری طاقت سے چیخا۔ ”روڈا!!“

میری پریشانیاں بے بنیاد تھیں۔ روڈا نے ہر چیز کا خیال رکھا تھا۔ کھڑکی کے ساتھ باغ میں سیڑھی لگی ہوئی تھی۔

پرانا گھر تمام سامان سمیت جل کر خاکستر ہو گیا تھا۔ تاہم آگ نے جانشینی کی شق کو متاثر نہیں کیا تھا۔ مسٹر سائنس اسٹال نے عدالت کو قانونی نکات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ میں نے اپنے چچا کی آخری وصیت کو اس لمحے تک باقاعدگی سے انجام دیا جب تک قدرتی حالات میرے قابو سے باہر نہیں ہو گئے اور ان پر عمل درآمد کرنا ممکن نہیں رہا۔

لہٰذا مجھے زمین وراثت میں ملی۔ میں نے کچھ عرصے بعد اسے خطیر رقم میں بیچ دیا اور جلد ہی روڈا اور میری شادی ہو گئی۔ اس کے کردار میں تمام واضح خامیوں کے باوجود میں نے اسے قبول کر لیا تھا۔

”میں نے گھر کو خود آگ لگائی تھی۔“ اس نے مجھے بعد میں بتایا۔

معلوم ہوا کہ اس دن وہ میرے نوٹ لے کر سکاٹوک یونیورسٹی کی لائبریری گئی جو کہ نایاب پرانی کتابوں کے ذخیرے کے لیے مشہور ہے۔ ان کا جائزہ لینے کے بعد جن کا جادو ٹونے اور شیطانی طاقتوں سے تعلق تھا، اس نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ گھر میں رہنے والا بھوت میرے چچا اوریا گیریسن کی روح تھی۔ اس کے بقول وصیت میں بتائی گئی اس شق کا مقصد صرف اور صرف مجھے کچھ وقت کے لیے گھر میں روکنا تھا تاکہ دوسری دنیا کی پراسرار قوتیں مجھ پر غالب آ جائیں۔ چونکہ بوڑھے گیریسن کا ارادہ تھا کہ وہ میرے جسم پر قبضہ کرے گا۔ وہ ملازمہ بھی طور پر ایک...... بدروح تھی اور جو ہے کاہل کی اور جنت کا راستہ تھا۔

یہ حقیقت ہے کہ آپ کوئی معاملہ ایک عورت کے سپرد کریں تو وہ فوری طور پر آپ کے لیے ایسے بظاہر غیر موزوں سوا سے بھی ایک رومانوی کہانی گھڑ لے گی۔ بس بری روح کو آپ نے شکست کر دیا ہوگا۔ کبھی کبھی اس کا استدلال میرے اعصاب پر اثر کرتا ہے اور مجھے واقعی شک ہوتا ہے کہ آخر میں کون ہوں۔ ایڈم ویٹسن یا اوریا گیریسن؟ اس موضوع پر روڈا کے ساتھ بات نہ کرنا بہتر ہے۔

میں نے ایک بار کوشش کی تھی۔ اس کا کہنا تھا۔ ”تم جانتے ہو ایڈم اس تجربے نے تم کو کچھ طریقوں سے فائدہ بھی پہنچایا۔“

”وہ کس طرح؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”تمہیں اندازہ ہو گیا ہوگا کہ تمہیں ایک عقل مند بیوی ملی ہے۔“

”نہیں، میں اب بھی عورتوں کو بے عقل مخلوق سمجھتا ہوں۔“ میں نے دل میں کہا۔ روڈا آج بھی ان مضحکہ خیز توہمات کو مانتی ہے۔ بدقسمتی سے جو کچھ ہوا، میں اس کا معقول سائنس پر مبنی جواز پیش نہیں کر سکتا اور ان سوالوں کا جواب بھی نہیں پاتا جو میں کبھی کبھی اپنے آپ سے پوچھتا ہوں۔ میں تنہا بیٹھ کر عجیب و غریب واقعات کو یاد کرتا ہوں۔ میں شریک تھا یا شکار؟ جو میں ایک بار بن گیا تھا۔

⌘⌘⌘

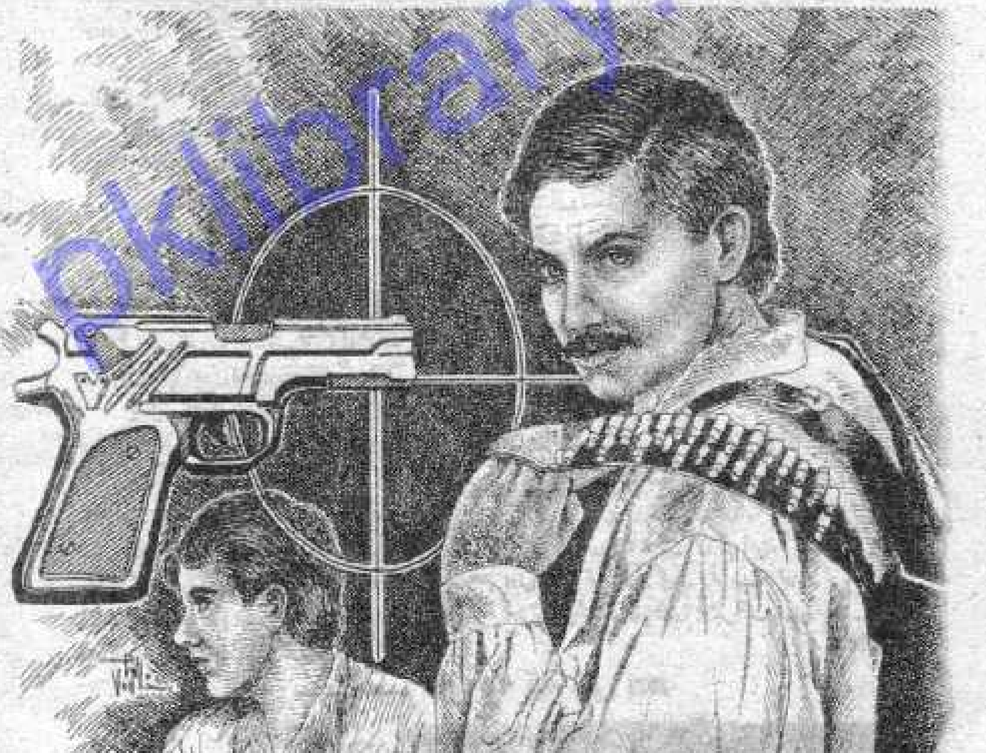
جنگ باز

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

قسط: 15

مقدر کا عروج ہو یا نصیب کا زوال... جانے کن خاموش لمحوں میں زندگی میں شامل ہو جاتے ہیں... لیکن کچھ لوگ تقدیر سے زیادہ تدبیر پر بھروسا کرتے ہیں... وہ جو حالات کی زنجیر میں قید بوسیدہ در و دیوار تک محدود تھا تمام تر معصومیت کے ساتھ شب و روز کی ہنگامہ خیزیوں میں مصروف تھا کہ اچانک حرص و طمع اور لالچ کے مارے... چہروں پر شرفا کا نقاب ڈالے عیرت و مکر کے تمام حربے آزمانے اس کے راستے میں چلے آئے... وہ جو رنگین شاموں... سنگین ہنگاموں اور تحیر انگیز چالوں سے ناآشنا تھا... ایسا بازی گر بن گیا کہ تمام پردہ داروں کی ڈوریاں الجھ کر رہ گئیں... اس کے ذہن میں قید ناآسودہ خواہشوں کا بھنور اسے کسی کل چین سے بیٹھنے نہیں دیتا تھا۔ تقدیر کے سہارے چلنے والا... کچھ اس انداز سے تدبیروں سے اپنی کایا پلٹتا چلا گیا کہ چال بازوں کی تمام چالیں لڑکھڑا گئیں۔

معاشرتی ناسوروں اور درندوں کی خوں ریز سازشوں اور زخم زخم ہونے والے ایک جنگ باز کی دلدوز داستان





گذشتہ اقساط کا خلاصہ

روشنیوں کا شہر کراچی...... اس نے جانے کتنے لوگوں کو اپنے دامن میں ماں کی طرح سمیٹ رکھا ہے۔ ان گنت داستانوں کی امین اسی مہربان گود کے کسی کونے میں سہراب خان یعنی میں بھی رہتا ہوں جو ایک غریب محلے میں محبت کرنے والی ماں اور ایک سخت گیر طبیعت کے حامل باپ کا ایسا ناخلف بیٹا بھی تھا جو ہر وقت باپ کی بے جا مار پیٹ کا نشانہ بنتا رہتا۔ میری ایک بہن بھی تھی راحیلہ۔ مگر نہیں، بعد میں مجھ پر انکشاف ہوا کہ وہ میری بہن نہیں تھی، خالہ زاد تھی۔ بچپن میں اس کے ماں باپ ایک ناگہانی حادثے میں مر چکے تھے اور ماں نے اسے میرے ساتھ ہی پال پوس کر جوان کیا تھا۔ یہ راز صرف میری ماں اور راحیلہ کو پتا تھا۔ میں تو راحیلہ کو بچپن سے ہی سگی بہن سمجھا کرتا تھا مگر وہ بچپن سے ہی مجھے ایک بھائی کی نہیں بلکہ کسی اور ہی "نگاہ" سے دیکھا کرتی۔ ماں میری شادی اس سے کروانا چاہتی تھی لیکن یہ حقیقت آشکار ہونے کے باوجود بھی میرے اس جذبے میں کوئی فرق نہ آیا۔ میں اب بھی اسے ایک "بہن" کے ہی روپ میں دیکھتا تھا۔ راحیلہ نے میرے اس برتاؤ پر برا منایا گھر میں اسے بری طرح جھڑک دیتا۔ میرا باپ، ماں کو مارا پیٹا کرتا تھا۔ ایک دن ماں کو اس نے گہرا زخم دیا تو میں برداشت نہ کر پایا اور باپ کے سامنے سینہ تانے کھڑا ہو گیا۔ باپ کا یہ دیکھ کر بلڈ پریشر بڑھ گیا اور اس کی دماغ کی رگ پھٹ گئی۔ وہ جہان سے کوچ کر گیا تو گھر میں سکون ہوا۔ پتا چلا کہ اصل موت غربت کی نہیں بلکہ ایک غصہ ور شخص کی روز روز کی داستاں کل کی تھی۔ غربت اور عسرت کی زندگی کو ایک لعنت شاید اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اس کی کوکھ سے جرائم پھوٹنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ غربت اور باپ کی سخت گیر طبیعت نے مجھے بھی ایک حد تک جرائم کی طرف راغب ضرور کر دیا تھا مگر چونکہ شاید میری رگوں میں "نسلی" خون دوڑ رہا تھا اسی لیے میں جلد ہی "سنبھل" گیا مگر اس "سنبھلنے" کی مجھے بڑی قیمت چکانا پڑی۔ میں اور میرا باپ ایک فیکٹری میں معمولی ورکر تھے۔ گلی کے محلے میں ہی تین ہم عمر لڑکے میرے یار کہلاتے۔ ایک کا نام سلیم، دوسرے کا راجو اور تیسرا ماجد تھا۔ ماجد کی جوان بہن فوزیہ میری پہلی اور آخری محبت ٹھہری۔ ہم چاروں جرائم پیشہ گروہ کے آلۂ کار بن گئے۔ اقبال نامی ایک پُراسرار شخص ہمارا "باس" کہلایا۔ اس کا نائب سجاد بیگ تھا۔ اسی گروہ نے ہم چار یاروں (سلیم، راجو، ماجد اور مجھے) ایک روز آنکھوں پر پٹی باندھ کر کسی نامعلوم مقام پر پہنچا دیا جہاں ہمیں لڑائی بھڑائی کی خصوصی ٹریننگ دی گئی۔ میں جسامت کے لحاظ سے چھریرا، لمبا اور مضبوط کاٹھی کا تھا۔ سلیم صاحب قد و قامت کا جبکہ راجو اور ماجد قدرے گٹھی ہوئی جسامت کے مالک تھے۔ گروہ نے ہمارے ناموں کے ساتھ عجیب و غریب قسم کے "لاحقے" منسلک کر دیے۔ میں سہراب لمبو کہلایا۔ سلیم کے ساتھ "چھپالیا" منسلک ہو گیا۔ راجو "بوری" ہو گیا جبکہ ماجد "ماجا"۔ گروہ دیگر جرائم کے ساتھ بھتا خوری بھی کرتا تھا۔ ہماری فیکٹری مالک سیٹھ سکندر سے بھتا لینے کے لیے "باس" اقبال نے ہمیں استعمال کیا۔ میری غیرت جاگی۔ میں اور میرا باپ اس سیٹھ کا نمک کھاتے تھے۔ میں نے سلیم وغیرہ کو سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ میرے ہی دشمن ہو گئے۔ تاہم میں نے سیٹھ سکندر کے ساتھ نمک حلال کیا اور اسے سب بتا دیا کہ بھتا نہ دینے کی صورت میں اس کی فیکٹری کو بم سے اڑا دینے کی دھمکی دی گئی ہے۔ میں نے بروقت بم کی اطلاع دے کر جہاں سیکڑوں ورکروں کی جان بچالی وہیں سیٹھ سکندر کو بھی بھاری مالی اور جانی نقصان سے بچالیا۔ گروہ سمیت میرے تینوں یار میری جان کے دشمن ہو گئے۔ سیٹھ سکندر کی جواں سال خوب صورت بیٹی سدرہ میری "نمک حلالی" سے متاثر ہوئی۔ سیٹھ سکندر تو تھا ہی میرا معترف۔ عقدہ کھلا کہ سدرہ کا ماموں یعنی سیٹھ سکندر کا سالا سدرہ کی والدہ کا بھائی، سجاد بیگ ہی جرائم پیشہ گروہ کے باس اقبال کا نائب ہے۔ بعد میں اس راز سے بھی پردہ ہٹا کہ وہ سدرہ کی ماں کا سوتیلا بھائی تھا۔ وہ بھائیوں والی محبت جتا کر سوتیلی بہن کا سب کچھ ہتھیانا چاہتا تھا اور اپنے گروہ کو بھی مالی فائدہ پہنچانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میں نے اس کی یہ حقیقت آشکار کر دی۔ وقت تیزی سے بدلا۔ ماں مر گئی۔ ماجد عرف ماجے کے قتل کا الزام مجھ پر لگا۔ فوزیہ مجھ سے متنفر ہوئی تھی کیونکہ بعد میں راحیلہ نے اسے حقیقت بتلا دی تھی۔ میں لاک اپ ہوا۔ اسی دوران کوئی "چھوٹا خان" نامی اجنبی میری مدد کو آیا۔ اندازہ ہوا کہ یہ گروہ کا کوئی مخالف تھا۔ اس کی مدد سے میں نے کسی طرح قانون سے رہائی پائی۔ باس اقبال، سلیم چھپالیا اور راجو بوری میرے خون کی بو سونگھتے پھر رہے تھے۔ میں راحیلہ اور فوزیہ کو لے کر کراچی سے سیالکوٹ ہجرت کرنے لگا۔ وہاں سدرہ کا کوئی مکان خالی پڑا تھا۔ ادھر سدرہ کو اپنے نام نہاد ماموں سجاد بیگ سے بھی جان کا خطرہ تھا۔ سیٹھ سکندر کے دو وفادار محمود قریشی اور مشتاق بھی تھے۔ ٹرین کراچی سے پنجاب کے لیے روانہ ہوئی اور صادق آباد میں فوزیہ اور راحیلہ سے بچھڑ کر میں بااثر "چودھری جی برادران" کے نرغے میں چلا گیا۔ وہاں بھولے سے میری عجیب حال میں ملاقات ہوئی۔ اس کی منگ سے چودھری شاہ لاجی نے زبردستی شادی کر لی تھی۔ اس کا نام نادو تھا۔ ہم تینوں فرار اختیار کر گئے۔ راستے میں پولیس اور چودھری جی برادران کے حواریوں سے مقابلے میں بھولا مارا گیا۔ نادو میری ذمے داری بن گئی۔ وہ ایک عجیب لڑکی تھی۔ اسے درحقیقت کسی اور سے محبت تھی۔ اس کا نام مختیار تھا۔ وہ بھولے کو بھی بے وقوف بنائے ہوئے تھی۔ مختیار راجن پور میں رہتا تھا۔ فوزیہ اور راحیلہ کو بھی میں نے کسی طرح تلاش کر لیا۔ جوان عورتوں کو اغوا کرنے والے خطرناک گروہ میں فوزیہ جا پھنسی تھی اور بہت کٹھن مراحل سے گزرتے ہوئے میں نے اسے آزاد کرا لیا۔ سیالکوٹ میں ایک ماں بیٹی سے میری شناسائی ہوئی۔ وہ محلے دار تھیں۔ لڑکی نگہت اور ماں شگفتہ خاتون۔ نگہت کسی وسیم نامی لڑکے سے محبت کرتی ہے۔ دونوں فائٹنگ کلب کے ممبر بھی تھے۔ عقدہ کھلا کہ شگفتہ، باس اقبال کی منکوحہ تھی اور

عجمت بیٹی گر شوہری عجز باند زندگی سے تنگ آکر شگفتہ اپنی بیٹی عجمت کے ساتھ کراچی سے سیالکوٹ اپنے ماں باپ والے گھر میں آن بسی تھیں۔ ان کی الگ کہانی تھی۔ فائٹنگ کلب کا ایک ماسٹر عرف استاد جوجی میرا دوست بن جاتا ہے۔ عجمت اب بھی باپ (اقبال) سے ملاقات کرتی ہے۔ سیالکوٹ میں اقبال چوک پر اس کے باپ یعنی باس کا بنگلا ہے۔ وہاں دو چوکیدار اور ملازم ارشد وغیرہ ہیں۔ ایک خفیہ گروہ ''کالی لہر'' سے میرا ٹکراؤ ہوتا ہے۔ یہ جادو ٹونے کرنے والا گروہ ہے۔ عدیل جو کہ چھکو نامی شخص کا بھائی ہے ان کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔ چھکو ایک بڑی سیاسی شخصیت کا آلہ کار ہے۔ وہ میرا دشمن اور بعد میں دوست بن جاتا ہے۔ کالی لہر کے رانگا بابا اور میڈم بھی سے میری دشمنی عروج پر ہے اور ان کے میرے خلاف جادو ٹونے بھی۔ گھر میں یہ سب ان کی ''شعبدہ بازی'' پر محمول کیے ہوئے ہوں۔ میرا محسن باس اقبال بھی ان کی جادوئی ہانڈیوں کی زد میں آ کر اسپتال پہنچ جاتا ہے۔ اس کی بیٹی عجمت میری دشمن بن جاتی ہے جبکہ اس کی ماں شگفتہ خاتون مجھے بھائی سمجھتی ہے۔ اب میری ایک وقت جنگ بازی...... باس اقبال کے نائب سجاد بیگ، چوہدری جی برادران اور کالی لہر والوں کے ساتھ جاری ہے۔ میں رانگا کا پیچھا کرتے ہوئے رانگا بابا کے ٹھکانے پر پہنچ جاتا ہوں اور اسے اٹھا کر قدم باس لے آتا ہوں۔ رانگا نے منتر پڑھنا شروع کر دیے اور اچانک وہاں ہانڈیوں کی بارش ہونے لگی۔ مجھے سر پر کچھ مار کر بے ہوش کر دیا گیا اور جب ہوش آیا تو وہ لوگ باور کرانے لگے کہ میں مر چکا ہوں اور میری روح ان کے قبضے میں ہے۔ عجیب عجیب شعبدہ بازیاں دکھائی گئیں پھر مجھے حالت بے ہوشی میں قبر میں دفنا دیا گیا۔ وہاں بھوتے حملہ کیا اور جب ہی بھی مدد ہوئی اور ایک ماں بیٹی نے مجھے قبر سے نکالا۔ میری حالت دگرگوں تھی۔ پھر میری محسن میرا علاج کرنے لگی۔ ان ماں بیٹی کو گاؤں والوں نے دربدر کر دیا تھا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

میری محسن ماں بیٹی موجودہ حالات میں دلبرداشتہ تھیں۔ گاؤں والوں نے انہیں دربدر کر دیا تھا۔ بقول چنبیلی کے، اصل خرابی کی جڑ نمبردار کا گھرانا تھا۔ اچھے برے ہر جگہ ہوتے ہیں لیکن گاؤں کے عام لوگوں کو تو کم از کم یہ سوچنا چاہیے تھا کہ یہ سب صحیح کر رہے ہیں یا غلط۔ اس کے در پردہ کیا عوامل تھے؟ اس کا بھی ان لوگوں کو یقیناً علم ہوگا مگر طاقتور کے آگے کسے علم حق بلند کرنے کی ہمت تھی؟

کوڑھ کا علاج ممکن تھا۔ وہ پرانا زمانہ تھا کہ مریض کو دھکے دے کر نکال دیا جاتا تھا۔ اب اس کا علاج شافی طریقے سے اور بہ آسانی ممکن تھا۔ یوں وہ بزرگ خاتون جس قدر اسے علم تھا، اپنے مرحوم حکیم باپ کے نادر و نایاب نسخوں کے ذریعے اپنا علاج خود ہی کر رہی تھی۔ اپنی بیٹی چنبیلی کا بھی وہ علاج کر چکی تھی۔ خود بھی اسے بقول انہی کے شفا مل رہی تھی۔

اب اصل مسئلہ صمد یار کی بدفطرتی، اس کی ماں شمیلہ خانم اور اس کے سسر چوہدری فتح خان کی مطلق العنانی تھی لیکن در پردہ جو اصل بات میری سمجھ میں آئی تھی، وہ صمد یار کی بدنیتی اور بدقماشی تھی۔ وہ چنبیلی پر گندی نظر ڈالے ہوئے تھا۔ اس پر جب ماں بیٹی نے صدائے احتجاج بلند کی تو اسے انتقاماً گاؤں سے بے دخلی کی سزا دے دی گئی۔ گویا صمد یار کے لیے راہ کھول دی گئی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ماں اور دادا کو اپنے اوباش فطرت بیٹے اور پوتے کو سمجھانا اور لعن طعن کرنا چاہیے تھا لیکن بجائے اس کے، اس سے چشم پوشی کی گئی، یہ ناانصافی تھی۔

ماں بیٹی اپنا یہ ''دکھ'' مجھ سے چھپانے کی کوشش کر رہی تھیں اور مجھے جلد صحت یاب کر کے یہاں سے چلتا کرنا چاہتی تھیں لیکن یہ معاملہ اب میرے سامنے آشکار ہو چکا تھا۔

مجھ میں کافی دیر تک ایک نامعلوم سے ڈر اور خوف کی فضا چھائی رہی۔ ضعیف خاتون جو میرے لیے دوائیاں بنا رہی تھی، وہ اس نے مجھے کھلا دی تھیں۔ ساتھ ہی ایک تیل بھی بنا کر مجھے مالش کرنے کو دیا تھا جس سے میں اپنے اندر بحال ہوتی طاقت کو محسوس کرنے لگا تھا۔

پوچھنے پر بزرگ خاتون نے ہی مجھے بتایا تھا کہ مجھ پر کسی ایسے سفوف کا چھڑکاؤ کیا گیا تھا جو ناک اور سانس کے ذریعے جسمانی طاقت کو عارضی حد تک مفلوج کر ڈالتا ہے لیکن اس سفوف کا اصل حملہ انسانی اعصاب یعنی سینٹرل نروس سسٹم پر ہوتا تھا۔ زد میں آیا ہوا انسان خالی الذہنی کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہے اور زیادہ دیر اسی حالت میں رہنے کے سبب وہ عمل تنویم کی سی کیفیت کا شکار ہو سکتا ہے۔

مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ میں ''کالی لہر'' والوں کی نظروں میں ان کا سب سے خطرناک دشمن تھا اور میں عملی طور پر ان بدبختوں کی گرفت بلکہ رحم و کرم پر بھی تھا۔ انہیں تو مجھے دیکھتے ہی ختم کر دینا چاہیے تھا لیکن شاید میڈم بھی اور رانگا مجھے اذیت ناک موت سے ہمکنار کر کے اپنی ختم المرادی یا جذبۂ انتقام کی آگ کو اسی بہانے کسی سرد کرنا

چاہتے تھے۔ اس ضمن میں ایک بات اور بھی سمجھ میں آئی تھی کہ کیا خبر وہ مجھے عام طریقے سے ہلاک کرنے سے خوفزدہ ہوں۔ انہیں ڈر ہو کہ کوئی میری کھوج میں ان تک نہ پہنچ جائے۔ اس لیے کہ میں ہی وہ واحد شخصیت تھا جس نے سب سے پہلے ان کا بھانڈا پھوڑا تھا کیونکہ یہ اپنے دشمنوں کی پوری جاسوسی اور معلومات رکھتے تھے اور اس کے بعد اس پر ہاتھ ڈالتے تھے۔

تاہم جو سب سے بڑی وجہ سمجھ میں آئی تھی، وہ بہت آسان اور سادہ سی تھی اور اتنی ہی قابلِ فہم بھی۔ وہ تھی تقدیر...... خدا ایسے فرعونوں کو وہ زعم بھی عطا کر دیتا ہے کہ وہی ان کی تباہی کا سبب بنتا ہے۔ ان کی عقل خبط ہو جاتی ہے۔ انہوں نے بھی سمجھا ہوگا کہ میں اسی طرح نقاہت اور اعصابی وجسمانی کمزوری کی حالت میں ایک زندہ قبر میں بھلا کتنی دیر جی پاؤں گا مگر خدا کی قدرت ہی تھی کہ جس نے مجھے بچایا تھا۔ یوں یہ دونوں ماں بیٹیاں میرے لیے فرشتہ ہی ثابت ہوئی تھیں اور اگر میں ان کے پاس تھا تو یہ بھی خدا کی مصلحت ہی تھی۔

☆☆☆

جانے انجانے خوف اور غم آمیز اداسی کی سی فضا میں دونوں ماں بیٹیاں دن بھر سے شام تک بدستور میری تیمارداری میں مصروف رہتیں۔ میں ان کا جتنا بھی شکریہ ادا کرتا وہ کم ہی ہوتا۔ اپنے گھٹنوں کے علاج معالجے کے باعث ہی میں اپنے اندر اب بھی صرف نصف فیصد ہی طاقت محسوس کر پایا تھا۔ مجھے اس کی فکر لاحق ہوئی تو میں نے پوچھا۔

"اماں اس منحوس بیماری کا اثر مکمل طور پر آخر کب تک زائل ہوگا؟"

خاتون نے جواب دیا۔ "یہ تو شکر کرو کہ تمہارا مرض میں سمجھ چکی ہوں اور اسی کے مطابق میں نے تمہارا فوری علاج بھی شروع کر دیا ہے ورنہ تمہیں اپنی اصل حالت میں آنے کے لیے ہفتے اور کئی ماہ بھی لگ سکتے تھے کیونکہ یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی انسان پر اچانک فالج کا حملہ ہو جائے اور وہ بستر کا ہو کر رہ جاتا ہے۔"

میں اس کی بات سن کر دہل گیا اور اس کا چہرہ تکتا رہا۔ میرے چہرے کی تشویش بھانپنے کے باوجود وہ سنجیدگی سے بولی۔

"فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ تم ٹھیک تو ہو جاؤ گے مگر مکمل طور پر تندرست ہونے میں ابھی تھوڑا وقت لگے گا۔ ویسے میں کوشش کروں گی کہ اللہ کے حکم سے تمہیں جلد شفا عطا ہو جائے۔ میں آج کانٹا جال بچھانے جاؤں گی اور اس سے جنگلی کبوتر شکار کر کے لاؤں گی پھر اس کا گوشت ایک خاص قسم کی جنگلی بوٹی میں پکا کر تمہیں کھلاؤں گی۔ امید تو ہے کہ اس سے ایک دم جادوئی فائدہ ہو جاتا ہے۔ پر وہ بوٹی بہت جنگلی اور دوسرے گاؤں سے ملتی ہے۔ وہ ذرا دور اور سرحد پار ہے۔" وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئی۔

وہ میری شفایابی کے لیے نہ صرف بہت محنت کر رہی تھی بلکہ اپنی جان کا بھی رسک لے رہی تھی۔ پھر متفکرانہ لہجے میں آگے بولی۔

"پر اس بدبخت صمد یار کی طرف سے مجھے بڑی پریشانی لگ گئی ہے۔ میں اگر گئی تو مجھے یہاں میری جوان بیٹی چنبیلی کی فکر رہے گی۔"

میں نے کہا۔ "تم وہ بوٹی رہنے دو۔ میں کبوتروں کا گوشت ہی کھالوں گا۔ سنا تو ہے میں نے بھی کہ کبوتروں کا گوشت فالج زدہ مریضوں کے لیے بہت مفید ہوتا ہے۔ باقی تو تمہارا علاج چل ہی رہا ہے۔"

"نہیں بیٹا! اب تجھے بیٹا کہا ہے تو تیری خاطر سب کچھ کروں گی۔ ہمارا اللہ مالک ہے۔ وہ سب سے زیادہ طاقتور ہے۔" وہ ضعیف خاتون جیسے ایک دم بھرے جوش سے بولی۔ میرا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا۔

اس کی باتوں سے مجھے اپنی ماں یاد آ گئی۔ وہ بھی ایسی ہی جذباتی تھی۔ میری خاطر سب کچھ کر جاتی تھی۔ وہ بھی جو اس کے بس میں بھی نہ ہوتا تھا۔ مائیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ وہ اپنے مقدر کا نوالہ ہی نہیں بلکہ اولاد کی خاطر بڑے سے بڑے خطرے سے بھی دلیرانہ وار ٹکرا جاتی ہیں۔ بے اختیار میری آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ وہ چھپانے کے لیے میں نے نیچے بیٹھے بیٹھے اپنا سر سینے کی طرف جھکا دیا۔

کمرے کی محدود اداس سی فضا میں ایک درد بھری سوگواری بھی گھل گئی۔ ایسے میں اماں نے میرے سر پر اپنا کپکپاتا ہوا ہاتھ رکھا اور پیار سے حوصلہ مند لہجے میں دوبارہ بولی۔

"بیٹا سہراب! تو پریشان نہ ہو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ پتا نہیں کیا بات ہے تو اُدھر ہے تو مجھے چنبیلی کی زیادہ فکر نہیں ہوتی۔ تو جیسا بھی ہے پر ایک مرد تو ہے چنبیلی کے سر پر..... اللہ تجھے جلد شفا دے گا۔ میں وہ جنگلی بوٹی لینے آج ہی ضرور جاؤں گی۔ چنبیلی کا بابو (باپ) بھی وہاں جاتا رہا ہے۔" اس نے مجھے بڑی محبت سے تسلی دی۔

وہ اپنی جڑی بوٹی سے میرا علاج کرتی رہی پھر سر شام وہ جنگل میں چلی گئی۔ کافی دیر بعد تھکی ہاری لوٹی۔ اس نے بتایا کہ وہ جنگلی کبوتروں کو پکڑنے کے لیے کانٹا جال بچھا آئی ہے۔

اس نے مجھے اپنا پروگرام بتایا کہ وہ صبح صادق بیدار ہوکر سب سے پہلے جال میں پھنسے کبوتر لائے گی۔ اس کے بعد وہ مخصوص جنگلی بوٹی لینے کے لیے سرحد پار کے گاؤں آتا گی روانہ ہوجائے گی اور دوپہر تک لوٹے گی۔

رات کو چنبیلی ہی کی مدد سے میں نے کھانا کھایا۔ چنبیلی اب سنجیدہ نظر آرہی تھی مگر اس کے چہرے پر اب بھی کسی ڈر یا خوف کا شائبہ تک نہ تھا۔ اس نے بھی اپنی ماں پر یہی زور دیا تھا کہ وہ میری جلد شفا یابی کے لیے جنگلی بوٹی لے آئے۔

دونوں ماں بیٹی پہلے ہی خود مشکل گھڑیوں میں تھیں مگر میری مدد کے لیے تیار تھیں۔ رات ہوئی اور مجھے ایک گمبھیر سی سوچوں نے گھیر لیا۔ میں مڑھی کے کونے میں دھرے فرشی گرم بستر پر دراز آنکھیں کھولے چھت کو گھور رہا تھا۔ باہر جنگل میں سناٹا طاری تھا۔ سرد ہواؤں کا ہلکا شور سرسراتا محسوس ہوتا۔ دور کہیں قبرستان کی جانب سے کسی آوارہ جانور کے بولنے کی آواز ابھرتی سناٹے میں بھی دھڑکا دینے والا انتشار پھیلا دیتی اور پھر گہرا سکوت طاری ہوجاتا۔

میں آج جو بے بسی اور کم مائیگی محسوس کررہا تھا، وہ پہلے کبھی نہیں کی تھی۔ میں جو ایک کراؤلی جنگ باز مرد تھا، بڑے بڑے سورما دشمنوں کو آج تک خاک چٹاتا رہا، اب خود بے بس خاک پڑا تھا...... بس اس قدر کہ زندہ اور سانس لینے کے سوا کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ ایک ذرا نوالے کے لیے بھی دوسروں کا محتاج ہوکر رہ گیا تھا۔

یہ میری انتہا درجے کی بے بسی نہیں تھی تو اور کیا تھا۔ مجھے فوزیہ اور راحیلہ کی فکر الگ ستا رہی تھی کہ نہ جانے وہ دونوں غریب کن حالوں میں تھیں؟ فوزیہ کے ساتھ اور راحیلہ کا ساتھ کچھ تسلی سی تھی لیکن دونوں جن لوگوں کی گرفت میں تھیں، وہ میرے اب تک کے سب سے خطرناک ترین دشمنوں کا گروہ تھا جنہوں نے مجھے بھی اس حال کو پہنچا دیا تھا۔

''کالی لہر'' والوں کے بارے میں خیال آتے ہی میرے دل و دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ ان کے خلاف شدید نفرت و عداوت کی ایک لہر سی میرے اندر اٹھی لیکن پھر اپنی حالت دیکھتا تو دل مسوس کر رہ جاتا۔ گروہ چہرے والی چڑیل نما عورت میڈم مجھی اور بدہیئت اور صفت ابلیس راکا کے شیطانی قہقہے مجھے اپنی سماعتوں میں سنائی دینے لگتے۔ یوں جیسے وہ میری بے بسی اور کم مائیگی پر ہنس رہے ہوں اور اتراتے ہوں۔ اس میں کوئی شک بھی نہ تھا کہ میں اس رذیل جادو ٹونے والے گروہ کے ہاتھوں عبرت ناک موت سے ہمکنار ہوتے بال بال ہی تو بچا تھا۔

مجھے پیاس محسوس ہوئی۔ حالانکہ سردیوں میں اتنی پیاس نہیں لگتی مگر شاید منہ میں خشکی اس کا سبب تھا۔ پانی کون دیتا؟ چنبیلی اور اس کی ماں دوسرے گوشے میں سو رہی تھیں۔ پانی کا گھڑا رسوئی کے اندر رکھا تھا۔ اگرچہ پانی کا ایک گلاس بھر کر چھوٹی تھالی سے ڈھانپ کر چنبیلی نے میرے سرہانے رکھ بھی دیا تھا مگر وہ میں پہلے ہی ختم کرچکا تھا۔ مڑھی کے وسط میں کوئلوں سے دہکتی ہوئی انگیٹھی رکھی تھی۔ اس کے ساتھ ہی بدھا بانس سے ایک لالٹین بھی جھول رہی تھی۔ اس کی لو سوتے وقت چنبیلی نے دھیمی کردی تھی۔ یوں سلگتی انگیٹھی سے بھی سرخی مائل روشنی ہورہی تھی۔

جیسے لیٹے لیٹے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں کی مٹھیوں کو بھینچنے کی کوشش کی کہاں تو ایک لمحے میں ان مٹھیوں کی گرفت دشمنوں کی گردنیں ناپ لیتی تھیں مگر اب جیسے مجھے انہیں حرکت دینے میں ہی چند سیکنڈ لگ گئے۔ مٹھیاں بھینچ تو لیں مگر ان میں وہ گرفت اور طاقت نہیں تھی۔

میں نے اسی طرح دو تین بار بلکہ کئی بار اپنے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں کھولیں بند کیں۔ اس کے بعد اب جسم کی بحالی ...... ہوئی جتنی بھی طاقت تھی وہ مجتمع کی اور کہنیوں کے سہارے اٹھ بیٹھنے کی کوشش کی۔ ایک ذرا پشت سے بھی دیوار کا سہارا لیا اور چند لمحات کی سعی سے میں دیوار کے سہارے بیٹھ گیا۔

اتنی سی ''مشقت'' سے ہی مجھے اپنا سانس پھولتا محسوس ہونے لگا مگر اس بار میں نے کم ہمتی اور مایوسی کو اپنے اندر گھر نہیں کرنے دیا۔ ایک قوت ارادی سے اپنی یہ کوشش پیہم جاری رکھی۔

گرم لحاف سرکا تو سردی نے آن لیا۔ اگرچہ وسط میں رکھی انگیٹھی سلگ رہی تھی۔ خالی گلاس ہاتھ میں لیا اور کھڑے ہونے کی سعی کرنے لگا۔ پیروں میں جیسے جان ہی نہیں رہی تھی۔ دیوار کے سہارے ہی سہی، کھڑا تو ہو گیا مگر وہ کپکپانے لگیں۔ چکر بھی آنے لگے۔ مایوسیوں کے اندھیاروں نے پھر یلغار بولا مگر میں نے انہیں در آنے ہی نہ دیا اور ایک قدم اٹھایا۔ دیوار کا سہارا چھوڑا۔ میں اپنے دونوں پیروں پر تھا۔ میری سانسیں تیز تیز چلنے لگیں۔ مرتعش وجود کے ساتھ ایک قدم رسوئی کی جانب بڑھایا...... پھر دوسرا اور تیسرا۔ اس کے بعد رسوئی کی چوکھٹ تک میرا ہاتھ پہنچ گیا۔ میں نے فوراً اس کا سہارا لے لیا۔ اندر گیا۔ صراحی رکھی تھی۔ میں نے...... اس میں سے پانی نکالا اور وہیں چوکھٹ کے سہارے بیٹھ کر پیا۔

دوبارہ بستر تک پہنچنے کے لیے میں اپنے اندر رہی سہی

طاقت مجتمع کرتا رہا کہ اچانک میری نظر چولہے کے قریب والی دیوار پر پڑی۔ وہاں وہی خم دار درانتی (ہنسیا) لگی ہوئی تھی۔ نہ جانے میرے دل میں کیا خیال آیا کہ وہ میں نے اسی طرح "مشقت" سے اٹھالی۔ ڈر بھی لگا کہ چکرا کر گر نہ جاؤں اور اپنے ہی ہاتھوں اس تیز دھار درانتی کا شکار ہی نہ ہو جاؤں۔

چند منٹوں کی کوشش کے بعد میں دوبارہ اپنے فرشی بستر پر تھا اور درانتی میرے سرہانے۔

☆☆☆

سرد ٹھٹھرتی ہوئی پہر رات، آبادی سے دور جنگل اور پاس میں قبرستان...... ایسے میں جانے انجانے دشمنوں کی طرف سے وسوسے اور خطرات سے پُر یہ ماحول...... اچھے بھلے انسان کے اعصاب پر نامعلوم خدشات کا بوجھ لاد دینے کے لیے کافی ہوتے ہیں۔ ایسے میں اچانک میرے اندر کوئی استہزائیہ ہنسی ہنسا۔

"کیوں میراب میاں...... درانتی تو اٹھالی مگر تم اسے صرف اٹھا ہی سکتے ہو...... ہا...... ہاہا......"

"خاموش۔" بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ گہرے سکوت میں مجھے اپنی ہی کمزوری کراہ نما آواز سرگوشی سے زیادہ محسوس نہیں ہوئی تھی۔ کیا یہ درست تھا کہ میں درانتی اٹھا ہی سکتا تھا مگر اسے استعمال کرنے سے قاصر تھا۔ میں جو بڑے بڑے بھاری ہتھیاروں کو کھلونے کی طرح اچھالا کرتا تھا، ایک ذرا درانتی پر میری گرفت کپکپا کر رہ گئی تھی۔

میں نے ان مایوس کن اور منفی خیالات کو ذہن سے پھر جھٹک دیا۔ اپنے اندر خود اعتمادی اور قوت ارادی پیدا کی اور دوبارہ لیٹ گیا مگر نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور رہی۔

معاً ہی مجھے ایک ہلکی سی آواز سنائی دی۔ یہ آواز ایسی ہی تھی جیسے مڑھی کے قریب ہی باہر خشک پتوں اور بھربھری مٹی والی زمین پر کوئی دھیرے دھیرے چلا ہو۔ پہلے تو میں نے اسے اپنا وہم سمجھا لیکن دوسری بار بھی آواز دوبارہ ابھری اور یکلخت میرے اعصاب تن گئے۔

اس بار آواز مڑھی کے دروازے کے بالکل قریب ہوتی محسوس ہوئی تھی۔

رات کے پہر ٹھٹھرا دینے والے سناٹے میں مجھے کسی کے خشک پتوں پر چلنے کی یہ آواز نہایت منحوس لگی تھی۔ کچھ اس لیے بھی کہ اگر کوئی اندر آجاتا تو میں کیا کر سکتا تھا؟

میں نے ایک بار پھر ذہن سے مایوسیوں کو جھٹکا اور نظریں دروازے پر ہی جمائے ہوئے...... نہایت دھیرے دھیرے اپنا ایک ہاتھ سرہانے کے نیچے سرکایا۔

وسط میں رکھی کوئلوں کی انگیٹھی میں شعلے دھیمی دھیمی آواز میں چٹخ رہے تھے۔ مڑھی کا محدود ماحول گرم تھا۔ میں نے سر سے لحاف ذرا سا کھسکا لیا تھا۔ درانتی کے چوبی دستے پر میرے ہاتھ کی گرفت کمزور سہی، پڑ چکی تھی اور میں اب یک ٹک اپنی نظریں مڑھی کے داخلی گوشے پر جمائے رہا۔

کسی کے قدموں کی چاپ دروازے کے قریب پہنچ کر ہنوز تھمی رہی۔ میرا دل سینے میں جیسے رک رک کر دھڑکنے لگا۔ مجھے اپنے پورے وجود میں ارتعاش سا محسوس ہونے لگا۔ کہاں تو شکار کو جھپٹنے کے لیے میں پتھر کی طرح ایک دم ساکت ہو جایا کرتا تھا اور پھر شکار دیکھتے ہی اس پر بلا کی پھرتی سے جھپٹ پڑتا تھا۔ اب تو پھرتی کیا، ایک ذرا سی حرکت بھی مجھے بھاری لگ رہی تھی۔ میرے اعصاب کمزور ہو چکے تھے۔ ان مردودوں (کالی لیر) نے میرے دل و دماغ کی ساری توانائی ہی سلب کر لی تھی۔ یہ تو شکر تھا اس ضعیف خاتون اور اس کی بیٹی چنبیلی کا جن کی توجہ اور تیمارداری نے مجھے ایک حد تک صحت یاب کیا تھا مگر اب بھی میں پوری طرح کہاں ٹھیک ہوا تھا۔

قدموں کی چاپ یا آہٹ سے مجھے اس بات کا دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں یہ اس اوباش نوجوان صمد یار اور اس کے حواری تو نہیں تھے جس کی بدطینتی کے بارے میں اس بوڑھی خاتون اور اس کی بیٹی چنبیلی نے مجھے بتا رکھا تھا اور یہ بھی کہ وہ ان کی مڑھی پر دھاوا بولنے کے لیے پر تولے ہوئے تھا۔

معاً ہی ایک ہلکی سی آواز ابھری۔ چوکھٹ پر لگے لکڑی کی کھپچیوں سے بنے دروازے کو شاید کسی نے چھوا تھا یا کھولنے کی کوشش کی تھی۔ میں درانتی پر اپنے ہاتھ کی انگلیوں کو گرم پایا یہ الفاظ دیگر "وارم اپ" کرنے کے لیے حرکت دینے لگا۔ کبھی گرفت ڈھیلی کرتا اور کبھی مضبوط۔

اچانک دروازے کو زور زور سے دھکا دیا جانے لگا۔ میرا دل اب تیز تیز دھڑکنے لگا۔ کوئی مصیبت در آنے کے لیے کوشاں ہو چکی تھی۔ میرا منہ خشک ہونے لگا۔ مجھے اپنی سانسیں بھی تیز تیز چلتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔

لامحالہ میرے تھکے ہوئے ذہن میں یہی ابھرا کہ یہ ضرور صمد یار اور اس کے ساتھی ہی ہو سکتے ہیں جو بقول ضعیف خاتون کے، چنبیلی کو اغوا کرنے کا ناپاک منصوبہ بنائے ہوئے تھے لیکن اگلے ہی لمحے میرا دل دہل سا گیا۔ شاید خطرہ ان سے بھی بڑا تھا کیونکہ اگلے ہی لمحے مجھے باہر کسی حیوانی "غرانے" کی آواز سنائی دی۔ کوئی آوارہ جنگلی جانور تھا یا پھر کوئی شکاری درندہ۔ میں دم سادھے پڑا رہا۔

البتہ لحاف چہرے سے تھوڑا سا سرکا رکھا تھا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ آیا یہ موذی تھا کون؟

دروازے کو باہر سے بدستور دھکیلنے کی کوشش جاری تھی اور اب خرانے کی آواز ہلکی ہلکی غراہٹوں میں بدل گئی تھی۔ تب ہی میرا ماتھا ٹھنکا۔ اندازہ ہوا کہ وہ کوئی معمولی یا چھوٹی جسامت کا جانور نہیں ہوسکتا تھا کیونکہ دروازے کی ساخت بھی کسی مگر شاخوں اور ٹہنیوں کی مدد سے مضبوطی سے چوبی فریم میں بنائی گئی تھیں۔ یہی نہیں، ان کے پیچھے وہ بانس کے لیے ڈنڈے بھی بلیوں میں پھنسا رکھے تھے۔

دروازہ نہ کھلنے کی کوشش اب ایک جھنجھلی سی جدوجہد میں بدل گئی تھی کیونکہ اب ایک طرف درندے کی غراہٹیں تیز ہوتی گئیں اور دوسرے اس کی ''کوشش'' بھی۔ یہاں تک کہ دروازے کا فریم، چوکھٹ پر اس زور زور سے ہلنے لگا جیسے ابھی ٹوٹ کر گر پڑے گا اور درندہ اندر داخل ہوتے ہی سب سے پہلے مجھ پر ہی حملہ کرے گا۔

اس کی خونخوار غراہٹوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کوئی خطرناک شکاری درندے کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ میرے اندر کی پریشان کن تشویش مزید گہری ہوچلی۔ میرے جی میں تو آیا کہ آواز دے کر اس مہربان بوڑھی عورت اور اس کی بیٹی چنبیلی کو جگادوں یا مدد کے لیے پکاروں کیونکہ وہ یہاں ایسے ماحول کی عادی تھیں اور انہیں ایسے حالات سے نمٹنے کا ضرور تجربہ بھی رہا تھا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بے خبری میں سوتے ہوئے وہ بھی اس درندے کا شکار ہوجائیں۔

یہ خیال آتے ہی میں نے اپنے جسم کی رہی سہی طاقت کو گویا حلق میں مجتمع کرتے ہوئے انہیں مدد کے لیے پکارا۔

''اماں...... ! چنبیلی......!'' اپنی ہی آواز پر میں خود ہی دل مسوس کر رہ گیا۔ اب بھی میرے حلق سے صرف اسی قدر آواز نکل پائی تھی جیسے کنوئیں سے آرہی ہو۔

انگیٹھی میں ہنوز سلگتے ہوئے کوئلوں کے چٹخنے کی آواز آرہی تھی۔ ادھر موذی نے اگلی چند ہی ساعتوں میں کچا سا دروازہ توڑ ڈالا اور اندر گھس آیا۔ ذرا سے سرکے ہوئے لحاف سے جب میں نے اسے دیکھا تو میرا خون خشک ہوگیا۔ وہ سیاہ دھبوں والا کوئی برفانی تیندوا تھا۔

☆☆☆

میں نے تو جیسے اپنی سانسیں تک روک لیں۔ یہی نہیں، اپنی بے بسی اور ناتوانی کو دیکھتے ہوئے خوف کے ایک فطری احساس کے ردعمل پر لحاف بھی منہ پر لے لیا۔ گویا خطرے کو دیکھ کر جیسے کبوتر آنکھیں بند کرلے لیکن

دوسرے ہی لمحے میں نے لحاف پھر تھوڑا سا چہرے سے کھسکا دیا۔ برفانی تیندوا اب ہلکی ہلکی خرانے دار غراہٹیں خارج کرتا اور ادھر ادھر سرگشت کرتا ہوا میری جانب گھوما تو جیسے میری رگوں میں خون جمنے لگا۔

اسے شاید انسانی خون کی بو آگئی تھی۔ سنا تھا کہ درندے بھوک کے وقت انسان کے گوشت سے بھی شکم سیری کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے اور شاید اسی لیے بعد میں ''آدم خوری'' پر اتر آتے ہیں۔ تیندوا آج شاید مجھ سے ہی اس کی ابتدا کرنے والا تھا۔

مڑھی میں یکلخت تھرادینے والی موت کی فضا طاری ہوگئی۔ لحاف کے سرکے ہوئے کونے سے میں تیندوے کو دیکھ رہا تھا اور وہ مجھے...... ایسا لگا جیسے وہ لحاف کے اندر سے میرا اڑا سا چہرہ تک دیکھ رہا ہو۔ دراتی پر میری چاروناچار گرفت تو تھی مگر سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ میں اس سے کیا کرسکتا تھا؟

اچانک تیندوا میری جانب متوجہ ہوگیا اور دھیرے دھیرے میری جانب بڑھنے لگا۔ مجھے اب اپنی بھیانک موت صاف نظر آرہی تھی۔ کسی خونخوار درندے کے نرغے میں چیر پھاڑ کر کھائے جانے کا خوف اور عذاب کیا ہوتا ہے، اس کے تصور سے ہی جیسے میری گھگی بندھ گئی۔

جلد ہی میں نے اپنے خوف پر قابو پایا اور سوچا کہ جسم کی طاقت نہ رہی تو کیا ہوا میرا دماغ تو اسی طرح کام کررہا تھا۔ یہ خیال آتے ہی اچانک میرے اندر ایک جھماکا ہوا۔ تیندوا کسی شاطر شکاری کی طرح اب دبے پاؤں میرے قریب آرہا تھا۔ یقینی طور پر اسے میری ''بو'' آچکی تھی۔

یکلخت میرے ذہن میں جس خیال کا اچانک جھماکا ہوا تھا۔ میں نے اس پر فوراً سے پیشتر عمل کر ڈالنے کا فیصلہ کرلیا لیکن میرے بس میں ایسی پھرتی کہاں تھی کہ میں اس پر فوری عمل کرتا۔ تاہم مجھے اندازہ تو تھا کہ درندے خواہ کیسے ہی ہوں، مرے ہوئے یا کسی ساکت شے پر حملہ نہیں کرتے۔

...... ساکت رہنے کے سوا میرے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔

مڑھی کے فرش پر دھیرے دھیرے پنجے رکھتا ہوا تیندوا میرے اب بالکل قریب آچکا تھا۔ اس قدر قریب کہ اس کے خونخوار دہانے سے اٹھنے والی سانسیں بھی سنائی دینے لگیں۔ وہ میرے بالکل قریب آگیا اور میں دم سادھے لیٹا جیسے اپنی موت کا انتظار کرتا رہا۔

اس نے ادھر ادھر تھوتھنا تھما کر مجھے سونگھا اور پھر پلٹ گیا۔ میرے اندر مسرت کی لہر اٹھی لیکن اگلے ہی لمحے

میں ڈھل گیا۔ تیندوے کا رخ اس گوشے کی طرف تھا جدھر میری وہ دونوں محسن ماں بیٹی محوِ خواب تھیں۔ مجھے خود سے زیادہ اپنی محسنوں کی فکر ہوئی۔ تیندوے کا رخ دوسری جانب ہوتے ہی میں نے مقدور بھر طاقت سے ہی سہی، دھیرے سے خود کو سلگتی ہوئی انگیٹھی کی جانب کھسکایا اور اس قدر تو میں کر ہی سکتا تھا لیکن جیسے ہی میں انگیٹھی کے قریب پہنچا، درندے کو اپنے پیچھے کسی آہٹ کا فوراً ہی احساس ہو گیا اور وہ دوسرے گوشے کی طرف جاتا ہوا یکدم رکا اور پیچھے یعنی میری جانب گردن موڑ کر دیکھنے لگا۔

کچھ دیر پہلے بے حس و حرکت "شے" کو اچانک اپنی جگہ بدلتے دیکھ کر اس کے حلق سے ہلکی سی غراہٹ خارج ہوئی اور وہ تیزی سے میری جانب دوبارہ گھوم گیا اور میری طرف آنے لگا لیکن میں جب تک اپنی سوچی سمجھی اسکیم پر عمل کر چکا تھا۔

میں نے سلگتی ہوئی انگیٹھی کو کسی طرح ہلکی ٹھوکر مار کر گرا دیا۔ اس کے اندر سے سلگتے ہوئے شعلے فرش پر بکھر گئے۔ یہی نہیں میں نے ان پر لحاف کا ایک حصہ بھی رکھ دیا جس کے سبب اس سے آگ اور دھواں اٹھنے لگا۔ تیندوا غراتا ہوا جس تیزی سے میری جانب بڑھا تھا، اسی تیزی سے وہ رک گیا۔ شکر تھا کہ کوئلے سلگ رہے تھے۔ لحاف کے ایک کونے کو بھی انہوں نے سلگا دیا تھا۔ کوٹھڑی میں دھواں بھرنے لگا۔ درندہ خواہ کوئی بھی ہو وہ آگ اور دھوئیں سے گھبرا جاتا ہے۔ اتنا مجھے بھی اندازہ تھا۔ وہی ہوا۔ تیندوا مجھے تر نوالہ سمجھتے ہوئے میری جانب پیش قدمی کرنے کے بعد رک گیا تھا۔

اب میرے اور اس کے درمیان سلگتے ہوئے کوئلے، جلتا ہوا لحاف اور دھواں تھا۔ آگ بھی اس سے بلند ہونے لگی۔ اس موذی خطرے سے نمٹتے ہوئے مجھے یہ بھی ڈر ہوا کہ کہیں اس گھاس پھوس اور سرکنڈوں کی کوٹھڑی میں آگ ہی نہ بھڑک اٹھے۔

وہی ہوا۔ آگ لحاف کو نگلے جا رہی تھی۔ تپش میں اضافہ ہو چلا تھا۔ میری کوشش تھی کہ لحاف ایک حد تک جلے اور خود بھی محفوظ رہوں۔ ایک خدشہ مجھے اس بات کا بھی تھا کہ کہیں وہ بوڑھی خاتون اور اس کی بیٹی چنبیلی نہ جاگ پڑیں اور ادھر آ نکلیں۔ تیندوا یقیناً انہیں ہڑپ کر سکتا تھا۔ لہٰذا میں نے اپنی سی کچھ اور جسارت کی اور جلتے ہوئے لحاف کو لپیٹے ہی کسی طرح تیندوے کی طرف سرکانے لگا۔ وہ ہولے ہولے غراتا ہوا پیچھے ہٹنے لگا۔ یہاں تک کہ وہ پلٹ کر ٹوٹے ہوئے دروازے سے باہر تاریکی میں نکل گیا۔

کوٹھڑی میں دھواں بھرنے لگا اور مجھے ماں بیٹی کے کھانسنے کی آوازیں آنے لگیں۔ ساتھ ہی وہ دونوں جاگ کر میری طرف آ گئیں اور یہاں کا نظارہ دیکھتے ہی چیخ ماری۔ انہیں کیا معلوم ہو سکتا تھا کہ ہم کتنی بڑی مصیبت سے بال بال بچے تھے۔ وہ یہی سمجھ رہی تھیں کہ حادثاتی طور پر آگ بھڑک اٹھی ہے۔ دونوں نے غیر معمولی پھرتی سے آگ بجھائی اور پانی ڈالا مگر کوٹھڑی میں دھواں بھر چکا تھا۔ ہم سب پر ہی کھانسی کا دورہ پڑا۔

کافی دیر بعد ماحول بہتر ہوا۔ ماں بیٹی نے میری خیریت دریافت کی اور میں نے انہیں ساری بات بتا دی جسے سن کر وہ دونوں بھی چند لمحے کے لیے مارے خوف کے تھرا اٹھی تھیں پھر ان دونوں نے مجھے سہارا دے کر دوسرے گوشے میں پہنچایا جہاں تھوڑی دیر پہلے وہ بے خبر سو رہی تھیں۔ اس کے بعد وہ دونوں لوٹ گئیں اور کافی دیر تک صفائی ستھرائی کرتی رہیں۔ تھوڑی دیر بعد کوٹھڑی سے دھواں چھٹ گیا تو فضا پُرسکون ہوئی۔

دروازہ بھی کسی حد تک درست کر لیا گیا تھا۔ انگیٹھی بجھ چکی تھی لیکن دروازہ ٹوٹنے کے سبب باہر کی سرد اور برفیلی ہوائیں اندر در آئیں اور ماحول میں برف جیسی ٹھنڈ بڑھ گئی تھی۔ خشک لکڑیوں کا ٹھیکرا کونے میں کہیں موجود تھا، وہ کام آ گئے۔ پھر تھوڑی تگ و دو کے بعد انگیٹھی دہکا دی گئی۔ کوٹھڑی کی فضا گرم ہوئی اور کچھ سکون میسر ہوا۔ اس ساری کشاکش میں صبح ہو گئی اور دونوں ماں بیٹی بے چاری ناشتے کی تیاری میں مصروف ہو گئیں۔

"تمہاری وجہ سے کل رات تو میری اور اماں کی جان بچ گئی ورنہ تو اس وقت ہم سب اس تیندوے کے پیٹ میں ہوتے۔" چنبیلی ہلکی سی پرشوخ مسکراہٹ سے بولی۔ وہ میرے لیے ناشتہ لے آئی تھی۔ اس بار میں اس کے سہارے کے بغیر ہی فرشی بستر سے اٹھ کر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا تھا۔

"کیا اس سے پہلے بھی ایسا واقعہ یہاں نہیں ہوا؟" میں نے پوچھا اور ساتھ ہی ناشتہ کرنے لگا۔

"کبھی نہیں، لیکن دوسرے چھوٹے موٹے خونخوار جانوروں سے باہر سامنا ہوتا رہا ہے۔" چنبیلی نے جواب میں کہا۔ "اللہ نے ہی تمہیں بچایا ہے ورنہ تو جس حالت میں تم تھے، ایسے میں تیندوے جیسے خونی درندے سے بچنا تمہارے لیے ناممکن ہی تھا۔"

"ہاں، تم ٹھیک کہتی ہو۔ اللہ نے ہی بچایا ہے ورنہ تو گیا تھا۔"

"اور ہم بھی۔"

"اللہ سے خیر کی دعا مانگو، بچو!" اچانک اماں اندر آ گئی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں چھاچھ اور ایک برتن تھا۔ وہ شاید اپنا اور چنبیلی کا ناشتا بھی ادھر ہی لے آئی تھی۔ ہم سب ایک ساتھ وہیں بیٹھ کر ناشتا کرنے لگے۔

"یہ درندہ دوبارہ بھی یہاں کا رخ کر سکتا ہے۔" میں نے کسی خیال کے تحت کہا۔ "اسے یہاں انسانی خون کی بو لگ چکی ہے۔"

"فکر کی بات نہیں۔ میں آج ہی اس کا بندوبست کر دوں گی۔" اماں بولی۔

"اماں! آپ کیا بندوبست کریں گی؟" میں نے قدرے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

"وہی جو سرحدی جنگلی دیہات کے لوگ خونخوار جانوروں کے اچانک حملے کے ڈر سے کرتے ہیں۔" اماں نے بے پروائی سے کہا تو چنبیلی ہنسی پھر ایک نگاہ اپنی ماں پر ڈالتے ہوئے مجھ سے بولی۔

"مجھے معلوم ہے۔ اماں ہر روز شام میں دو عدد ہنڈولے بال (جلا) کر جھگی کے باہر لٹکا دے گی اور بھلا کیا کرے گی۔"

"ہاں، آگ کو دیکھ کر جانور گھر کے قریب نہیں آتے اور واپس مڑ جاتے ہیں۔" اماں نے بھی اضافہ کیا۔

اچانک باہر کہیں شور کی آواز ابھری۔ ہم تینوں بری طرح چونک گئے۔ دونوں ماں بیٹی دیکھنے کے لیے اٹھ کر باہر کو دوڑیں۔ میں بھی پریشان سا ہو گیا۔ میں نے دیوار سے ہی اپنی پشت لگائے ہوئے سہارا لیا اور اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا۔ اس کے بعد بغیر سہارا لیے ایک قدم آگے بڑھایا، پھر دوسرا...... اس کوشش سے مجھے ایک خوشگوار سی حیرت ہوئی۔

میں بغیر سہارے کے تھوڑا ہی سہی، چل پا رہا تھا۔ میں نے اپنی یہ کوشش جاری رکھی اور جھگی کے اندرونی گوشے سے نکل کر بیرونی گوشے اور پھر دروازے تک بھی جا پہنچا۔ اس بار میں نے محسوس کیا کہ میرا سانس کم پھولا تھا۔ کچھ توانائی بھی محسوس کی تھی ورنہ تو سہارے سے اتنا ہی چل کر میری سانسیں چڑھ جاتی تھیں۔ میں اسی طرح خود کو "وارم اپ" بھی کرتا رہا۔

بہرکیف، چوکھٹ کا سہارا لے کر باہر دیکھا تو میرا چہرہ متغیر ہو گیا۔ وہاں کچھ لوگ کھڑے تھے۔ وہ زور زور سے ناراضگی اور جھگڑے کے انداز میں ماں بیٹی سے باتیں کر رہے تھے۔ ماں بیٹی بھی اپنے دفاع میں جواب دے رہی تھیں۔

نہ جانے کیا معاملہ تھا۔ میری سمجھ میں تو نہ آیا البتہ غصہ ضرور آ رہا تھا کہ آخر ان غریب ماں بیٹی نے ان کا کیا بگاڑا تھا؟ یہ مجھے گاؤں والے ہی لگ رہے تھے جو انہیں بے دخل کرنے کے بعد بھی چین سے نہیں بیٹھے تھے۔ ان میں مجھے ایک تنومند نوجوان بھی نظر آیا۔ وہ بڑھ چڑھ کر بول رہا تھا۔ باقی لوگ بھی اس کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے۔

ان میں مرد، بوڑھے اور کچھ عورتیں بھی تھیں جو ہاتھ نچا نچا کر دونوں ماں بیٹی کے خوب لتے لینے میں لگی ہوئی تھیں۔ تنومند نوجوان ایک سفید گھوڑے پر سوار تھا۔ باقی لوگ پیدل تھے۔ تاہم گدھا ریڑھے کھڑے تھے۔ وہ اس میں سوار ہو کر شاید یہاں پہنچے تھے۔ نوجوان گھڑسوار کے ہمراہ تین چار افراد اور بھی گھوڑوں پر سوار تھے۔ ان کے کاندھوں پر رائفلیں بھی جھول رہی تھیں۔ تب ہی ان میں سے ایک کی نظر مجھ پر پڑی اور ایک نے چلا کر میری جانب اشارہ کیا۔

چند لوگوں کے مجمعے نے میری جانب دیکھا پھر پہلے گھڑسوار اور اس کے بعد باقی لوگ بھی مجمعے سے بڑبڑاتے ہوئے میری جانب آنے لگے۔ میں چوکھٹ کا سہارا لیے کھڑا تھا۔ انہیں اپنی جانب اس طرح بڑھتے ہوئے آتا دیکھ کر میں پریشان بھی ہوا اور وجہ پریشانی فقط میری معذوری تھی۔ یہ لوگ تھوڑی دیر میں میرے قریب آ گئے۔ دوسرے بھی پیدل ہی ان کے پیچھے چلتے ہوئے قریب آنے لگے۔

"اوئے تو کون ہے؟" اس مغرور اور تنومند گھڑسوار نوجوان نے میری طرف انتہائی نخوت سے گھورتے ہوئے کہا۔ اس کے لب و لہجے سے مجھے رعونت اور نخوت صاف محسوس ہو رہا تھا۔ شاید یہی نوجوان ان سب لوگوں کو ان ماں بیٹی کے خلاف بھڑکا کر یہاں تک لایا تھا۔ تاہم مجھے اندازہ ہو چلا تھا کہ یہ صرف یہی ہو سکتا تھا۔

میرا جی چاہا کہ اس مغرور اور اوباش نوجوان کو پورے جی جان کے ساتھ دھاڑ کر لتاڑ دوں مگر میرے اندر اتنی سکت کہاں تھی۔ میں نے بہ مشکل اس سے کہا۔

"میں...... ایک مسافر ہوں۔"

"مسافر...... ہونہہ۔" نوجوان حقارت آمیز طنز سے بولا۔ "تمہاری حالت دیکھ کر تو لگ رہا ہے کہ تم سرحد پار سے بھاگے ہوئے جاسوس ہو۔ پناہ لینے کے لیے یہاں آ گئے ہو۔" اس مردود کی بات پر میں اندر سے دہل گیا۔ یہ مجھ پر

سرحد پار جاسوس کا الزام لگا رہا تھا۔ یہ بہت خطرناک بات ہو سکتی تھی۔ میرے لیے بھی اور ان دونوں بے چاری ماں بیٹی کے لیے بھی۔

''یہ غلط ہے۔ میں مسافر ہی ہوں اور...... مجھے میرے دشمنوں نے اس حال کو پہنچایا ہے۔ معاملہ کیا ہے، تم لوگ ادھر کیوں آئے ہو؟''

''معاملے کے ماموں...... ابھی تجھے بتاتے ہیں۔'' حسبِ توقع صمد یار نے طیش سے دانت پیستے ہوئے کہا اور گھوڑے سے اتر آیا۔ مجھے اس کی آنکھوں سے فتنے جھانکتے ہوئے محسوس ہوئے۔ اس کے ساتھی بھی اتر آئے۔ تب تک گاؤں کے وہ لوگ بھی قریب آ گئے جو اس کے ساتھ تھے۔

''یہ دیکھو لو تم سب۔ ان ماں بیٹی نے یہاں ایک جاسوس کو پناہ دے رکھی ہے۔'' صمد یار نے فتنہ جگانے کے انداز میں لوگوں سے کہا۔ وہ سب حیران اور غصہ بھری نظروں سے میری جانب دیکھنے لگے۔

اماں اور چنبیلی اس نئی صورتِ حال سے پریشان اور ہراساں نظر آئے لیکن پھر چنبیلی نے ہی ہمت کر کے میرے بارے میں انہیں بتایا کہ میں ایک مسافر ہوں، جاسوس نہیں اور میرے دشمنوں نے ہی مجھے اس حال کو پہنچایا ہے جبکہ وہ میرا علاج کر رہی تھیں۔

''ہاں، لوگو! یہ بات سچ ہے۔ کبھی تم ہم پر درندہ پالنے کا الزام لگاتے ہو اور کبھی جاسوس۔ ہمیں گاؤں سے بے دخل کرنے کے بعد بھی تمہیں چین نہیں ملا۔ ہم خود یہاں اس درندے سے مرتے مرتے بچے تھے۔ خدا کا خوف کرو۔ اب تو ہم غریبوں کی جان چھوڑ دو۔''

اماں نے ہاتھ جوڑ کر روتے ہوئے ان سے کہا۔ میرا دل بھر آیا۔ طیش آمیز ابال، دکھ اور بے بسی کی ان ملی جلی کیفیات نے میرے اندر ایک ہلچل سی مچا دی تھی۔

''وہ تیندوا تمہارا ہی پالا ہوا تھا۔'' صمد یار نے بوڑھی خاتون کی طرف دیکھ کر برہمی سے کہا۔ ''جمعہ بھائی کے علاوہ اور لوگوں نے اس درندے کو ادھر ہی سے آتے دیکھا تھا، جس کے گھر پر حملہ کر کے وہ اس کی بیوی کو ہلاک کر کے بھاگ کھڑا ہوا۔''

''یہ جھوٹ ہے۔'' چنبیلی چلائی۔

''کیسے جھوٹ ہے؟'' ایک عمر رسیدہ عورت ہاتھ نچاتی ہوئی ایک قدم آگے بڑھ کر بولی۔ ''اس درندے نے تمہیں کیسے زندہ چھوڑ دیا؟''

''اس نے ہماری جھونپڑی پر حملہ کیا تھا۔'' اماں نے صفائی پیش کرنا چاہی۔ ''مگر ہم نے اسے مار بھگایا تھا۔''

''اچھا!'' ایک آدمی نے طنزیہ مسکراہٹ سے کہا۔ ''مار بھگایا تھا یا اپنے پالتو کو آبادی کا راستہ دکھا دیا تھا تاکہ تم ہم سے اپنی بے دخلی کا انتقام لے سکو۔''

''یہ جھوٹ ہے۔'' چنبیلی پھر چیخ کر بولی۔ ''سرحد پار سے پہلے بھی گاؤں میں شکاری درندے آتے اور حملہ آور ہوتے رہے ہیں۔ کیا تم نہیں جانتے؟''

''بس بس...... فیصلہ ہو گیا۔'' صمد یار نے ہاتھ کھڑا کر کے کہا اور لوگوں کی طرف منہ کر کے اعلانیہ بولا۔ ''تم سب نے دیکھ لیا کہ یہاں ان ماں بیٹی نے ایک خونی درندہ ہی نہیں بلکہ ایک جاسوس بھی پال رکھا ہے۔ سب سے پہلے اس جاسوس کو سرحدی پولیس کے حوالے کرنا ہوگا۔ اس کے بعد دونوں ماں بیٹی کو بھی جیل جانا ہوگا کیونکہ انہوں نے ایک سرحد پار ملک کے جاسوس کو پناہ دینے کا خطرناک جرم کیا ہے۔''

''چھوٹے سرکار! آپ کی بات بالکل ٹھیک ہے۔ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ آپ جو فیصلہ کریں۔''

لوگوں نے ہم آواز ہو کر کہا۔ ''چھوٹے سرکار'' کا سن کر اس بات کی تصدیق ہو چکی تھی کہ یہ صمد یار ہی تھا۔ باقی معاملہ بھی میری سمجھ میں آ چکا تھا۔

وہ تیندوا یقیناً یہاں سے بھاگ کر آبادی کی جانب گیا تھا اور کسی کے گھر پر حملہ کر دیا تھا۔ اب صمد یار نے اپنی دشمنی نکالنے کے لیے ان ماں بیٹی پر الزام لگا دیا تھا۔

''ٹھیک ہے۔ تم سب لوگ اپنے اپنے گھر لوٹ جاؤ۔'' صمد یار نے مکاری سے کہا۔ ''اور کسی بات کی فکر نہ کرو۔ ہم اس درندے کو بھی ڈھونڈ کر ہلاک کر دیں گے اور انہیں بھی دیکھ لیتے ہیں...... جاؤ۔''

سب واپس لوٹنے لگے۔ میں نے دیکھا صمد یار اب چنبیلی کو بڑی گرسنہ اور طنزیہ نظروں سے گھور رہا تھا پھر اس نے ایک حقارت بھری نگاہ مجھ پر ڈالی اور دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہوا میرے بالکل قریب آ گیا۔ وہ مجھے اوپر سے نیچے تک بڑی تحقیر آمیز نظروں سے گھورتا رہا پھر اپنی رائفل کی نال سے مجھے ٹھوکا دیا۔ میں گرتے گرتے بچا۔ وہ ٹھٹھا مار کر ہنسا۔

''اوئے، تیرا تو تیل پانی ہی ختم لگتا ہے۔ سچ سچ بتا کون ہے تو اور پڑوسی ملک سے کون سے مشن پر یہاں آیا تھا؟''

اپنی اس بے توقیری اور لاچاری پر میں خود اندر سے شکست و ریخت کا شکار ہونے لگا۔ میں جو جنگ باز فطرت تھا،

مدمقابل کے لیے ہر بار ہی لوہے کا چنا ثابت ہوتا رہا تھا مگر آج میری یہ حالت تھی کہ میں ایک ذرا ٹھوکے سے ڈھے جاتا۔ صمد یار میرے سامنے کیا حیثیت رکھتا تھا یا اس کے مسلح ساتھی...... میں نے اپنے اندر کی شکست وریخت اور ٹوٹ پھوٹ پر قابو پایا اور اس سے بڑے تحمل سے مخاطب ہو کر بولا۔

''تم مجھ پر ایک غلط الزام لگا رہے ہو۔ میں مسلمان ہوں اور اپنے وطن کا وفادار ہوں۔ اپنے دشمنوں کا گھیرا توڑ کر میں پناہ لینے یہاں اتفاق ہی سے آیا تھا۔ ٹھیک ہے، اگر تم بضد ہو تو سرحدی پولیس یا رینجرز کو میرے بارے میں بتا دو۔ یہ تو اور اچھا ہوگا۔ اس طرح ان دونوں ماں بیٹی کو بھی جو شکایات ہوں گی، وہ بھی کھل کر بیان کر لی جائیں گی۔''

میرے پُراعتماد لہجے اور دلائل نے صمد یار کو اندر سے جھنجھوڑ دیا تھا کیونکہ میں اب تک اس کے بارے میں ان ماں بیٹی کی زبانی جان چکا تھا کہ یہ چاہتا کیا تھا۔ وہ جھلا کر بولا۔

''اپنی بکواس بند کرو۔'' پھر اس نے اپنے ایک ساتھی کے قریب ہو کر کچھ کہا۔ اس کے بعد اس نے چنبیلی کو ایک نظر گھور کر دیکھا۔ یوں جیسے دھتکار رہا ہو پھر وہ اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ آبادی کی طرف لوٹ گیا۔ اس کے دو مسلح ساتھی ادھر ہی موجود رہے۔ ان دونوں کو وہ یہاں شاید پہرے پر رکھ گیا تھا۔

میں نے اماں اور چنبیلی کو اندر آنے کا اشارہ دیا اور خود بھی پلٹا۔ چنبیلی نے بڑھ کر بڑی محبت اور اپنائیت سے مجھے سہارا دیا۔ ہم تینوں دروازہ بند کر کے اندر آ گئے۔

''تم نے اس رذیل کو بڑا اچھا جواب دیا۔ اس کا منہ ہی بند کر دیا۔'' چنبیلی خوش ہو کر اور توصیفی لہجے میں مجھ سے بولی۔

اماں فکرمند نظر آ رہی تھی۔ وہ میرے دوا دارو میں لگ گئی۔ اس نے میری جلد صحت یابی کے لیے جو بوٹی سرحد پار کے جنگل سے لاتی تھی، اس کا نام اس نے ''بھاگی بوٹی'' بتایا تھا۔ کبوتروں کا گوشت کھلانے کے لیے وہ پہلے ہی کا جال بچھا چکی تھی۔ اب جبکہ صمد یار پہرے کے لیے اپنے دو ساتھی یہاں چھوڑ گیا تھا، ایسے میں اماں فکرمند تھی کہ وہ کس طرح باہر جائے۔ جبکہ اس نے ہمیں تسلی دی۔ میں نے اسے جانے سے منع بھی کیا مگر وہ نہ مانی۔ اسی وقت بارش شروع ہو گئی۔ سردی بھی غضب کی پڑنے لگی۔ دونوں پہریدار غائب ہو گئے۔

بارش ایک گھنٹے تک مسلسل ہوتی رہی۔ سہ پہر سے شام ہو گئی۔ اماں نے تیاری پکڑی۔ میں اور چنبیلی حیران نظروں سے اماں کو تیار ہوتے تکتے رہے۔ اس نے موٹی چادر کی بکل ماری، ایک ڈنڈا پکڑا جس کا سرا چھیل کر اس نے اسے نیزہ سا بنا رکھا تھا۔ ایک پوٹلی سنبھالی اور بولی۔

''میں جا رہی ہوں۔ تم دونوں میری کامیاب واپسی کی اللہ سے دعا کرتے رہنا۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''لیکن اماں! میں تجھے نہیں جانے دوں گا۔'' میں نے بے چین ہو کر کہا۔ ''تو محض میری خاطر ایسے موسم اور ایسے وقت میں سرحد پار جانے کا خطرہ کیوں مول لے رہی ہے۔ میں جیسا بھی ہوں، ٹھیک ہو جاؤں گا۔ تو نے ہی تو کہا تھا کہ یہ سب عارضی ہے اور گزرتے وقت کے ساتھ میری معذوری خود ہی دور ہو جائے گی۔''

''میں نے ٹھیک ہی کہا تھا۔'' اماں ممتا بھری مسکراہٹ سے بولی۔ ''لیکن اس میں بہت وقت لگ جائے گا۔ جبکہ اس بھاگی بوٹی کے استعمال کرتے ہی دیکھنا تو ایک دم پہلے جیسا شیر بن جائے گا۔ یہی نہیں، یہ بوٹی تجھے......'' وہ اتنا کہتے ہوئے اچانک رک گئی۔

مجھے لگا جیسے وہ اس جادوئی بھاگی بوٹی کے بارے میں اور بھی کچھ بتانے والی تھی لیکن نہ جانے کیوں چپ ہو گئی پھر چند ثانئے دوسری جانب دیکھتے ہوئے عجیب سے لہجے میں دوبارہ مجھے مخاطب کر کے بولی۔

''سہراب بیٹے! میری بوڑھی مگر تجربے کار آنکھوں نے تیرے اندر چھپا ہوا ایک شیر دیکھ لیا ہے۔ تیرے سینے میں بے طوفان چھپے کروٹیں لے رہے ہیں، مجھے اس کا بھی اندازہ ہو چکا ہے۔'' پھر اس نے میری آنکھوں میں اپنی آنکھیں گاڑ دیں اور بولی۔

''میں نہیں جانتی کہ تیرے دشمن کون ہیں اور کیا ہیں لیکن میں تیری آنکھوں میں سلگتی ہوئی وہ تپش صاف دیکھ رہی ہوں جسے سرد کرنے کے لیے تو کس قدر بے چین ہے۔ بھروسا رکھ اس ماں پر، سہراب بیٹا! اور مجھے دعائیں دے کر اس ہستی کے سپرد کرو جو نیک مقاصد اور نیک نیتی کے ساتھ کسی کام کو کرنے نکلتا ہے تو اس عظیم ہستی کی مدد ساتھ ہوتی ہے۔''

میں اماں کا آج ایسا روپ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ مجھے تو جیسے ایک چپ سی لگ گئی۔ چنبیلی بھی خاموش تھی۔ اس کے بعد اماں رخصت ہو گئی۔ میں اور چنبیلی مڑھی میں اکیلے رہ گئے۔ ہم نے اماں کو بالآخر اللہ کے سپرد کر دیا۔ وقت بیتا جا رہا تھا۔ سرِشام ہی رات کا گمان ہونے لگا۔ چنبیلی خاموشی سے رات کا کھانا بنانے لگی۔ میں فرشی بستر پر دیوار سے

پشت لگائے بیٹھا رہا۔

بہت عجیب اور غیر یقینی کا عالم تھا۔ ہر لمحہ دل دھڑکا دینے والا تھا۔ انجانے خوف کے یہ اذیت ناک لمحے بہت مصلوب کر رہے تھے۔ دل کو کسی بھی وقت کچھ بھی ہوجانے کا ایک دھڑکا سا لگا ہوا تھا۔ چنبیلی نے سبزی اور انڈے کا خاگینہ بنایا تھا۔ مجھے بھوک تو نہ تھی مگر چنبیلی نے بڑی محبت سے کھانا بنایا تھا۔ میں نہ کھاتا تو یہ اس کے خلوص کی ناقدری ہوتی۔ لہٰذا ہم دونوں نے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ اس کے بعد چنبیلی نے قہوہ بنایا۔ بہت خوش ذائقہ تھا۔ اس نے انگیٹھی بھی گرم کرکے رکھ دی۔

اس کے بعد چنبیلی بھی وہیں بیٹھ گئی۔ لالٹین اور ایک مخصوص طرز کا ہاتھ کا بنایا ہوا چراغ بھی اس نے جلا دیا تھا۔ ہم دونوں کے سائے اس کی روشنی میں دیوار پر لرزنے لگے۔

"میراب! تم کون ہو؟" معاً چنبیلی نے اپنی ٹھوڑی لحاف میں سکیڑ کر گھٹنے پر رکھتے ہوئے مجھ سے ہولے سے پوچھا۔ اس کا انداز مجھے بڑا پراسرار سا لگا۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی کشادہ و حسین آنکھوں میں ہزاروں بھید لرزاں تھے۔

میں مسکرا دیا۔ "تمہیں میں کیا لگتا ہوں؟ سرحد پار کا کوئی جاسوس؟"

میری بات پر وہ ہنس دی۔ "نہیں، میرا ایسا خیال نہیں۔" پھر ایک ہنکاری سی بھر کر دوبارہ بولی۔ "پتا نہیں کیوں تم مجھے ایک بہت گہرے آدمی لگتے ہو یا کوئی خاص آدمی۔"

"مثلاً؟" میں نے بدستور مسکرا کر پوچھا۔

"میں کیا جانوں؟ تم ہی بتاؤ نا اپنے بارے میں۔" وہ مصنوعی رکھائی سے بولی۔

"کیا کروگی جان کر؟"

"پھر بھی۔" اس کی گھنیری پلکوں تلے آنکھوں میں دل کشید کردینے والی حیرت کسی دمکتے ہوئے نگینے کی طرح جھلکی۔

میرا اب ان دونوں ماں بیٹی سے اپنائیت اور محبت کا رشتہ قائم ہوچکا تھا۔ اگر وہ میرے بارے میں ایک تجسس سے استفسار کرنا چاہ رہی تھی تو مجھے بھی کوئی عار نہ تھا۔

"چنبیلی! اصل زندگی اور حالات ایک عام انسان کو بھی خاص بنا دیتے ہیں۔" بالآخر میں نے بتانا شروع کیا۔ "چنبیلی! میری زندگی کی کہانی بھی فقط اتنی ہی عام سی ہے جتنی کہ ایک غریب محلے میں پیدا ہونے والے اور غربت و عسرت میں حلال کی روزی سے پلنے والے کی ہوتی ہے۔ بچپن سے لڑکپن تک حالات نے بالکل غیر محسوس انداز میں کروٹیں بدلیں اور آج جوانی تک میں انہی کروٹوں سے گزر رہا نئی نئی صورت گری میں ڈھلتا رہا ہوں۔ یہاں تک کہ......"

اس کے بعد میں نے اسے دھیرے دھیرے سب بتادیا!! ... کچھ نہیں چھپایا۔ وہ بڑے اشتیاق، محبت، غور اور ششدر حیرت سے یک ٹک خاموش سنتی رہی۔ میں خاموش ہوگیا اور اپنا چہرہ جھکا لیا۔ وہ بھی کچھ لمحوں کے لیے چپ سی رہی اور کچھ نہ بولی۔ ہم دونوں جیسے دم بخود سے بیٹھے، وقت کی ان دیکھی لڑی میں لمحوں کے موتی ایک ایک کرکے پروتے رہے۔ کوٹھری کی محدود اور ٹھہری فضا میں سلگتی انگیٹھی ہولے ہولے احتجاجی انداز میں چٹخ رہی تھی۔ کوٹھری کی دیواروں پر ہمارے لرزاں سائے مبہوت سے تھے۔ باہر برفیلی ہواؤں کی ہلکی شائیں شائیں سنائی دیتیں۔ دور کہیں کسی آوارہ جانور کی ٹھٹکا دینے والی آواز ابھر جاتی۔ ہر سو گہرا سکوت طاری رہا پھر ایک گہری سسکاری سے مشابہ آواز ابھری۔ چنبیلی نے ایک طویل سانس کھینچی تھی۔ میری گردن جوں کی توں جھکی رہی۔ تب ہی چنبیلی کے نرم و نازک ہاتھ کا گداز اور لطیف دباؤ مجھے اپنے کندھے پر محسوس ہوا۔

میں نے دھیرے سے اپنا سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ چنبیلی کی کشادہ آنکھوں میں مجھے ہلکی سی نمی تیرتی ہوئی نظر آئی۔ یوں جیسے وہ میرے درد کو سمجھ رہی ہو۔ میرے اندر کو محسوس کررہی ہو۔ مجھے جان رہی ہو پھر اس کے لبوں پر جنبش ابھری۔ مرتعش سے لہجے میں لرزیدہ سے الفاظ اس کے لبوں سے برآمد ہوئے۔

"میراب! میں نہیں جانتی کہ تم اندر سے کس قدر گھائل اور دکھی ہو۔ واقعی میں نہیں جانتی کہ تمہارے دل اور سینے میں کیسا آتش فشاں ابل رہا ہے۔ اب تک تم کتنے کڑوے حالات اور کٹھنائیوں سے گزرے ہو، وہ تم ہی جانتے ہوگے اور تمہاری ہی ہمت ہے یہ سب سہنے کی۔"

"نہیں، چنبیلی!" میں نے ہولے سے اس کی آخر الذکر بات کی نفی کی۔ "حالات کی بھٹی میں جو بھی میری طرح جلے گا، وہ ایسا ہی ہوگا۔"

"لیکن ہمت والے کم اور حوصلہ ہارنے والے زیادہ ہوتے ہیں۔ تم ہمت والے اور حوصلہ مند ہو۔" چنبیلی نے فوراً ہی مجھ سے اختلاف کیا۔ میں نے ہولے سے سر جھکا اور پھیکی سی مسکراہٹ سے چنبیلی کی طرف دیکھ کر بولا۔

"چنبیلی! ابھی تک مجھے تم ماں بیٹی کی ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔"

"وہ کون سی؟" اس نے بڑی بڑی آنکھیں پٹپٹا کر

مجھے دیکھا۔

''جب تم دیکھ ہی رہی ہو کہ یہاں تمہارے سب دشمن ہیں تو تم یہاں سے کسی اور قصبے یا شہر سیالکوٹ کی طرف کیوں نہیں نکل جاتیں؟''

''شہر......؟'' چنبیلی یوں حیرت سے بولی جیسے میں نے کوئی انہونی بات کہہ دی ہو۔

''کیا تمہیں معلوم نہیں کہ شہر یہاں سے کتنی دور ہے؟''

''اچھا!'' مجھے حیرت ہوئی۔ سوچا ان رذیلوں، کالی لبروالوں کو آخر مجھے شہر سے اتنی دور زندہ دفنانے کی ضرورت کیوں پیش آئی تھی؟ شاید اس لیے کہ وہ میرا نام و نشان ہی ختم کر دینا چاہتے تھے۔ اپنے گھناؤنے جرم پر ہمیشہ کے لیے پردہ ڈالنا ان کا مقصد تھا۔

''پھر بھی دیکھا جائے تو یہ کچھ اتنی زیادہ مسافت تو نہیں۔ کوئی اور قریبی دیہات اور قصبہ ہی سہی۔'' میں نے کہا۔

''ہم اس وقت مقبوضہ جموں و کشمیر کی ورکنگ باؤنڈری سے صرف چند کلومیٹر ہی دور ہیں۔'' وہ اپنی رو میں بتاتی رہی۔ میں غور سے اس کی بات سنتا رہا۔ پھر ذرا ٹھہر کر میرے سوال کے جواب میں دوبارہ آگے بولی۔

''کہاں جاتے؟ ہم بہت غریب ہیں۔ ہمارے پاس اتنے پیسے بھی نہیں رہے کہ کہیں کا رخ بھی کر سکیں۔ ہمارے گھر چوری کروا کے سب کچھ ان ظالموں نے لوٹ لیا۔ صمد یار ہمیں بالکل ہی بھیک مانگنے پر مجبور کرنا چاہتا تھا تاکہ...... تاکہ میں اس کی بات مان لوں۔''

''کون سی بات؟'' بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا مگر بعد میں مجھے اپنے اس لغو اور بے وقوفانہ سوال پر شرمندگی ہوئی۔ میری معذرت سے پہلے ہی چنبیلی ترخ کر بولی۔

''کون سی بات؟ کیا تو اتنا ہی بدھو ہے۔ ایک بدمعاش اور بدطینت آدمی ایک جوان لڑکی سے کون سی بات منوانے کو کہتا ہے؟'' اس نے خفا ہو کر مجھے آنکھیں دکھائیں۔

''سوری! مجھے معاف کر دینا۔ میرے منہ سے نکل گیا تھا۔'' میں نے معذرت چاہی تو وہ اچانک کھلکھلا کر ہنس دی۔

''کوئی بات نہیں۔''

''کیا تمہارے گاؤں میں کوئی پولیس تھانہ نہیں؟''

''ہے۔ مگر وہ چودھری فتح خاں اور شمسہ بیگم جیسے بااثر لوگوں کی مٹھی میں ہے۔''

''لیکن چنبیلی! اب تمہاری ماں کو تمہارے باپ کی سکھائی ہوئی حکمت آتی ہے۔ تم دوسرے گاؤں یا شہر جا کر حلال کی روزی کما سکتی ہو پھر صمد یار سے تمہیں اپنی عزت اور جان کا بھی تو خطرہ ہے۔'' میں نے کہا۔

''بتایا نا، ہمارے پاس بس اتنا ہی ہے کہ ہم روز دو وقت کی روٹی کھا سکیں۔ باقی جنگلی کھیتوں سے گزارہ کر لیتے ہیں لیکن ہمارا ارادہ تو یہاں سے جانے کا ہے۔ اگر تم......''

وہ اچانک کہتے کہتے رک گئی۔

''میں کیا؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''کچھ نہیں۔ میرا مطلب تھا، ہم تمہارے آنے سے دو ایک روز بعد یہاں سے کوچ کرنے ہی والے تھے۔ یہاں سے چھ، سات کلومیٹر کے فاصلے پر ایک گاؤں ہے تو سہی مگر ابھی اماں پکا فیصلہ نہیں کر پائی ہیں۔''

''وہ کیوں؟''

''اس لیے کہ وہ گاؤں میران پور بھی اسی ریڑھی گاؤں جیسا ہی ہے۔ چودھری فتح خاں کا وہاں بھی بڑا اثر رسوخ ہے۔ صمد یار بھی وہاں آتا جاتا ہے۔ بھلا وہ کمبخت وہاں بھی میرا پیچھا چھوڑنے والا کہاں ہے۔'' بتاتے ہوئے چنبیلی کی آنکھوں میں اداسی اور مایوسی کے سائے لرز گئے۔

''تم لوگوں کے لیے بہتر یہی ہے کہ پھر تم شہر کا ہی رخ کرو۔'' میں نے مشورہ دیا۔

''کیسے جائیں اتنی دور؟'' چنبیلی نے اپنی گھنیری پلکیں جھپکا کر میری طرف سوالیہ انداز میں دیکھا۔

''[illegible] ذرا مجھے بھلا چنگا ہو لینے دو۔'' میں نے [illegible] ایک عزم سے کہا۔

''کہاں سے [illegible] تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔'' وہ بولی۔

''وہ بوٹی کیا ہے؟ کہیں ایسا [illegible] سرحد پار [illegible] میں نہ پڑ جائے۔'' میں نے گہری تشویش سے کہا۔ ''انہوں نے میری خاطر بڑا خطرہ مول لیا ہے۔ میں ان کا احسان ساری زندگی نہیں بھلا سکتا۔''

''وہ ایک قدرتی جنگلی بوٹی ہے۔ بھاگی بوٹی نام ہے۔'' چنبیلی نے بتایا۔ ''جموں کے علاقے میں پائی جاتی ہے۔ جموں، مقبوضہ کشمیر کا ہی ایک ضلع ہے۔ ادھر سرحد پار چندر بھاگا کے نام سے ایک دریا بہتا ہے۔ اس کے کنارے ''بھوات'' نامی ایک جنگل میں ہی وہ بوٹی ہوتی ہے جو قدرتی اور بہت نایاب بھی ہے۔ اسے ہر کوئی نہیں پہچان پاتا۔ اسی دریا کے نام پر اس جادوئی بوٹی کا نام ''بھاگی بوٹی'' پڑا ہے۔''

''تو پھر یہ دریافت بھارتی سپاہیوں کے سر جاتی

ہے۔'' میں نے کہا۔

''نہیں۔'' چنبیلی نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اس بوٹی کی دریافت کا سہرا میرے نانا حکیم نظام شاہ کے سر جاتا ہے۔''

''اچھا! بڑی خوشی ہوئی یہ سن کر۔''

''یہ بوٹی بھی حادثاتی طور پر دریافت ہوئی تھی۔'' چنبیلی نے صاف گوئی سے کہا۔

''ہاں، بعض ایجادیں اور دریافتیں حادثاتی ہوتی ہیں مگر اس میں اللہ کی کوئی حکمت ہوگی۔''

وہ مزید بتانے لگی۔ ''دراصل ایک دن چودھری تاج خاں کا بیٹا یعنی شمیلہ خانم کا شوہر اور صمد یار کا باپ جس کے بارے میں تمہیں بتایا تھا کہ وہ ایک نہایت شریف اور نیک نفس آدمی تھا، بہت سخت بیمار پڑ گیا۔ اس کے علاج کے لیے میرے نانا حکیم نظام شاہ سرحد پار کسی شفائی بوٹی کی تلاش میں گئے اور یہ بوٹی ان کے ہاتھ لگ گئی۔ تاہم وہ اپنی مطلوبہ بوٹیاں لے کر لوٹے تو بدقسمتی سے زمان خاں مر گیا۔ بس اس لیے بھی وہ لوگ ہم سے بیر رکھتے ہیں کہ ہمارے نانا نے چودھری کے لاڈلے بیٹے کے علاج میں سستی دکھائی حالانکہ نانا جان کا اس میں کوئی قصور نہ تھا۔''

چنبیلی اتنا بتا کر چپ ہو گئی۔ میں بھی خاموش رہا۔ مڑھی کا محدود ماحول بھی جیسے تھم سا گیا۔ رات گہری ہو چلی تھی۔ باہر مقبوضہ کشمیر سے آنے والی برفیلی ہواؤں کا شور جاری تھا۔ چنبیلی اٹھی اور انگیٹھی کا معائنہ کیا۔ اس کے اندر کچھ سوکھی لکڑی کے ٹوٹے ڈالے اور پھر مجھے بھی سونے کا کہہ کر اپنے گوشے میں آرام کرنے چلی گئی۔

میں بھی گرم بستر پر لیٹ گیا مگر نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ مجھے اماں کی فکر ہو رہی تھی۔ فوزیہ اور راحیلہ کا خیال بھی بری طرح ستا رہا تھا۔ بقول چنبیلی کے، میں شہر سیالکوٹ سے کسی قدر دور ایک سرحدی جنگل میں پہنچ چکا تھا۔ مجھے اپنے خیر خواہ اور یار دوست بالخصوص استاد جوجی اور چنگو وغیرہ یاد آنے لگے۔ شگفتہ بیگم بھی تھیں اور سدرہ...... وہ تو بے چاری ہلکان ہو رہی ہوں گی۔ وہ سب میری اس اچانک اور پراسرار گمشدگی پر کس قدر پریشان اور فکر مند ہو رہے ہوں گے۔ اب ان بے چاروں کو بھلا کیا معلوم کہ میں شہر سے میلوں دور کہاں اور کن حالوں میں تھا۔

یوں ایک طرح سے میں نے خود کو تن بہ تقدیر کر دیا تھا اور کرتا بھی کیا؟ ایک معذور اور بے بس آدمی اور کرتا بھی کیا بھلا؟ میں اس وقت اماں کی بخیریت واپسی کی دعائیں ہی مانگتا رہا۔ ساتھ ہی مجھے صمد یار اور اس کے بدقماش حواریوں کی طرف سے بھی دھڑکا لگا ہوا تھا۔ ایسے غیر یقینی حالات اور بے بسی کے عالم میں لرزا دینے والا خیال بھی میرے دل میں ابھرتا کہ اگر ان رذیلوں نے مڑھی پر کسی بری نیت سے حملہ کر دیا تو کیا ہوگا؟

درانتی چنبیلی نے اٹھائی تھی۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ یہ میرے سرہانے پر ہی رکھی رہنے دو مگر وہ نہ مانی اور بولی۔ ''اس کی ضرورت نہیں۔ کبھی کبھی یہ درانتی خود کو بھی لگ جایا کرتی ہے کیونکہ اس کی شکل ہی ایسی ہے۔ اس کی نوک واپس گھوم رہی ہوتی ہے۔''

عجیب ہی منطق تھی اس کی۔ میں بھی مسکرا کر چپ ہو گیا۔ سرد اور ٹھٹھرتی رات دبے پاؤں بیتی جا رہی تھی۔ پتا نہیں مڑھی کے دوسرے گوشے میں چنبیلی بے فکری کی نیند سو چکی تھی یا نہیں لیکن مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ رہ رہ کر میری چھٹی حس کسی خطرے کا الارم بجاتی محسوس ہوئی۔ ہر آن کسی دھڑکے سے دل کھٹک سا جاتا تھا۔ شاید حالات ہی ایسے تھے اور خود میری ہیبت کذائی۔

کچھ وقت اور سرکا۔ وسط میں رکھی انگیٹھی کی سلگن بھی دھیمی ہو چلی تھی۔ باہر آگ کے ہنڈولے روشن تھے۔ مڑھی کی دیواروں اور بند دروازے کی باریک درزوں سے ان کی جھلکیاں اندر پھوٹی پڑتی تھیں۔

پھر یوں ہوا کہ میری آنکھیں بوجھل ہونے لگیں۔ شاید نیند بھی ایک مصیبت یا نحوست قدم رکھنے والی ہو تو نیند اچانک حملہ آور ہوتی ہے۔ میری آنکھیں بھی بند اور بھی وا ہونے لگتیں۔ میں اپنے رخ پر اپنا چہرہ گرم تکیے پر ڈالے ہوئے لیٹا تھا کہ بیک وقت دروازے اور چنبیلی کے گوشے کی طرف جانے والے راستے پر نظر پڑ رہی ہے۔

اچانک میں نے چنبیلی والے گوشے سے ایک سایہ ابھرتے دیکھا۔ میں چونک پڑا۔ شاید چنبیلی آ رہی تھی۔

میں سوتا بنا رہا۔ وہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ بے آواز قدموں سے چلتی ہوئی میرے قریب آئی۔ مجھے ایک نگاہ دیکھا پھر قریب رکھے گھڑے سے پانی پیا اور واپس چلی گئی۔ میں بے اختیار مسکرا دیا۔ وہ بھی شاید میری طرح جاگ ہی رہی تھی۔

پھر نہ جانے کب نیند نے مجھ پر غلبہ پا لیا۔ میں سو چکا تھا۔ اچانک میری آنکھ کھلی۔ میرا سر تکیے سے باہر تھا۔ میں یوں دائیں پہلو کے بل سویا ہوا تھا کہ جب بھی آنکھ کھلے تو دروازے پر نظر پڑتی رہے۔ وہاں دیکھا تو بری طرح ٹھٹک گیا۔ ایک پراسرار سا سایہ دبے پاؤں اندر داخل ہو چکا تھا۔

☆☆☆

میں نہیں دیکھ سکا تھا کہ اس نے دروازہ کیسے کھولا تھا مگر جان ضرور سکتا تھا کہ اس کے لیے بھلا گھاس پھونس اور سرکنڈوں کی جھونپڑی کا دروازہ کھولنا یا توڑنا کیا مشکل ہوسکتا تھا۔

میں چند ثانیے اسی طرح بے حس وحرکت گویا بظاہر سوتا پڑا رہا۔ تاہم میری ایک آنکھ کی جھری اس پراسرار سائے کی حرکات وسکنات ضرور دیکھ رہی تھی۔ میرے دل کی دھڑکنیں یکلخت تیز ہوچلی تھیں اور اعصاب تن گئے تھے۔

وہ خالی ہاتھ ہی نظر آرہا تھا۔ رک کر اس نے میری جانب اپنی گردن گھما کر دیکھا۔ مجھے سوتا پاکر وہ شاید مطمئن سا ہوا تھا لیکن پھر اس نے عقب میں اشارہ کیا۔ شاید دروازے کے باہر اس کے اور بھی ساتھی کھڑے تھے۔ اگلے ہی لمحے وہ بھی اندر آگئے۔ اب ان کی تعداد تین تھی۔ مدھم روشنی میں اور ایک رخ سے میں ان کے چہرے پہچاننے کی سعی کرتا رہا کیونکہ انہوں نے چہرے نہیں چھپائے ہوئے تھے۔ البتہ سوتی شال نما چادریں ضرور اوڑھ رکھی تھیں۔

اگلے ہی لمحے میں مجھے میرے بدترین خدشات درست ثابت ہوئے۔ میں ان تینوں کو پہچان چکا تھا۔ ابھی چند گھنٹے پہلے ہی تو ان رذیلوں سے میری شناسائی ہوئی تھی اور ان کی دلیری، غرور، طاقت پر میں اندر ہی اندر بری طرح تلملا کر رہ گیا تھا۔ ان کی ڈھٹائی بھی اپنی جگہ۔ ان میں سے ایک صمد یار تھا باقی دو اس کے گماشتے۔ بظاہر تو یہ خالی ہاتھ نظر آرہے تھے مگر ہوسکتا تھا کہ چھوٹے موٹے ہتھیار انہوں نے سوتی چادر کی بغل میں دبا رکھے ہوں۔

مجھے یقین تھا کہ ان بدبختوں کا ناپاک ارادہ چنبیلی کو اغوا کرنا تھا مگر ابھی انہوں نے اس گوشے کا رخ نہیں کیا تھا جدھر چنبیلی شاید بے خبر سو رہی تھی۔ تب ہی مجھے ہلکی سرگوشی سنائی دی۔ صمد یار اپنے ساتھیوں سے کہہ رہا تھا۔

''اس مردار کو پہلے اٹھا کر جنگل میں پھینک آؤ۔ یہ میرے رنگ میں بھنگ ڈالے گا۔'' اس کی بات سے میں اندر ہی اندر لرز گیا۔ مجھے اپنی فکر نہ تھی۔ تشویش تھی تو چنبیلی کی جس کی محسن ماں میری صحت یابی کے لیے اتنا بڑا رسک اٹھاتے ہوئے ایک دشوار گزار اور پرخطر سفر پر نکلی ہوئی تھی۔ میں کانپ گیا، خوف سے نہیں، اس اندیشے پر کہ اگر چنبیلی اس شیطان کے ہتھے چڑھ گئی تو میں اس کی کیا مدد کرسکتا تھا؟ اس کی ماں کو کیا منہ دکھا سکتا تھا؟

''کیا ضرورت ہے اسے باہر پھینکنے کی۔ ادھر ہی پڑا رہنے دیں۔ زندہ لاش ہی تو ہے۔ بھلا یہ ہمارا کیا بگاڑ لے گا، چھوٹے سرکار!'' ایک گماشتے نے کہا۔

''بجا، ٹھیک کہہ رہا ہے چھوٹے سرکار!'' دوسرے نے بھی اپنے پہلے ساتھی ''جی'' کی تائید میں صمد یار سے کہا۔ ''اس نے زیادہ چوں چرا کی تو ادھر ہی لٹا کر لاش باہر اندھی کھوہ میں پھینک دیں گے۔''

''ہمم ..... یہ بھی ٹھیک ہے۔'' صمد یار بولا۔ ''اب تم ذرا اس کے قریب جاکر کھڑے ہوجاؤ۔ میں اندر جاتا ہوں۔ وہ مغرور پری دیکھتا ہوں اب کیسے مجھے روکتی ہے۔'' صمد یار کے ان الفاظ نے میرے کانوں میں جیسے کھولتا ہوا لاوا انڈیل دیا۔

''چنبیلی ..... ! چنبیلی ..... !'' مجھے اور تو کچھ نہ سوجھا، میں نے اپنے اندر کی طاقت کو گویا حلق میں سموتے ہوئے پوری قوت سے چیخ کر چنبیلی کو خطرے سے آگاہ کرنے کی کوشش کی۔

صمد یار، چنبیلی کے گوشے کی طرف بڑھتے ہوئے یک دم چونک کر رکا۔ اس کے دونوں گماشتے بھی بری طرح ٹھٹک کر میری جانب گردن موڑے گھورنے لگے۔

''دیکھ کیا رہے ہو، خاموش کرواؤ اسے۔'' صمد یار نے غرا کر اپنے گماشتوں سے تحکمانہ کہا۔ وہ دونوں ہکا بکا یکدم چابی بھرے کھلونوں کی طرح حرکت میں آئے اور ایک ہی جست میں میرے قریب آن پہنچے۔ یہی نہیں، میرے سر پر پہنچتے ہی انہوں نے جوتوں اور لاتوں کی ٹھوکریں میرے چہرے پر رسید کرنا شروع کردیں۔ صمد یار چنبیلی والے گوشے میں غائب ہوچکا تھا۔

میں درد وکرب سے تڑپنے اور چیخنے لگا۔ میری چیخوں کی صدا میں بلندی نام کو نہ تھی۔ بس گھٹی گھٹی سی تھیں۔ پتا نہیں میری آواز اندر سوئی چنبیلی نے سنی بھی ہوگی یا نہیں۔ میں نے بچاؤ کے لیے اپنے دونوں ہاتھوں کو حرکت دینا چاہی کہ ان دونوں مردود رذیلوں کی لاتوں کو پکڑ سکوں، کچھ کامیاب بھی ہوا مگر ہاتھوں میں وہ دم خم کہاں رہا تھا۔ بس حرکت ہی دے پایا تھا۔

اس کے ساتھ ہی میری سماعتیں چنبیلی کی متوقع چیخ کی آواز کی بھی منتظر تھیں مگر وہ ابھی خاموش تھی۔ نہ جانے اس صمد یار نے اس بے چاری کو سوتے میں کسی شکاری باز کی طرح جھپٹ لیا تھا۔ مگر نہیں، وہ باز کہاں تھا۔ وہ تو کرگس تھا۔ ایک بھوکا گدھ۔

چند ہی ثانیوں بعد میں اپنے چہرے پر پڑنے والی

ٹھوکروں کی تکلیف کو بھول گیا اور وہ دونوں گماشتے بھی چونک کر تھم گئے۔ صمد یار دوبارہ گوشے سے نمودار ہوا تھا۔ ہم تینوں ہی جیسے سب کچھ بھول کر اس کی طرف دیکھنے لگے کہ ماجرا کیا ہے؟

"وہ کتیا جل دے کر بھاگ نکلی ہے۔" دفعتاً ہی صمد یار نے اپنی جھلائی ہوئی آواز میں اعلان کیا۔ میرے اندر یک گونہ سکون اور اطمینان پھیل گیا۔ چنبیلی مجھ سے زیادہ خطرے کی بو سونگھ کر بھانپ رہی تھی اور موقع تاک کر اپنی عزت اور جان بچا کر بھاگ نکلی تھی۔ مجھے حیرت تھی کہ وہ کس وقت اور کہاں سے نکلی تھی؟ شاید اس گوشے میں بھی کوئی کھڑکی تھی یا پھر کوئی نکاسی کا خفیہ دروازہ کیونکہ میں ابھی تک اس گوشے کے اندر نہیں گیا تھا۔

لیکن جہاں مجھے چنبیلی کے نکل بھاگنے کی مسرت ہوئی تھی، وہیں ایک دکھ بھی محسوس ہوا اور فکر بھی کہ وہ بے چاری اس ٹھٹھرتی ہوئی سرد رات اور ویران اندھیرے جنگل میں کہاں تک مدد کے لیے جا سکتی تھی؟ مجھے اپنے آپ پر شرم محسوس ہونے لگی۔ میں اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر پا رہا تھا۔ ایک زندہ لاش کی شکل تھا۔

پہلی بار مجھے صمد یار اور اس کے ان دونوں گماشتوں سے زیادہ رنگا بابا اور سیٹھ مم جی کے خلاف ایک عجیب سی نفرت کا احساس ہوا۔ ایک لہر سی تھی جو پورے بدن میں سرایت کرتی چلی گئی۔ مجھے ان دونوں رذیلوں نے کس حال میں پہنچا دیا تھا۔

"کھڑے میرا منہ کیا تک رہے ہو؟" معاً صمد یار گرج کر اپنے گماشتوں سے بولا۔ "جاؤ، باہر جا کر اسے تلاش کر کے لاؤ۔ وہ کتیا پہلے ہی خطرے کی بو سونگھ کر کھڑکی سے بھاگ نکلی ہے۔ میں ادھر ہی اس کے پاس رکتا ہوں۔" اس کا آخرالذکر اشارہ میری طرف تھا۔

دونوں گماشتے باہر کو دوڑے۔ میں تب تک کسی طرح اٹھ کر دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھ چکا تھا اور گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ صمد یار چند قدموں کے فاصلے سے میری طرف کھڑا قہربار نظروں سے گھورتا رہا پھر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا میرے قریب آن کھڑا ہوا اور شعلہ بار لہجے میں بولا۔

"تو کیا سمجھتا تھا کہ تیری چیخ سن کر وہ بھاگ گئی ہے، بچ گئی ہے؟ وہ کہیں نہیں جا سکتی۔ بہت جلد یہاں ہوگی۔"

"مت کرو ایسا صمد یار! خدا کے قہر سے ڈرو۔" میں نے اس سے کہا۔ میری آواز گھٹی گھٹی سی تھی۔

"اوہ...... تمہیں تو میرا نام بھی یاد کروا دیا گیا ہے۔" وہ طنزیہ بولا۔ "اچھی بات ہے، میرے بارے میں تمہیں پتا چل گیا۔" اس کے لہجے میں نخوت تھی۔ میرے اندر ابھل مچی ہوئی تھی اور رگ و پے میں لاوا دوڑ رہا تھا۔

اپنی بے بسی کا احساس مجھے اس سے پہلے اتنا جاں گسل نہیں لگا تھا۔ ورنہ میں ایسے مغرور انسان کا غرور خاک میں ملانے میں ایک لمحے کی بھی دیر نہیں لگاتا۔

"صمد یار! اللہ کی رسی دراز ضرور ہوتی ہے مگر جب وہ کھینچتا ہے تو انسان کو دوسرا سانس لینا بھی نصیب نہیں ہوتا۔"

"اپنی نصیحتیں اپنے پاس رکھ۔" وہ دہاڑ کر بولا پھر وہ خود ہی جھنجھلا گیا اور جھک کر اس نے مجھے گریبان سے دبوچ لیا اور اپنا غصے سے جلتا ابلتا چہرہ میرے چہرے کے اس قدر قریب کر لیا کہ وہ مجھے انتہائی کریہہ لگا۔ اسی لہجے میں غرا کر بولا۔

"تو...... تو، ایک زندہ لاش...... مجھے للکار رہا ہے۔ صمد یار کو......"

"میں للکار نہیں رہا ہوں، سمجھا رہا ہوں۔ خوف خدا یاد دلا رہا ہوں تجھے۔ میری تمہاری بھلا کیا حیثیت ہے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"ہاہاہا...... حیثیت...... ہاہاہا......" وہ غرور کے قہقہے مار کر بولا اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔ تب ہی اس نے اپنی موٹی چادر کے اندر سے ہاتھ باہر نکالا۔ اس میں لمبی نال والا خودکار سیاہ پستول دبا ہوا تھا۔ اس کا رخ اس نے میری پیشانی کی جانب کر دیا۔

"بتا دوں تیری اور اپنی حیثیت؟" اس نے خونخوار لہجے میں تہدید کی۔ وہ مجھے ایک پل میں گولی مار کر ہلاک کر سکتا تھا۔ عقل مندی یہی تھی کہ اسے طیش دلانے کے بجائے کسی اور راہ پر لگایا جاتا۔ لہٰذا میں نے کہا۔

"صمد یار! مجھے ہلاک کر کے تجھے کچھ نہیں ملے گا۔ تیرے پستول کی گولی میری جان سے زیادہ قیمتی ہوگی۔"

"ہاہاہا...... اب کی نا تو نے عقل مندی والی بات۔" وہ پھر پُرغرور قہقہے اگلتے ہوئے بولا اور اس نے پستول واپس اپنے لباس میں چھپا لیا اور بولا۔

"اب سچ سچ بتا، تو ہے کون؟ پڑوسی ملک کا جاسوس یا پھر چنبیلی سے تیرا کوئی آنکھ مٹکا ہو چکا ہے؟"

"ہاں، میں ایک جاسوس ہی ہوں۔ اپنے مقصد کے لیے ان دونوں ماں بیٹی کو دھوکے سے اپنی مدد کے لیے استعمال کر رہا تھا۔" میں نے جواب میں کہہ دیا۔

بسا اوقات ہمہ وقت سوچتے رہنے سے کوئی کام کی بات

ذہن میں کہیں آتی لیکن جب ایسے نازک مواقع اور پھر سوچنے کے لیے بہت قلیل وقت ہو تو ذہن بھی شاید قدرتی طور پر اسی رفتار سے سوچ لیتا ہے۔ کسی کی زبردستی مسلط کی ہوئی مرضی کے مطابق جواب دینا معاملے کو عارضی طور پر ہی ٹھنڈا کرنے کا سبب بھی بن جاتا ہے اور اندھیرے میں تیر بھی ٹھیک سمت جا لگتا ہے۔

میرے جھوٹ پر صحرا پار کی آنکھوں میں یکلخت عجیب سی چمک ابھری۔ اس کی گھنی مونچھوں تلے مسکراہٹ بھی بڑی معنی خیز رہی۔ وہ بولا۔

''ہم...... تو میرا اندازہ بالکل درست تھا۔ تب تو تمہیں چنبیلی کی فکر نہیں ہونا چاہیے۔ تمہارا اس کے لیے جوش میں آنا میرے غصے کو ہوا دے رہا تھا۔''

''مجھے اپنی غرض عزیز تھی۔'' میں نے اسی چال بازی سے کہا۔ ''یہاں کوئی گڑبڑ ہو تو ظاہر ہے اس کا مجھ پر اثر پڑے گا۔''

وہ چند ثانیے پرسوچ انداز میں میرا جائزہ لینے لگا اور پھر الجھ کر بولا۔ ''ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ تیری یہ حالت کیسے اور کیونکر ہوئی؟ جبکہ تو کہیں سے بھی مجھے زخمی بھی نہیں لگتا۔ ورنہ اس طرح ایک مجھو جیسا جاسوس ہمارے نرغے سے بچ کر بھاگ بھی نکلے تو وہ کم از کم زخمی ضرور ہوتا ہے اور ہاں...... ایک بات اور مجھے حیران کر رہی ہے۔ وہ بڑھیا چنبیلی کی ماں اتنی رات گئے کدھر غائب ہے؟'' اس کی عقل ٹھکانے لگ رہی تھی یا پھر وہ طاقت کے نشے میں تھا۔

میں نے کہا۔ ''وہ تم لوگوں کے جانے کے بعد ہی اچانک نہ جانے کہاں غائب ہو گئی تھی۔ میں اور چنبیلی اسی وجہ سے پریشان تھے اور ہمیں اسی فکر سے رات گئے تک نیند نہیں آ رہی تھی۔ سوئے تو تم لوگ آ گئے۔''

''تم کس مشن پر آئے ہو؟'' اس نے بھویں سکیڑ کر سوال کیا۔

''ہے ایک خاص مشن لیکن یہی بات اب بھی میں نے تم سے چھپا رکھی ہے۔''

''کون سی بات؟''

''میں جس خاص مشن پر یہاں بھیجا گیا ہوں، اس نے میری نیت بھی خراب کر ڈالی ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''بات جب دولت کی آ جائے تو اچھے اچھوں کی نیتوں میں فتور آ ہی جاتا ہے۔''

''دولت...... کیسی دولت؟'' وہ چونکا۔ میں جانتا تھا کہ دولت کی ہوس ہی ایسی ہوتی ہے کہ وہ اچھے بھلے انسان کی عقل پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ اس کی دلچسپی ظاہر کرتی تھی کہ وہ میرے جھانسے میں آ رہا تھا۔

دراصل میں نے پینترا ہی کچھ ایسے انداز میں بدل کر اس سے یہ سب کہا تھا کہ وہ یقین کر لے۔ ایک مفکر کا قول میں نے کہیں سن رکھا تھا کہ جب تم دیکھو مدمقابل تم پر الزام تراشی میں غالب آ چکا ہے تو اسے ایسا ہی بن کر دھوکا دو جیسا کہ وہ تمہیں سمجھے ہوئے ہے۔ یہ غالب مدمقابل کی فطرت ہوتی ہے اور وہ اپنے اندر ایسا فخر محسوس کرتا ہے کہ پھر وہ تم پر یقین کرنے لگتا ہے۔ یہی منزل اسے دھوکا دینے اور اس پر غالب آنے کی ہوتی ہے۔

میں بھی یہی کر رہا تھا۔ وہ میری باتوں میں آ گیا تھا۔

''تم نے مجھے یہاں مشہور کروا کر بہت برا کیا جس سے میرا اوّلین مشن خطرے میں پڑ گیا۔'' میں نے کہا۔

''کھل کر بات کرو ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔'' وہ برہم ہو کر بولا لیکن اب کے اس کے لب و لہجے میں پہلے جیسی تندی یا استہزا نہیں تھا۔

میں نے کہا۔ ''میرے پاس اب اس کے سوا چارہ ہی کیا بچا ہے کہ میں تم سے کھل کر ہی بات کروں۔'' میں نے مکاری سے کہا۔ ''ورنہ یہ ضرور ہوگا کہ میرے ہاتھ کچھ آئے گا نہ تمہارے۔ تو کیوں نہ تم سے مل کر ہی نصف حصے کی دولت کا مالک تو بن ہی جاؤں۔''

''تم نہ جانے کیا بکواس کیے جا رہے ہو؟'' وہ جھلا گیا۔

''سب سے پہلا کام تم یہ کرو کہ تمہارے جو دو گرگے اس لڑکی کو پکڑنے گئے ہیں، انہیں واپس بلوا لو۔ ہاں، دوبارہ اسے چھوٹی موٹی دھمکی دے کر لوٹ جاؤ اور مجھے بھی دو ایک ہاتھ مار لینا۔ یہ ضروری ہے۔ اس کے بعد ہی میں کہیں......''

''اپنی بکواس بند کرو اب۔'' وہ غصے سے دہاڑا۔ ''تم لاغر اور معذور مجھے بے وقوف بنا کر اپنا الو سیدھا نہیں کر سکتے۔''

مجھے توقع تھی کہ وہ اتنی آسانی سے میرے پھیلائے ہوئے جال میں نہیں پھنسنے والا تھا اسی لیے میں نے اپنا اعتماد متزلزل نہیں ہونے دیا اور معنی خیز انداز میں مسکرا کر بولا۔

''سوچ لو کیا تم اپنے علاوہ ان ماں بیٹی کو بھی اس اہم راز میں شریک کرنا چاہتے ہو تو ٹھیک ہے۔ تین حصے کر لیں گے۔''

اب وہ واقعی آپے سے باہر ہو گیا اور ایک بار پھر اپنی چادر کے اندر سے وہی لمبی نال والا بھیانک پستول نکال کر

مجھ پر تان لیا اور دانت پیستے ہوئے بولا۔

"اب اگر تم نے پوری بات مجھے نہیں بتائی تو میں تمہیں یہیں گولی ماردوں گا۔"

میں بھی یہی چاہتا تھا۔ اسے طیش دلا کر اس کی عقل خبط کر ڈالوں۔ میں نے کہا۔ "آج سے کچھ عرصہ پہلے میں اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ ایک خفیہ مشن پر یہاں آیا تھا۔ مشن تو پورا نہ ہوسکا اور ہم بارڈر سیکیورٹی فورسز کی فائرنگ سے بال بال بچ کر یہاں آن پہنچے اور جس اسمگلر نے ہمیں اپنے اونٹ ریوڑ میں دیگر لوگوں کے ساتھ خانہ بدوشوں کے بھیس میں رکھا تھا، وہ درحقیقت راجستھانی ڈاکوؤں کا ایک ٹولا تھا۔ انہوں نے کسی راجا کی دولت لوٹی تھی اور پانچ بڑی بڑی دیگوں میں ڈال کر جموں کے راستے سرحد پار کرکے یہاں تک پہنچے تھے۔ ہمیں بھنک ملی تو میں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ ان کی لوٹی ہوئی دولت کو ہتھیانے کا منصوبہ بنایا۔ مشن تو ہمارا ناکام ہو ہی گیا تھا مگر اتنی ساری دولت دیکھ کر ہماری نیتوں میں فتور آگیا تھا۔ ہم خود چاہتے تھے کہ اس طرح کی نوکری سے جان چھوٹے اور بہت سی دولت کے ساتھ کسی اور اچھے اور بڑے ملک جا کر سکون اور عیش کی زندگی بسر کریں۔ القصہ ہم نے ایک موقع پر شراب میں زہر ڈال کر سارے ڈاکوؤں کو ہلاک کر ڈالا اور پھر ان کی دیگوں کو ایک جنگل میں خفیہ مقام پر دبا دیا کہ کسی وقت واپس آکر اسے استعمال کرنے کی کوشش کریں گے۔ بدقسمتی سے جب ہم واپس لوٹنے لگے تو ایک بار پھر بارڈر فورسز کی فائرنگ کی زد میں آگئے۔ میں اپنے ملک جانے کے بجائے دوبارہ الٹے پاؤں ادھر ہی پلٹ آیا۔ میرے دونوں ساتھی مارے گئے۔ میری کمر پر چوٹ لگی۔ میں اسی وجہ سے معذور ہوا ہوں مگر یہ بوڑھی خاتون میرا علاج کررہی ہے اور مجھے افاقہ ہے۔ اب میں واپس اپنے ملک نہیں جانا چاہتا تھا۔ صحت مند ہونے کے بعد یہ ساری دولت کسی طرح سمیٹ کر آگے کہیں نکل جانا چاہتا تھا مگر اس کے لیے صبر اور مناسب وقت گزارنا ضروری تھا۔ یہی سوچا تھا کہ یہاں کا عام باشندہ بن کر ادھر ہی کچھ وقت گزارتا رہوں گا کہ تمہارا مسئلہ آن کھڑا ہوا۔ اب تم فیصلہ کرلو۔"

میں اتنا بتا کر چپ ہوگیا لیکن دزدیدہ نظروں سے اس کے درشت چہرے پر اپنی بات کی اثر پذیری کے تاثرات بھی بھانپنے کی کوشش کرتا رہا۔ اب میں کہہ سکتا تھا کہ وہ متاثر ہونے لگا تھا۔ میرا آدھے سچ اور آدھے جھوٹ کا فارمولا کامیاب رہا تھا۔ وہ مجھے پڑوسی ملک کا جاسوس سمجھے ہوئے تھا۔ خواہ سازش ہی سہی مگر بہرحال وہ (اس کی نظر میں) سچ ثابت ہوا تھا اور یوں وہ میری آگے کی "رنگ آمیزی" میں آگیا۔

"وہ دولت تم نے کہاں چھپائی ہے؟" اس نے سوال کیا۔ اسی وقت اس کے وہی دونوں گماشتے اندر داخل ہوئے جو چنبیلی کی تلاش میں نکلے ہوئے تھے اور کامیاب لوٹے تھے کیونکہ چنبیلی بے چاری ان کی گرفت میں بری طرح مچل رہی تھی۔ اسے خراشیں بھی آئی ہوئی تھیں اور سردی کے مارے اس کا برا حال ہورہا تھا۔

میرا دل اندر سے کڑھنے لگا۔ چنبیلی بھی مجھے صمد یار کے رحم و کرم پر دیکھ کر پریشان نظر آنے لگی لیکن میں ابھی اسے کسی قسم کی تسلی دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ وقت کا منتظر ضرور تھا۔

"چھوڑ دو اسے۔" صمد یار نے اچانک اپنے دونوں گماشتوں کی طرف دیکھ کر حکم صادر کیا۔ یکلخت میرے اندر مسرت چھلکی۔ گماشتوں نے پہلے حیرت سے صمد یار کی طرف دیکھا پھر چنبیلی کو۔ اس کے بعد انہوں نے فوراً اسے چھوڑ دیا۔ وہ میری طرف دوڑی اور میرے قریب آکر کھڑی ہوگئی۔

میری چال کی کامیاب پیش بندی میرے سامنے تھی۔ صمد یار نے ایک نظر چنبیلی پر اور پھر مجھ پر ڈالی۔ اس کے بعد بولا۔ "ٹھیک ہے سیراب! اس واقعے کو بھول جاؤ اور میں کل صبح تم سے ملنے کے لیے آؤں گا۔" میں نے اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے سر ہلایا پھر اس نے اپنے حیران پریشان سے کھڑے گماشتوں کو اشارہ کیا اور مڑ کر باہر نکل گیا۔ چنبیلی کی ساری تشویش اور پریشانی ایک لمحے میں ہوا ہوگئی۔ وہ کبھی دروازے کی طرف دیکھتی اور کبھی میری طرف...... جبکہ میرے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ رقصاں تھی۔

"تت...... تم نے اس سنگ دل پر کیسا جادو کردیا؟ وہ تو چلا گیا۔" وہ ہکلاتے ہوئے مسرت اور حیرانی کے ملے جلے تاثرات سے بولی۔ "وہ مردود...... تو...... ہم...... مجھے کچا چبانے کے لیے پاگل سا ہوا جارہا تھا۔"

"بس تم جہاں پناہ...... کیا تمہیں یہ اچھا نہیں لگا؟" میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

"یہ مردود یہاں سے بغیر کوئی خون خرابا کیے دفع ہوگیا! بھلا اس سے اچھی اور کیا بات ہوسکتی ہے لیکن...... یہ سب ہوا کیسے؟ تم نے اس درندے کو کیسے قابو کیا جبکہ...... تم

تو...... تم تو......" چنبیلی پر حیرتوں کے پہاڑ ہنوز ٹوٹے پڑ رہے تھے۔

"میں جسمانی طور پر مفلوج ہوا ہوں مگر دماغ تو میرا پوری طرح کام کر رہا ہے نا۔ یہ اسی کی کرامات ہیں۔"

"میرے خدا!" بے اختیار چنبیلی کے منہ سے نکلا۔ اس نے دروازہ بند کیا اور میرے قریب آ کر فرشی بستر پر بیٹھ گئی۔ "مگ...... کیسے...... کیسے ہوا یہ سب؟"

رات کے گزرتے آخری پہر میں، میں دھیرے دھیرے اسے سب بتاتا چلا گیا۔

☆☆☆

صبح دن چڑھے تک میں لمبی تانے سوتا رہا۔ چنبیلی بھی دیر سے اٹھی۔ یہاں کوئی گھڑی وغیرہ نہ تھی۔ خود ہی وقت کا اندازہ لگا لیا جاتا۔ چنبیلی نے میرے اور اپنے لیے ناشتا تیار کیا اور لے آئی۔

"اماں نہیں آئی ابھی تک؟" میں نے فکرمند لہجے میں پوچھا۔

"سہ پہر یا شام تک آ جائے گی۔" چنبیلی برتن اپنے اور میرے درمیان میں رکھتے ہوئے بولی۔

"اللہ اماں کی حفاظت فرمائے۔ مجھے ان کی بڑی فکر ہو رہی ہے۔" میں نے کہا۔

"اللہ بہتر ہی کرے گا۔ اماں خیریت سے لوٹ آئیں گی۔"

"ان شاء اللہ۔"

ہم ناشتا کر کے فارغ ہوئے ہی تھے کہ باہر گاڑی کی آواز آئی۔ چنبیلی پھر متوحش سی نظر آنے لگی۔ میں نے اسے تسلی دی اور اسے دروازہ کھول کر اندر اپنے گوشے میں چلے جانے کی ہدایت کی۔ اس نے خاموشی سے خالی برتن اٹھائے، مڑھی کا دروازہ کھولا اور دوسرے گوشے میں چلی گئی۔

ذرا دیر بعد ہی حسب توقع صمد یار اندر داخل ہوا۔ اس نے اردگرد نظریں دوڑائیں پھر میری طرف دیکھا۔

"تمہیں ابھی میرے ساتھ چلنا ہے۔" وہ سرد لہجے میں بولا۔

"میں تیار ہوں۔" میں نے بھی فوراً کہہ ڈالا۔ "لیکن تم میری حالت دیکھ رہے ہو۔ میں زیادہ دیر چل نہیں سکتا۔ مجھے سہارا دینا ہوگا۔"

اس نے مڑھی کے کھلے دروازے کی جانب منہ کر کے اپنے دونوں گماشتوں کو آواز دی۔ وہ اندر آ گئے پھر انہیں مخصوص اشارہ کیا۔ وہ میری طرف بڑھے۔ میں چنبیلی کو چونکہ سب بتا چکا تھا اس لیے وہ اندر ہی رہی تھی لیکن میں جانتا تھا کہ ساری حقیقت بتانے کے باعث وہ بے چاری پھر بھی میری طرف سے پریشان اور متفکر ہوگی کیونکہ مصیبت ٹل تو گئی تھی مگر عارضی طور پر۔ حالات اب بھی غیر یقینی تھے مگر مجھے اپنے اوپر اعتماد تھا۔ میں یہاں بھی کوئی نہ کوئی نکاسی کی صورت تلاش کر ہی لوں گا۔

وہ دونوں مجھے سہارا دیے باہر آ گئے۔ سامنے صمد یار کی جیپ کھڑی تھی۔ انہوں نے مجھے ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر بٹھا دیا اور خود عقبی نشستوں پر براجمان ہو گئے۔ صمد یار بھی گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔ ابھی اس نے جیپ اسٹارٹ نہیں کی تھی، میری طرف گھور کر بولا۔

"سہراب! ایک بات یاد رکھنا۔ اگر یہ سب جھوٹ یا دھوکا نکلا تو چنبیلی میرے لیے یوں بھی آسان شکار ہے لیکن تمہیں میں وہیں مار کر لاش کھڈ میں پھینک دوں گا۔"

"مجھے افسوس ہے صمد یار!" میں نے اعتماد سے کہا۔ "اتنا کچھ جان لینے کے باوجود کیا اب بھی تم اسے جھوٹ سمجھ رہے ہو تو تمہاری مرضی۔ چنبیلی یا اس کی ماں سے میرا کوئی رشتہ نہیں لیکن کسی غلط فہمی یا بدگمانی کی وجہ سے میری جان لینے کی غلطی مت کرنا کیونکہ میں نے تو یوں بھی سر سے کفن باندھ رکھا ہے۔ زندہ لاش کی مثل ہوں مگر تم ایک بڑے نقصان سے دوچار ہو جاؤ گے۔"

"ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے۔" اس نے ہاتھ ہلا کر جھنجھلائے ہوئے لہجے میں کہا اور اگلے ہی لمحے جیپ اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔

موسم خوشگوار ہو رہا تھا۔ مجھے امید تھی اس بدبخت سے کہ وہ اس قدر جلدی یہ سب گزرنے کی کوشش کرے گا مگر حالات ہی ایسے تھے۔ اب کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ میں بھی دیکھ رہا تھا کہ کہاں تک میں "پہنچ" سکتا ہوں۔ حالات اور وقت کے دھارے پر میں نے ویسے بھی خود کو چھوڑ رکھا تھا البتہ ذہن پر تفکر رہا۔

میں نے ابتدائی دنوں میں گاہے بگاہے چنبیلی اور اس کی ماں سے یہاں کے جغرافیائی محل وقوع اور اسی نوع کی دیگر معلومات لے رکھی تھیں۔ اسی کے مطابق میں اسے ایسی برفیلی پہاڑی وادی کی جانب لے گیا جو ریڑی گاؤں سے دس گیارہ کلومیٹر متصل جنوب کی طرف انتہائی دشوار گزار راستوں پر جاتی تھی۔

یوں وہاں تک پہنچنے میں ہی ہمیں گھنٹے سے زیادہ کا وقت لگ گیا۔ یہاں تک کہ اب گاڑی کے آگے جانے کا کوئی راستہ ہی نہ بچا تھا۔ صمد یار نے جیپ روک لی۔ میں

یوں بھی اداکاری کے انداز میں اب تک کبھی ونڈ اسکرین سے اور کبھی دائیں بائیں کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا جیسے مطلوبہ مقام کھوجنے کی کوشش کر رہا ہوں جبکہ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ مطلوبہ مقام کا تو میرے فرشتوں کو بھی علم نہ ہوگا۔

"بڑی مشکلوں سے یہاں تک پہنچے ہیں۔ اب گاڑی مزید آگے نہیں جاسکتی۔" صمدیار بولا۔

"تب پھر ہمیں آگے پیدل چلنا ہوگا۔" میں نے کہا۔ "جگہ ادھر ہی کہیں آس پاس ہے۔"

"تم نے کوئی نشانی تو رکھی ہوگی؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں، لیکن لگتا ہے تاخیر اور بعد میں ہونے والی طوفانی بارش اور برف باری میں سب مٹ گئی۔" میں نے جواب دیا۔ وہ جھلایا ہوا سا نظر آنے لگا۔ اسی لہجے میں بولا۔

"پھر اب کیا ہوگا؟"

"میرا خیال ہے مجھے نقشے کی مدد لینا ہوگی۔" میں نے مفکرانہ انداز میں سوچتے ہوئے کہا۔

"نقشہ؟" وہ چونکا۔ "جب تمہارے پاس نقشہ ہے تو پہلے اس سے مدد کیوں نہ لی؟"

"کس نے کہا نقشہ ہے میرے پاس؟" میں حیرت سے بولا۔ "نقشہ تو مجھے خود بنانا ہوگا کیونکہ اس مقام کا خاکہ میرے دماغ میں موجود ہے۔ ہمیں جاسوسی کے ساتھ خود ساختہ نقشہ بنانے کی بھی ٹریننگ دی جاتی ہے۔"

صمدیار سوچتے ہوئے جھلاہٹ کے عالم میں دو ایک لمحے اپنے ہونٹ کاٹتا رہا پھر اپنے گماشتوں سے بولا۔

"یاور..... تیجے! کیا بولتے ہو تم؟"

"چھوٹے سرکار! میرا خیال ہے پیدل چل کر دیکھ لیتے ہیں۔ کیا خبر اسے وہ جگہ نظر آجائے۔" یاور نامی گماشتے نے مشورہ دیا تو دوسرے یعنی تیجے نے بھی اس کی تائید کی۔

"ہم..... تو پھر اترو۔ پیدل ہی چل کر دیکھ لیتے ہیں۔" صمدیار نے کہا۔

میں تھوڑا پریشان ہوا۔ تاہم بولا۔ "اس میں بڑا رسک ہوگا کیونکہ اس طرف پڑوسی ملک کی سرحد لگتی ہے۔ ورکنگ باؤنڈری بھی نزدیک ہے۔ ہماری ایک ذرا جھلک بھی انہیں ہم پر گولیاں اور راکٹ برسانے پر اکسا سکتی ہے۔ ہمیں جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیے۔ جب ایک کام چند دنوں بعد آسانی اور بغیر کسی جان کے رسک سے کیا جاسکتا ہے تو کیا ضرورت ہے کہ ہم اپنی جانیں خواہ مخواہ ہی خطرے میں ڈالیں۔ پھر میری حالت بھی تم لوگ دیکھ ہی رہے ہو۔ مجھے بھی تمہیں سنبھالنا ہوگا۔ میں خود سے بھلا کہاں چل سکتا ہوں۔"

میری بات پر صمدیار جزبز سا ہونے لگا۔ میں نے بات جاری رکھی۔ "میں دو تین روز میں نقشہ تیار کرلوں گا۔ تب تک میں بھی کچھ بہتر ہو جاؤں گا۔ اس کے بعد بہت احتیاط اور محفوظ طریقے سے یہ اہم کام انجام دے دیں گے۔"

"اس کی کیا ضمانت ہے کہ تمہارا محض اندازے سے بنایا ہوا نقشہ سو فیصد درست ہوگا؟" یاور نے سوال کیا۔ وہ خاصا چالاک لگا۔

میں نے کہا۔ "اندازہ سو فیصد بھلا کب درست سمجھا جاتا ہے لیکن تم نے شاید سنا نہیں کہ ہمیں نقشہ بنانے کی بھی خصوصی تربیت دی جاتی ہے۔ سو فیصد نہیں تو نوے فیصد درست ہوگا۔ کیا یہ کم ہے؟"

"چھوٹے سرکار! مجھے اس کی بات میں وزن لگتا ہے۔ آگے آپ کی مرضی۔" تیجے نے کہا۔ مخاطب صمدیار ہی تھا۔

"ٹھیک ہے۔ واپس چلتے ہیں۔" اس نے کہا۔ جیپ کا انجن اسٹارٹ تھا۔ میری یہ چال بھی کامیاب رہی تھی۔ تاہم اب بھی آگے بہت سے خدشات موجود تھے۔ پلٹتے وقت صمدیار کو میں نے نقشہ بنانے سے متعلق وہ تمام اشیا بتادیں جو کام میں لائی جاسکتی تھیں۔ وہ اس نے آج ہی مجھے پہنچا دینے کا کہتے ہوئے حسب سابق ایک دھمکی بھی نتھی کردی۔ یعنی دھوکا، چالاکی اور بعد میں انجام کار میری اس کے ہاتھوں بھیانک موت پر بنی تھی۔

وہ مجھے واپس کوٹھری پر اتار کر چلے گئے۔ چنبیلی بے چاری بڑی پریشان ان بے رحموں کے ساتھ میری واپسی کی منتظر تھی۔ مجھے صحیح سلامت ان کے ساتھ دیکھ کر اس نے اطمینان کی سانس لی۔ وہ مجھے سہارا دیے اندر آگئی۔ اماں ابھی تک نہیں آئی تھی۔ دوپہر ہو چکی تھی۔

"تو ٹھیک تو ہے نا؟ تجھے ان ظالموں نے مارا وارا تو نہیں؟" چنبیلی نے فکر مندی سے پوچھا۔

"نہیں، ایسا کچھ نہیں ہوا ابھی۔" میں نے آہستگی سے کہا اور مقدور بھر اپنے سہارے سے اپنے فرشی بستر پر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

"شکر ہے اللہ کا۔" وہ بولی۔ "خدا غارت کرے ان مردودوں کو مگر تو نے اب انہیں اپنے پیچھے لگا کر خطرناک کام کیا ہے۔"

"اپنے پیچھے نہ لگاتا تو یہ رذیل تیرے پیچھے پڑجاتے۔" میں نے بے تاثر مسکراہٹ سے کہا۔ اس کے کھلتے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا اور وہ بھیدوں

بھرے لہجے میں بولی۔

"میری خاطر تُو نے کیوں اپنی جان خطرے میں ڈال دی سہراب؟ تیری تو پہلے ہی حالت اتنی خراب ہے پھر تُو نے ابھی اپنی منگیتر اور بہن راحیلہ کو بھی ڈھونڈنا ہے۔"

"ان کا اللہ مالک ہے۔"

"میرا بھی اللہ مالک ہے۔ تُو بس بھلا چنگا ہو کر یہاں سے جتنی جلدی ہو سکے چلا جا۔" کہتے ہوئے چنبیلی نے اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا۔

"کیا ہوا؟ مجھ سے اکتا گئی ہو تم؟" میں نے یونہی ہلکی مسکراہٹ سے کہا۔

اس نے ایک دم میری طرف چہرہ گھمایا اور اپنے نازک ہاتھ کی ہتھیلی یکدم میرے ہونٹوں پر رکھ دی لیکن دوسرے ہی لمحے کچھ سوچ کر اس نے یکدم ہٹا لی اور بولی۔

"ایسا کیوں کہتے ہو۔ میں بھلا تم سے کیوں اکتانے لگی لیکن......"

"تم کچھ بھی نہ بولو اور نہ سوچو۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "بس تم یہ دعا کرو کہ اماں خیریت سے واپس لوٹ آئیں اور میرا علاج ہو جائے پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

وہ ایک ٹک میری جانب گہری گہری نگاہوں سے تکتی رہی۔ اس کے گداز لب مرتعش تھے۔ یوں جیسے کچھ ان کے جذبات کے سمندر میں بے چین الفاظ کی کشتیاں کسی ساحل کی آس میں ہچکولے لے رہی ہوں۔

"میں کھانا لاتی ہوں۔" وہ یہ کہہ کر میرے پاس سے اٹھ کر چلی گئی اور میں سوچتا رہ گیا۔

چنبیلی ایک خوب صورت اور سیدھی سادی سی دیہاتی لڑکی تھی۔ ایسی لڑکی جسے اپنے خوابوں کے شہزادے کا انتظار ہوتا ہے۔ وہ اپنے ان دیکھے شہزادے کے خیالوں اور خوابوں میں چہکتی رہتی ہے۔ اب تک اس کے دل پر کسی شہزادے نے دستک دے دینی چاہیے تھی۔ یہ بھی اچھا ہی ہوا تھا کہ میں نے اپنے بارے میں بھی اسے صاف صاف بتا دیا تھا۔ اس سے کچھ بھی نہیں چھپایا تھا۔ باوصف اس کے میں چنبیلی کی آنکھوں میں اپنے لیے بہت کچھ دیکھ رہا تھا۔ ہمدردانہ جذبات کا الگ انداز ہوتا ہے اور اپنایت کا الگ۔ میں کسی خوش فہمی کا شکار تو نہ تھا، نہ ہی مجھے اس کی ضرورت تھی لیکن چنبیلی کا اس طرح اچانک تڑپ کر میرے منہ پر ہاتھ رکھنے کا انداز اور اس کی آنکھوں میں درد کی لہر نے مجھے بہت کچھ یاد کرا دیا تھا۔ تاہم مجھے تسلی تو تھی کہ ہم دونوں ہی اس حقیقت سے واقف تھے کہ چنبیلی میری اور میں اس کی جس قسم کی بھی مدد کر رہے تھے، وہ محض انسانیت کے اعلیٰ جذبات کی معراج اور ہمدردی کے سوا اور کچھ بھی نہ تھا لیکن "تعلقِ خاطر" کا جذبہ بھی اپنے اندر بہت قوت رکھتا ہے۔ یہ تیسرے دروازے سے آ کے اندر کی دنیا اتھل پتھل کر دیتا ہے۔ ثابت قدمی کو تہس نہس کر دیتا ہے۔ اس کے در آنے کے بہت سے خفیہ دروازے ہوتے ہیں اور ان دیکھے بھی۔

وہ میرے لیے کھانا لے آئی۔ اس کا چہرہ مجھے کچھ اترا اترا سا نظر آنے لگا۔ کچھ سوچ کر میں نے بھی اسے چھیڑنا مناسب نہ سمجھا۔ اس کی تیکھی پیشانی پر ان گنت سوچوں کی لکیریں کسی ادھورے خواب کا بنتا ظاہر کر رہی تھیں۔ وہ خاموشی اور جھکی جھکی نگاہوں کے ساتھ کھانے کے برتن میرے سامنے رکھ کر اندر جانے لگی تو میں نے پکارا۔

"چنبیلی!"

وہ مڑی۔

"تم کھانا نہیں کھاؤ گی؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے...... بھوک نہیں ہے۔"

"تو پھر مجھے بھی بھوک نہیں ہے۔" میں نے بھی اسے جواب مسکت عطا کر دیا۔ وہ ایک دم سے بڑی بڑی کشمیری پلکیں پھیلا کر مجھے تکنے لگی۔ اس کی گہری آنکھوں میں بچھڑنے کا ایک درد تھا۔ یوں جیسے میں ابھی اسے الوداع کہنے لگا ہوں۔

"اچھا۔" اس نے دھیرے سے کہا اور میرے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے لگی۔ انداز بے دلی کا سا تھا۔ تب ہی میں نے اس کا ہاتھ ہولے سے تھاما۔ جب وہ منہ میں نوالہ ڈال چکی تو بولا۔

"چنبیلی! زندگی کے راستوں میں بہت سے لوگ آتے جاتے اور ملتے بچھڑتے ہیں۔ یہی زندگی ہے۔ اداس مت ہونا۔ مجھے آخر تو ایک دن یہاں سے جانا ہی ہے۔"

"تم نے پھر ایسے کیوں کہا تھا کہ ہم تم سے اکتا گئے ہیں؟" اس نے ہولے سے شکوہ کیا۔

"اوہو...... تم ایک ہی بات دل کو لگا بیٹھی ہو۔ میں نے تو یونہی مذاق میں کہا تھا۔" ماحول کی اداسی کو دور کرنے کی غرض سے میں مسکرا کر بولا۔ "کیا تم مجھے ایسا ہی کم ظرف سمجھتی ہو؟ تم اور اماں تو میرے لیے نجات دہندہ ثابت ہوئی ہو۔ قبر میں زندہ لیٹنے والے ایک ایسے شخص کو تم دونوں نے سنبھالا دیا جو واقعی ایک زندہ لاش کی شکل تھا۔ یہی نہیں، اب اماں میری صحت یابی کے لیے کتنا بڑا خطرہ مول لے کر اور اپنی جان

بچی کو خطرے میں چھوڑ کر طویل پیدل سفر پر جا نکلیں۔ یہ میں بھول سکتا ہوں؟ کبھی نہیں...... کبھی بھی نہیں۔"

پہلی بار چنبیلی کی آنکھوں میں مسرت چمکی۔ وہ کچھ شوخ سی ہو کر بولی۔ "میں نے بھی مذاق میں ہی تمہیں چھیڑا تھا۔ چلو کھانا ختم کرو۔"

ہم دونوں ہی مسکرانے لگے۔

کھانے سے فارغ ہو کر ہم دونوں باتیں کرنے کے ساتھ اماں کی واپسی کا انتظار کرنے لگے۔

"تمہیں مہلت تو مل گئی ہے لیکن اب اس قتل کرانے کی کہانی کو کہاں تک چلا سکتے ہو؟ صمد یار بہت اتاولا ہو رہا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہیں غصے اور جھلاہٹ میں آ کر وہ تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔" وہ گہری تشویش سے بولی۔

"میرے لیے اتنی مہلت کافی ہوگی۔" میں نے یقین سے کہا۔ "اسے میں نے الجھا دیا ہے۔ دولت کا محض لالچ بھی آنکھوں پر پٹی باندھ دیا کرتا ہے۔ اب وہ میرے کہنے پر مجبور رہے گا۔"

"لیکن کب تک؟ آخر تو تمہارا جھوٹ کھل جائے گا۔"

"عارضی سہی مگر عنقریب میں اسے سبق سکھا چکا ہوں گا اور تم دونوں کو بھی یہاں سے بخیر و عافیت کسی اور محفوظ جگہ چھوڑ دوں گا تاکہ پھر دوبارہ آبادی والے یا صمد یار جیسے بدطینت تم لوگوں کو تنگ نہ کریں۔"

میری بات سن کر اس کی آنکھوں میں یک دم مسرت چمکی۔ اسی لہجے میں بولی۔ "ہیں...... ! کیا واقعی تم مجھے اور اماں کو بھی اپنے ساتھ لے جاؤ گے؟" وہ ایسے میں بڑی معصوم لگی۔ مجھے اس پر ترس آنے لگا۔ میں بولا۔

"تم مجھے کیا اتنا ہی خودغرض سمجھتی ہو کہ میں بھلا چنگا ہونے کے بعد تمہیں اور اماں کو ان کے رحم و کرم پر چھوڑ جاؤں گا؟ کمال ہی کر دیا تم نے تو چنبیلی۔" میں ہنسا۔

چنبیلی کا اندازہ درست نکلا۔ سہ پہر تک اماں لوٹ آئی۔ اماں کے بخیر و عافیت لوٹ آنے پر چنبیلی سے زیادہ مجھے مسرت ہوئی تھی مگر بے چاری کی ہیئت کذائی دیکھ کر ہم دونوں ہی پریشان اور متفکر ہو گئے۔ پیادہ سفر کی دشوار گزار مسافت اور موسمی تغیر و تبدل نے اماں کی حالت ناگفتہ بہ کر دی تھی۔ میری صحت یابی کی خاطر اس ضعیف خاتون نے اتنا بڑا خطرہ اور مصیبت مول لی تھی۔ وہ سرحد پار انڈین فورسز کے ہاتھوں پکڑی بھی جا سکتی تھی۔ اس بے چاری نے میری خاطر بڑا رسک لیا تھا۔ یوں جیسے وہ اصلی میری سگی ماں ہو۔

چنبیلی اپنی ماں کی تیمارداری میں لگ گئی۔ رات تک اماں کی حالت سنبھلی۔ اس نے چنبیلی کو بقچی کھولنے کا کہا۔ میں اور چنبیلی حیرت اور بڑی اشتیاق بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگے۔ اس بھاگی بوٹی کو دیکھنے کا تجسس مجھے بھی تھا۔

چنبیلی نے بقچی سامنے رکھ کر کھول دی۔ اماں نے اس کے اندر سے ایک سیل پیک پوٹلی نکالی اور کھول کر ہمیں دکھائی۔

"یہ ہے بھاگی بوٹی۔" بتاتے ہوئے اماں کے لہجے میں مسرت تھی۔ میں نے دیکھا، بوٹی گہری سبز رنگ کی تھی۔ یوں جیسے کوئی ادرک ہو۔ وہ تو سبز نہیں ہوتی مگر بوٹی کی شکل ایسی ہی تھی۔ وہ بے بو تھی۔ دو یا تین انچ سے زیادہ نہ ہوگی۔ جیسے آدھ چھٹانک کی ادرک ہو۔

"اماں! یہ اتنے بڑے شیر کو یہ چھوٹی سی بوٹی کیا اثر کرے گی بھلا؟" چنبیلی نے پرشوخ لہجے میں دانستہ ماں سے کہا تو میں مسکرا دیا۔ شیر سے مراد میں ہی تھا۔ اماں کے کامیاب اور بخیریت لوٹ آنے سے ماحول خوشگوار ہو گیا تھا۔

اماں بولی۔ "پگلی! یہ ذرا سی بوٹی نہیں ہے۔ اس کا صرف سواں حصہ ہی اس کے لیے کافی ہوگا۔"

ابھی اماں کو یہاں کے حالات وغیرہ کے بارے میں ہم نے کچھ نہیں بتایا تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں یہاں کیا کچھ ہو چکا تھا۔ کیسی قیامت آتے آتے رہ گئی تھی...... وغیرہ۔

اماں اسی وقت دوا گھوٹنے میں لگ گئی۔ شکار کیے ہوئے بٹیر بھی وہ لے آئی تھی۔ وہ اس نے چنبیلی کو پکانے کے لیے دیے۔ رات گئے یہ کام جاری رہا۔ رات کا کھانا بھی ہم نے دیر سے ہی کھایا۔ بٹیر کا گوشت چنبیلی نے بہت لذیذ بنایا تھا۔

اماں نے سفوف کی صورت میں دوا تیار کر لی جو مجھے نہار منہ کھانا تھی۔ اسی بوٹی کا اماں نے تیل بھی بنایا تھا۔ یوں نصف بوٹی کی چار خوراکیں تھیں جو روزانہ نہار منہ کھانا تھیں۔ تیل ایک ہی بار لگانے کا تھا اور وہ تیسری خوراک کے بعد استعمال کرنا تھا۔

یہ تیل پورے جسم پر لگانے کا نہیں بلکہ صرف ہاتھوں، پیروں کے جوڑوں پر لگانا تھا۔ یہ مالش اماں نے اپنے ذمے لی تھی۔ مجھے شرمندگی محسوس تو ہوئی تھی مگر اماں نے بڑی محبت اور پیار سے مجھے گلے لگا کر کہا تھا کہ وہ مجھے اپنا بیٹا سمجھتی ہے۔

معاشرتی ناسوروں اور درندوں کی خون ریز سازشوں اور زخم زخم ہونے والے ایک جنگ باز کی دلدوز داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

ٹرین کے آنے میں ابھی کچھ دیر تھی۔ انتظار میں بیٹھے مسٹر سائمن نے ساتھ رکھے بیگ میں سے ایک ناول نکالا اور پڑھنے لگے۔ انہوں نے بینچ کی پشت سے یوں ٹیک لگا رکھی تھی جیسے ٹرین کچھ دیر نہیں، کافی دیر بعد آنے والی ہو۔ وہ ہمیشہ ایسا انداز ہی اختیار کرتے جب انہیں اپنے من پسند مشغلے یعنی مطالعے کا ٹائم ملتا۔ مسٹر سائمن کو ناول پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ جہاں کہیں جاتے، ایک دو یا بعض اوقات زیادہ کتابیں ان کے سامان میں موجود رہتیں۔ ذرا سا بھی وقت ملنے پر آرام سے ٹیک اور چشمہ لگا کر اطمینان سے مطالعہ شروع کرتے جیسے بس یہی ایک کام کرنا مقصد ہے۔

حیران کر دینے والے ایک ہمدرد چور کا طریقۂ واردات

کائنات تنوع کا مظہر ہے... ہر قدرتی چیز تغیر کی شیدائی ہے مگر... فطرت چاہے انسان کی ہو یا جانور کی... تبدیلی کو پسند نہیں کرتی... وہ دونوں بھی اپنی فطرت سے مجبور تھے... وہ جو بہت شریف النفس... بہت ملنسار طبیعت کا تھا مگر... ایسا چور تھا جو چوری بھی بہت اچھے طریقے سے کرتا اور ہیرا پھیری کی واردات میں بھی وقار قائم رکھتا تھا... اور اسی وجہ سے وہ کسی بھی سزا سے بچ ہی جاتا تھا...

طریقۂ واردات

شاہ حسنان



مسٹر سائمن کے پاس بیگ کے علاوہ تین سوٹ کیس رکھے ہوئے تھے جو کافی بڑے تھے۔ اچھا مہنگا لباس اور چہرے کی متانت سے ظاہر ہو رہا تھا کہ ایک امیر شخصیت بیٹھی ہے۔ ناول پر نظریں جمائے مسٹر سائمن کو چند منٹ گزرے تھے کہ انہیں اپنی گردن پر چاقو کا لمس محسوس ہوا۔ وہ بری طرح چونک گئے اور گھبرا کر انہوں نے سر ہلانا چاہا لیکن ہلا نہ سکے۔

"آرام سے بیٹھے رہو مسٹر!" درشت و کھردری آواز ان کی سماعتوں میں پڑی۔ ریلوے اسٹیشن پر لوگوں کی تعداد برائے نام تھی۔ کچھ فاصلے پر چند لوگ تھے۔ وہ ایک چھوٹے سے قصبے کا ریلوے اسٹیشن تھا۔ کچھ لوگ ہی ادھر کا رخ کرتے تھے۔ مسٹر سائمن کی یہاں آبائی زمین اور گھر تھا۔ وہ کبھی کبھار ہفتہ دو ہفتہ قیام کے لیے آتے تھے اور پھر اس شہر چلے جاتے جہاں چند سال قبل وہ اپنی فیملی کے ساتھ شفٹ ہو گئے تھے۔ آج بھی وہ اپنا دس دن کا قیام مکمل کر کے شہر واپس جا رہے تھے۔ بینچ پر بیٹھے ہوئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ ان کے پاس ایک لٹیرا آ کھڑا ہوا۔

"اس چاقو کی موجودگی میں آرام سے کیسے بیٹھا جا سکتا ہے، نان سنس!" مسٹر سائمن نے سنجیدگی سے کہا۔ وہ گھبراہٹ پر قابو پا چکے تھے۔ "تمہیں کیا چاہیے؟ بولو جلدی۔" انہوں نے مزید کہا۔ وہ لٹیرا اب ان کے سامنے آ چکا تھا۔ چاقو بدستور گردن پر ہی رکھا تھا۔

"اپنی گھڑی، انگوٹھی اور والٹ میرے حوالے کر دو۔" الجھے بالوں والے بیس اکیس سال کے لڑکے نے بدتمیزی سے کہا۔

"چاقو ہٹاؤ، میں گھڑی اتارتا ہوں۔" مسٹر سائمن نے کہتے ہوئے ادھر اُدھر نظر دوڑائی جسے محسوس کرتے ہی اس لڑکے نے گردن پر ہلکا سا کٹ لگا دیا۔ گردن پر کٹ لگتے ہی خون بہہ نکلا۔

"چالاکی دکھانے کی کوشش کر رہے ہو؟" مسٹر سائمن کی سوچ اس لڑکے نے بھانپ لی اور تیزی سے گھڑی اور انگوٹھی خود اتارنے لگا۔

مسٹر سائمن نے مزاحمت شروع کر دی۔ چاقو گر چکا تھا اس لیے مسٹر سائمن بے فکر تھے۔ لٹیرا کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال رہا تھا اور بھرپور کوشش میں تھا کہ کچھ تو لوٹ سکے۔ اس مزاحمت میں مسٹر سائمن کا کوٹ پھٹ گیا، بٹن ٹوٹ گئے اور خون الگ رس رہا تھا۔ دیکھنے میں دبلا سا لڑکا بہت تیز اور طاقتور ثابت ہو رہا تھا۔ مسٹر سائمن بڑھتی عمر کے باوجود کافی پھرتیلے تھے لیکن اچانک پڑنے والی افتاد سے سنبھل نہیں پا رہے تھے۔ دونوں کے درمیان لوٹنے اور لٹنے سے بچنے کی لڑائی جاری تھی کہ ایک طرف سے کوئی بھاگتا ہوا تیزی سے ان دونوں کے قریب پہنچا۔ اس نے آتے ہی دو ہاتھ اس لڑکے کے جمائے اور گردن سے پکڑ کر ایک طرف گھسیٹ کر لے گیا۔ چند اور لوگ جو دور تھے، یہ دیکھ کر وہیں پہنچ گئے۔ مسٹر سائمن نے اپنا رومال گردن پر لگے کٹ پر رکھا اور اپنے ابتر ہوتے لباس کو دیکھنے لگے۔ ان کو بچانے والا لڑکا اب ان کے پاس آ بیٹھا۔

"مسٹر! لائیں میں آپ کی مدد کروں۔" نہایت شائستگی سے کہتے ہوئے اس نے جواب سنے بغیر زخم صاف کیا اور پانی پلایا۔

"آپ کی قسمت اچھی تھی۔ بہت معمولی زخم ہے۔" وہ نوجوان ہلکا سا ہانپتے ہوئے بولا۔ مسٹر سائمن نے اس کا جائزہ لیا۔ بلیک تھری پیس میں وہ بہت اچھی فیملی کا لگ رہا تھا۔ نیلی آنکھوں پر نفیس سا نظر کا چشمہ تھا۔ لب و لہجے میں شائستگی تھی۔

"ہاں، لیکن میرا لباس بہت خراب ہو چکا ہے۔ میں تبدیل کرنا چاہتا ہوں۔" مسٹر سائمن نے کہا۔ ان کے کوٹ کے بٹن وغیرہ تو ٹوٹے ہی تھے، کالر پر خون بھی لگ گیا تھا۔

"بہت غلط طریقۂ واردات تھا اس بدتمیز کا۔ یہ کیا بات ہوئی کہ اچھے بھلے انسان کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا۔ آپ جائیں اور لباس تبدیل کر لیں۔ میں سامان کا دھیان رکھتا ہوں۔ آپ مجھ پر اعتماد کر سکتے ہیں۔" نوجوان نے مسٹر سائمن سے کہا۔ باقی لوگ اس لڑکے کو پولیس کے حوالے کرنے کا کہہ کر اپنے کام میں لگ گئے۔

مسٹر سائمن نے کپڑے بدلے ہی تھے کہ ٹرین آ گئی۔ نوجوان نے ایک بیگ گلے میں لٹکا رکھا تھا۔ اس نے بھاگ بھاگ کر مسٹر سائمن کا سامان رکھوانے میں مدد کی اور دونوں ٹرین میں آ بیٹھے۔

"میرا نام مارک ہے۔ انجینئر بن رہا ہوں۔ فٹ بال میچ دیکھنا اور کھیلنا بہت پسند ہے۔ اب آپ اپنے بارے میں بتائیں۔" ٹرین چلتے ہی نوجوان نے مسکراتے ہوئے اپنا تعارف کروایا اور ساتھ ہی سوال بھی کر دیا۔

"میرا نام سائمن ہے۔ ریٹائرڈ پروفیسر ہوں۔ یہاں آبائی زمین کے کچھ معاملات دیکھنے آیا تھا، ویسے شہر میں رہائش پذیر ہوں۔ مجھے ناول پڑھنا اچھا لگتا ہے۔" پروفیسر سائمن نے بھی اپنا تعارف کروا دیا۔ وہ بھی مسکرا رہے تھے۔ دو تین رسمی جملوں کے بعد وہ دونوں مکمل

کر باتیں کرنے لگے۔ مارک کی منزل مسٹر سائمن کی منزل سے ایک اسٹیشن پہلے تھی۔

''مارک! تمہارا شکریہ۔ تم نے عین وقت پر آ کر میری جان اور سامان بچایا ورنہ وہ احمق تو شاید میرے دل میں چاقو گھونپ دیتا۔'' مسٹر سائمن بولے۔

''مجھے غصہ آ رہا ہے اس پر۔ طریقۂ واردات بہت غلط اور انداز بہت بدتمیز قسم کا تھا۔ یہ کیا بات ہوئی کہ ایک انسان کے گلے پر کٹ لگا دیا جائے۔ اس کے کپڑے پھاڑ دیے جائیں۔ کچھ خیال کرنا چاہیے۔'' مارک بالوں میں انگلیاں پھیرتا ہوا ہلکے سے غصے سے بول رہا تھا۔

''مجھے بہت الجھن ہو رہی تھی جب میرا لباس ابتر حالت میں ہوا۔ دراصل میں اپنے کپڑوں کا بہت خیال رکھتا ہوں۔ میں ہلکی سی شکن یا بے ترتیبی برداشت نہیں کر سکتا۔ مجھے میرے حلقہ احباب میں خوش لباس پرستانی کہا جاتا ہے۔ تم دیکھو کہ میں چند دن کے قیام کے لیے کتنے سوٹ کیس لے کر آیا تھا۔ میرے سامان میں زیادہ تعداد میرے ڈریسز کی ہے۔'' مسٹر سائمن کھڑکی میں سے باہر کا منظر دیکھ رہے تھے۔

''لگتا ہے آپ کو گھڑیوں کا بھی شوق ہے۔ آپ کے ہاتھ پر بندھی گھڑی دیکھ کر خیال آیا ہے جو شاید غلط بھی ہو سکتا ہے۔'' مارک نے آگے بڑھ کر ہاتھ تھامتے اور مسٹر سائمن کی رسٹ واچ کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں، تمہارا محض خیال نہیں ہے، یہ سچ ہے۔ مجھے رسٹ واچ خریدنے، پہننے کا بہت شوق ہے، بالکل اچھے لباس کی طرح اور ہاں...... مختلف قیمتی پتھروں کی انگوٹھیاں بھی میرے پاس ہیں۔ افسوس کہ اس وقت میری انگلی والی سیت صرف تین انگوٹھیاں ہیں ورنہ میں تمہیں تمام دکھاتا۔'' مسٹر سائمن تو مارک کے دوست بن گئے تھے۔ ظاہر ہے جان بچانے والا اجنبی کیسے ہو سکتا ہے؟

''مسٹر سائمن! آپ یہاں اکیلے ہی آئے تھے؟'' مارک نے پوچھا۔

''نہیں، میرا بیٹا بھی میرے ساتھ آیا تھا۔ وہ پرسوں واپس چلا گیا تھا۔ دراصل ہم اپنی گاڑی میں آئے تھے۔ تمہیں اپنا ایک اور شوق بتاؤں...... مجھے ٹرین میں سفر کرنا اچھا لگتا ہے۔ صرف اپنا یہ شوق پورا کرنے کی خاطر میں نے اسے اکیلے بھیج دیا۔'' مسٹر سائمن بتاتے ہوئے ہنسے تھے۔

''اوہ، واقعی۔ اچھا شوق ہے...... لیکن کیا اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟'' مارک بھی ہنس دیا۔

''خاص وجہ تو کوئی نہیں۔ بس مجھے ریلوے اسٹیشن کی رونق اور پھر ٹرین کی کھڑکی میں سے باہر کے مناظر دیکھنا ایک خاص چیز لگتا ہے۔ جب میں اسٹوڈنٹ تھا تب مجھے یہ شوق پیدا ہوا تھا جو آج تک ختم نہیں ہوا۔ ٹرین میں سے درختوں، پہاڑوں، انسانوں، جانوروں کو دیکھنا میرے لیے خوش کن چیز ہے اور...... مجھے یہ بھی لگتا ہے کہ ٹرین میں ناول بھی پُرسکون انداز میں پڑھا جا سکتا ہے۔ اگر میں باہر کے مناظر نہ دیکھ رہا ہوں تو ناول پڑھتا ہوں۔'' مسٹر سائمن نے ٹیک لگا لی۔

''ارے، تو کہیں میں آپ کی دلچسپیوں میں خلل تو نہیں ہو رہا؟ میرا مطلب ہے، مجھ سے گفتگو کی وجہ سے آپ باہر دیکھ پا رہے ہیں اور نہ ہی مطالعہ کر رہے ہیں۔'' مارک نے چونک کر کہا۔ مسٹر سائمن کو اس کے چہرے کی شائستگی میں ہلکی سی شرمندگی کی واضح جھلک نظر آئی۔

''نہیں...... نہیں مارک! ایسا کچھ نہیں ہے۔ میں باہر گاہے بگاہے دیکھ رہا ہوں۔ میں کون سا مسلسل ٹکٹکی باندھ کر نظارہ کرتا ہوں اور ناول بھی میں تب پڑھوں گا جب سو رہا ہوں گا۔ تم خوامخواہ نادم ہو رہے ہو اور ویسے بھی تم میرے محسن ہو۔ میں تو تم سے بات کر کے خوشی محسوس کر رہا ہوں۔'' مسٹر سائمن نے جلدی سے اس کی غلط فہمی دور کی۔ اچانک ان کے منہ سے سسکاری نکلی۔ سیٹ ٹھیک کرتے ہوئے اچانک ہاتھ گردن کے زخم پر لگ گیا تھا۔ مارک نے ان کی طرف دیکھا۔

''بہت غلط طریقہ اختیار کیا اس نے۔ کیسے ظالمانہ انداز میں چاقو مارا۔'' مارک پھر غصہ کرنے لگا۔

''کبھی لوٹنا غلط کام ہے تو پھر اس کے لیے طریقہ بھی ہو غلط ہی ہوگا۔'' مسٹر سائمن نے گہری سانس لی۔

''پھر بھی انسانیت، تہذیب بھی کوئی چیز ہے۔'' مارک نے کہا۔

''ہونہہ...... لٹیرا بن کر انسانیت یا تہذیب کہاں۔'' مسٹر سائمن باہر دیکھ رہے تھے۔ ٹرین تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی اور اس کے ساتھ بھاگتے درخت، چلتے پھرتے انسان مسٹر سائمن کی نگاہوں کا مرکز تھے۔

''اس نے آپ کا کالر پکڑا، کوٹ کھینچا، زبردستی چیزیں چھیننے کی کوشش کی۔ ایک معزز انسان کے ساتھ ایسا کرنا بہت برا ہے۔'' مارک بھی باہر دیکھنے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ بول بھی رہا تھا۔

''چلو، یہ تو اچھا ہوا کہ میرا نقصان نہیں ہوا لیکن آج

کا دن ایک چھوٹی سی تکلیف کے حوالے سے یادگار بن گیا۔'' مسٹر سائمن اب کھل کر ہنسے تھے۔

''دن کے علاوہ میں آپ کا یہ سفر بھی یادگار بنا دوں گا۔ مسٹر سائمن! میں آپ کو بالکل بور نہیں ہونے دوں گا اور یقین دلاتا ہوں کہ اسٹیشن پر پیش آنے والے واقعے کی تکلیف بھلا دوں گا۔'' مارک نے چشمہ اتار کر صاف کر کے دوبارہ لگاتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

مسٹر سائمن نے سر ہلایا۔ کچھ دیر کے لیے دونوں خاموش ہو گئے۔ دونوں کھڑکی سے باہر کا نظارہ کر رہے تھے۔ مارک کی آنکھیں بار بار بند ہو رہی تھیں۔

''مارک! آرام کرنا چاہتے ہو تو کر لو۔ میں ذرا مطالعہ کرنے لگا ہوں۔'' مسٹر سائمن نے نرمی سے کہا اور اپنا چشمہ نکالا۔ مارک جلدی سے اٹھ کر ان کے قریب آیا۔

''ادھر لائیے اپنا چشمہ۔'' کہتے ہوئے اس نے چشمہ پکڑا اور بڑے اچھے طریقے سے صاف کر کے مسٹر سائمن کی آنکھوں پر لگا دیا۔ مسٹر سائمن نیلی آنکھوں والے شائستہ اجنبی سے بہت متاثر تھے جو اب اجنبی نہیں رہا تھا۔ مارک پھر سے اپنی جگہ پر جا بیٹھا۔ مسٹر سائمن کتاب کھول چکے تھے۔ اچانک انہیں اپنے زخم میں تیز ٹیس محسوس ہوئی۔ چہرے پر بے چینی کے تاثرات دیکھ کر مارک پھر سے کھڑا ہو گیا۔

''سر! میں آپ کی کوئی مدد کر سکتا ہوں؟'' بڑے احترام اور پریشانی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ مارک نے پوچھا۔

مسٹر سائمن نے شدید حیرانی سے اسے دیکھا۔ 'یہ نوجوان بہت انسانیت دوست ہے۔' انہوں نے سوچا۔

''میں اپنے ساتھ فرسٹ ایڈ کا سامان رکھتا ہوں۔ آپ ذرا گردن ادھر موڑیں، میں مرہم لگاتا ہوں۔'' مسٹر سائمن خاموش ہی تھے کہ نوجوان نے اگلی بات کہہ دی۔

''ٹھیک ہے، لگا دو۔'' مسٹر سائمن فوراً ہی تیار ہو گئے۔ مارک نے احتیاط سے مرہم لگایا اور پھر مسٹر سائمن کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

''مجھے حیرت ہو رہی ہے کہ کوئی انسان ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ تم نے مجھے لٹنے سے بچایا۔ ٹرین میں سوار ہونے سے لے کر اب تک میری مسلسل مدد کر رہے ہو۔ مجھے اکیلا پن محسوس نہیں ہونے دے رہے۔ مجھے لگ ہی نہیں رہا کہ میں اکیلا سفر کر رہا ہوں۔'' مسٹر سائمن متاثر کن لہجے میں مارک کی تعریف کیے جا رہے تھے۔

''سر! اس مدد کرنے میں میرا بھی فائدہ ہے۔'' مارک کی نیلی آنکھوں میں مسکراہٹ تھی۔

''کون سا فائدہ؟'' مسٹر سائمن حیران ہوئے۔

''میں آپ کا دل جیت چکا ہوں اور اس سے بڑا فائدہ کیا ہو سکتا ہے کہ انسان کسی کے اچھے جذبات حاصل کر لے۔'' مارک نے ان کا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ جواباً مسٹر سائمن نے بھی اپنا دوسرا ہاتھ مارک کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

باتیں کرتے، ناول پڑھتے اور کچھ اونگھتے آدھا سفر کٹ چکا تھا۔ اب پہلے مارک کی منزل تھی اور اس سے آدھے گھنٹے بعد مسٹر سائمن نے اترنا تھا۔ مسٹر سائمن نے آنکھیں پھر سے بند کر لیں۔ اس بار وہ اونگھنے کے بجائے سو گئے تھے۔ تقریباً بیس منٹ بعد ان کی آنکھ کھلی۔ انگڑائی لیتے ہوئے انہوں نے اپنا ہیٹ سیدھا کیا اور ڈبے میں نظر دوڑائی۔ مارک موجود نہیں تھا۔

'کسی کام سے گیا ہوگا۔' انہوں نے سوچا اور ٹائم دیکھنے کے لیے رسٹ واچ دیکھنا چاہی لیکن وہ ٹائم نہ دیکھ سکے۔

☆☆☆

''میں ایک بار پھر ''کمائی'' کرنے میں ناکام رہا ہوں۔'' ٹک نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔ آٹھ دس آوارہ، میلے سے لڑکے اکٹھے بیٹھے تھے جنھوں نے ٹک کی بات سن کر قہقہہ لگایا۔

''تم احمق ہو۔ غلطیاں کر جاتے ہو اسی لیے یہ تیسرا موقع ہے کہ تم کسی کو لوٹنے کے بجائے خود پٹنے والے تھے۔ خوش قسمتی سے تمھیں پولیس کے ہتھے چڑھنے سے بچا لیا گیا ہے۔'' ایک لمبوترے چہرے والے لڑکے نے ہنستے ہوئے اس کا مذاق اڑایا۔

''میں احمق نہیں ہوں اور یہ میں ثابت کر دوں گا۔'' ٹک کو غصہ آ گیا۔

''اس میں تمھیں ٹائم لگے گا کیونکہ ٹک سے آتے ہوئے۔'' کسی اور نے سمجھایا۔

''دیکھنے میں تو اتنا چست نہیں لگتا تھا لیکن اپنے آپ کو لٹنے سے بچانے کے لیے اس نے توقع سے زیادہ مزاحمت دکھائی۔'' ٹک کو غصہ آ رہا تھا کہ وہ ناکام کیوں رہا۔

''خود کو مصیبت سے بچانے کے لیے کوئی بھی چست و توانا ہو سکتا ہے۔ اس کی توقع ہمیشہ رکھ کر دھیان سے واردات کرنا پڑتی ہے۔'' ٹک جیسے ایک اور آوارہ لڑکے نے فلسفہ بیان کیا۔ وہ یوں کہہ رہا تھا جیسے کسی بزنس مین کو کوئی ماہر بزنس آئیڈیاز سمجھائے۔

''چلو، کوئی بات نہیں۔ انجری پر پورا یقین ہے۔ وہ تو

بغیر سارا سامان اڑائے واپس نہیں آئے گا۔'' نک نے کھڑے ہو کر ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔ اسے اینڈی کا انتظار تھا۔ وہ سب آوارہ لڑکے ایک جگہ بیٹھے اینڈی کے منتظر تھے۔ سب شکل ہی سے آوارہ، اچکے، مجرم ٹائپ لگتے تھے۔ ان کا ذریعہ معاش لوٹ مار تھا۔ ان کے گروہ میں کافی تعداد میں لڑکے تھے جو مختلف جگہوں پر مختلف طریقے سے مختلف بھیس بدل کر وارداتیں کرتے تھے۔

''جس انداز میں اینڈی واردات کرتا ہے، اس میں کبھی جلدی کامیابی مل جاتی ہے اور کبھی بھی ٹائم لگتا ہے اس لیے بے صبری مت دکھاؤ۔ وہ اپنا کام کر کے آجائے گا۔'' اپنا کیپ منہ پر رکھے زمین پر لیٹے ہوئے ایک لمبے لڑکے نے کہا۔ وہ نک کو بیٹھ جانے کا کہہ رہا تھا۔ کچھ دیر انتظار کے بعد اینڈی ایک ٹیکسی میں آیا اور ان لڑکوں سے چند قدم دور ٹیکسی رکوائی اور دو بیگ، دو بڑے سوٹ کیس اس میں سے نکالے۔ سب لڑکوں کے چہروں پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ ٹیکسی کے جاتے ہی اینڈی کے قریب چلے آئے۔

''دیر تو لگی لیکن بہت قیمتی مال ہاتھ آیا ہے۔'' اینڈی مسکرا رہا تھا۔

☆☆☆

مسٹر سائمن ٹائم نہ دیکھ سکے۔ ان کی رسٹ واچ غائب تھی ساتھ ہی نظر خالی انگلی پر پڑی۔ قیمتی انگوٹھی بھی غائب تھی۔ عقل مند آدمی تھے۔ لمحوں میں صورت حال بھانپ گئے۔ چند منٹ بعد ان پر یہ حقیقت آشکار ہو چکی تھی کہ منزل پر پہنچنے سے کچھ ہی دیر پہلے نہ صرف ان کی رسٹ واچ اور انگوٹھی بلکہ والٹ اور سارا سامان جس میں قیمتی ڈریسز، جوتے، دو عدد انگوٹھیاں اور دیگر چیزیں تھیں، لٹ چکا ہے۔ وہ تاسف بھری سانس لے کر رہ گئے۔ سامان کے ساتھ ساتھ نفیس و شائستہ مارک بھی غائب تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایک ٹیکسی میں بیٹھے اس طرح گھر جا رہے تھے کہ ہاتھ اور جیب دونوں خالی تھے اور کرایہ انہوں نے گھر جا کر دینا تھا۔ ان کا قیمتی اور فیورٹ سامان چلا گیا تھا۔ مسٹر سائمن کے چہرے پر گہری افسردگی تھی۔ مارک کا با اخلاق انداز اور مسکراتا چہرہ بار بار ان کے سامنے آ رہا تھا۔ ان کے کانوں میں مارک کے یہ جملے بھی گونج رہے تھے۔

''آپ کا یہ سفر بھی یادگار بنا دوں گا۔''

''یقین دلاتا ہوں، اسٹیشن والے واقعے کی تکلیف بھلا دوں گا۔''

''سر! آپ کی مدد کرنے میں میرا بھی فائدہ ہے۔''

''اس بدتمیز لڑکے کا طریقہ واردات بہت غلط تھا۔'' یہ جملہ ایک سے زائد مرتبہ کہا گیا تھا۔

سفر واقعی یادگار بن گیا تھا جو ساری زندگی نہ بھلایا جا سکے اور ساری چیزیں چوری ہو جانے کی وجہ سے اسٹیشن پر پیش آنے والا واقعہ معمولی لگنے لگا تھا۔ مدد کرنے سے مارک کو ''فائدہ'' ہوا تھا اور ''طریقہ واردات''......

☆☆☆

''اولڈ مین کو سونے میں بہت دیر لگ گئی۔ مجھے تو خدشہ تھا کہ سارا سفر ختم ہو جائے گا اور میں کچھ نہیں کر پاؤں گا۔'' اینڈی نے ہنستے ہوئے کہا۔

''تو پھر اس صورت میں آج پہلی بار تم خالی ہاتھ واپس آتے۔'' نک نے جو ناکامی سے دکھی بیٹھا تھا، بڑے انداز سے مسکرا کر کہا۔

''نہیں...... میں کسی بہانے، چاہے گھر تک جانا پڑتا، جاتا اور خالی ہاتھ بھی واپس نہ آتا۔'' اینڈی نے جو مسٹر سائمن کے سامنے مارک بنا ہوا تھا، چشمہ اتار کر جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔

اینڈی اور مزید انیس بیس لڑکوں کا یہ گروہ چند سال پہلے بنا تھا۔ ہمیشہ واردات کرتے ہوئے پلان ''بی'' اور ''سی'' بھی رکھتے۔ اگر ایک ناکام ہو جاتا تو دوسرا یا تیسرا فوراً حرکت میں آ جاتا۔ ان میں سے چند عام سے حلیے میں رہتے اور چند ڈیسنٹ اور ایجوکیٹڈ انداز میں رہتے۔ اگر چور اچکا ٹائپ کا ساتھی پکڑا جاتا یا لوٹ نہ پاتا تو ڈیسنٹ ٹائپ بھاگ کر شکار کو پہلے تو بچاتا پھر اسے کافی شاپ، کسی ہوٹل میں لے جا کر یا اس کے ساتھ سفر کر کے لوٹتا۔ آج بھی نک کچھ نہ کر پایا تو اینڈی نے باقی کا کام سنبھالا اور اچھا خاصا مال لوٹ لایا۔ یہ آوارہ لڑکے کبھی یہیں اور کبھی کہیں لوٹ مار کرتے اور جگہ تبدیل کرتے رہتے۔ مسٹر سائمن جب اسٹیشن پر ٹرین کے انتظار میں بیٹھے تو ان لڑکوں نے ظاہری حلیے، انگلی میں موجود قیمتی انگوٹھی اور کلائی پر بندھی برانڈڈ گھڑی دیکھ کر اندازہ لگا لیا تھا کہ تگڑی اسامی ہے جس کے سوٹ کیس بھی مہنگی چیزوں سے بھرے ہوں گے۔ انہوں نے مسٹر سائمن کو ٹکٹ لیتے دیکھا تھا۔ دراصل ان کے یہاں آتے ہی انہوں نے سب لوگوں میں سے جو چند ہی تھے، انہیں نظر میں رکھ لیا تھا اسی لیے ان کی پوری جاسوسی کی اور اینڈی نے بھی اسی شہر کا ٹکٹ لیا جہاں مسٹر سائمن نے جانا تھا۔ چند دنوں سے وہ آوارہ لڑکے زیادہ ''کمائی'' نہیں کر پا رہے تھے اور تنگ دست ہو گئے تھے۔

جائے واردات پر موجود نک، اینڈی اور جمی تینوں نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ ہر صورت آج یہ سامان لوٹیں گے۔ پہلے نک کو بھیجا گیا کہ اسٹیشن پر تقریباً تنہا بیٹھے امیر شخص کو لوٹے لیکن نک ایسا نہ کر سکا اور اینڈی کو ڈرامے میں شامل ہونا پڑا۔ جب وہ مسٹر سائمن کو تسلی دیتے ہوئے ان کو اپنی شائستگی کے جال میں پھنسا رہا تھا، جمی اپنی ڈیوٹی کرتے ہوئے نک کو دیگر لوگوں کی نسبت زیادہ مارتے ہوئے برا بھلا کہہ رہا تھا پھر اسی نے لوگوں سے کہا کہ یہ اتنی معافیاں مانگ رہا ہے، چلو چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ کہہ کر اس کی پولیس کے حوالے کرنے سے جان بخشی کروائی۔

جمی کا حلیہ بھی کافی اچھا تھا۔ اس کی بات مان لی گئی اور اینڈی ٹرین میں سوار ہو گیا۔ مسٹر سائمن سو رہے تھے نہ سیٹ چھوڑ کر ادھر اُدھر ہو رہے تھے اس لیے اینڈی کو کافی دیر لگ گئی۔ وہ بظاہر مسکرا مسکرا کر بات کر رہا تھا لیکن اندر سے اس کا خون کھول رہا تھا کہ اولڈ مین اس طرح سے اسے پریشان کر رہا ہے۔

نہ جانے کب سوئے گا اور میری جان عذاب سے چھوٹے گی۔ اس نے متعدد بار سوچا۔ وہ کن وقتوں سے بیٹھے دور رہتے تھے ورنہ اس کے دل میں کئی بار آیا تھا کہ مسٹر سائمن کو چلتی ٹرین سے دھکا دے کر سامان اٹھا لے جائے۔

آخر کار بدقسمت مسٹر سائمن سو ہی گئے اور اینڈی کی مراد بر آئی۔ اب وہ جلدی جلدی سامان کو بیچنے کے بارے میں غور کر رہے تھے۔ نک کے اناڑی پن سے جو حاصل نہ ہو سکا، وہ اینڈی کے پڑھے لکھے، سیکھے ہوئے انداز سے مل چکا تھا۔ اینڈی نے انہیں مشورہ دیا کہ آئندہ وہ ساری وارداتیں اسی طرح کریں گے کہ شکار کو شک تک نہ ہو کہ شکاری اسے پھانس رہا ہے۔ ان کے گروہ میں زیادہ وارداتیں اسی انداز میں کامیاب ہوئی تھیں۔

☆☆☆

مسٹر سائمن گھر پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے ساری تفصیل اپنی بیوی اور بیٹے کو بتا دی۔

"ہمیں پولیس میں رپورٹ کرنا چاہیے۔" ان کا بیٹا کارلس غصے سے بولا۔ "آپ کی پسندیدہ انگوٹھیاں، لباس، گھڑی اور فیورٹ ناول، سب کچھ لے گیا وہ ذلیل انسان۔" وہ بولے جا رہا تھا۔

"تمہاری مرضی ہے۔ ویسے مجھے اس جھنجھٹ میں نہیں پڑنا..... چھوڑو۔" جواباً مسٹر سائمن بولے۔

"یہ کیا بات ہوئی۔ کسی شریف انسان کو باتوں میں لگایا، اچھا امپریشن ڈالا اور لوٹ لیا۔ میرا خیال ہے پولیس کو اس کا حلیہ وغیرہ بتا دیں۔ وہ اسے اسی علاقے میں تلاش کریں جہاں سے وہ آپ کے ساتھ سوار ہوا تھا۔" کارلس کا غصہ کم نہیں ہوا۔ مسٹر سائمن خاموش بیٹھے تھے اور سوچ رہے تھے کہ ایک اجنبی پر انہوں نے اتنا اعتبار کیوں کیا کہ اپنی قیمتی چیزوں، شوق کا ذکر کر بیٹھے اور واردات سے بچ جانے پر خوش ہونے والا، بچانے والے کے ہاتھوں بہ آسانی لٹ گیا۔ ساری زندگی کا پڑھنے پڑھانے کا تجربہ بھی کسی کام نہ آیا۔ ایک اجنبی جو عمر میں ان سے کہیں چھوٹا تھا، انہیں دھوکا دے گیا۔

"ویری سیڈ، میرے ناول بھی چلے گئے۔" وہ اٹھے اور اپنے کمرے میں آرام کی غرض سے جاتے گئے۔ "کسی کا چہرہ دیکھ کر اس کا باطن کیسے دیکھا جا سکتا ہے۔ اسے نہیں پہچانا تو میرا کیا قصور؟" انہوں نے خود کو تسلی دی۔

کارلس مسلسل بول رہا تھا۔ لٹیرے کے کرتوت پر اسے شدید غصہ تھا۔ "کیسا بدتمیز شخص تھا۔ کیسے پلان بنا کر آیا اور کامیاب بھی ہو گیا۔"

مسٹر سائمن رک گئے۔ "چھوڑو، غصے کا کیا فائدہ۔ جو ہونا تھا، ہو چکا۔" انہوں نے کہا۔

"تو ڈیڈ! یہ کیا بات ہوئی کہ ایک شخص آیا۔ ایک شریف آدمی کو بے وقوف بنا کر لوٹ گیا۔ بہت غلط طریقہ ہے، بہت غلط۔" کارلس نے کرسی کے ہتھے پر زور سے ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

مسٹر سائمن ہلکا سا چونکے۔ ان کے ذہن میں مارک کے بار بار کہے گئے جملے گونجے۔ "بہت بدتمیز تھا وہ لٹیرا۔ بہت غلط طریقہ واردات تھا۔ سینے پر چاقو رکھ کر لوٹ کر چھوڑ دیا، گردن پر کٹ لگا دیا۔ بہت غلط بات ہے۔"

مسٹر سائمن کارلس کی جانب مڑے اور گہری سانس لیتے ہوئے بولے۔ "اسے بدتمیز مت کہو... جو بھی ہوا، اس کا طریقۂ واردات بہت شریفانہ تھا۔"

کارلس حیرت سے منہ پھاڑے باپ کو دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

"اس نے میرے کٹ پر مرہم لگایا، میرا چشمہ صاف کر کے لگایا، میرے ناول سنبھال کر مجھے پکڑائے، مجھ سے گپ شپ کی، مجھ سے بدتمیزی کرنے والے کو برا بھلا کہا..... بڑے نفاست بھرے لہجے میں خوب شرافت دکھائی۔ میں کیسے اس کے طریقۂ واردات کو برا کہہ سکتا ہوں؟" بیڈ پر آنکھیں بند کیے مسٹر سائمن سوچ رہے تھے۔

☆☆☆

تاتاری سپاہی جنگل میں پھیل گئے۔ انتہائی تلاش اور جستجو کے بعد انہیں کچھ جاں بہ لب مسلمان مل گئے۔ کچھ مر چکے تھے۔ مرے ہوؤں کو لے جانا فضول تھا اس لیے ان کے سر کاٹ لیے گئے اور زخمیوں سے معاملے کی بات کی گئی۔ انہیں یقین دلایا گیا کہ وہ اپنی اس جدوجہد میں کامیاب نہیں ہو سکتے اس لیے ہتھیار ڈال کر معافی حاصل کر لیں۔ اس طرح انہیں معاف کر دیا جائے گا۔ وہ اپنے ساتھیوں کے پتے بتا دیں تا کہ ان سے بھی معاملہ طے کر لیا جائے۔

اٹھارہویں صدی کا آخری عشرہ کئی بڑی شخصیات کے حوالے سے بہت یادگار رہا ہے۔ اسی عشرے کے پیدا ہونے والوں نے روس کے ایک خاص طبقے کے خلاف آواز بلند کی اور داغستان اور قفقاز کے مسلمانوں میں اسلامی روح پیدا کی۔ بے وسیلہ اور بے یارو مددگار یہ لوگ تقریباً تیس پینتیس سال تک روس کا مقابلہ کرتے رہے۔ وہ اپنی کوششوں میں کتنے کامیاب ہوئے، یہ ایک علیحدہ سوال ہے اور اس کا جواب ہنوز ہمیں نہیں ملا لیکن جب ہم چیچنیا میں مسلمانوں کو روس سے برسرِ پیکار دیکھتے ہیں تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ اپنے خاکستر کی یہی وہ چنگاری ہے جو 1859ء میں دب گئی تھی۔ سر پھرے اور سروں کو ہتھیلیوں پر لیے پھرنے والوں کی داستان۔ اللہ والے جو اللہ کے نام پر مر مٹے۔

مجاہدین کے حوالے سے امام شامل کی کاوشیں۔ گوریلا جنگ کے ماہر اور

پہلے مسلمان گوریلا جنرل کی داستان

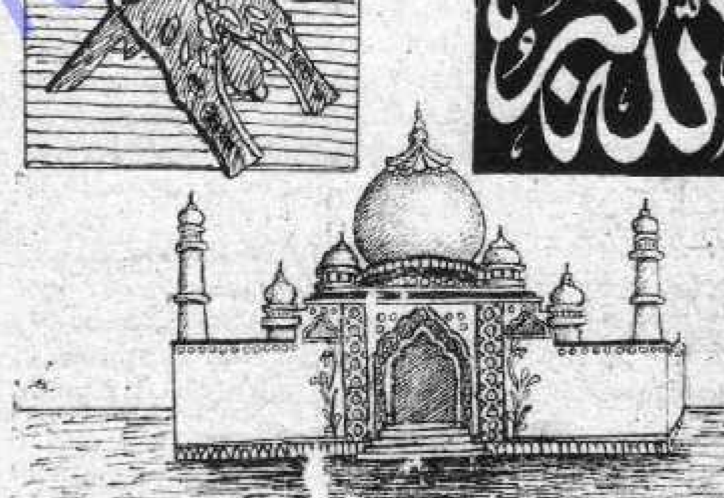
چیچنیا کا عقاب

ضیاء تسنیم بلگرامی



دوسرا حصہ





لیکن کسی ایک زخمی نے بھی ان کی اس پیشکش پر توجہ نہیں دی اور قید میں مر جانا گوارا کرلیا۔

روسی جنرل زخمی مجاہدوں کے مل جانے کے بعد بھی مجبور اور بے بس تھا۔ انجام کار یہی طے پایا کہ سفر جاری رکھا جائے اور مسلمان آبادیوں کا صفایا کردیا جائے۔

توپ خانہ ان کے پیچھے سفر کر رہا تھا اور ان پر دائیں بائیں اور آگے پیچھے سے حملے ہوتے رہے۔

زخمیوں سے گفتگو جاری رہی کیونکہ روسی جنرل اب بھی کچھ پُرامید تھا۔ اس نے ان زخمیوں سے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ ''تم لوگ زخمی ہو اور تمہارا علاج بھی ہو رہا ہے۔ ہم تمہاری بہادری کے بھی مداح ہیں اور چاہتے ہیں کہ تمہیں اپنی حکومت سے معافی دلوا دیں مگر یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب تم ہمیں اپنے ساتھیوں کے پتے بتا دو گے۔ ہم ان کے لیے بھی معافی نامے حاصل کرلیں گے۔''

ایک زخمی نے پوچھا۔ ''تیرے معافی ناموں سے ہمیں اور دوسرے مسلمانوں کو کیا فائدہ پہنچے گا؟''

جنرل نے جواب دیا۔ ''اس کے بعد تم اپنے گاؤں، اپنے قصبوں اور اپنے شہروں کے گھروں میں آزادی اور خوشحالی سے رہ سکو گے۔''

زخمی نے پوچھا۔ ''کیا اس کے بعد ہمارے علاقوں سے روسی استعماریت بھی رخصت ہوجائے گی؟''

جنرل نے جواب دیا۔ ''جسے تم اپنی جہالت اور نادانی سے روسی استعماریت کہہ رہے ہو، وہ تمہارے حق میں ایک نعمت ہے۔ ہماری حکومت اس جہالت زدہ اور پسماندہ علاقے کو ترقی دینا چاہتی ہے۔ جب تم لوگ پڑھ لکھ کر ترقی کرو گے اور علاقے سے جہالت دور ہوجائے گی تو ہم تمہیں اقتدار سونپ کر واپس چلے جائیں گے۔''

زخمی مسلمانوں کو ان کھوکھلی تسلیوں پر ہنسی آرہی تھی۔ ایک نے دریافت کیا۔ ''تم کس چیز کو جہالت اور کس شے کو علم و ترقی کہہ رہے ہو، ہمیں بھی تو معلوم ہو؟''

جنرل نے جواب دیا۔ ''تمہارا مذہب علم و ترقی کی راہ میں حائل رہتا ہے اور ہم یہ چاہتے ہیں کہ تم اپنے مذہب کو چھوڑ دو یا اس پر قائم رہو مگر خود میں اتنی لچک اور تبدیلی ضرور لاؤ کہ زمانے کے ساتھ چل سکو۔ ہم تمہارے دشمن نہیں، دوست ہیں اور آج ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں، تمہاری ترقی یافتہ نسلیں اس کا اعتراف کریں گی اور ہمیشہ ہمیں اور تمہیں خراجِ تحسین پیش کرتی رہیں گی۔''

ایک زخمی نے پوچھا۔ ''تم یہ کام کسی اور طرح بھی کرسکتے تھے۔ اس کے لیے فوج کشی کی کیا ضرورت تھی؟''

جنرل نے جواب دیا۔ ''اگر تم لوگ عیسائیوں، پادریوں اور پولیس افسروں کو قتل نہ کرتے تو ہمیں بھی طاقت کا استعمال کرنا پڑتی۔''

زخمیوں نے کہا۔ ''ہمیں اپنے عقائد اور طریقوں سے زندگی بسر کرنے دو اور اپنی ہمدردیاں اپنے علاقوں کے پسماندگان کے لیے وقف کردو۔ یہاں سے فوراً نکل جاؤ۔''

جنرل نے دھمکی دی۔ ''ہماری جو باتیں ابھی نرمی سے سمجھ میں نہیں آرہی ہیں، وہ ہماری طاقت کے استعمال کے بعد سمجھ میں آجائیں گی۔ مجھے تم پر رحم آرہا ہے کہ تم اپنی طاقت کا اندازہ لگائے بغیر ہی ختم ہوجاؤ گے۔''

ایک مجاہد نے کہا۔ ''معلوم نہیں کہ تم جذبۂ آزادی کو ہماری کمزوری کہہ رہے ہو یا روسی استعماریت کو طاقت سمجھ رہے ہو بہرحال ہم اپنے دین، اپنے عقائد اور اپنی آزادی کی بقا کے لیے تم سے جنگ کرتے رہیں گے۔''

اس گفتگو کے بعد دونوں ایک دوسرے سے مایوس ہوگئے کہ آپس میں صلح نہیں ہوسکتی۔

چیف آف دی اسٹاف نے آپس میں رازداری کے خیال سے کچھ اشارے اور کچھ کوڈ ورڈز مقرر کیے اور فوج کو ہدایت کی کہ وہ اس طرح روانہ ہوں کہ ان کے دائیں بائیں توپ خانہ حرکت میں رہے۔ درمیان میں خوراک اور دوسرا ضروری سامان رکھا جائے۔

توپ خانے کے ساتھ ساتھ دو دو نشانچی بھی چل رہے تھے۔

اس عالم میں دونوں طرف سے مجاہدین اچانک نمودار ہوتے، نشانچیوں کو نشانہ بناتے اور کہیں غائب ہوجاتے۔

توپ خانہ حرکت میں آتا اور حملہ آوروں کی طرف بڑھتا تو وہ جوابی کارروائی سے پہلے ہی کہیں غائب ہوچکے ہوتے۔

بہت جلد روسی سپاہی عاجز آگئے۔ وہ بار بار ترکیبیں سوچتے، ان پر عمل کرتے اور ناکام رہتے۔

آخرکار یہ طے پایا کہ دو دو نشانچی ناکافی ہیں۔ اب ان میں اس لیے اضافہ ضروری ہے کہ حملہ آوروں پر بہ آسانی قابو پالیے

ہیں۔ ان کی تعداد میں اضافہ کر دیا گیا اور یہ دس دس کر دیے گئے اور انہیں حکم دیا گیا کہ یہ قدم قدم پر نہایت محتاط رہیں اور جہاں کہیں بھی شبہ ہو پوری قوت سے اس سمت حملہ کر دیں۔ کچھ لوگ توپ خانے کو خبردار کریں گے تاکہ یہ توپ خانہ ان کی مدد کرے۔

یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہوئی اور مجاہدوں نے ان کا بھی صفایا کرنا شروع کر دیا۔ آخر کار یہ طے پایا کہ ان نشانچیوں کی تعداد مزید بڑھا دی جائے اور دس کی جگہ بیس کر دی جائے۔

ان معرکوں میں یہ بات بھی غلط ثابت ہو گئی کہ مجاہد جاہل ہیں اور ان کو جدید علوم سے نفرت ہے۔ مجاہد تو مروجہ ہتھیار استعمال کر رہے تھے اور فنون جنگ کے ایسے ماہر تھے کہ روس کی تربیت یافتہ فوج اور جنرل بھی بے بس ہو کر رہ گئے تھے۔

اب مجاہدوں نے ان پر ہر طرف سے حملے شروع کر دیے تھے۔ روسیوں پر حملے ہوتے، سپاہی قتل ہو جاتے، سامان لٹ جاتا اور حملہ آور کہیں نظر نہ آتے۔ بڑے سے بڑا جنرل حیران تھا کہ یہ کون سا طریقہ جنگ ہے اور ان سے کس طرح لڑا جائے جس سے ان کی طاقت ٹوٹ جائے۔ آخر کار یہ طے پایا کہ جنگل سے نکل کر مقابلہ کھلے میدان میں ہونا چاہیے۔ وہاں دشمن کی قوت کا صحیح اندازہ بھی ہو جائے گا وہاں ان کی تعداد بھی معلوم ہو جائے گی اور ان کے فوجی سامان کا بھی تفصیلی علم ہو جائے گا۔

اب یہ لوگ جلد از جلد جنگل سے نکلنا چاہتے تھے کہ کافی دور جانے کے بعد فوج کے پچھلے اور آخری حصے پر مجاہدین نے حملہ کر دیا جس سے یہ پچھلا حصہ باقی فوج سے کٹ گیا۔

بہت دیر بعد جب فوج کو اپنے پچھلے حصے کی بربادی کی خبر ملی اور یہ ان کی مدد کو پہنچے تو پچھلے حصے کا مکمل صفایا ہو چکا تھا اور حملہ آور کہیں غائب ہو چکے تھے۔ یہ بڑی بے بسی کی صورت حال تھی۔

1832ء کا مارچ کا مہینا انہی جھڑپوں میں ختم ہو گیا اور روسی فوج کو حسرت ہی رہ گئی کہ کہیں مجاہدوں سے آمنے سامنے مقابلہ ہوتا۔

انجام کار پچھلے حصے کو مضبوط کر دیا گیا کیونکہ مجاہدین کے سارے حملے فوج کے عقبی حصے پر ہوئے تھے۔

کئی میل کا سفر طے کرنے کے بعد مجاہدین کا ان کے قلب پر حملہ ہو گیا اور مجاہدین نے ان کے قلب کو برباد کر ڈالا۔

جنرل نے اپنی جدید تیاریوں کے لیے کچھ مہلت چاہی لیکن مجاہدین کا کوئی نمائندہ بھی انہیں میسر نہ آیا کہ جس کے ذریعے وہ اپنے منصوبے پر عمل کرتے۔

تاتاری سپاہیوں کو اجازت دی گئی کہ وہ پرامن آبادیوں میں جائیں، وہاں سے باتیں کریں اور حملہ آور مجاہدوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ تو دیکھیں کہ یہ آبادیاں مجاہدوں سے کوئی تعلق رکھتی ہیں یا نہیں۔

تاتاری سپاہی کارکردگی دکھانے کے شوق میں بہت آگے نکل گئے اور پرامن بستیوں میں لوٹ مار کرنے لگے۔

مسلمانوں نے تاتاریوں کو یاد دلایا۔ ”تم لوگ اپنے بزرگوں سے پوچھو وہ تمہیں بتائیں گے کہ ان کے آبا و اجداد بھی مسلمان تھے اور کبھی امیر تیمور تاتاری بھی ان کے علاقوں سے گزرا تھا۔ اس وقت یہاں کے لوگ مسلمان ہو گئے تھے اور اسلامی روایات نے ان کی زندگی میں عمل دخل کر لیا تھا۔“

تاتاری سپاہی جواب میں کہتے تھے۔ ”ہم یہ بھی نہیں سوچتے کہ ہم ماضی میں کیا تھے۔ اس وقت ہمیں یہ معلوم ہے کہ ہم روسی فوج میں ملازم ہیں اور ہمیں وہاں سے تنخواہیں ملتی ہیں۔ تم لوگ کب تک یوں ہی منہ چھپائے پھرتے رہو گے اور چوروں کی طرح حملہ کرتے رہو گے۔“

مسلمان مجاہدوں نے ان سوالوں کا جواب دیا ہوتا اگر وہ سامنے ہوتے لیکن مشکل یہ تھی کہ جن پرامن باشندوں سے ان کی ملاقاتیں ہو رہی تھیں، ان میں ایک بھی مجاہد نہیں تھا۔ دراصل مجاہد نہیں چاہتے تھے کہ ان کی وجہ سے ان بستی والوں پر مظالم ڈھائے جائیں۔ ان کی یہ ساری جنگ روسیوں سے تھی، استعمار پرستوں سے تھی، روس سے تھی، عیسائیوں سے تھی اور وہ اس بڑی طاقت کو یہ بتانا چاہتے تھے کہ جنگ کے لیے کسی عظیم لشکر اور ہتھیاروں سے زیادہ جذبہ ایمانی اور نصب العین کی ضرورت ہوتی ہے۔

روسی فوج کی حکمت عملی یہ تھی کہ مجاہدین کو کھلے میدان میں لایا جائے اور انہیں فیصلہ کن کارروائی کر کے برباد کر دیا جائے لیکن مجاہدین کا کہیں کوئی پتا نہیں تھا۔

روسی اپنے اصل لشکر کو چھپائے ہوئے تھے اور ان کے چاروں طرف حفاظتی دستے تعینات کر رکھے تھے تاکہ مجاہد لشکر تک نہ پہنچ سکیں لیکن ایک رات بھی خالی نہیں گزری۔ مجاہدین دفاعی حصار کو توڑ کر اصل لشکر تک پہنچ گئے اور اسے نقصان پہنچا کر جنگل میں غائب ہو گئے۔

روسی جنرل کا خیال تھا کہ اگر مجاہدین کا اصل لشکر سے مقابلہ ہوا تو اس کا اثر مسلمانوں کی حوصلہ شکنی کی صورت میں ظاہر ہوسکتا ہے لیکن وہ حیران تھے کہ یہ کیسے ماہر جنگجو ہیں جو کسی طرح، کسی ترکیب سے قابو میں نہیں آتے۔ آخرکار روسیوں نے خفیہ مورچے بنانا شروع کردیے اور یہ کام راتوں کو انجام دیا گیا تاکہ مجاہدین کو ان کے مورچوں کا پتا نہ چل سکے۔

رات کے اندھیرے میں روسی اپنے مورچوں میں دم سادھے بیٹھے تھے اور کسی طرف سے روشنی کی معمولی سی کرن بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ مطمئن تھے کہ مجاہدین کی نظروں سے محفوظ ہیں لیکن نصف شب کے بعد اور صبح سے پہلے اچانک ان پر حملہ کردیا گیا۔ یہ سانحہ اتنا اچانک، حادثاتی اور غیر متوقع تھا کہ روسی فوج کچھ دیر حیرت اور تذبذب کا شکار رہی۔ اس وقفے میں مجاہدین نے ان کو کافی نقصان پہنچا دیا۔ گولیوں کی آوازوں سے جنگل گونج اٹھا۔ ان پر کئی اطراف سے حملہ ہوا تھا اور حملہ آوروں کے سامنے نہ ہونے کی وجہ سے روسی اندازوں سے دشمن کو جواب دے سکتے تھے۔ انہوں نے ایسا کیا بھی اور خود کو بھی نقصان پہنچا لیا کیونکہ دشمن کی گولیاں تو روسیوں کو نقصان پہنچا ہی رہی تھیں مگر اپنی گولیاں بھی اپنوں ہی کو لگ رہی تھیں۔

روسیوں کو مجاہدین کی اس حقیقت کا علم تھا کہ ان کی تعداد زیادہ نہیں ہے اس لیے اگر ایک بار بھی ان سے کھلے میدان میں مقابلہ ہوگیا تو یہ جنگ ختم ہوجائے گی۔

ان کا یہ خیال بھی غلط ثابت ہوا اور کئی ماہ کے دوران مجاہدین کا روسی لشکر سے چار بار کھلے میدان میں آمنا سامنا ہوا۔ گھمسان کی جنگ ہوئی۔ جب تک مجاہدین نے جنگ لڑنا چاہی، لڑتے رہے اور جب ضرورت محسوس کی کہ اب مقابلہ ملتوی کردیا جائے تو وہ آہستہ آہستہ روسیوں کی نظروں سے اوجھل ہوگئے اور کچھ پتا نہ چلا کہ کہاں چلے گئے۔

کم از کم اب روسیوں کو یہ یقین ہوگیا تھا کہ یہ مجاہدین اتنے آسان لوگ نہیں ہیں جنہیں میدان جنگ میں آسانی سے زیر کیا جائے۔

ایک طرف قاضی ملا اور امام شامل تھے جو گوریلا جنگ لڑ رہے تھے اور گوریلا جنگ کی پوری حکمت عملی انہی دونوں حضرات کی سوچ سے متعلق تھی۔ دوسری طرف روسی کمانڈر انچیف تھا، چیف آف دی اسٹاف تھا، دوسرے جنرل تھے، کرنل تھے اور حکومت کے اصل وسائل تھے اور یہ سارے اسباب کم تر اور اقلیت پر مشتمل مجاہدین پر قابو پانے میں ناکام تھے۔

تھیتھیا کے جنگلوں میں ایک رات بھی پرسکون نہیں گزری۔

معلوم نہیں کس طرح روسی فوجیوں کو یہ پتا چل گیا کہ جنگل میں کچھ دور امیر حاجی یورت نامی قصبے میں مجاہدین موجود ہیں اور روسیوں کے خلاف وہیں سے کارروائیاں ہو رہی ہیں۔

روسیوں نے پانچ سو کاسکوں کے دستے کو مذکورہ مقام کی طرف بڑھایا۔ یہ کاسک دراصل قازق ہیں جو روسی زبان میں کاسک ہوگئے ہیں اور دریائے ڈان کے کنارے آباد ہیں۔ روسیوں نے ان کاسکوں کو مسلمان مجاہدوں کے مقابلے میں اس لیے بڑھایا تھا کہ یہ بھی مجاہدوں کی طرح دلیر اور جنگجو تھے اور نسلی مطابقت بھی پائی جاتی تھی۔

پانچ سو کاسک فوجی جنگل میں نہایت خاموشی سے مذکورہ قصبے کی طرف بڑھتے رہے۔ انہیں کچھ پتا نہیں تھا کہ مجاہدوں نے ان کو گھیرے میں لے رکھا ہے چنانچہ جب وہ امیر حاجی یورت کے قریب پہنچے تو ان پر چاروں طرف سے فائرنگ شروع ہوگئی۔

اس دستے کی کمان روسی کرنل وولانسکی کے ہاتھ میں تھی۔

اس نے اچانک حملے سے بچنے کی بڑی کوشش کی مگر ان کے فرار کی راہیں تک بند کردی گئی تھیں۔ جوابی کارروائی اس لیے ناممکن ہوگئی تھی کہ مجاہدین کہیں نظر ہی نہیں آ رہے تھے۔ گولیاں تھیں کہ مختلف سمتوں سے آ رہی تھیں۔ کوئی ایک سمت سے حملہ ہوتا تو اندازے سے اس کا مقابلہ کیا جاسکتا تھا۔

مجاہدوں کا یہ حملہ اتنا اچانک اور فیصلہ کن تھا کہ روسیوں کو عبرت ناک شکست ہوئی۔ کرنل وولانسکی اپنے ایک ساتھی افسر کے ساتھ مارا گیا اور دو افسر اور بیالیس سپاہی جاں بلب سسکتے رہے جبکہ ایک سو تین سپاہیوں کی لاشیں جنگل میں بکھری پڑی تھیں۔

اس واقعے کے پانچ دن بعد تک مجاہدوں کے خلاف منصوبہ بندی ہوتی رہی۔ اب یہ لوگ ایک میدانی قصبے گوموت چنگ کے قریب پہنچ چکے تھے۔

جنگل میں کچھ مقامی غیر مسلموں سے ملاقات ہوگئی۔ ان سے معلوم ہوا کہ یہ تھیتھیا کا ایک خوشحال قصبہ ہے اور اس میں تقریباً چھ سو مکانات مسلمانوں کے ہیں اور سب کے سب قاضی ملا کے ارادت مند ہیں۔ قاضی ملا اس قصبے کو بچانے کے لیے مجاہدین کی نفری ضرور بھیجیں گے اس لیے اس قصبے پر قبضہ بہت ضروری ہے۔

اس قصبے کی طرف جنرل تورتوف بڑھا۔ توپ خانے سامنے لائے گئے اور قصبے کو گھیرے میں لینے کی ترکیبیں سوچی جانے لگیں۔

روسیوں کا خیال تھا کہ کھلے میدان میں جنگ کا فیصلہ ان کے اپنے حق میں ہوگا اور بھاری بھرکم ساز و سامان دیکھ کر مسلمان خوفزدہ ہو جائیں گے۔

توپ خانے کی نمائش خاص طور پر ہوتی رہی کیونکہ مجاہدین کے پاس توپ خانہ نہیں تھا۔

جنرل تورتوف نے ایک غیر مسلم مقامی کو واسطہ بنایا اور قصبے کے مسلمانوں کو پیغام بھیجا۔ ”جیسا کہ تم نے خود بھی اندازہ لگا لیا ہوگا کہ تم اتنے طاقتور نہیں ہو کہ روسی افواج اور توپ خانے کا مقابلہ کر سکو۔ تم نے ابھی تک ہمیں بہت پریشان کیا ہے اور ہمیں تمہاری طرف سے جو نقصانات پہنچے ہیں، ان کا تقاضا یہی تھا کہ ہم تمہارے اس قصبے کو تباہ و برباد کر دیں لیکن ہم تمہاری لاعلمی اور جہالت کے علاج کی خاطر یہاں آئے ہیں۔ ہم ہر طرح تمہیں یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ ہم تمہارے دشمن نہیں، دوست ہیں اور ایک دوست کی حیثیت سے اپنے دوست کی نادانیوں کو نظر انداز بلکہ معاف کر دینا چاہتے ہیں۔ آؤ، صلح کا ہاتھ بڑھاؤ، ہتھیار پھینک دو۔ تم ہمارے روسی قیدیوں کو رہا کر دو، ہم تمہیں معاف کر دیں گے۔ تمہارے ہاں اصلاحات ہوں گی، تمہارے علاقوں کو ترقی دی جائے گی اور تمہیں دنیا کے ترقی یافتہ قصبوں اور شہروں کے برابر لایا جائے گا۔“

گفتگو جاری تھی اور جنرل تورتوف اپنے طور پر اپنی پارٹی کے ساتھ صورت حال کا جائزہ لیتا پھر رہا تھا۔ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ مکانوں سے چاروں طرف عمدہ نشانے باز موجود ہیں اس لیے ان کے سامنے پہنچنے کا یہ مطلب ہوگا کہ وہ بہ آسانی مسلمانوں کا نشانہ بن جائیں گے۔

گاؤں کے ایک سرے پر تین گھر تھے اور اطلاعات کے مطابق ان گھروں میں تقریباً کے لوگ جمع ہو گئے تھے اور انہی میں قاضی ملا کے دست راست مرید بھی شامل تھے۔

یہ تین مکان روسیوں کا مرکزی نشانہ قرار پائے اور یہ طے پایا کہ کس طرح ان مکانوں کو تباہ کیا جائے۔ ان کی تباہی کا اثر پورے قصبے پر پڑے گا اور مجاہدین سنبھلنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

ان تینوں مکانوں کو اڑا دینے کا فیصلہ ہوا۔ اڑانے کے لیے بارودی سرنگیں بچھانا ضروری تھا اور بارودی سرنگیں بچھانا اس لیے دشوار تھا کہ اگر ایک بھی روسی میدان میں پہنچتا تو وہ گولیوں کا نشانہ بن سکتا تھا۔

دیر تک آپس میں صلاح مشورے ہوتے رہے۔ آخر دو روسی آمادہ ہو گئے کہ وہ ان تینوں مکانات تک بارودی سرنگیں بچھانے کی ذمے داری قبول کرتے ہیں۔ ان دونوں نے رینگ رینگ کر مٹی کھودنا شروع کی اور بارودی سرنگوں کے ذریعے شگاف ڈالنا شروع کر دیے۔

اپنی اس کوشش میں وہ کامیاب ہو گئے لیکن دوسری طرف سے گولیوں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔

سرنگیں بچھانے والوں نے یہاں تک کامیابی حاصل کر لی کہ تینوں مکان آگ کی زد میں آ گئے۔ مسلمان اس آگ کو اپنے مکانوں کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ وہ ان کے جواب میں اپنے دشمنوں پر فائرنگ تو کر سکتے تھے مگر اپنی طرف بڑھتی ہوئی آگ کو نہیں بجھا سکتے تھے اور فائرنگ کا سلسلہ اس لیے غیر مؤثر رہا کہ روسی، مجاہدوں کی گولیوں سے بہت دور تھے۔

مجاہدوں کی اس مایوسی کے عالم میں روسیوں نے اپنے توپ خانوں کو آگے بڑھایا۔

روسی سپاہی اس وقت کا بھی انتظار کر رہے تھے جب آگ کی تپش مکانوں میں چھپے ہوئے مسلمانوں کو باہر نکلنے پر مجبور کر دے۔ اس آگ کے عمل میں کچھ روسی سپاہی ایک مکان کے روشن دان تک پہنچ گئے۔ اس روشن دان کے ذریعے اندر بم پھینکے گئے۔ ایک آدھ دھماکا بھی ہوا مگر کوئی خاص نقصان نہیں ہوا اور باقی بم نہیں پھٹے۔ ان کے لیے یہ معلوم ہوا کہ مجاہدین ان بموں پر بیٹھ گئے تھے اور انہیں پھٹنے سے پہلے ہی ناکارہ کر دیا تھا۔

آگ نے گھروں کو لپیٹ میں لے لیا اور مسلمان انہیں خالی کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اب یہ مسلمان گویا روسیوں کی زد میں تھے۔

روسی چیف آف دی اسٹاف نے جنرل تورتوف سے کہا۔ ”تم ان بہادروں کو دیکھ رہے ہو۔ انہوں نے اب تک جو کچھ بھی کیا، میں اس کی قدر کرتا ہوں اس لیے تم اپنے طور پر کوشش کرو کہ یہ جنگ سے باز آ جائیں کیونکہ اب ان کے سامنے بچت کی کوئی صورت نہیں ہے۔“

جنرل تورنوف نے ایک بار پھر ترجمان کو آگے بڑھایا اور کہا۔ ”تم مسلمانوں کو یہ یقین دلا دو کہ وہ خودکشی نہ کریں، جنگ نہ کریں۔ انہیں معاف کر دیا جائے گا اور انہیں بتاؤ کہ ان کی جانوں کی سلامتی کی ضمانت کمانڈر انچیف کی طرف سے دی جارہی ہے۔“

فائرنگ کی بوچھاڑ میں یہ ترجمان اپنے ہاتھ میں سفید جھنڈا لیے آگے بڑھا۔ فائرنگ کا سلسلہ رک گیا اور ترجمان کو مجاہدوں کے درمیان جانے کی اجازت مل گئی۔ اندر کیا طے پایا، روسیوں کو کچھ پتا نہ تھا مگر کچھ دیر بعد انہوں نے دیکھا کہ پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس ایک نیم برہنہ شخص باہر نکلا۔ وہ کچھ دیر کھڑا بہ آواز بلند کچھ کہتا رہا۔ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا، اس کے مخاطب روسی تھے۔

مترجم کو موقع دیا گیا کہ وہ روسیوں میں واپس پہنچ جائے اور جب یہ روسی ترجمان اپنوں میں واپس پہنچا تو جنرل تورنوف نے پوچھا۔ ”یہ نیم برہنہ مسلم مجاہد کیا کہہ رہا ہے؟“

ترجمان نے کہا۔ ”یہ کہہ رہا ہے کہ ہمیں کسی قسم کی امان نہیں چاہیے۔ اگر تم ہم پر کوئی احسان کرنا چاہتے ہو تو جاؤ اور ہمارے خاندانوں کو یہ بتادو کہ ہم نے زندگی پر موت کو ترجیح دی ہے اور یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ جب تک زندہ ہیں، اغیار کے جبر و استبداد اور تسلط کو نہیں مانیں گے اور ان سے جنگ کرتے رہیں گے۔“

مسلمان مجاہد کے اس اعلان نے روسیوں کو دم بخود کر دیا۔ روسی چیف آف دی اسٹاف نے اپنے آدمیوں سے کہا۔ ”افسوس کہ جب یہ لوگ مرنے پر آمادہ ہیں تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔ آگے بڑھو اور مکانوں کو چاروں طرف سے آگ لگا دو۔“

گھر جانے آگ اگلنے لگے اور جلتے ہوئے مکانوں میں سے مجاہدین تلواریں لہراتے رجزیہ اشعار پڑھتے نمودار ہونا شروع ہو گئے۔ یہ شیروں کی طرح روسیوں کی صفوں میں گھسنے کی کوشش کرتے اور مارے جاتے۔

مکانات راکھ کا ڈھیر بنتے جارہے تھے۔ باغ انگاروں کی طرح دہک رہے تھے۔ کافی دیر بعد چھ مسلمان رینگتے ہوئے باہر نکلے مگر یہ جل چکے تھے۔ روسی سپاہیوں نے انہیں ایمبولینس تک پہنچایا مگر یہ راستے میں ہی مر گئے۔

جنرل تورنوف کا خیال تھا کہ کوئی نہ کوئی پناہ کی درخواست ضرور کرے گا مگر اس کی یہ حسرت پوری نہ ہوئی۔ یہ سلسلہ ختم ہو گیا اور معلوم ہوا کہ یہ کل بہتر افراد تھے اور ایک کو بھی زندہ گرفتار نہ کیا جاسکا۔

دن میں جو کچھ پیش آیا تھا، رات کو جنرل تورنوف نے انہیں اپنی یادداشت میں اس طرح قلم بند کیا۔ ”میرا قلم کانپ رہا ہے۔ میں نے اپنی پوری ملازمت کے دوران اتنے بہادر انسان نہیں دیکھے اور آئندہ بھی شاید ہی دیکھنا نصیب نہ ہوں۔ رات ڈھل رہی ہے لیکن میں جاگ رہا ہوں۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے دل کی جگہ پتھر کا ایک ٹکڑا رکھ دیا گیا ہے۔ اف خدایا! میری آنکھوں نے یہ کیسے مناظر دیکھے۔ بہتر جیتے جاگتے انسان میری آنکھوں کے سامنے جل کر بھسم ہو گئے۔ اف خدایا...... اف خدایا!“

بظاہر یہ معرکہ یکطرفہ تھا لیکن اس میں بھی روسیوں کا ایک افسر اور سو سپاہی مارے گئے تھے اور اٹھارہ افسر اور تین سو تینتیس فوجی زخمی ہوئے تھے۔

گھمبیا کے ہرے بھرے باغات اور شاد و آباد مکانات مٹے اور راکھ کا ڈھیر بن گئے۔ اکسٹھ گاؤں مکمل طور پر تباہ و برباد ہو گئے۔

کہا جاتا ہے کہ تباہی کے یہ آثار آج بھی وہاں دیکھے جاسکتے ہیں۔

☆☆☆

اب قاضی ملا اور امام شامل کو داغستان کی فکر لاحق ہو گئی۔ انہیں یقین تھا کہ روسی ان کے وطن غمری کو ہر حال میں تباہ و برباد کرنے کی کوشش کریں گے۔ چنانچہ ان دونوں نے غمری کی حفاظت کے لیے دفاعی انتظامات کیے۔ قاضی ملا نے امام شامل کو بتایا۔ ”میں نہیں جانتا کہ میری شہادت مجھ سے کتنی دور ہے مگر موت کی آہٹ بہت قریب سے سنائی دے رہی ہے۔ شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن۔ جب میں تمہاری طرف دیکھتا ہوں تو مجھے یک گونہ سکون حاصل ہو جاتا ہے کہ میرے بعد کوئی ہے تو سہی جو جہاد کے اس بار گراں کو بہ آسانی اٹھا سکتا ہے۔ تم حالات پر نظر رکھو اور یہ سمجھو کہ اب میں تم میں موجود نہیں ہوں۔“

امام شامل یہ سب سنتے رہے اور جواب دینے کے بجائے دفاعی انتظامات کرتے رہے۔

قاضی ملا کے اندازوں کے مطابق گھمبیا کی تباہی اور بربادی کے بعد روسی فوج نے داغستان کا رخ کیا اور اب ان کے

حملے کا مرکز اور ہدف غمری تھا۔ یہاں مجاہدین روسیوں کا انتظار کر رہے تھے۔

اس موسم میں برف باری کچھ جلدی شروع ہو گئی۔ بلندیوں پر کافی برف پڑ چکی تھی۔ یہی موسم انگوروں کی تیاری کا تھا۔ غمری تک پہنچنے کے لیے روسی فوج کے سامنے صرف دو راستے تھے۔ ایک بحیرہ کا سپین کی طرف سے شورا کے راستے پانچ میل نشیب میں اتر کے..... دوسرا کرتائی کے کم دشوار گزار راستے سے۔ یہ دوسرا راستہ اختیار کیا گیا کیونکہ اس راستے سے ایک دریا تک پہنچنے کے بعد ایسی زمین مل جاتی تھی جہاں بظاہر کوئی سڑک تو نہیں تھی لیکن مسطح ہونے کی وجہ سے یہاں سڑک بنائی جا سکتی تھی۔

روسی جنرل نے سردی کے موسم سے فائدہ اٹھایا اور گہری دھند میں اپنی فوج ساز و سامان کے ساتھ دریا تک پہنچا دی اور آگے جانے کے لیے سڑک کی تعمیر شروع کروا دی۔ یہاں احمد خان نامی مقامی حاکم روسی حکومت کا وفادار تھا۔ وہ بھی مقامی ملیشیا کے ساتھ روسی جنرل سے مل گیا۔ تیسری طرف سے ایک دوسرا روسی جنرل کلگو بھی ایک بٹالین، ایک پہاڑی توپ خانے اور کچھ مقامی رسالے کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔

قاضی ملا اور امام شامل دفاعی نقطۂ نظر سے ایک ایسی جگہ سے آگاہ تھے جو دونوں معروف راستوں سے آنے والوں کو بالآخر ایک جگہ پہنچا دیتی تھی۔ اسے دونوں راستوں کا جنکشن کہا جا سکتا تھا اور یہی جگہ مجاہدین کا دفاعی مورچا قرار پائی۔ یہاں پتھر کے دو مکان بھی تھے۔ بظاہر ان دونوں مکانوں کی روسیوں کی نظر میں کوئی خاص اہمیت نہ تھی لیکن مجاہدین نے ان سے بڑا کام لیا۔

جنرل ویلیم نوف نے ایک فوجی دستے کو اپنے فوجی افسر کی نگرانی میں اس طرح روانہ کیا تھا کہ وہ طویل چکر لگا کر مجاہدین کے عقب میں پہنچ جائے اور پھر چاروں طرف سے ان کا گھیراؤ کر کے کام تمام کر دیا جائے۔

جو مقامی راہنما اس فوجی افسر کی راہنمائی کر رہے تھے، وہ دانستہ راستہ بھول گئے تھے یا قصداً جنگل کی بھول بھلیوں میں اسے پھنسا دیا تھا۔ یہ روسی دستہ کئی دن تک بھٹکتا رہا اور جب یہ منزلِ مقصود پر پہنچا تو یہ مجاہدین کے بالکل سامنے تھا۔

بچاؤ کا کوئی راستہ نہ دیکھ کر اس دستے نے جنگ کا فیصلہ کر لیا۔

قاضی ملا کے مرید حمزہ بیگ اپنے مریدوں کے ساتھ اپنے مرشد کی مدد کے لیے آگے بڑھے مگر ہر طرف روسی فوجیں موجود تھیں اس لیے حمزہ بیگ کی کمک قاضی ملا تک نہ پہنچ سکی۔

جنگ شروع ہوئی مگر روسیوں کو بھاری جانی نقصان پہنچا اور وہ پیچھے ہٹ گئے۔

کچھ توقف کے بعد روسی سنبھل گئے۔ انہوں نے دونوں مکانوں کی اہمیت کا اندازہ لگا لیا تھا اور اس حقیقت سے بھی واقف ہو چکے تھے کہ اگر مجاہدین کے پاس زیادہ آدمی ہوتے اور دونوں مکانوں کے پیچھے پہاڑی چٹانوں میں ادھر ادھر جانے کے راستے موجود ہوتے تو یہ مورچا ان کے لیے بہت ہی کارآمد ثابت ہوتا لیکن پہاڑی چٹانوں کے پیچھے خندق تھے گویا فرار کی راہیں مسدود تھیں۔ جب تک مقابلہ جاری رہتا تب تک ہی پناہ تھی۔ پیچھے ہٹنے اور بچ نکلنے کی کوئی راہ نہ تھی۔

جنگ نے بھیانک شکل اختیار کر لی اور اس میں روسی رجمنٹ کا کمانڈر بوگدووچ مارا گیا۔ اس کے ساتھ بہت سے روسی سپاہی بھی ہلاک ہوئے۔ بعد میں یہاں بوگدووچ کی ایک یادگار تعمیر کی گئی اور یہ یادگار آج بھی موجود ہے۔

جب مجاہدین کے لیے بچ نکلنا یا روسیوں کو پیچھے دھکیل دینا ناممکن ہو گیا تو کچھ شہید ہو گئے اور کچھ چٹانوں سے کود گئے اور ان کودنے والوں کی اکثریت ہلاک ہو گئی۔ کچھ مجاہدین دو دو کی تعداد میں باہر نکلتے اور روسی فوجیوں سے لڑتے ہوئے شہید ہو جاتے۔ یہاں امام شامل بھی موجود تھے اور قاضی ملا بھی۔ یہ دونوں بھی بچ نکلنا چاہتے تھے مگر روسیوں نے ان کا راستہ روک رکھا تھا۔ قاضی ملا نے امام شامل سے کہا۔ ”تم بچ نکلنے کی کوشش کرو اور میری فکر نہ کرو۔“

امام شامل کو یہ قلق تھا کہ وہ قاضی ملا کو یہاں چھوڑ کر کس طرح جائیں لیکن پھر یہ سوچ کر کہ اگر یہ دونوں اس معرکے میں کام آ گئے تو جہاد کا یہ سلسلہ رک جائے گا اور داغستان کا علاقہ روسیوں کے قبضے میں چلا جائے گا۔ امام شامل تنہا نکل جانے پر آمادہ ہو گئے۔ روسیوں نے تو یہ بھی سوچا بھی نہ تھا کہ امام شامل ان کے سامنے سے بچ کر نکل جائیں گے۔

امام شامل نے کئی روسی سپاہیوں کے اوپر سے چھلانگ لگائی اور روسی سپاہی یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ امام شامل تین روسی سپاہیوں کے اوپر سے گزر کر چوتھے کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ پلٹ کر تین روسی سپاہیوں کو ہلاک کیا مگر چوتھے روسی سپاہی نے اپنی سنگین امام شامل کے سینے میں پیوست کر دی۔ اسی حالت میں امام شامل نے ایک ہاتھ سے سینے میں پیوست

نیزہ پکڑا اور دوسرے سے حملہ آور کا کام تمام کر دیا۔ سنگین کو سینے سے نکالا اور زخمی حالت میں راہ فرار اختیار کی اور جنگل تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔

خون بہہ رہا تھا۔ پھیپھڑے، پسلی اور کاندھے کی ہڈی میں بڑی دراڑیں تھیں۔

جنگل میں کچھ مسلمان ان کے کام آگئے اور انہوں نے امام شامل کو تین دن تک چھپائے رکھا۔ یہاں سے وہ قریبی قصبے اونسوکول پہنچے۔ ان کے زخمی ہونے کی خبریں رازداری سے ان کے رشتے داروں تک پہنچادی گئیں اور رشتے کے سسر عبدالعزیز ان کے علاج کے لیے اونسوکول پہنچ گئے۔ یہ اس عہد کے ایک نامور جراح تھے۔

عبدالعزیز نے موم، مکھن اور کول تار کے مرکب سے ایک مرہم تیار کیا اور پینے کے لیے دوا بھی تیار کی۔ دوران علاج عبدالعزیز نے بتایا کہ سنگین سے ایک پسلی ٹوٹ چکی ہے اور سنگین کی انی ایک پھیپھڑے کو زخمی کر چکی ہے۔ کاندھے کی ہڈی بھی ٹوٹ گئی تھی۔

تیمارداری کے لیے امام شامل کی بہن فاطمہ بھی اونسوکول پہنچ گئیں اور پچیس دن تک امام شامل کی یہ کیفیت رہی کہ اب گئے اور جب گئے۔ کسی کو بھی یہ امید نہیں تھی کہ امام شامل زندہ بچ جائیں گے۔

پھر وہ آہستہ آہستہ صحت یاب ہونے لگے لیکن صحت یاب ہوتے ہوتے ان کی حالت ایک دم بگڑ گئی اور ایسا لگا جیسے وہ اس بار نہیں بچیں گے۔

دوسرے عزیز واقارب یا جاننے والے جو امام شامل کی دیکھ بھال کر رہے تھے، انہوں نے امام شامل کی بہن پر الزام لگایا کہ امام شامل کی دوبارہ علالت کی ذمے دار فاطمہ ہے کیونکہ یہ اپنے زخمی اور بیمار بھائی کے پاس ہیرے، جواہرات اور زیورات کے ساتھ پہنچی تھی اور ان کا یہ عقیدہ تھا کہ اگر کسی مریض کے پاس ہیرے، جواہرات اور زیورات پہنچادیے جائیں تو وہ اور زیادہ بیمار پڑ جائے گا اور اس سے اس کی موت بھی واقع ہو سکتی ہے۔

بیمار امام شامل کو جب یہ معلوم ہوا کہ ان کی بہن فاطمہ پر کچھ الزام لگائے گئے ہیں تو انہوں نے اسے واہمہ قرار دیا اور سب کو یقین دلایا کہ یہ کچھ نہیں۔ وہ پھر صحت یاب ہو جائیں گے۔

دوسری طرف جس معرکے میں امام شامل زخمی ہوئے تھے، وہاں ہر طرف مریدین کی لاشوں کے ڈھیر لگے تھے۔ روسی ان لاشوں میں ملا قاضی اور امام شامل کو تلاش کر رہے تھے مگر ناکام تھے۔ آخر کسی سپاہی نے یہ خبر دی کہ اس نے ایک عظیم الجثہ اور پُررعب شخص کی لاش اس حال میں دیکھی ہے جیسے وہ نماز پڑھ رہا ہو۔ اس کا ایک ہاتھ اپنی داڑھی پر ہے اور دوسرا ہاتھ آسمان کی جانب اٹھا ہوا ہے۔

روسی جنرل نے مقامی لوگوں کو بلوایا اور انہیں اس لاش کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا۔ ”پہچانو یہ کس کی لاش ہے؟“

مسلمانوں نے لاش دیکھی تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے کیونکہ یہ قاضی ملا کی لاش تھی۔

روسی جنرل نے مسلمانوں سے رونے کا سبب پوچھا اور جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ یہ قاضی ملا کی لاش ہے تو ان میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ہر طرف ایک جشن کا سماں نظر آنے لگا۔

چالاک روسی جنرلوں نے مقامی مسلمانوں کے دل جیتنے کے لیے قاضی ملا کی لاش کی بڑی عزت کی اور ان کی تجہیز و تکفین میں خاصی دلچسپی لی اور نہایت اعزاز و احترام سے ضلع کے صدر مقام تارکو میں دفن کروادیا۔ اس کے بعد جنرل کلنکو غمری میں داخل ہوا۔ کسی طرف سے کوئی مزاحمت نہیں ہوئی اور نہ کوئی گولی چلی لیکن غمری کے لوگ بہت افسردہ تھے۔

جنرل کلنکو نے افسردہ مسلمانوں کی دلجوئی کی اور کہا۔ ”تم لوگوں کے ساتھ جو سانحہ پیش آیا، مجھے اس کا افسوس ہے۔ تمہارے قاضی ملا بڑے آدمی تھے۔ ہم بھی ان کا احترام کرتے تھے۔ مذہبی اور متعصب ہونے کی وجہ سے وہ ہمیں سمجھ نہ سکے۔ اگر وہ ہمارے نیک عزائم پر شبہ نہ کرتے تو آج یہ سانحہ رونما نہ ہوتا اور سیکڑوں مسلمانوں کی جانیں بھی ضائع نہ ہوتیں۔

”ہم تو تمہارے علاقوں کو ترقی دینا چاہتے ہیں۔ ترقی یافتہ زمانے کے ہم قدم رکھنا چاہتے ہیں لیکن انتہا پسند مسلمان اپنی تنگ نظری اور کوتاہ بینی کی وجہ سے بھی ہمارے پروگرام کو سمجھ نہ سکے۔ اب تم لوگ دیکھنا یہ غمری کتنی ترقی کرتا ہے۔

”اب قاضی ملا کا ساتھی امام شامل باقی رہ گیا ہے۔ اگر وہ بھی کسی طرح ہمارے قابو میں آجائے تو ہم دنیا کو دکھا دیں گے کہ پسماندہ علاقوں کو کس طرح شاہراہِ ترقی پر ڈالا جاتا ہے۔“

غمری کے لوگ جنرل کلنکو کی تقریر سنتے رہے مگر وہ اس کی باتوں سے متفق نہ تھے کیونکہ ابھی تو وہ اس پر بھی یقین نہیں

کرتے تھے کہ قاضی ملا واقعی شہید ہو چکے ہیں۔ ان کے خیال میں قاضی ملا کی شخصیت ماورائے فہم و ادراک تھی اور انہیں شہید نہیں ہونا چاہیے تھا۔

مسلمانوں نے در پردہ حمزاد بیگ کو قاضی ملا کا جانشین بنایا اور مجاہدین کی یہ تحریک حمزاد بیگ کے ہاتھوں میں چلی گئی جبکہ روسی یہ سمجھ رہے تھے کہ یہ تحریک ختم ہو گئی ہے کیونکہ اس تحریک کے روح رواں صرف دو اشخاص تھے۔ ایک قاضی ملا جو شہید ہو چکے تھے اور دوسرے امام شامل جو شدید زخمی پڑے ہوئے تھے اور جن کے بچنے کے آثار نہیں پائے جاتے تھے۔

دوسری طرف امام شامل صحت یاب ہوتے چلے گئے۔ انہیں بھی قاضی ملا کی شہادت کا انتہائی دکھ تھا مگر وہ اپنی اس تحریک کو زندہ رکھنے کا عزم کیے ہوئے تھے۔ جب انہیں یہ بتایا گیا کہ حمزاد بیگ کو قاضی ملا کا جانشین قرار دیا گیا ہے اور اب یہ تحریک ان کے ہاتھ میں چلی گئی ہے تو انہیں یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ حمزاد بیگ کے کچھ مخالف بھی ہیں جو ان کی امامت کو تسلیم نہیں کریں گے اور سازشوں سے حمزاد بیگ کو عاجز کر دیں گے جس سے مسلمانوں کو نقصان پہنچے گا۔ اس طرح امام شامل کی ذمے داریوں میں بہت اضافہ ہو چکا تھا۔ انہوں نے اپنے طور پر یہ فیصلہ کیا کہ روسیوں کے خلاف یہ جنگ وہ لڑیں گے۔ وہ مسلمانوں میں حریت اور اسلام کی روح بیدار کریں گے۔ ان میں جذبہ جہاد پیدا کریں گے اور اپنے علاقے سے روسیوں کو نکال باہر کریں گے۔ انہوں نے شمال میں اشیلتا نامی مقام کو اپنا مستقر بنایا لیکن حمزاد بیگ کی موجودگی میں وہ ان کی مرضی کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتے تھے۔

حمزاد بیگ سمجھ جا رہے تھے کہ سازشیوں نے انہیں راستے ہی میں شہید کر دیا۔ اس شہادت نے یہ ثابت کر دیا کہ امام شامل کتنے روشن ضمیر، معاملہ فہم اور زمانہ شناس تھے۔ گویا انہیں پہلے سے معلوم تھا کہ حمزاد بیگ کی امامت چند روزہ ہے اور اپنے ہی لوگ انہیں نقصان پہنچائیں گے۔

امام شامل خونزاخ سے اشیلتا جانے ہی والے تھے کہ انہیں بتایا گیا کہ سازشی بلوائیوں نے حمزاد بیگ کو مسجد جاتے ہوئے گھیر کر قتل کر دیا۔ اس خبر نے امام شامل کو گویا چاق و چوبند کر دیا اور وہ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر ہی اشیلتا روانہ ہو گئے۔ یہ جگہ خونزاخ سے شمال مغرب میں واقع تھی۔

غمری پر قبضہ حاصل کرنے کے بعد بظاہر روسی حکومت مطمئن ہو گئی تھی اور اس کا خیال تھا کہ مریدین کی تحریک کا خاتمہ ہو چکا ہے مگر امام شامل کی مصروفیات نے ایک بار پھر روس کو ان کی طرف متوجہ کر دیا۔

جن روسی سپاہیوں کو داغستان میں شکستیں اٹھانا پڑی تھیں وہ دوبارہ امام شامل کے مقابلے پر جانے کے لیے تیار نہ تھے کیونکہ میدان جنگ کا تو انہیں تجربہ تھا اور اس میں سپاہی کو معلوم ہوتا تھا کہ وہ کس حد تک محفوظ یا غیر محفوظ ہے مگر امام شامل کے طریقہ جنگ میں کہیں بھی سپاہی محفوظ نہیں تھا اور اکثر مقابلہ کیے بغیر ہی مار دیے جاتے تھے۔

اس بار امام شامل کے خلاف جنرل فیسی کو داغستان روانہ کیا گیا۔ یہ 1837ء کا زمانہ تھا۔ پانچ ہزار دو سو فوجی، ایک سو اٹھی توپوں اور مارٹر توپوں کے ساتھ مئی کے آغاز میں ساحلی شہر تمر خان شورا سے چل کے دریائے اروما کے قریب پہنچے۔ یہ صرف ستائیس میل کا فاصلہ تھا جس میں پانچ دن صرف ہو گئے۔

اس فوج کو مزید سو میل کا فاصلہ طے کر کے خونزاخ پہنچنا تھا اور یہ فاصلہ بیس دن میں طے ہوا۔

امام شامل یہاں سے جا چکے تھے چنانچہ کچھ فوج اور چھ توپیں لے کر جنرل فیسی، اونسوکول روانہ ہو گیا۔ وہاں سے اشیلتا جانے کا ارادہ تھا۔

روسی فوجی اتنے خوفزدہ تھے کہ وہ جنرل فیسی کا ساتھ چھوڑ کر آس پاس روپوش ہو گئے تھے۔ جنرل فیسی کے لیے یہ خطرناک صورت حال تھی لیکن یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اونسوکول کے لوگوں نے مقابلہ کیے بغیر ہی جنرل فیسی کی اطاعت قبول کر لی۔

پانچ جون کو جنرل فیسی اونسوکول میں داخل ہوا اور مقامی عہدیداروں سے کہا۔ ''ہم تمہاری اطاعت کو اسی وقت تسلیم کریں گے جب تم لوگ بھگوڑے سپاہی ہمارے حوالے کر دو گے۔''

چنانچہ ان بھگوڑوں کی تلاش شروع ہوئی اور جب مل گئے تو انہیں جنرل فیسی کے حوالے کر دیا گیا۔ اب جنرل فیسی اشیلتا روانہ ہو گیا۔ اس نے نہایت ہوشیاری سے اشیلتا کو محاصرے میں لے لیا لیکن سات جون کی شب کو امام شامل نے یہ محاصرہ توڑ دیا۔

اس وقت جنرل فیسی کے ساتھ پانچ ہزار سپاہی تھے جن میں سے دو افسر اور بانوے سپاہی ہلاک کر دیے گئے۔ تین افسر اور ایک سو تراسی سپاہی شدید زخمی ہوئے۔

اس نقصان نے جنرل فیسی کو بدحواس کر دیا اور وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اگر اس جنگ کو طول دیا گیا تو اس کا فائدہ امام شامل کو پہنچے گا۔ اس لیے معرکے کو کم سے کم وقت میں سر کر لینا چاہیے۔

وہ 9 جون کو اپنی فوج کو داگسوگول کی طرف سے کچھ بلندی پر لے گیا۔

یہاں بھی مجاہدین کے ایک طرف پہاڑی دیوار حائل تھی اور دوسری جانب خاصی گہرائی تھی۔ مجاہدوں کو یہاں سے گاؤں کی طرف جانے کے لیے روسی تھمبوں کا سامنا تھا اور انہیں ہر حال میں روسیوں کا حصار توڑ کر گاؤں پہنچنا تھا۔ راستے میں انگوروں کی بیلوں کے خوشے لٹک رہے تھے۔

باغوں میں انگوروں کے تختوں کے زیر سایہ سفر کرنا نہایت دشوار کام تھا۔

اس وقت امام شامل کے ساتھ شوف حاجی اور کیبت ماہوما جیسے دو مسلمان مجاہد بھی مسلمانوں کی قیادت کر رہے تھے۔

جنرل فیسی نے گاؤں تک پہنچنے والے راستوں کی سخت ناکا بندی کر دی جبکہ مجاہدین نے قرآن پر ہاتھ رکھ کر یہ عہد کر لیا تھا کہ وہ جانوں کی پروا کیے بغیر یہ محاصرہ توڑ دیں گے اور گاؤں میں داخل ہو جائیں گے۔

جنرل فیسی نے مسلمانوں کو روکنے کے لیے پہاڑی توپیں بھی آگے بڑھائیں لیکن باغوں کے اندر اور انگوروں کے تختوں کے سائے تلے توپ خانے کا استعمال مشکل تھا کیونکہ یہیں روسی سپاہ بھی ناکا بندی کیے ہوئے تھی اور توپ خانے کے استعمال سے روسیوں کو بھی نقصان پہنچ سکتا تھا۔

مجاہدین نے پیش قدمی شروع کر دی اور روسی فوج ان پر حملہ آور ہو گئی۔ جنگ شروع ہو گئی۔ خون بہنے لگا۔ انگوروں کے خوشے خون سے تر ہو گئے۔

یہ جنگ گاؤں کی گلیوں تک پہنچ گئی۔ جنرل فیسی خود بھی جنگ میں شامل ہو گیا۔ یہ جنگ دست بدست ہو رہی تھی۔

مجاہدین کو جنگ کے دوران یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ گاؤں بھی کوئی محفوظ جگہ نہیں ہے اور اگر انہیں اس جنگ کو طول دینا ہے تو جنگی حکمت عملی کے تحت اشیلتا کو چھوڑ کر دریا کے اس پار پہنچ جانا چاہیے۔ چنانچہ اب وہ پل کے ذریعے دریا کے اس پار پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔

صبح سے دوپہر تک جنگ جاری رہی اور جنرل فیسی کو یقین ہو گیا کہ اس نے یہ معرکہ سر کر لیا ہے چنانچہ اس نے فوج کو حکم دیا۔ ”مجاہدین کو قتل بھی کرو اور گرفتار بھی کرو اور کسی کو بچ کر نہ جانے دو۔“

مجاہدین نے پل عبور کر لیا جبکہ اشیلتا کے عام مسلمانوں نے اپنے گھر خالی کر دیے اور پہاڑوں میں پناہ لی۔

روسی اس وقت بہت حیران ہوئے جب مجاہدین نے پل کو آگ لگا کر جلا دیا اور یہ کارروائی اس وقت عمل میں لائی گئی جب ایک ایک مجاہد پل عبور کر چکا تھا۔ جنرل فیسی کی سپاہ ایک مجاہد کو بھی زندہ گرفتار نہ کر سکی۔

مجاہدوں کی ستاسی لاشیں بکھری پڑی تھیں جبکہ زخمیوں کو وہ اٹھا لے گئے تھے۔ روسیوں کے دس افسر اور ایک سو تیرہ سپاہی ہلاک اور زخمی ہوئے۔

اشیلتا کے ہرے بھرے باغات کو آگ لگا دی گئی اور جنرل فیسی نے آگے بڑھ کر پوزیشن لینا چاہی۔ اسے روسی فوج کی مزید کمک حاصل ہو گئی۔ مجاہدین نے ان پر اچانک حملہ کیا اور جنگل میں غائب ہو گئے۔ اس اچانک حملے میں چھ افسر اور ایک سو اٹھائیس سپاہی زخمی ہوئے جبکہ ایک افسر سمیت بتیس سپاہی ہلاک کیے گئے تھے۔

اگلا معرکہ تلیتل نامی قصبے میں ہوا جہاں چھ سو گھر تھے۔

جنرل فیسی کو بتایا گیا کہ امام شامل کے آس پاس مجاہدین کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور اس کی جنگی حکمت عملی یہی تھی کہ جنگ کو طول نہ دیا جائے۔ وہ تلیتل کی طرف بڑھا اور توپ خانے کی مدد سے قصبے کو خاصا نقصان پہنچایا مگر توپ خانے سے محروم مجاہدوں نے چار دن تک روسیوں کا مقابلہ کیا۔ یہاں بھی پانچ افسر اور ساٹھ سپاہی ہلاک کر دیے گئے اور تین افسر اور دو سو تریپن سپاہی زخمی ہوئے۔

(جاری ہے)

ماخذات

سرگزشت مجاہدین، مولانا غلام رسول مہر، امام شامل، کیپٹن محمد حامد، تاریخ بخارا، بخارا کے امیر کی سرگزشت، تاتاریوں کی یلغار، ہیرالڈ لیمب، عثمان بطور (قازقوں کی داستان)، گوڈفرے لیاس



شاکا

نازیب کامران

جب ڈاکٹر وینزو کافز نامی جزیرے پر پراسرار اموات کی وجہ جاننے کے لیے آیا تو اس کا سامنا کئی عفریتوں سے ہوا... جن کے خاتمے کے لیے شاکا جیسی پراسرار طاقت نے ایک دنیا سے دوسری دنیا کا سفر کیا... چار صدیوں پر پھیلی یہ کہانی بار بار دہرائی جاتی رہی جس کے بعد چند سائنس دانوں کی ایک بھیانک غلطی نے اس دنیا کو ایک بہت بڑے خطرے سے دوچار کر دیا مگر... اس بار کوئی پراسرار طاقت ان کی مدد کے لیے ان کے ساتھ نہ تھی اور انہیں ایک بار پھر شاکا جیسی اسرار بھری ہستی کو ڈھونڈنا تھا چاہے کتنا ہی مشکل سفر ہو جاتا... گزشتہ عہد کے ڈاکٹر وینزو کی ڈائری میں لکھے تحیر انگیز راز انہیں دوسری دنیا کا رستہ دکھا رہے تھے لیکن شاکا تک پہنچنا اب اتنا آسان بھی نہ تھا...

صدیوں کی پراسرار رازوں سے جنم لینے والی

ایک دلچسپ داستان

Year-1723

Capiz-Philippines

رات کے پر پھیلاتے ہی کاپز کو طوفانی بارش نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ریزو نے بگھی کا پردہ ہٹا کر باہر جھانکا۔ تیز بارش اور بجلی کی کڑک ماحول کو پراسرار بنا رہی تھی۔ بگھی جنگل کے کچے پکے راستے پر بہ مشکل اپنی رفتار برقرار رکھے ہوئے تھی۔ جنگل میں ہر طرف ہُو کا عالم تھا۔

عام طور پر یہاں لوگ شام ڈھلنے سے پہلے ہی اپنے گھروں میں بند ہو جاتے تھے۔ گھنے جنگلات اور جزیروں سے گھرا یہ علاقہ بہ مشکل چند ہزار نفوس پر مشتمل تھا۔ علاقہ مکینوں کی بڑی تعداد ماہی گیری کے پیشے سے منسلک تھی۔ ان کا دن یا تو مچھلیاں پکڑنے میں گزرتا یا سمندری خول جمع کرنے میں۔ یہاں کی عورتیں سمندری خول کی تراش خراش کرکے انہیں باریک سے باریک تر کرتیں اور پھر اسے مختلف طریقوں سے استعمال میں لایا جاتا۔

کاپز سے ملنے والی سمندری غذا پورے فلپائن میں مشہور تھی۔ یہاں کے ماہر شکاریوں کو اپنے مضبوط بازوؤں پر فخر تھا۔ وہ سمندر میں جال بچھاتے، رنگ برنگے خول چنتے اور اس لذیذ خوراک سے لطف اندوز ہو کر کاپز کی سرزمین کو سجدہ کرکے سوتے۔ کائنات میں اتنا سکون شاید ہی کسی جزیرے پر میسر تھا۔

مگر پچھلے کچھ ہفتوں سے یہ سکون خوف میں تبدیل ہو گیا تھا۔ کاپز کے ماہر شکاری خود شکار ہونے لگے تھے۔ ان کی ادھ کھائی لاشیں کبھی سمندر کے قریب ملتیں، کبھی جنگلات میں۔ لاشوں کی حالت ایسی ہوتی کہ ڈھونڈنے والے انہیں ان کے اہل و عیال کو دکھائے بغیر ہی سمندر میں بہانے لگے۔

یہ جنگل ان کا گھر تھا۔ وہ یہاں کے چپے چپے سے واقف تھے۔ یہاں کسی آدم خور درندے کی موجودگی ناممکن تھی۔

وہ یہ علاقہ چھوڑنا نہیں چاہتے تھے لہٰذا باہمی رضامندی سے مختلف اوقات میں رہائشی علاقے کی حدود پر پہرا دینے لگے مگر کالی موت کے بھیانک پنجوں نے وہاں بھی انہیں آدبوچا۔

پہرے داروں کی اموات کے بعد کوئی بھی گھر سے نکلنے پر راضی نہیں تھا۔ شام ڈھلتے ہی سب اپنے گھروں میں دبک جاتے۔ منہ اندھیرے نکلنے والے ماہی گیر بھی ساحل کی طرف جانے سے کترانے لگے تھے۔ جب تک سورج نہ نکل جاتا کوئی بھی باہر نہ نکلتا مگر موت نے ہر حد پار کرنا شروع کر دی تھی۔

اس رات جیکب کی حاملہ بیوی لارا اسے کھانا دے کر سونے چلی گئی تھی۔ وہ بھی دن بھر کا تھکا ہارا ایسا سویا کہ دن چڑھے ہی اس کی آنکھ کھلی۔ سورج کو کھڑکی سے چمکتا دیکھ کر اسے لارا پر شدید غصہ آیا۔ ویسے ہی اس درندے کی وجہ سے ان کے شکار کرنے کا دورانیہ مختصر ہو گیا تھا۔ اوپر سے اب اسے اکیلے ساحل تک جانا پڑتا۔ جب سے اس درندے نے رہائشی علاقے کا رخ کیا تھا، وہ گروہوں کی صورت میں ساحل تک جاتے تھے۔

وہ لارا کو کوسنے کی نیت سے اندرونی کمرے کی طرف بڑھا مگر پورا کاپز اس کی چیخوں سے گونج اٹھا۔ لارا کی لاش کمرے کے فرش پر خون میں لت پت پڑی تھی۔ اس کی آنکھیں خوف سے پھٹی ہوئی تھیں۔ اس کے رحم سے بچے کو نوچ کر باہر نکالا گیا تھا اور اسے آدھا چبا کر وہیں پھینک دیا گیا تھا۔ حیرت کی بات تو یہ تھی کہ جیکب نے پچھلی رات کوئی آہٹ تک نہیں سنی تھی۔ وہ بے سدھ سوتا تھا مگر ہوش و حواس سے اس قدر بیگانہ نہیں ہو جاتا تھا کہ لارا کی مدد کے لیے کی گئی چیخ و پکار بھی نہ سن پاتا۔ علاقے میں کہرام مچ گیا۔ وہ درندہ گھروں میں داخل ہونے لگا تھا۔

جیکب کا غم کم ہونے میں ہی نہیں آ رہا تھا۔ لارا اس کی محبت تھی اور وہ اس کا پہلا بچہ تھا جو اس درندے کی بھوک کی نذر ہو چکا تھا۔

کاپز کے سیانے بالآخر دارالحکومت سے مدد کی درخواست کرنے پر مجبور ہو گئے۔ ان کا چھوٹا سا وفد تحریری درخواست کے ساتھ دارالحکومت میں گورنر کی خدمت میں حاضر ہوا۔ گورنر کو ان کا مسئلہ سمجھنے میں وقت لگا۔ آدم خور درندے کے شکار کے لیے مدد مانگنے آئے تھے جبکہ کاپز تو بہترین شکاریوں سے بھرا پڑا تھا مگر ان کی آہ و بکا معاملات کی سنگینی کا پتا دے رہی تھی۔ اس نے سپاہیوں کو فوری طور پر ڈاکٹر ریزو ویوس کے دواخانے کی طرف دوڑایا۔

ڈاکٹر ریزو ویوس کا شمار دارالحکومت کے ذہین و فطین لوگوں میں ہوتا تھا۔ پیشے سے معالج ہونے کے ساتھ ساتھ ریزو ویوس بہترین شکاری اور جاسوس تھا۔ گورنر اکثر ہی اہم معاملات میں اس کی رائے کو شامل کرنا ضروری سمجھتا تھا۔ گو کہ ریزو کی عمر بہ مشکل چھتیس سال ہوگی مگر معاملہ فہمی میں اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔

ریزو نے کاپز کے لوگوں کی درخواست پڑھنے کے بعد اس وفد سے تفصیلی ملاقات کی تھی۔ گورنر بذات خود اس

ملاقات کا حصہ تھا۔

ریزو اس نتیجے پر پہنچا کہ کافر کے حالات ان کی سوچ سے زیادہ خراب ہو چکے تھے۔ کافر چونکہ صوبے کی معاشی ترقی میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا تھا، لہٰذا فوری اقدامات کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ دوسری صورت میں شکاری وہ علاقہ خالی کرنا شروع کر دیتے اور دراصل حکومت کو بھاری نقصان اٹھانا پڑتا۔

طے یہ پایا کہ ڈاکٹر ریزو ڈیوس خود کافر کا دورہ کرے گا اور کچھ دن وہاں رہائش اختیار کرے گا۔ کافر کے جنگلات اور ساحلی علاقوں کی جانچ پڑتال کے بعد ہی کوئی حتمی فیصلہ کیا جائے گا اور اسی بنا پر وہاں فوری تعینات کی جائے گی۔

کافر کا وفد، ڈاکٹر ریزو ڈیوس کی رہائش کے انتظامات کرنے کے لیے واپس لوٹ آیا اور اب وہاں کے لوگوں کو اپنے مسیحا کا بے چینی سے انتظار تھا جو انہیں اس درندے کے عذاب سے ہمیشہ کے لیے نجات دلانے آ رہا تھا۔

ڈاکٹر ریزو ڈیوس نے دو دن کی تیاری کے بعد مطلوبہ سامان جس میں خاص کیمیکلز کی شیشیاں، کچھ ہتھیار، جاسوسی آلات اور مخصوص دوائیں شامل تھیں، کو احتیاط سے لکڑی کے صندوقچوں میں رکھوایا اور بالآخر کافر کی طرف رختِ سفر باندھا۔

گورنر ڈیوس نے ڈاکٹر ریزو کے آرام دہ سفر کے لیے دو چست گھوڑوں پر مشتمل ایک بگھی مع کوچوان کا انتظام کر دیا تھا۔ سمندری سفر سے ریزو کی طبیعت خراب ہو جاتی تھی لہٰذا اس نے بگھی کے ذریعے سفر کرنا مناسب سمجھا۔

سفر دو دن اور ایک رات پر مشتمل تھا۔ اس کے پاس وافر مقدار میں کھانے پینے کا سامان موجود تھا جو اس کے اور کوچوان کے لیے کافی تھا۔ وہ دو دن بعد شام کے قریب کافر پہنچے مگر بگھی کا پہیا ٹوٹنے اور اس کی مرمت کے باعث انہیں کافر کے جنگلوں میں داخل ہونے تک رات ہو چکی تھی۔

"رات کے سفر سے جتنا ممکن ہو، پرہیز کرنا۔ اگر کوئی مجبوری آ جائے تب بھی سورج نکلنے سے پہلے کافر کے جنگلات میں داخل ہونے کی غلطی نہ کرنا۔" ریزو کو کافر کے وفد میں موجود اس بوڑھے کے الفاظ یاد آ گئے۔ اسے بے اختیار ہی جھرجھری آ گئی۔

"اس طوفانی بارش میں یقیناً وہ درندہ بھی چھپ کر بیٹھ گیا ہو گا۔" اس نے خود کو تسلی دی اور ہاتھ میں پکڑی کتاب پر متوجہ ہو گیا۔

ابھی چند گھنٹوں کا سفر باقی تھا اور وہ وقت کو ضائع کرنے کا عادی نہیں تھا۔ اس نے عینک درست کی اور کتاب میں موجود سائنسی اصطلاحات پر غور کرنے لگا۔

اچانک جنگل وائلن کی آواز سے گونج اٹھا۔ وہ بری طرح چونکا۔ کتاب اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گئی۔ اس نے پردہ اٹھا کر باہر جھانکا۔ جنگل میں موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔

"اس طوفانی بارش میں اتنی رات کو کون ان جنگلات میں بیٹھ کر وائلن بجائے گا؟" اسے حیرت ہوئی۔

"کیا آپ بھی وائلن کی آواز سن سکتے ہیں؟" کوچوان نے چلا کر پوچھا۔

"ہاں۔ کافی صاف آواز ہے۔ لگتا ہے کوئی قریب ہی موجود ہے۔" وہ ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا۔

"اور کافر کے لوگ کہہ رہے تھے یہاں خونی درندہ گھومتا ہے۔" کوچوان ہنسنے لگا۔

ریزو نے کوچوان پر نظر ڈالی۔ وہ کہیں سے بھی خوفزدہ نہیں لگ رہا تھا۔ ریزو کو اپنے خوف پر شرمندگی محسوس ہوئی۔ کوچوان کی عمر بہ مشکل بیس، اکیس سال ہو گی مگر وہ مضبوط جسم کا مالک تھا۔ اس نے برساتی کوٹ پہن رکھا تھا اور بارش میں بھی مہارت سے بگھی اور گھوڑوں کو سنبھالے ہوئے تھا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" ریزو نے چلا کر اس سے پوچھا۔

"لوئس!" اس نے گردن کو ہلکا سا خم دے کر اپنا نام بتایا۔

"تم ایک بہادر انسان ہو۔ مجھے تم پسند آئے۔" ریزو نے اس کی تعریف کرنا ضروری سمجھا۔

"شکریہ ڈاکٹر ریزو!" وہ خوش ہو گیا۔ ڈاکٹر ریزو ڈیوس جیسے عقلمند انسان سے اپنی تعریف سننا اس کے لیے فخر کی بات تھی۔

"چلو، شاباش! اب مجھے جلد از جلد کافر پہنچاؤ۔" ریزو نے یہ کہہ کر پردہ گرا دیا۔

لوئس نے سر کو اثبات میں ہلایا اور گھوڑوں نے اس کے تیز چابک کا وار سہتے ہی اپنی رفتار دوگنی کر دی۔

ریزو کو امید تھی کہ وہ صبح ہونے سے پہلے ہی کافر کے مرکزی قصبے میں موجود ہوں گے۔ جنگل کے اس سفر نے اس کے بہت سے شکوک و شبہات دور کر دیے تھے مگر اسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ یہ راستہ اسے موت کے قریب تر کرتا چلا جا رہا ہے۔

☆☆☆

Year 2020

Vɔstok Research Centre-Russia

ہیری نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے ہی انگڑائی لی۔ اسے احساس ہوا کہ اس کی گردن مسلسل کام کرنے سے اکڑ چکی ہے۔ اس نے اپنے ہاتھ کی انگلیوں کو گردن کی پشت پر پھیرا مگر صرف گردن کا اکڑاؤ ہی اس کی بے توجہی کا باعث نہیں بنا تھا۔ اسے شدید بھوک بھی لگی تھی۔ شاید وہ دوپہر کا کھانا، کھانا بھول گیا تھا۔

اس نے گردن گھما کر چاروں طرف دیکھا۔ جوشوا، جیکال اور شمشیر بھی اسے مسلسل کام میں مصروف نظر آئے۔

وہ ایک گہری سانس لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ان سب پر تو پوری رات ایک ہی جگہ بیٹھے رہنے کا بھی کوئی اثر نہیں ہونے والا تھا لہٰذا اسے ہی اپنی پیٹ پوجا کا انتظام کرنا تھا۔

"کہاں جا رہے ہو؟" جیکال اسے کھڑا ہوتے دیکھ کر بولا۔

"بھوک لگ رہی ہے مجھے۔ فریڈ نے کچھ بتایا ہے یا نہیں؟" وہ انگڑائی لے کر بولا۔

"یہاں ہی ہوگا لیکن وہ بھی کب تک انتظار کر سکتا ہے ہمارا۔ سوچا ہوگا۔ تم ہم سب کے لیے بھی سینڈوچ لیتے آنا۔" شمشیر نے گردن گھما کر اسے ہدایات دیں۔

"تم لوگ خود کیوں نہیں کچن تک جانے کی تکلیف کرتے؟" وہ کمر پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ "اور ویسے بھی ہمیں یہاں کون دیکھنے آتا ہے؟ تم لوگ تو ایسے کام کر رہے ہو جیسے حکومتی اہلکار چوبیس گھنٹے ہمارے سروں پر سوار ہیں۔ وہ ہمیں یہاں بھیج کر بھول چکے ہیں۔ ہم ان کے لیے برف میں بنی قبروں کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں!" وہ اکتائے ہوئے لہجے میں دل جلتے ہوئے بولا۔

وہ تینوں ہنس پڑے۔

"لگتا ہے تمہیں صوفیہ کی یاد آ رہی ہے۔" جوشوا نے مسکراتے ہوئے لقمہ دیا۔

"اسے یہاں بلا کیوں نہیں لیتے؟" جیکال کو اس پر ترس آیا۔

"وہ کسی اعلیٰ سطح کے کیس کی رپورٹنگ میں مصروف ہے اور اسے وہاں سے فارغ ہونے میں مزید ایک ہفتہ لگے گا۔ لہٰذا تب تک مجھے یہ تنہائی برداشت کرنا ہوگی۔" اس کا موڈ اپنے پسندیدہ موضوع کے شروع ہوتے ہی خوشگوار ہو گیا۔

"تنہائی برداشت کرو مگر بھوک برداشت نہ کرو۔ شاباش! جلدی سے کچن کی طرف جاؤ اور ہمارے لیے بھی سینڈوچ لیتے آؤ۔" شمشیر نے اس کی ہمت بڑھائی اور وہ کندھے اچکا کر لیب سے باہر نکل گیا۔

وہ چاروں ایک اہم حکومتی پروجیکٹ کے سلسلے میں واسٹوک ریسرچ سینٹر میں تعینات تھے۔

واسٹوک ریسرچ سینٹر روس کے سب سے زیادہ ٹھنڈے اور ویران علاقوں میں شمار ہوتا ہے۔ یہاں عام طور پر درجہ حرارت منفی 89.2 ڈگری سینٹی گریڈ رہتا ہے۔ یہ اسٹیشن سمندر سے 3488 فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ واسٹوک اسٹیشن کی بنیاد سوویت یونین نے 1957ء میں رکھی تھی۔ واسٹوک اسٹیشن کے اہم مقاصد میں آئس کور ڈرلنگ اور میگنیٹو میٹری شامل ہیں۔ یہ دنیا کا سب سے زیادہ سنسان مگر جدید ریسرچ سینٹر ہے۔ یہاں کی کل آبادی پچیس افراد پر مشتمل ہے اور یہ پچیس افراد واسٹوک ریسرچ سینٹر کے اندر ہی مقیم تھے۔ ان میں چند نامور سائنسدان، ان سب کے کھانے پینے کے انتظامات کے لیے تین شیف، صفائی کے لیے مددگار اسٹاف اور کچھ لیب اسسٹنٹ شامل تھے...

آمد و رفت کا واحد ذریعہ یہاں کا پرائیویٹ ایئرپورٹ تھا جو صرف روسی حکومت کے اہم افسران ہی استعمال کر سکتے ہیں۔

یہاں تعینات سائنس دانوں کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا تھا کہ حکومت نے یہاں دنیا کے بہترین دماغوں کو اکٹھا کیا تھا۔ وہ سب اپنی اپنی فیلڈ کے ماہر ترین لوگ تھے اور ان سب کا آئی کیو لیول عام انسان سے کئی گنا زیادہ تھا۔

مگر یہ لوگ یہاں سے کہیں باہر نہیں جا سکتے تھے۔ پروجیکٹ کی حساسیت کی وجہ سے باہر کی دنیا سے ان کے روابط محدود تھے اور وہ ایک خاص عرصے تک اسی سینٹر میں کام کرنے کے پابند تھے۔

ایمرجنسی کی صورت میں وہ اپنے اہل و عیال سے ٹرانسمیٹر کے ذریعے رابطہ کر سکتے تھے مگر ان ٹرانسمیٹر کالز کا بھی باقاعدہ ریکارڈ رکھا جاتا تھا۔ ان کی خوراک اور دیگر ضروریات کا تمام سامان ہفتے میں ایک دفعہ ہوائی جہاز کے ذریعے سینٹر پہنچا دیا جاتا تھا۔ ایک طرح سے وہ اس سینٹر کی چار دیواری میں قید تھے۔

اس کی دوسری وجہ ہوا میں آکسیجن کی کمی اور نمی کا تناسب بھی تھا۔ یہاں سے باہر نکلتے ہی انہیں اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہوتا۔ اگر وہ یہاں سے کہیں اور جانا بھی چاہتے تو بغیر ہوائی جہاز کے ممکن نہ ہوتا۔ کسی بھی میڈیکل ایمرجنسی سے نمٹنے کے لیے واسٹوک اسٹیشن میں ہی دو ڈاکٹر مستقل طور پر رہائش پذیر تھے۔

یہاں قیام اور ریسرچ کے عوض روسی حکومت نے ان سب کو اس قدر خطیر معاوضے سے نوازا تھا کہ ان کی آئندہ

نسلیں بھی آرام سے بیٹھ کر کھا سکتی تھیں۔ لہٰذا انہیں یہاں کام کرنے میں کوئی پریشانی نہیں تھی۔

مہینے میں ایک دفعہ وہ واسٹوک سینٹر سے ہوائی جہاز کے ذریعے قریبی فوجی اڈے پر اتر کر اپنے گھر والوں سے ملاقات کر سکتے تھے اور پھر انہیں وہیں سے واپس روانہ کر دیا جاتا۔

ابتدائی طور پر ان کا حکومت سے تین سال کا معاہدہ تھا اور ڈیڑھ سال کا عرصہ جیسے تیسے گزر ہی چکا تھا۔ اس کے بعد وہ چاہتے تو معاہدہ ختم کر سکتے تھے یا اپنا کام جاری رکھتے ہوئے مزید فوائد حاصل کرتے۔ ویسے بھی ان سب کو سکون سے کام کرنے کی عادت تھی۔ یہاں کے جدید ترین اور لیبارٹریز، ان کی ہر چینل تک رسائی اور ان کی پسند کا کھانا ان کے سامنے ہمہ وقت موجود ہوتا لہٰذا ان کو یہاں کوئی پریشانی نہیں تھی مگر ہیری جو کہ ان کے مقابلے میں نوجوان اور غیر شادی شدہ تھا، کبھی کبھی اس ماحول سے اکتا جاتا لیکن وہ جانتا تھا کہ صوفیہ سے شادی کرنے کے لیے اسے اس پروجیکٹ کی سخت ضرورت تھی۔

صوفیہ ایک مشہور چینل میں نیوز رپورٹر تھی اور مستقبل میں اپنا نیوز چینل کھولنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ گزشتہ دو سالوں سے ہیری کی منگیتر تھی۔ ہیری اسی پروجیکٹ کی وجہ سے اس کا یہ خواب پورا کرنے کے قابل ہوا تھا مگر اس نے وہ رقم صوفیہ کو دینے کے بجائے تین سال تک اپنے پاس رکھنا ہی مناسب سمجھا۔ وہ یہاں سے باہر نکل کر صوفیہ کو سرپرائز دینا چاہتا تھا۔ صوفیہ کو اندازہ تھا کہ ہیری ہی اس کے تمام خواب پورے کر سکتا ہے لہٰذا وہ بھی اس کے ساتھ خوش تھی۔ وہ ہفتے، دو ہفتے بعد اس سے ملاقات کے لیے آتی تھی اور دو دن گزار کر واپس چلی جاتی۔

یہ سہولت صرف صوفیہ کو ہی میسر تھی کیونکہ ہیری نے پروجیکٹ پر کام کرنے کی شرائط میں صرف اسی نکتے پر زیادہ زور دیا تھا۔ وہ دنیا کا جانا مانا آئی ٹی ایکسپرٹ اور ہیکر تھا لہٰذا اس کی بات بے چون وچرا مان لی گئی۔ صوفیہ کو فوجی اڈے سے اچھی طرح چیکنگ کرنے کے بعد روانہ کیا جاتا۔ وہ اپنے ملک سے مخلص بھی تھی اور سیکیورٹی معاملات کی نزاکت کو اچھی طرح سمجھتی تھی لہٰذا راز کو راز ہی رکھتی تھی۔ اس کے اور ہیری کے رشتے کے بارے میں فی الحال اس کے باپ کے علاوہ اور کسی کو معلوم نہیں تھا۔ صوفیہ ہر تیسرے ویک اینڈ پر باپ سے ملنے کے بہانے ہیری سے ملنے آتی تھی۔ لہٰذا اس کے دوستوں اور چینل کے ساتھیوں کو آج تک کسی قسم کا شک نہیں ہوا تھا۔

جیکال اور شمشیر کی عمریں بمشکل پینتیس سے چالیس سال کے قریب تھیں اور دونوں ہی بال بچوں والے تھے۔ ان کے خاندان اس پروجیکٹ کے توسط سے ملنے والی مراعات پر چین سے گزر بسر کر رہے تھے اور مہینے میں ایک دفعہ فوج کی نگرانی میں واسٹوک اسٹیشن کے قریبی فوجی اڈے پر ان سے ملاقات کرنے آتے تھے۔ واسٹوک اسٹیشن چونکہ کافی بلندی پر موجود تھا لہٰذا ہر کسی کو وہاں تک رسائی دینا ناممکن تھا۔ شمشیر اور جیکال خود ہی ہوائی جہاز کے ذریعے فوجی اڈے تک جاتے اور اسی طرح واسٹوک اسٹیشن کے باقی ملازمین کی ملاقات بھی ان کے اہل وعیال سے کروائی جاتی۔

البتہ جوشوا سے کبھی کوئی ملاقات کے لیے نہیں آیا تھا اور نہ ہی وہ اس ڈیڑھ سال کے عرصے میں کسی سے ملاقات کے لیے گیا تھا۔ وہ چالیس کی عمر کو پہنچنے کے باوجود اب تک غیر شادی شدہ تھا۔

یوں لگتا تھا کہ اس نے اپنی زندگی ریسرچ کے لیے وقف کر دی ہے۔ جیکال اکثر اسے دو دماغوں والا کہہ کر مخاطب کرتا۔ وہ جرثوموں اور مختلف جانوروں کے ڈی این اے پر ریسرچ کر رہا تھا۔

کہنے کو تو واسٹوک اسٹیشن کا اصل کام کوڈورنگ اور سیکیورٹی ہیکنگ تھا مگر سائنس والوں کی یہ ٹیم ایک خاص حیاتیاتی ہتھیار کی تیاری پر کام کر رہی تھی۔

جوشوا ان کی ٹیم کا سربراہ تھا۔

ہیری سینڈوچ لے کر آ گیا تھا۔ وہ سب اپنی اپنی ڈیسک پر ہی سینڈوچ سے انصاف کرنے لگے۔

”آج رات میں لیب میں گزاروں گا۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ ہم کامیابی کے قریب ہیں۔“ جوشوا نے سکون سے اپنی بات مکمل کی۔

”کیا واقعی؟“ شمشیر اپنی کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

جوشوا نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا اور سینڈوچ کھانے لگا۔

”یعنی ہماری محنت رنگ لے آئی۔“ جیکال بھی پُرجوش ہوا۔

”اتنی بڑی خوشخبری اور وہ بھی بغیر وائن کے؟“ ہیری کمرے سے باہر نکل گیا۔

”میں بھی تمہاری مدد کے لیے لیب میں موجود رہوں گا۔“ جیکال بولا۔

”آج نہیں۔ مجھے مدد کی ضرورت پڑی تو میں

بتادوں گا پہلے سے۔" جوشوا نے ہمیشہ کی طرح مدد لینے سے انکار کیا۔

"سیلیبریشن ٹائم۔" ہیری وائن کی بوتل تھامے کمرے میں دوبارہ داخل ہوا اور وہ تینوں ہنس پڑے۔

جب سے وہ یہاں آئے تھے جوشوا کچھ خاص ڈی این ایز پر کام کر رہا تھا۔ اسے کام کرنے کے لیے الگ سے ایک لیب تیار کر کے دی گئی تھی جہاں جوشوا کے علاوہ اور کوئی داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ ان تینوں میں سے کسی نے بھی آج تک وہ لیب نہیں دیکھی تھی۔ واشنگٹن میں جوشوا کی لیب کے علاوہ بھی دو جدید لیبارٹریز موجود تھیں لہٰذا کسی کو بھی جوشوا کی ذاتی لیب سے کوئی مسئلہ نہ تھا۔

جوشوا اکثر کئی کئی دنوں تک اس لیب میں بند ہو جاتا تھا۔ کام کی نوعیت چونکہ خفیہ تھی اس لیے سب ہی اپنے کام سے کام رکھتے اور کریدنے سے گریز کرتے۔ ان سب کی کامیابی کا دارومدار جوشوا کی ریسرچ سے جڑے اس ڈی این اے چین کے انسانی خون سے مل جانے پر تھا۔ جب تک یہ تجربہ کامیاب نہ ہوتا وہ آگے نہیں بڑھ سکتے تھے اور آج جوشوا نے انہیں یہ خوشخبری بھی سنا دی تھی۔

"تو کل ہم ڈی این اے سلنگ کا کامیاب تجربہ کریں گے۔ شکر ہے کہ کام آگے بڑھے گا۔" شمشیر نے وائن کا گلاس ہوا میں لہراتے ہوئے کہا۔

شمشیر روسی نژاد مسلمان تھا۔ اس کے آبا و اجداد ایک عرصے سے روس میں مقیم تھے۔ اس کا اوڑھنا بچھونا بھی ملک تھا اور وہ اسی رنگ میں مکمل طور پر رنگ چکا تھا۔ ویکسینز اور ان سے ہونے والے ری ایکشن کی صورت میں اینٹی باڈیز تیار کرنا اس کی ایکسپرٹیز میں شامل تھا۔ کسی بھی نئے تجربے کی صورت میں بیماری کے پھیلاؤ کو روکنے یا مخصوص لوگوں کی مصونیت (امیونائزیشن) بہت ضروری تھی اور شمشیر کسی بھی مہلک بیماری کا توڑ گھنٹوں میں تلاش کر سکتا تھا۔ لہٰذا شمشیر کا اس ٹیم میں موجود ہونا بہت ضروری تھا مگر ویکسین تو تب تیار ہوتی نا جب جوشوا کا تجربہ کامیاب ہوتا اور آج اسے وہ خوشخبری بھی مل گئی تھی۔

"کل نہیں۔ مجھے تین چار دن مزید لگیں گے۔ میں نے آٹھ مختلف ڈی این ایز پر کام کرنا شروع کیا تھا اور مجھے ان میں سے تین جینز پر کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ اب مجھے کچھ جانوروں پر ان کے تجربات کرنے ہیں۔ اس کے بعد ہی ہم انسانی تجربات کی طرف آئیں گے۔ میں تمہیں جینز کی میچنگ رپورٹ ای میل کر رہا ہوں۔ تم ویکسین پر کام شروع کر سکتے ہو۔" جوشوا نے سنجیدگی سے انہیں تفصیلات سے آگاہ کیا اور شمشیر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"کیا اب تم ہمیں یہ بتانا پسند کرو گے کہ یہ ڈی این ایز اصل میں ہیں کس کے اور تم نے کہاں سے حاصل کیے؟" جیکال کو ہمیشہ سے اسی بات کا تجسس تھا۔

جیکال ڈی کمپوزنگ ایکسپرٹ تھا۔ کسی بھی جانور یا پودے کے مردہ خلیوں میں مصنوعی طریقے سے جان ڈالنا یا ان کے مردہ خلیوں کو نئی زندگی دینے میں اسے کمال حاصل تھا۔ وہ اب تک کئی کامیاب تجربات کر چکا تھا اور سائنس دانوں میں "گاڈ آف دی ڈیڈ" کے نام سے جانا جاتا تھا۔ جوشوا نے اسی کی مدد سے ان ڈی این ایز کو تجربے کے قابل بنایا تھا۔

"انسانی تجربات کرنے سے پہلے میں تم سب کو تفصیلی بریفنگ دوں گا۔ تین چار دن مزید انتظار کرو۔" جوشوا مسکرایا تو ان سب نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اپنی اپنی فیلڈ کے یہ ایکسپرٹ دنیا میں خون کی ایک نئی ہولی کھیلنے کی تیاری میں مصروف تھے مگر وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ یہ کھیل انہی پر الٹا پڑنے والا تھا۔

☆☆☆

Year 1723

Jungdaal–Parallel Universe

3:00am

رات گہری ہو چکی تھی۔ جنگل کو کہرے اور بادلوں نے ڈھک رکھا تھا۔ میلوں دور کالی چٹانوں پر گرتی عظیم الشان آبشار کی گونج رات کے اس پہر خوفناک معلوم ہوتی تھی۔ جنگل کے باسی محو استراحت تھے مگر الو اور چمگادڑ وقتاً فوقتاً رات پر اپنی جاگیر ہونے کا حق جتانے کے لیے آواز نکال رہے تھے۔

مگر رات تو صرف اس کی جاگیر تھی۔ یہ جنگل اس کا گھر تھا۔ یہاں ہونے والی ہلکی سی تبدیلی بھی اس کی تیز نظروں سے اوجھل نہیں رہ سکتی تھی اور کوئی اس کی جاگیر پر قبضہ کرنے آئے تو وہ اسے چیر کر دو ٹکڑے کر دینے پر یقین رکھتا تھا۔ وہ جنگل کے سب سے اونچے درخت پر چوکنا بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں گھپ اندھیرے میں کسی چیتے کی آنکھوں کے مانند چمکتی تیزی سے چاروں طرف حرکت کر رہی تھیں۔ اس کے کھڑے کان پتوں کی سرسراہٹ تک محسوس کر سکتے تھے۔

جنگل اچانک ہی کسی پرندے کے پروں کی

پھڑپھڑاہٹ سے گونجا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔
غفراش اپنا کام کر چکا تھا۔

اس نے اندھیرے میں اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور ایک باز اڑتا ہوا اس کے بازو پر آ بیٹھا تھا۔

"غفراش!" وہ پیار سے اس کا نام لے کر اس کی پشت سہلانے لگا۔

اچانک اس کے منہ سے باز کی آواز نکلی۔ غفراش نے اپنے مالک کی بات سن کر اس کو جنگل کے حالات سے آگاہ کیا تھا اور غفراش کی بات سنتے ہی اس کے چہرے پر غصہ پھیل گیا۔ وہ ایک جست میں درخت سے نیچے کودا اور چیتے کی رفتار سے جنگل کے درمیان دوڑنے لگا۔ اس کے سامنے آتی جھاڑیاں اور پودے اس کے عتاب کا سامنا نہیں کر پا رہے تھے۔ جنگل نے اس کے لیے راستہ چھوڑنا شروع کر دیا۔ غفراش اس کے بازو سے اڑ کر اس کے سر کے اوپر چکراتا ساتھ ساتھ ہی محو پرواز تھا۔ جنگل میں چھایا یہ گاڑھا کہر بھی اس کی رفتار کم کرنے میں ناکام ہوا۔ اچانک ہی آس پاس کی جھاڑیوں میں تیز سرسراہٹ ہوئی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس کے دونوں اطراف کی جھاڑیوں میں طوفان برپا ہو۔ غفراش نے اچانک ہی ایک بلند چیخ ماری اور ان جھاڑیوں سے سات بھاری جسامت کے قد آور بھیڑیے باہر نکل کر اس کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگے مگر وہ تب بھی ان سے آگے تھا۔

جنگل اس ہیبت کی تاب نہ لا سکا اور چاروں طرف سے جانوروں کی آوازیں بلند ہوگئیں۔ بھیڑیے غرانا شروع ہوئے۔ ایسا لگتا تھا جیسے جنگل میں زلزلہ آ گیا ہو۔ وہ بھاگتے ہوئے اچانک رکا۔ جنگل کی واحد جھیل اس کے سامنے تھی۔ بھیڑیے بھی اس کی پیروی کرتے ہوئے اس کے پیچھے رک گئے۔ اس نے مڑ کر ان بھیڑیوں کو اشارہ کیا اور خود پانی میں چھلانگ لگا دی۔

غفراش نے چنگھاڑتے ہوئے جھیل کے اوپر چکر کاٹنا شروع کر دیے۔ جھیل میں اس کے کودنے سے جو طوفان اٹھا تھا وہ تھوڑی ہی پل کے بعد تھم گیا۔ بھیڑیوں کے گروہ میں بے چینی پھیل گئی۔ وہ جھیل کے قریب پہنچ کر پانی کو سونگھنے لگے۔ ان میں سے سیاہ بھیڑیا اپنا منہ چاند کی طرف کر کے غرایا اور اچانک ہی وہ بھیڑیے انسانی روپ میں جھیل کے کنارے کھڑے تھے۔ وہ سارے قد آور اور مضبوط اجسام کے مالک تھے۔ چمڑے اور دھاتی لباس سے مزین ان کے بھاری وجود دیکھنے والے پر دہشت طاری کر دینے کے لیے کافی تھے۔ ان کے لمبے بال چٹیا کی صورت میں ان کی کمر تک آتے تھے۔ ان سب نے ہاتھوں میں عجیب و غریب کڑے پہن رکھے تھے۔ گلے میں ہاتھی دانت اور دھات کے بنے لاکٹ اور کانوں میں اوپر تک جاتی بالیوں کی لڑی۔

ان سب کے چہروں کی بڑی بڑی مونچھیں اور داڑھی ان کے رعب میں مزید اضافہ کر رہی تھی۔ ان سب کے بائیں گال پر آدھا چاند گدا تھا۔

"شاکا..... شاکا!" ان میں سے ایک جھیل کے کنارے پر جھک کر چلایا۔

"جھیل میں کودیں؟" ایک اور آگے بڑھ کر بولا۔

"شاکا کے حکم کے بغیر کوئی پلے کا بھی نہیں۔" تیسرا غرایا۔ اس کا قد ان ساتوں میں سب سے بڑا تھا۔ وہ سارے خاموش مگر بے چین ہو کر جھیل کے کنارے کھڑے ہو گئے۔

غفراش جو چکر لگاتے لگاتے قریبی درخت پر جا بیٹھا تھا، اچانک ایک چیخ کے ساتھ ہوا میں دوبارہ بلند ہوا اور اس کے پرواز بھرتے ہی وہ عفریت جھیل کے پانی کو چیرتا ہوا ہوا میں بلند ہوا۔ اس نے اپنے لمبے الجھے بالوں سے پانی کو جھٹکا اور اپنی خون ٹپکاتی آنکھوں سے ان سب کو گھورا۔ وہ جسامت سے انسان جیسا تھا مگر اس کی لال آنکھیں اور اس کے ہونٹوں سے باہر آتے وہ لمبے دانت اس کے حیوان سے بدتر ہونے کا پتا دیتے تھے۔ اس نے ان کا جائزہ لے کر اپنے حلق سے ایک بھیانک چیخ بلند کی۔ اس کی چنگھاڑ سے پورا جنگل دہل گیا۔

ان سب کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ وہ اپنے انسانی روپ سے بھیڑیوں میں تبدیل ہو چکے تھے مگر ان میں سے کسی نے بھی اس پر حملہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ شاکا کا شکار تھا اور شاکا کے حکم کے بغیر جنگل کا پتا بھی نہیں ہل سکتا تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ عفریت ان پر حملے میں پہل کرتا، شاکا بجلی کی تیزی سے جھیل سے باہر نکلا اور ہوا میں بلند ہوتے اس عفریت پر چھلانگ لگا چکا تھا۔ وہ دونوں آپس میں گتھم گتھا ہوتے جھیل کے کنارے پر آ گرے۔ وہ بھیڑیے اب انہیں دائرے کی صورت میں گھیرے کھڑے تھے اور ان کی خوفناک غراہٹیں جنگل کے ہر ذی روح کو اپنی جگہ دبکنے پر مجبور کر چکی تھیں۔ وہ عفریت اپنے دیو قامت وجود اور نکیلے دانتوں کے ساتھ بار بار شاکا پر حملہ آور ہوتا مگر شاکا کے گھومتے ہاتھ پیر اس کی ہر کوشش کو ناکام بنا رہے

تھے۔ اس بار وہ غراتا ہوا شاکا پر کودا مگر شاکا ایک ہی جست میں اس کی گردن پر سوار ہو چکا تھا۔

عفریت نے شاکا کو اپنے اوپر سے جھٹکنے کے لیے زور لگایا مگر شاکا کے بازو اس کی گردن کے گرد حائل ہو چکے تھے۔ وہ شاکا کے قابو میں آچکا تھا۔ عفریت نے بری طرح اچھل کود شروع کی مگر شاکا کی گرفت اس کی سوچ سے زیادہ مضبوط تھی اور اچانک کڑک کی آواز گونجی۔ شاکا کے بازوؤں میں پھڑپھڑاتے عفریت کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ بھیڑیوں نے آسمان کی طرف دیکھ کر غرانا شروع کر دیا۔

شاکا نے اپنے دانت اس عفریت کی گردن میں گاڑے اور اس کی گردن ایک جھٹکے سے ادھیڑ ڈالی۔ خون کا ایک فوارہ بلند ہوا۔

شاکا اطمینان سے اس کی پشت سے اتر کر کھڑا ہوا اور اپنی آستین سے منہ پونچھ کر اپنا بازو ہوا میں بلند کر دیا۔ غفراش اس کے بازو پر آبیٹھا۔ شاکا نے گھوم کر ان بھیڑیوں کو دیکھا اور وہ دور دور سے ہٹنے لگے۔

وہ سارے انسانی روپ میں آچکے تھے اور شاکا کے ساتھ اس جشن میں شامل تھے۔ شاکا، ان کے قبیلے کے سردار جگندال کا اکیلا وارث۔ اس کا لمبا قد اور طاقتور جسم اسے ان سب سے ممتاز بنا رہا تھا۔ گو کہ اس کا حلیہ ان سے اتنا بھی مختلف نہ تھا مگر اس کی ایک کی جگہ دو چوٹیاں اور ناک میں پہنی دھاتی بالی اس کے سردار ہونے کا پتا دیتی تھی۔ یہ جگندال کے سرداری کی پہچان تھی۔ اس نے گلے میں پہنے دھاتی خنجر کو چوما اور ایک جست میں گھنے جنگل میں غائب ہو گیا۔

☆☆☆

Year-1723

Capiz-Philippines

ریزو کو کافز پہنچتے پہنچتے صبح کے ساڑھے پانچ بج گئے۔ طوفانی بارش کی وجہ سے کوشش کے باوجود بھی لوکس اپنی بگھی کی رفتار تیز نہیں کر پایا تھا۔ کافز پہنچنے تک بارش رک چکی تھی۔ ریزو بھی رکتے ہی نیچے اتر آیا۔ بارش کی وجہ سے سردی بڑھ گئی تھی۔ ریزو نے اپنے ہاتھ ملتے ہوئے علاقے کا جائزہ لیا۔ کافز ایک کشادہ اور سرسبز گاؤں تھا۔ لکڑی سے بنے کشادہ گھر اس بات کا ثبوت تھے کہ گاؤں کے لوگ خوش حال ہیں۔ چمنیوں سے نکلتا دھواں اس بات کی غمازی کر رہا تھا کہ گاؤں والے جاگ رہے ہیں مگر حیرت کی بات تو یہ تھی کہ گاؤں بالکل خالی پڑا تھا۔ ریزو کو بتایا گیا تھا کہ گاؤں والے صبح سویرے ہی شکار کے لیے نکل جاتے ہیں مگر یہاں پھیلی ویرانی اس بات کی نفی کر رہی تھی۔ لوکس نے بگھی گاؤں کے اکلوتے کنویں کے پاس روکی تھی جو گاؤں کے وسط میں واقع تھا مگر کنواں بھی گاؤں کی طرح ویران پڑا تھا۔

کنویں عام طور پر چھوٹے علاقوں میں رہنے والوں کے لیے ان کی سماجی زندگی کا اہم جزو ہوتے ہیں۔ وہاں ہر وقت ہی کسی نہ کسی کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ گاؤں کے بہت سے اہم فیصلے اور بحث و مباحثے کنویں پر ہی طے پایا کرتے ہیں مگر یہاں کی ویرانی کچھ اور ہی کہانی سنا رہی تھی۔ لوکس نے بگھی کو ایک طرف باندھا اور کنویں سے پانی نکال کر اپنے گھوڑوں کی پیاس بجھانے لگا۔ قریب ہی تنی ہوئی گھاس کا ڈھیر لگا تھا جو شاید گاؤں والے مویشیوں کے چارے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ لوکس گھوڑوں کی آؤ بھگت کرنے کے بعد ریزو کی طرف متوجہ ہوا جو اپنے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے گاؤں کا تفصیلی جائزہ لے رہا تھا۔

''میں نے تو سنا تھا گاؤں کے لوگ صبح سویرے ہی اٹھ جاتے ہیں۔'' لوکس چلتا ہوا ریزو کی طرف آیا۔

''صحیح سنا تھا مگر یہاں معاملہ کچھ اور لگتا ہے۔'' ریزو نے سر پر پہنا ہیٹ اتار کر ہاتھ میں پکڑا۔

''کوئی ہے؟'' لوکس اونچی آواز میں بولا۔

چند لمحوں بعد آس پاس موجود گھروں کے دروازے، کھڑکیاں کھٹکنے کی آواز آئی۔ انہوں نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ دروازوں کو پوری طرح کھولا نہیں گیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے دروازے میں موجود جھریوں سے ان دونوں کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔

''کون ہے؟'' ریزو کے دائیں طرف موجود گھر کے دروازے سے اچانک ہی ایک نسوانی آواز گونجی۔

''ڈاکٹر ریزو ڈیوس!'' ریزو نے دائیں طرف گھوم کر اپنا تعارف کروایا۔

دروازہ دوبارہ بند ہو گیا۔ ریزو ہونٹ بھینچ کر انتظار کرنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد وہی دروازہ کھلا۔ ایک بھاری جسامت اور چھوٹے قد کا آدمی دروازے سے باہر نکل کر تیزی سے ریزو کی طرف آیا۔ ریزو اسے دیکھتے ہی پہچان گیا تھا۔ وہ کافز کے اس وفد میں شامل تھا جو گورنر سے ملاقات کے لیے دارالحکومت آئے تھے۔

''ہیلو ڈاکٹر ریزو ڈیوس! خوش آمدید۔ شکر ہے کہ آپ خیریت سے کافز پہنچ گئے۔ امید ہے آپ کو راستے میں

کوئی تکلیف نہیں ہوئی ہوگی۔ میرا نام فلپس ہے۔ آپ کو شاید یاد ہوگا کہ میں نے وفد کے ساتھ آپ سے ملاقات کی تھی۔'' وہ عجلت میں کہتے ہوئے مسکرایا۔

''ہیلو فلپس! مجھے بالکل یاد ہے۔'' ریزو نے مسکراتے ہوئے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

فلپس نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

''یہ لوئس ہے جو مجھے یہاں تک لے کر آیا ہے۔'' ریزو نے لوئس کا تعارف کروایا اور فلپس نے مسکراتے ہوئے اس سے بھی مصافحہ کیا تھا۔

''آپ باہر کیوں کھڑے ہیں؟ اندر چلیں۔ باہر اس وقت خطرہ ہے۔'' وہ یہ کہتا ہوا تیزی سے آگے بڑھا۔

ریزو نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ گاؤں کے لوگ دروازے کی جھریوں سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ وہ فلپس کے پیچھے چلتا ہوا گھر کے اندر داخل ہوگیا۔ لوئس نے بھی اس کی پیروی کی۔

گھر کے اندر داخل ہوتے ہی ریزو کو خوشگوار احساس نے گھیرا۔ فلپس کا گھر پورا لکڑی سے بنا ہوا تھا۔ ایک طرف بنے آتش دان نے گھر کا ماحول گرم کیا ہوا تھا۔ گھر کی سجاوٹ اور سامان سے اندازہ ہوتا تھا کہ فلپس خوش حال اور باذوق ہے۔ ریزو ایک طرف رکھے صوفے پر بیٹھ گیا جو شاید کسی جانور کی کھال سے ڈھکا تھا۔ لوئس آتش دان کے پاس رکھے کشن پر بیٹھ کر ہاتھ سینکنے لگا۔

''آپ بیٹھیں، میں آپ لوگوں کے لیے ناشتے کا انتظام کرواتا ہوں اور اگر آپ نہانا چاہتے ہیں تو واش روم اس طرف ہے۔'' فلپس نے بائیں طرف اشارہ کیا۔ ریزو نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ریزو نہانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ تھوڑی دیر بعد وہ تازہ دم ہوکر باہر نکلا تو ناشتا لگ چکا تھا۔ لوئس بھی نہا کر ناشتے کی میز پر آبیٹھا۔

گرم کافی، ڈبل روٹی، کیک اور بھاپ اڑاتے آملیٹ نے ان کی بھوک چمکا دی۔ وہ دونوں ناشتے سے انصاف کرنے لگے۔

''یہاں کے لوگ تو کچھ زیادہ ہی ڈرے ہوئے لگتے ہیں۔'' لوئس کیک کا ٹکڑا منہ میں ڈالتے ہوئے بولا۔

''ہم! مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہاں اتنا خوف و ہراس ہے۔ اب میں آگیا ہوں تو یہاں کی بلاؤں سے بھی نمٹ لوں گا۔'' ریزو نے مسکراتے ہوئے کافی کا گھونٹ بھرا۔

''ڈاکٹر ریزو! اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک بات کی اجازت چاہتا ہوں؟'' لوئس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''ہاں کہو۔'' ریزو اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''مجھے بھی جاسوسی کا بہت شوق ہے۔ میں بچپن سے ہی ایک جاسوس بننا چاہتا تھا اور جب گورنر ڈیوس نے مجھے یہ ذمے داری سونپی کہ مجھے آپ کو لے کر گاؤں آنا ہے تو مجھے لگا کہ میرا خواب پورا ہونے کا وقت آگیا ہے۔'' لوئس نے ہچکچاتے ہوئے اپنی بات مکمل کی۔

''تم کیا کہنا چاہتے ہو؟ کھل کر کہو۔'' ریزو کو اس کی بات سمجھ نہیں آئی۔

''میں وہ...... میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مجھے گورنر نے ہدایت کی تھی کہ آپ کو یہاں چھوڑ کر میں دوسرے دن واپس جاسکتا ہوں مگر میں یہاں سے جانا نہیں چاہتا۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے مددگار رکھ لیں۔'' لوئس نے ڈرتے ڈرتے اپنی بات مکمل کی۔

ریزو قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ ''مجھے تمہارا اعتماد پسند آیا ہے اور جس طرح یہاں لوگوں میں ڈر اور خوف پھیلا ہوا ہے، مجھے لگتا ہے کہ مجھے ایک مددگار کی ضرورت پڑنے والی ہے کیونکہ یہاں سے تو کوئی بھی میرا مددگار بننے پر راضی نہیں ہوگا۔ جاسوسی کرنے کے لیے بھی کئی بہت بڑے خطروں سے کھیلنا پڑتا ہے مگر یہاں کے لوگ اس قدر خوفزدہ لگ رہے ہیں کہ وہ اپنے گھروں سے باہر نکلتے ہوئے بھی کترا رہے ہیں۔ ایسی صورت میں تم میرے مددگار کی حیثیت سے یہاں رک سکتے ہو۔ بشرطیکہ تمہارے گھر والوں کو اعتراض نہ ہو۔'' ریزو نے مسکراتے ہوئے اسے اجازت دی۔

''واؤ! بہت بہت شکریہ ڈاکٹر ریزو! میں آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔ آپ کے ساتھ کام کرنا میرے لیے باعث فخر ہے اور رہی بات گھر والوں کی تو میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔'' لوئس جوش سے بولا۔

ریزو اس کی خوشی دیکھ کر ہنس پڑا۔

''ڈاکٹر ریزو! کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو بتائیں۔''

فلپس دوبارہ کمرے میں داخل ہوا۔

''نہیں، میں چاہتا ہوں کہ آپ ہمارے ساتھ ناشتا کریں۔'' ریزو نے اپنے میزبان کو دعوت دی۔

''شکریہ۔ مگر میں صبح ہی ناشتا کرچکا ہوں۔'' فلپس کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

''یعنی آپ صبح سے بیدار ہیں لیکن لوگ اپنے گھروں سے باہر کیوں نہیں نکل رہے؟'' ریزو کو حیرت نے گھیرا۔

''سب کو اس درندے کا خوف ہے۔ آپ نے یہاں سے ملنے والی لاشوں کی حالت نہیں دیکھی۔ مجھے تو حیرت ہے

کہ آپ نے کافرے کے جنگلات میں رات کا سفر کیا کیسے؟ وہاں بہت خطرہ ہے جبکہ ہم نے آپ کو خبردار بھی کیا تھا۔ شکر ہے کہ آپ صحیح سلامت پہنچ گئے۔" وہ بات کرتے ہوئے بھی خوفزدہ لگ رہا تھا۔

"جنگل میں تو کوئی خطرہ نہیں تھا بلکہ رات کو کوئی جنگل میں بیٹھا والٹن بجا رہا تھا۔" لوکس اس کی بات سن کر بولا۔

"کک کیا...... والٹن؟" فلپس کے چہرے پر خوف کے آثار پھیل گئے۔

ریزو نے لوکس کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

"آپ جانتے ہیں کہ یہاں والٹن کس کے پاس ہے؟ میں اس بہادر شخص سے ملنا چاہوں گا۔ مجھے تفتیش شروع کرنے کے لیے مقامی افراد کی مدد کی ضرورت پڑے گی مگر کافرے کے لوگوں کا خوف دیکھ کر مجھے نہیں لگتا کہ کوئی میری مدد کے لیے راضی ہوگا اور میں یہاں کے راستوں سے انجان ہوں۔ کسی مقامی فرد کا میرے ساتھ موجود ہونا بہت ضروری ہے۔" ریزو نے جلدی سے اپنی بات مکمل کی۔

"میں نہیں جانتا کہ آج رات کو جنگل میں والٹن بجانے کی بے وقوفی کس نے کی تھی؟ یہ تو کھلے عام موت کو دعوت دینے والی بات ہے اور ویسے بھی جنگل یہاں سے کافی دور ہے۔ اگر وہ کوئی اجنبی تھا تو اسے کافرے تک آنے میں پورا دن لگ جائے گا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ یہاں تک پہنچنے سے پہلے ہی اس درندے کے ہاتھوں مارا جائے۔ ہاں، مگر آپ کا اندازہ بالکل ٹھیک ہے۔ کافرے کوئی بھی آپ کی مدد کے لیے راضی نہیں ہوگا۔ گاؤں کے لوگوں میں بہت خوف و ہراس پھیل چکا ہے اور اب جبکہ وہ گھروں میں گھس کر شکار کر رہا ہے تو لوگ سورج نکلنے سے پہلے اپنے گھروں سے باہر نہیں نکلتے اور سورج ڈوبنے سے پہلے ہی اپنے گھروں میں بند ہو جاتے ہیں لیکن کافرے کی بھلائی کے لیے کسی نہ کسی کو تو آگے بڑھنا ہوگا۔ اگر آپ برا نہ مانیں تو میری بیٹی آپ کی مدد کر سکتی ہے۔ وہ کافرے کی واحد طبیب ہے اور اس نے اپنی پڑھائی دارالحکومت سے مکمل کی ہے۔ اس نے آپ کے بارے میں بہت سن رکھا ہے اور جب سے اس کو پتا چلا ہے کہ آپ یہاں تفتیش کے لیے آرہے ہیں، وہ مجھ سے مسلسل اصرار کر رہی تھی کہ وہ آپ کے ساتھ کام کرنا چاہتی ہے۔" فلپس نے ایک ہی سانس میں اپنی بات مکمل کی۔

"کیا عمر ہوگی آپ کی بیٹی کی؟ جس کام کے لیے یہاں کے مرد آگے نہیں بڑھنا چاہتے، وہ لڑکی ہو کر اتنی بہادر ہے۔ میں متاثر ہوا ہوں اس کی بہادری سے لیکن آپ کو نہیں لگتا کہ یہ کام بہت خطرناک ہے؟" ریزو نے فلپس کو گہری نظروں سے دیکھا۔

"میں اس بات کے لیے بالکل بھی راضی نہیں تھا مگر میں اس کی ضد کے آگے ہار چکا ہوں۔ وہ اکثر مجھے بتائے بغیر بھی اکیلی جنگلوں میں نکل جاتی ہے۔ آپ کے ساتھ ہوگی تو کم از کم مجھے یہ تسلی تو رہے گی کہ وہ اکیلی نہیں ہے اور ساتھ ہی اسے کچھ سیکھنے کو بھی ملے گا۔" فلپس نے کندھے اچکائے۔

ریزو کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ "ٹھیک ہے۔ تو پھر آج سے وہ میری ٹیم میں شامل ہے اور جیسا کہ آپ نے بتایا کہ وہ اکیلی جنگل میں نکل جاتی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے اپنا کام شروع کرنے کے لیے ساری اہم معلومات اسی سے مل جائیں گی۔ مجھے اپنی بیٹی سے ملوا دیجیے۔" ریزو نے کافی کا کپ لبوں سے لگایا۔

فلپس نے ریزو کی بات سن کر سر کو خم دے کر کسی کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ شاید وہ دروازے سے لگی ان کی باتیں سن رہی تھی اور اجازت ملتے ہی تیزی سے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

اونچا قد، متناسب جسم اور سفید رنگت پر نیلی آنکھوں اور سنہرے بالوں کا امتزاج، جنہیں اس نے جوڑے کی شکل میں باندھ رکھا تھا مگر چند شریر لٹیں جو اس کے چہرے کا احاطہ کرنے کے لیے جوڑے کی قید سے آزاد ہوئی تھیں، اس کے بالوں کے گھنگرالے ہونے کا پتا دیتی تھیں۔ اس نے سفید رنگ کی ٹی شرٹ زیب تن کر رکھی تھی جسے اس نے چمڑے کی واسکٹ نما جیکٹ پہن کر ڈوریوں سے کس رکھا تھا۔

ریزو جو کافی کا گھونٹ لینے ہی لگا تھا اسے دیکھ کر بھول گیا تھا کہ کافی شدید گرم ہے۔ اس کی زبان جل گئی۔ اس نے جلدی سے کافی کا کپ میز پر رکھا۔ لوکس بھی اسے ہی دیکھنے میں محو تھا۔

"یہ لورین ہے۔ میری بیٹی۔" فلپس نے فخر سے اپنی بیٹی کا تعارف کرایا اور وہ دونوں اپنی اپنی کرسیوں سے کھڑے ہوگئے۔

لورین نے سر کے اشارے سے ریزو کو خوش آمدید کہا۔

ریزو کچھ کہنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ ایسا حسن تو اس نے دارالحکومت میں بھی نہیں دیکھا تھا۔

"تم ڈاکٹر ریزو کے ساتھ کام کر سکتی ہو۔" فلپس نے اسے خوشخبری سنائی تھی اور لورین کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

ریزو نے لورین سے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

لورین نے خوشی سے اس کا ہاتھ تھام کر شکریہ ادا کیا۔ ریبزو تو کافوسی درندے کی تلاش میں آیا تھا مگر یہاں آ کر وہ اپنا دل دے بیٹھا۔ وہ پہلی ہی نظر میں قید ہوا تھا۔ لوئس کو ریبزو کی حالت دیکھ کر اندازہ ہوا کہ یہ کیس سب کے لیے دلچسپ ثابت ہونے والا تھا۔

☆☆☆

Year 2020

Vostok Research Centre-Russia

جوشوا صبح سے ہی لیب میں مصروف تھا۔ آج اسے جانوروں پر ڈی این اے مکمل ٹیسٹ ہونے کے تجربات کرنے تھے۔ گو کہ انسانی خون کے ان ڈی این ایز کے ساتھ اسٹیبل ہونے کے کامیاب تجربات کی رپورٹ وہ پہلے ہی تیار کر چکا تھا مگر اپنا شک دور کرنے کے لیے اسے عملی تجربے کی ضرورت تھی اور یہ جانوروں پر ہی ممکن تھا۔

اس نے لیب میں موجود پنجروں میں سے ایک بندر کو نکال کر اسٹریچر پر لٹایا تھا۔ بندر نیم بے ہوشی کی حالت میں تھا۔ جوشوا نے دراز سے ایک بوتل نکالی اور ڈھکن کھول کر اس میں موجود محلول کو سرنج میں بھرنے لگا۔ اس نے ایک نظر بندر پر ڈالی۔

سرنج بھر کر اس نے اسے میز پر رکھ دیا اور اپنی آنکھوں پہ لگا چشمہ اتار کر انگلیوں سے اپنی آنکھیں دبانے لگا۔ اسے شدید تھکن محسوس ہو رہی تھی۔ اب جبکہ وہ کامیابی کے بے حد قریب تھا، اسے سالوں سے کی گئی اپنی محنت بہت یاد آئی جب وہ دن اور رات کا فرق بھول کر لیب میں گھسا رہتا تھا۔ اس نے اپنا سر کرسی کی پشت سے لگا دیا۔ اس تجربے کے بعد اس کی قسمت کا فیصلہ ہونا تھا۔ گو کہ وہ جانتا تھا کہ اسے کامیابی حاصل ہوگی مگر نہ جانے کیوں ایک جھجک تھی۔ وہ کرسی سے اٹھ کر لیب میں موجود خفیہ سیف کی طرف بڑھ گیا۔

اس نے سیف پہ لگا لاک مخصوص انداز سے گھمایا تو وہ سیف کلک کی آواز کے ساتھ کھل گیا۔ جوشوا نے ہاتھ بڑھا کر سیف کے اندر موجود اسٹیل کا باکس اور اس کے ساتھ رکھی چمڑے کی جلد والی بوسیدہ سی ڈائری باہر نکالی۔ دونوں چیزیں لے کر وہ دوبارہ اپنی میز پر آ گیا۔ اس نے احتیاط سے اسٹیل کا باکس کھولا۔ اس میں بے شمار چھوٹی چھوٹی شیشے کی بوتلیں موجود تھیں جو مختلف قسم کے محلول سے بھری ہوئی تھیں۔ شیشیوں کی ساخت سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ کافی پرانی ہیں۔ اس نے ان شیشیوں پر ایسے ہاتھ پھیرا جیسے کسی خزانے پر ہاتھ پھیر رہا ہو پھر اسٹیل کے باکس کو احتیاط سے بند کر کے اس نے اپنے سامنے پڑی وہ بوسیدہ ڈائری کھولی اور چند صفحے پلٹنے کے بعد ایک صفحے پر رک گیا۔

ڈائری کے صفحے بوسیدہ ہونے کی وجہ سے زردی مائل ہو کر گل رہے تھے لیکن ان پر لکھی ہوئی تحریر کو بہ آسانی پڑھا جا سکتا تھا۔ وہ تھوڑی دیر اس صفحے پر غور کرتا رہا پھر اس نے اپنے سامنے پڑی سرنج اٹھائی اور اسٹیل کے باکس میں سے ایک شیشی نکال کر اس میں سے تھوڑا سا محلول سرنج میں بھر لیا۔ سرنج میں پہلے سے موجود محلول سبز رنگ اختیار کر چکا تھا۔ جوشوا نے ڈائری اور باکس کو دوبارہ سیف میں رکھا اور سرنج لے کر اسٹریچر کی طرف آ گیا۔

لیب کے ایک طرف بنے پنجروں میں موجود جانور اسے بندر کی طرف بڑھتا دیکھ کر شور کرنے لگے۔ جوشوا نے کانپتے ہاتھوں سے سوئی کو بندر کی نس میں اتار دیا۔

"ایکسپیریمنٹل ٹرائل 347۔" اس نے ہاتھ میں پکڑے ریکارڈر کا بٹن دبا کر یہ الفاظ دہرائے اور تیزی سے چلتا ہوا کمپیوٹر اسکرین کے سامنے آ بیٹھا۔

اسکرین پر بندر کے جسم میں موجود ایک ایک نس کو واضح طور پر دیکھا جا سکتا تھا۔ سرنج کا محلول آہستہ آہستہ اس کے جسم میں سرایت کر رہا تھا۔ بندر کے جسم نے جھٹکے لینا شروع کر دیے تھے اور لیب اس کی فلک شگاف چیخوں سے گونج اٹھی۔ پنجروں میں موجود باقی بندر بھی اس کے ساتھ چیخنے چلانے لگے۔

تھوڑی دیر بعد بندر کا جسم ساکت ہو گیا۔ جوشوا نے مین اسکرین سے نظریں ہٹا کر بندر پر لگا دیں۔

"کم آن...... کم آن۔" وہ بڑبڑایا۔

اچانک ہی بندر نے آنکھیں کھول دیں۔ جوشوا کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کا تجربہ کامیاب ہو چکا تھا۔ بندر ابھی تک ساکت لیٹا تھا مگر اس کے جسم نے اس محلول کو جذب کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ کمپیوٹر اسکرین پر اس کی نسوں میں شامل ہوتے اس مادے کو دیکھ سکتا تھا۔

اس نے آہستگی سے بندر کے جسم کو تسموں کی قید سے آزاد کیا اور اسے واپس پنجرے میں ڈال کر پنجرے کو لاک کر دیا۔

بندر کھلی آنکھوں کے ساتھ خاموشی سے ایک طرف پڑا تھا۔ اس کے ساتھی اسے دیکھ کر خاموش ہو چکے تھے۔

جوشوا کا تجربہ کامیاب رہا تھا۔ بندر کے جسم پر اس

محلول کا اثر ہونے میں اڑتالیس گھنٹے لگتے تھے مگر اس کا آنکھیں کھول لینا اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ اس تبدیلی کو قبول کر چکا ہے۔

جوشوا لیب کی لائٹ بند کر کے باہر نکل آیا۔ اسے اپنے ساتھیوں کو یہ خوشخبری سنانا تھی کہ پچھلے ڈیڑھ سال سے وہ جس پروجیکٹ پر کام کر رہے تھے، اس کا پھل کھانے کا وقت آ پہنچا ہے۔

وہ دنیا کا سب سے مہلک ہتھیار بنانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ ایسا ہتھیار جو انسان کو ناقابلِ یقین قوتیں دینے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

☆☆☆

Year 1723

Jungdaal-Parallel Universe

جنگدال میں صبح کا اجالا پھیل رہا تھا۔ جنگل کا چپا چپا اوس میں بھیگا اور جنگلی پھولوں کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ شاکال کے لوگ علی الصباح ہی بیدار ہو جاتے تھے۔ گو کہ آس پاس کے علاقوں کے جنگلات بھی گھنے تھے مگر شاکال کی خاصیت یہ تھی کہ یہ بادلوں کے درمیان واقع تھا۔ یعنی ریاست جنگدال کا سب سے گھنا، خوبصورت اور بلند جنگل۔

یوں تو جنگدال کی ریاست میں کئی قبائل آباد تھے جن کے زیرِ اثر جنگلات کے مختلف علاقے تھے اور ہر علاقے کا الگ سردار تھا مگر جنگدال کی ریاست کا سردار ہمیشہ شاکال سے چنا جاتا تھا۔ یعنی جو شاکال کا سردار ہوتا، وہی جنگدال کی ریاست کا سردار کہلاتا اور تمام سردار اس کی پیروی کرنے کے پابند ہوتے۔ شاکال کے قبیلے نے ہمیشہ ہی جنگدال کے لیے سردار چنے تھے۔ خرزوم، قبائلیوں کی ایک ایسی نسل تھی جسے اس کی ریاضتوں کے بدلے انوکھی طاقتیں عطا کی گئی تھیں۔ ان کے پرکھوں نے ان جنگلوں میں ریاضت کے کئی ماہ و سال گزارے اور اپنے علوم سے بہت کچھ حاصل کیا تھا۔

یہ جنگل ان قربانیوں کا گواہ تھا اور بدلے میں خرزوم کو جنگدال کے وارث سے نوازتا رہا۔ خرزوم کا سب سے بڑا بیٹا قدرت کی طرف سے ان طاقتوں سے مالا مال ہوتا تھا اور یہ طاقتیں اس کی نسل سے جنم لینے والے سب سے بڑے بیٹے میں منتقل ہو جاتی تھیں۔ لہٰذا اگلا سردار چننا ان کے لیے کبھی مشکل نہ رہا تھا۔ شاکا کے بعد پیدا ہونے والے سارے بھائی اس کے محافظ کہلاتے تھے جو رات ہوتے ہی بھیڑیوں کے گروہ میں تبدیل ہو جاتے تھے اور یہ خصوصیت بھی صرف اور صرف خرزوم کے بیٹوں کو حاصل تھی۔

خرزوم کی ہر نسل نے جنگل کے سب سے بلند علاقے کو رہنے کے لیے چنا تھا۔ لہٰذا شاکال ایک طرح سے جنگدال کے لیے دارالحکومت کی حیثیت رکھتا تھا جہاں ان کا سردار رہتا تھا۔

خرزوم سردار انتہائی طاقتور، تیز رفتار، ذہین و فطین ہوتے تھے۔ شاکال میں تو کیا، پورے جنگدال میں بھی کوئی ان کے مقابلے میں ٹھہر نہیں پاتا تھا۔ جانوروں کی بولیاں سمجھنا، زہر کے اثر سے آزادی، تیز سماعت و بصارت جیسی حیرت انگیز خوبیاں قدرتی طور پر ان کے خون میں شامل تھیں اور جب خرزوم سردار اپنی عمر پوری کر کے بوڑھا ہونے لگتا تو اپنے ہاتھ سے سرداری کا خنجر اپنے بڑے بیٹے کے حوالے کر دیتا جس کا مطلب یہ ہوتا کہ اب وہی ریاست جنگدال کا سردار ہے اور اسی نسبت سے اس کا نام شاکا رکھا جاتا تھا۔

شاکا صرف ایک ہی تھا۔ برسوں سے جسم بدلتے رہے مگر شاکا کی روح ایک ہی رہی۔ ہر شاکا پچھلے سردار شاکا کی طرح اپنی تاریخ اور ذمے داریوں سے آگاہ ہوتا تھا۔

شاکا کے لیے جیون ساتھی کے انتخاب کا بھی الگ ہی طریقہ تھا۔ شاکا کی عمر کے 26 سال پورے ہونے کی رات، ریاست کی لڑکیوں کی عام دعوت کی جاتی۔ جو بھی شاکا سے شادی کی خواہش مند ہوتیں، وہ اس دعوت میں شریک ہوتیں اور جن کی مرضی نہ ہوتی ان کے آنے پر کوئی زبردستی نہیں تھی۔

اس رات چاند بہت نیچے آ جاتا اور ایک مخصوص لڑکی پر اپنی روشنی کا حصار قائم کر دیتا۔ وہی لڑکی شاکا کی جیون ساتھی ٹھہرتی اور اگلی صبح ہی چند مخصوص رسموں اور عبادتوں کے ساتھ انہیں ایک دوسرے کا جیون ساتھی مقرر کر دیا جاتا۔ سردار اسی عورت کی کوکھ سے جنم لیتا تھا جسے چاند، شاکا کے لیے چنتا تھا۔ لہٰذا بغیر کسی شک و شبے کے شاکا اسے دل سے اپنا جیون ساتھی تسلیم کر لیتا تھا۔ ان کی نسل اور سرداری کو جاری رکھنے کے لیے چاند اور آسمانی روحوں کا یہ فیصلہ ماننا بہت ضروری تھا اور اس بار بھی یہی کیا گیا تھا مگر پچھلے کچھ دنوں سے روحیں ان سے ناراض نظر آتی تھیں اور وجہ تھی جنگل میں ملنے والی انسانی لاشیں۔ اپنے طور پر اس مصیبت سے نمٹنے کی کوشش کی گئی تھی مگر تھک ہار کر انہیں شاکا کی ہی یاد آئی تھی۔ شاکال پہنچنا ان کے لیے بھی آسان نہ تھا۔ بادلوں کے درمیان موجود کالی چٹانوں سے نکلتی اس عظیم آبشار کو پار کرنا اور پھر اس گھنے جنگل سے گزرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں

تھی۔ انہیں یہ سفر کرنے میں کئی دن لگے تھے۔

شاکا کے پاس جنگدال کے تمام قبائل کے سردار اکٹھے ہوئے اور اپنا دکھ کہہ سنایا۔ جنگدال بہترین شکاریوں سے بھرا پڑا تھا۔ جنگل تو ان کا گھر تھا۔ یہ کیسا درندہ آیا تھا جو انسانوں کا شکار کر رہا تھا اور پوری ریاست اسے پکڑنے سے قاصر تھی۔

شاکا نے وہ رات اندھیرے جنگلوں میں گزاری۔ وہ ساری رات روحوں سے بات کرتا رہا اور صبح ہوتے ہی سب نے اسے عفراش کے ساتھ واپس آتے دیکھا۔

عفراش کو شاکا کا سرداروں کے ساتھ کئی سو سالوں سے دیکھا گیا تھا۔ وہ خاص موقعوں پر ہی شاکا کے ساتھ نظر آتا۔ یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ عفراش بھی شاکا کی طرح نسل در نسل جسم بدلتا تھا یا وہ کوئی مقدس روح تھا۔ عفراش کے ظاہر ہونے کا مطلب تھا کہ معاملات سنگین ہیں مگر اس کا آنا اس بات کا بھی اشارہ تھا کہ انہیں اس مصیبت سے جلد ہی چھٹکارا مل جائے گا۔

شاکا نے شاکال میں ٹھہرے سرداروں کو اکٹھا کیا اور انہیں واپس اپنے قبیلوں میں جانے کا کہا۔ وہ خود ہر قبیلے پر نظر رکھنے والا تھا۔ سرداروں کے لیے شاکا کی دی ہوئی تسلی ہی کافی تھی۔ وہ سب اطمینان سے اپنے قبیلوں میں لوٹ گئے اور اس کے بعد شاکا نے عفراش اور اپنے بھائیوں کے ساتھ کئی شکار کیے۔ ان کے لیے یہ شکار نئے نہیں تھے۔ یہ عفریت اکثر ہی اپنی دنیا سے راستہ بھٹک کر ادھر آنکلتے تھے۔ شاکا کی تاریخ ایسے شکاروں سے بھری پڑی تھی۔ اسے دوسری دنیاؤں کی معلومات حاصل تھیں۔ اسے ان دنیاؤں کے دروازے بھی معلوم تھے مگر اسے اپنی حدود بھی پتا تھیں۔

جیسے انسانوں کی دنیا تھی ویسے ہی شاکا کی، روحوں کی اور عفریتوں کی بھی دنیا تھی۔

شاکا پانچوں طول و عرض کا سفر کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا مگر وہ اپنی دنیا میں ہی خوش تھا۔ اس کی طاقتیں جنگدال میں عروج پر تھیں۔ وہ صدیوں سے یہاں خوش تھا مگر اس بار کچھ انوکھا ہو رہا تھا۔

یہ عفریت بار بار آ رہے تھے۔ وہ ایک رات عفریت کا خاتمہ کر کے سوتا اور دوسری صبح عفراش اسے نئے عفریت کے آنے کی خبر دیتا۔

یہ آخر ہو کیا رہا تھا؟ عفریتوں کو جنگدال کا راستہ کس نے دکھایا تھا؟ ایسا نہیں تھا کہ وہ گھبرا گیا تھا مگر اسے تواتر سے ان کا جنگدال کی طرف آنا باقی قبائل کے لیے مصیبت بن سکتا تھا۔ وہ ہر وقت، ہر جگہ موجود نہیں رہ سکتا تھا۔

اس رات بھی اسے عفراش سے ایک قبیلے میں وینڈیگو کی موجودگی کی اطلاع ملی تھی۔ وینڈیگو لمبے سینگوں والا ایک خوفناک آدم خور تھا جو جنگلوں میں چھپ کر انسانوں کا شکار کیا کرتا تھا مگر شاکا نے اس کا نرخرہ ہی ادھیڑ ڈالا تھا۔

وہ آٹھوں صبح ہونے سے پہلے ہی شاکال میں داخل ہو چکے تھے۔ شاکال کے لوگ اپنے سردار کو دیکھ کر گھر سے اس کی آؤ بھگت کی تیاری میں لگ گئے۔ شاکا قبیلے کے وسط میں بنے چبوترے پر جا بیٹھا۔ شاکال کے لوگ وہاں اکٹھے ہو رہے تھے۔

شاکا کی بیوی جو آٹھ ماہ کی حاملہ تھی، آوازیں سن کر اپنے خیمے سے باہر نکل آئی۔ شاکا نے ایک نظر اس پر ڈالی اور اسے اپنے ساتھ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ شاکا کا وارث پیدا کرنے والی تھی۔ اس کی عزت سب پر لازم تھی۔ شاکا کے ساتوں بھائی چبوترے کے آس پاس کھڑے ہو گئے۔

''سردار شاکا! کیا حالات ہیں جنگدال کے؟'' ایک بوڑھا احترام سے سر جھکائے جنگدال کے حالات جاننے کو بے قرار تھا۔

''کسی نے بدکال (عفریتوں کی دنیا) کا دروازہ کھول دیا ہے۔ وہ مسلسل جنگدال کی طرف آ رہے ہیں۔ جب تک یہ دروازہ بند نہیں ہوگا، وہ ایسے ہی تباہی پھیلائیں گے۔'' وقت آگیا تھا کہ وہ سب کو معاملے کی سنگینی سے آگاہ کرتا۔

''بدکال کا دروازہ؟ مگر یہ جرأت کون کر سکتا ہے؟'' بوڑھے کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''کسی کو ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جنگدال میرا ہے اور میں یہاں سے ایک ایک عفریت کو نوچ پھینکوں گا۔ پہلے مجھے یہ پتا لگانا ہے کہ یہ دروازہ کس نے کھولا کیونکہ دروازہ صرف وہی بند کر سکتا ہے۔ اس کے بعد اس کا خاتمہ یقینی ہے مگر اس تک پہنچنے سے پہلے ہی ایک نیا عفریت سامنے آجاتا ہے۔ اگر یہ دروازہ بند نہ ہوا تو عفریتوں کے غول کے غول یہاں اتر آئیں گے۔ شاکا ہر جگہ موجود نہیں رہ سکتا۔ میں آج رات روحوں سے بات کروں گا۔ امید ہے مجھے کوئی نہ کوئی حل ضرور مل جائے گا۔'' شاکا نے یہ کہہ کر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ سارے آہستہ آہستہ وہاں سے ہٹنے لگے۔

☆☆☆

1723

Capiz-Philippines

ریمزو اور لوئس سارا دن آرام کرتے رہے۔ خوفناک بارش کے اس سفر نے انہیں اچھا خاصا تھکا دیا تھا۔ ان کے رہنے کا انتظام فلپس کے گھر پر ہی تھا۔ ان کے آرام کے لیے ایک کمرا مخصوص کر دیا گیا تھا۔ ریمزو کا سارا سامان اسی کمرے میں پہنچا دیا گیا مگر اس نے فلپس سے گزارش کی تھی کہ اسے رات دیر تک کام کرنے کی عادت ہے جس کے لیے اسے ایک الگ کمرے کی ضرورت پڑے گی لہٰذا فلپس نے اپنے گھر سے متصل ایک خالی ڈسپنسری ریمزو کے لیے مختص کر دی جہاں وہ جتنی دیر چاہے کام کر سکتا تھا۔ یہ ڈسپنسری عرصے سے خالی پڑی تھی۔

ریمزو کو یہ ڈسپنسری ریسرچ کے لیے بہت مناسب لگی کیونکہ یہاں پر ایک عدد اسٹریچر اور دوائیاں رکھنے کے لیے مختلف ریک بھی بنے ہوئے تھے۔

ریمزو کا ارادہ دن میں آرام کرنے کے بعد شام کو اپنی تفتیش شروع کرنے کا تھا۔ علاقے کے لوگ سورج نکلتے ہی شکار کے لیے سمندر کی طرف جا چکے تھے۔ گاؤں میں اس وقت عورتیں اور بچے رہ گئے تھے مگر وہ بھی اپنے گھروں میں بند تھے۔ اسے سارا دن گلیوں میں بھی اکا دکا لوگ ہی نظر آئے۔

لورین بھی اسے دوبارہ نظر نہیں آئی۔ شاید وہ ان کے آرام میں خلل نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔ ڈسپنسری کا جائزہ لینے کے بعد ریمزو اور لوئس سونے کے لیے لیٹ گئے اور ان کی آنکھ شام کے قریب کھلی۔ فلپس ان کے لیے کھانا اور کافی کمرے میں ہی پہنچا گیا تھا۔

کھانے سے فارغ ہو کر ریمزو نے اپنی تفتیش کا آغاز فلپس سے کیا۔ اس سے سوالات کرنے کے بعد وہ اہم نکات اپنی ڈائری میں نوٹ کرتا رہا۔ یہ ڈائری وہ ہمیشہ ساتھ رکھا کرتا تھا۔ اگر دوران تفتیش وہ الجھن میں پڑ جاتا تو یہی ڈائری اس کیس کو حل کرنے میں اس کی مدد کرتی تھی۔

فلپس سے بات کرنے کے بعد وہ علاقے کے چند اور لوگوں سے ملا۔ شکار سے واپس آنے والوں کا تفصیلی جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ اس نے ان میں سے کچھ لوگوں کو روک کر بھی سوالات کیے۔ شام گہری ہونے تک وہ ابتدائی تفتیش کر کے فارغ ہو چکا تھا۔ لوئس اس کے ساتھ ہی تھا۔ لوئس نے ریمزو کا بیگ تھام رکھا تھا۔ وہ واقعی اس کے اسسٹنٹ کی طرح اس کی مدد کر رہا تھا۔

ابتدائی تفتیش کے بعد ریمزو اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ سب اس درندے کو دیکھے بغیر ہی اس کی الگ الگ اشکال اور تفصیل بیان کرتے تھے۔

ریمزو کو بھوت پریت پر یقین نہیں تھا۔ وہ اپنی تفتیش کو درندے تک ہی محدود رکھنا چاہتا تھا مگر گاؤں والوں کی بتائی گئی نشانیاں اس کی تفتیش میں کافی مشکلات پیدا کر رہی تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ اگر کسی علاقے میں خوف پھیل جائے تو لوگ اپنی طرف سے اس کو بڑھاوا دینے کے لیے من گھڑت قصے کہانیاں بنا لیتے ہیں۔

وہ ساری اہم باتیں اپنی ڈائری میں نوٹ کرتا رہا۔ گاؤں سے تفتیش ختم کرنے کے بعد اس کا ارادہ قریبی جنگل میں جانے کا تھا۔

شام تک ڈسپنسری کی صفائی بھی کر دی گئی تھی۔ ریمزو نے لکڑی کے صندوقوں سے سامان نکلوا کر ڈسپنسری کو اپنی ضرورت کے حساب سے سیٹ کر لیا تھا۔ وہ وقت کو ضائع کرنے کا عادی نہیں تھا اور یہاں سے جتنا جلدی ممکن ہو کام ختم کر کے واپس دارالحکومت جانا چاہتا تھا مگر جنگل سے تفتیش کا آغاز کرنے کی بات سن کر فلپس کے ہوش اڑ گئے اور وہ کسی صورت میں بھی اس کے ساتھ اس بات پر تعاون کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ریمزو کو اسے منانے میں بہت وقت لگا۔

"دیکھو فلپس! میں یہاں کام کرنے کے لیے آیا ہوں۔ اگر میں بھی ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا اور اس درندے سے ڈر گیا تو ہم اس سے چھٹکارا کیسے پائیں گے؟ میں یہاں گھر کے اندر چھپ کر بیٹھنے اور اس درندے پر نظر رکھنے نہیں آیا بلکہ اس کا خاتمہ کر کے سب کو اس سے نجات دلانے کے لیے آیا ہوں۔ میرے کام کرنے کا طریقہ یہی ہے۔ مجھے ڈر نہیں لگتا۔ تمہیں میری فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میرے پاس جدید ہتھیار ہیں اور لوئس میرے ساتھ ہر وقت موجود رہے گا۔" ریمزو نے اس سے بات کر کے اس کا خوف کم کرنے کی کوشش کی۔

"صرف لوئس ہی نہیں میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی۔ آپ یہ کیسے بھول گئے کہ آپ نے صبح ہی مجھے اپنی ٹیم میں شامل کیا تھا۔" اچانک لورین کمرے میں داخل ہوئی اور فلپس جو پہلے ہی مشکل سے اس بات کے لیے راضی ہوا تھا، لورین کی بات سن کر اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"ہرگز نہیں۔ میں تمہیں بھی اس بات کی اجازت نہیں دوں گا۔ مجھے تو دن میں تمہارے جنگل جانے سے ڈر لگتا ہے اور تم رات میں جانے کی بات کر رہی ہو۔ تم چاہو تو ڈسپنسری میں ڈاکٹر ریمزو کی مدد کر سکتی ہو۔ جنگل میں جانے کی تمہیں کوئی

ضرورت نہیں۔" وہ اسے سختی سے تنبیہ کرتے ہوئے بولا۔
"مجھے کسی ڈسپنسری میں نہیں بیٹھنا۔ میں نے آپ سے پہلے ہی کہا تھا کہ میں ڈاکٹر ریبزو کے ساتھ کام کرنا چاہتی ہوں۔ میں ان کے ساتھ جنگل میں جانا چاہوں گی۔ مجھے ڈر نہیں لگتا۔" لورین اپنی ضد کی پکی تھی۔ ریبزو کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔
"میں آپ کی بہادری سے متاثر ہوا ہوں لورین! اس وقت سارے گاؤں پر ایک خوف کی فضا طاری ہے، آپ اس مشکل وقت میں امید اور نجات کی کرن ہیں مگر آپ کے والد صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ جنگل خطروں سے خالی نہیں۔ آپ کو وہاں نہیں جانا چاہیے۔" وہ بھی اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔
"یہ جنگل میرا گھر ہے۔ میرا بچپن انہی جنگلوں میں گزرا ہے۔ مجھے کسی سے ڈر نہیں لگتا اور ویسے بھی آپ کو جنگل میں آگے بڑھنے کے لیے ایک گائیڈ کی ضرورت ہے جو آپ کو جنگل کی اونچ نیچ سے آگاہ کر سکے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اگر ہمارا سامنا کسی درندے سے ہو بھی گیا تو آپ میری حفاظت کریں گے۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مسکرائی۔
لوئس نے کچھ کہنا چاہا مگر ریبزو کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔
ریبزو نے ایک نظر فلپس پر ڈالی۔
"فلپس! تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں لورین کی حفاظت کروں گا۔" ریبزو نے فلپس کو تسلی دی اور بالآخر فلپس مان گیا۔
کافز پر رات اترنے کے ساتھ ہی ویرانی چھا گئی تھی۔ اندھیرا پھیلتے ہی ریبزو نے چمڑے کے مخصوص بیگ میں کچھ ضروری سامان رکھا اور لوئس اور لورین کی ہمراہی میں جنگل کے اس حصے کی طرف رخت سفر باندھا جہاں سب سے زیادہ لاشیں ملنے کی نشاندہی کی گئی تھی۔
لوئس نے جیپ جنگل کے باہری علاقے میں ایک درخت کے ساتھ باندھ دی تھی۔ باقی کا راستہ انہیں پیدل طے کرنا تھا۔ جنگل کے اندرونی حصے تک پہنچتے پہنچتے رات مزید گہری ہو گئی۔ ریبزو نے ہاتھ میں پکڑی لالٹین جلائی۔
وہ احتیاط سے آگے بڑھ رہے تھے۔ لورین نے انہیں بتایا تھا کہ جنگل کے وسط میں موجود جھیل کے پاس سب سے زیادہ لاشیں ملی ہیں۔ ریبزو کا ارادہ جھیل تک جانے کا ہی تھا۔ لورین کے ساتھ آنے سے انہیں کافی مدد ملی تھی اور وہ جنگل میں بھٹکے بغیر جھیل تک پہنچ گئے تھے۔
آج رات وہ جھیل پر پہرا دینا چاہتا تھا۔ اس کے اندازے کے مطابق اگر درندہ جنگل میں رہ رہا تھا تو یقیناً وہ جھیل پر اپنی پیاس بجھانے کے لیے ضرور آتا ہوگا۔ جھیل کو چاروں طرف سے گھنے درختوں نے گھیرا ہوا تھا۔ وہاں پھیلا سناٹا اور جھیل کا سکوت ماحول کو ہیبت ناک بنا رہا تھا۔
ریبزو نے ایک گھنا درخت منتخب کیا۔ اس درخت سے جھیل صاف نظر آ رہی تھی۔ وہ تینوں اس درخت پر چڑھ کر درندے کا انتظار کرنے لگے۔ نہ جانے انہیں وہاں بیٹھے کتنا وقت بیت چکا تھا مگر جھیل اب بھی پُرسکون تھی۔
ریبزو کے پاس بھرمار بندوق موجود تھی جو اس نے چمڑے کے پٹے کی مدد سے کاندھے پر لٹکائی ہوئی تھی۔ وہ بار بار دوربین سے جنگل کے اطراف کا جائزہ لیتا۔ اونچائی پر بیٹھے ہونے کی وجہ سے اسے دور تک پھیلا ہوا جنگل صاف دکھائی دے رہا تھا۔ لورین جو اس کے ساتھ والے تنے پر موجود تھی، بلا خوف و خطر چوکنا بیٹھی تھی جبکہ لوئس جمائیاں لے رہا تھا اور قریب تھا کہ وہ وہیں درخت کے تنے پر ٹانگیں پسار کر سو جاتا، اچانک جنگل کسی پرندے کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سے گونج اٹھا۔ وہ تینوں ہی چوکنا ہو گئے۔ پروں کی آواز سے اندازہ ہوتا تھا کہ پرندہ دیوقامت ہے۔
اچانک ایک خوفناک چنگھاڑ گونجی۔ ریبزو کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ محسوس ہوئی۔ لورین نے آواز پر حیرت سے ریبزو کی طرف دیکھا۔ یہ آواز اس کے لیے بھی نئی تھی۔ ایسی آواز جنگل کے کسی جانور کی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کا بچپن ان جنگلوں میں فلپس کے ساتھ شکار کرتے گزرا تھا۔ وہ تینوں خاموشی سے پرندے کے ظاہر ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ پرندہ جھیل پر اترنے کے بجائے درختوں کے اوپر منڈلا رہا تھا۔ وہ کھڑے نہیں ہو سکتے تھے۔ ایسا کرنے سے وہ اس کی نظروں میں آ جاتے۔ ریبزو اسے اپنی طرف متوجہ نہیں کرنا چاہتا تھا لہٰذا خاموشی سے اس کے ظاہر ہونے کا انتظار کرنے لگا۔
تھوڑی دیر بعد ہی جنگل پر پھر سے سکوت طاری ہو گیا۔ وہ پرندہ وہاں سے جا چکا تھا۔ ان تینوں نے مایوسی سے ایک دوسرے کو دیکھا مگر بات کرنے سے گریز کیا۔ سورج نکلنے سے تھوڑی دیر پہلے ہی ریبزو نے واپس جانے کا فیصلہ کیا اور کچھ نہیں تو کم از کم اس کے ہاتھ ایک سرا تو آیا تھا کہ وہ کوئی دیوقامت پرندہ ہے اور جھیل پر آج نہیں تو کل ضرور اترے گا۔ وہ آنے والی رات کو دوبارہ جنگل میں گھات لگانے کا ارادہ رکھتا تھا۔
خطرہ اتنا بڑا نہیں تھا جتنا کافز کے لوگوں نے بنا دیا تھا۔ اس پرندے کو ختم کرنے کے لیے تو اس کی بھرمار

بندوق کا ایک ماہر نشانہ ہی کافی تھا۔ وہ سورج ڈھلنے تک جنگل سے باہر نکل آئے تھے۔ گھوڑے بگھی کے ساتھ صحیح سلامت موجود تھے۔

"لورین! دیکھو، وہ درندہ اتنا خطرناک ہوتا تو ہمارے گھوڑے صحیح سلامت موجود نہ ہوتے۔" ریبژو مسکرایا۔

"ڈاکٹر ریبژو! آپ ایک بہادر شخص ہیں۔ میری امیدیں بڑھ گئی ہیں۔ آپ یقیناً ہمیں اس درندے سے چھٹکارا دلائیں گے۔" لورین نے جواباً مسکرا کر ریبژو کی تعریف کی۔

"میں بھی اسی بہادری کے ساتھ جنگل میں داخل ہوا تھا۔" لوئیس نے اپنی تعریف خود ہی کرنا مناسب سمجھا۔ وہ دونوں ہنس پڑے۔

وہ دونوں بھی بگھی میں سوار ہو گئے۔ بگھی کے جنگل سے نکلتے ہی ہلکے اندھیرے میں چمکتی وہ انگارہ آنکھیں جنگل کی گھنی جھاڑیوں میں غائب ہو گئی تھیں۔ شکار اگلی رات دوبارہ آنے والا تھا۔ اسے جلدی نہیں تھی۔

☆☆☆

Year 2020
Vostok Research Centre
7:00am

وہ چاروں ریسرچ ٹیم کے ساتھ لیب میں موجود تھے۔ جوشوا نے انہیں کامیاب تجربے کی خوشخبری دی تھی۔ بندر کو سرنج لگے 12 گھنٹے بیت چکے تھے اور اب وہ ان کے ساتھ اپنی لیب میں اس بندر کے پنجرے کے پاس کھڑا آگے کا لائحہ عمل طے کر رہا تھا۔

ان بارہ گھنٹوں میں بندر کے جسم میں خون کی رفتار میں واضح تیزی آئی تھی مگر وہ پہلے سے زیادہ چاق و چوبند نظر آتا تھا۔ ہوش میں آتے ہی وہ وحشی سے پنجرے میں گھوم رہا تھا۔ اس کے رویے میں کوئی بدلاؤ نہیں آیا تھا مگر اس کی جسمانی ساخت بدل رہی تھی۔ وہ پہلے سے زیادہ مضبوط اور طاقتور لگ رہا تھا۔ ان بارہ گھنٹوں میں اس نے غذا نہیں لی تھی۔

ہیری نے اس بندر کو مسلسل نگرانی میں رکھا ہوا تھا۔ اس کے سامنے موجود تمام کمپیوٹر اسکرینز بندر کے جسم میں موجود چھوٹی سے چھوٹی تبدیلی کو لمحوں میں جانچ سکتی تھیں۔ ایک طرف بندر کے جسم کی اندرونی ساخت، دوسری طرف اس کے خون میں دوڑتے ڈی این اے کی رپورٹ اور تیسری طرف اس کے وائٹلز پر ایک ہی وقت میں نظر رکھنا، یہ کام صرف اور صرف ہیری ہی کر سکتا تھا۔

شمشیر، بندر کے خون سے نمونے لے کر اینٹی ویکسین پر کام شروع کر چکا تھا۔ جیکال اس کی مدد کر رہا تھا۔ ویسے تو ویکسین پر کام انسانی تجربے کے بعد شروع ہونا تھا مگر شمشیر پہلے سے ہی اینٹی باڈی کی تیاری شروع کرنا چاہتا تھا۔

جوشوا کے لیے یہ بات خوش آئند تھی کہ بندر کے جسم میں اب تک کوئی ری ایکشن نہیں نظر آیا تھا۔ وہ شیشے کے پار بندر کو اچھل کود کرتے دیکھ رہا تھا۔ برسوں سے دیکھا گیا اس کا یہ خواب پورا ہونے جا رہا تھا۔

"ہم انسانی تجربہ کب کریں گے؟" اچانک جیکال اس کے ساتھ آ کر کھڑا ہو گیا۔

"ویکسین کا اثر صحیح معنوں میں اڑتالیس گھنٹوں کے بعد شروع ہوگا۔ اس کے بعد ہی ہم کوئی حتمی فیصلہ کر سکیں گے۔ فی الحال تو سب کچھ ٹھیک لگ رہا ہے۔" جوشوا نے بندر سے نظریں ہٹائے بغیر ہی جیکال کی بات کا جواب دیا۔

"اڑتالیس گھنٹوں بعد تم اس بندر میں کس طرح کی تبدیلی کی امید رکھتے ہو؟" جیکال اب تک اس ویکسین کی بناوٹ، ساخت کو سمجھ نہیں پایا تھا۔

جوشوا ایک گہری سانس لے کر شیشے کے سامنے سے ہٹا اور اپنی کرسی کی طرف بڑھ گیا۔ جیکال نے اس کی پیروی کی۔ جوشوا نے کرسی پر بیٹھ کر اسکرین پر نظریں دوڑائیں۔ یہ اسکرین ہیری کے کمپیوٹر سے کنیکٹڈ تھی۔ سب کچھ نارمل تھا۔ وہ جیکال کی طرف متوجہ ہوا جو اس کے سامنے رکھی کرسی پر آ بیٹھا تھا۔

"یہ ویکسین انسانی جسم کو ایک طاقت دینے کی صلاحیت رکھتی ہے جس کا مقابلہ اس دنیا کے ہتھیار نہیں کر سکیں گے۔ نہ کوئی بیماری اثر کرے گی نہ ہی بڑھتی عمر۔ تم نے Hulk کے بارے میں سنا اور پڑھا ہوگا۔ بس یوں سمجھو کہ یہ انسان کو ایک دیوہیکل طاقت دے گی۔ اس کی عمر روک دے گی۔" جوشوا خیالوں میں کھوئے ہوئے بولتا ہی چلا گیا۔

"مگر یہ ہتھیار کیسے ہوا؟ دشمنوں کو یہ ویکسین لگا کر تو ہم اسے ناقابل تسخیر بنا دیں گے۔" جیکال نے بے یقینی سے سر ہلایا۔

"یہ ویکسین میں دشمنوں کے لیے نہیں بلکہ اپنے ملک کے لیے تیار کر رہا ہوں۔ بیماریاں ایجاد کرنا اور انہیں پھیلانا خود ان ممالک کے لیے بھی نقصان دہ ثابت ہوا جو اس کام میں آگے آگے تھے۔ میں نے بالکل ہی مختلف ریسرچ پیش کی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ اپنے فوجیوں کے لیے ایسی ویکسین ایجاد کروں جو انہیں موت کی فکر سے آزاد کر دے۔ وہ اسے

طاقتور ہو جائیں کہ ناقابلِ تسخیر کہلائیں۔ ہم سب بھی اس سے فائدہ اٹھائیں۔ جب ساری دنیا بھوک، بیماری سے مر رہی ہو، ہمارے جسم اس قید سے آزاد ہوں۔ تب دنیا پر صرف ہماری حکومت ہوگی۔'' جوشوا اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

''تمہارا مطلب ہے کہ یہ آبِ حیات ہے؟'' جیکال نے بے یقینی سے آنکھیں پھیلائیں۔ ''یہ تو اس صدی کی سب سے بڑی ایجاد ہوگی۔''

''ایسا ہی سمجھ لو۔'' جوشوا سنجیدگی سے بولا۔

''اگر یہ ویکسین انسانوں کے لیے اتنی ہی کارآمد ہے تو ہم اینٹی ویکسین کیوں تیار کر رہے ہیں؟'' جیکال نے پوری توجہ سے کام کرتے شمشیر پر ایک نظر ڈالی۔ جو مختلف محلولوں کی شیشیوں کو سامنے رکھے اپنے کمپیوٹر پر مصروف تھا۔

''ہر ایکشن کا ری ایکشن ہے۔ لہٰذا اینٹی ویکسین بھی ساتھ ہی تیار ہونی چاہیے۔ ضروری نہیں کہ ہر جسم اتنی طاقت کو سہار سکے۔ یہ ویکسین صرف مضبوط اور چست جسم پر ہی صحیح طرح اثر انداز ہوگی ــــ خاص طور پر وہ جن کے اعصاب بھی ان کے جسم کی طرح مضبوط ہوں۔'' جوشوا آج ساری باتیں بتانے کے موڈ میں تھا۔

''اوہ، یعنی کہ ہماری فوج!'' جیکال کو ساری بات سمجھ آ گئی تھی۔

''ہاں، فوج یا اسٹیبلشمنٹ..... اور پھر ان کامیاب تجربوں کے بعد ہم اسے عام لوگوں کے لیے بھی کارآمد بنانے کی کوشش کریں گے۔'' جوشوا نے اثبات میں سر ہلایا۔

فریڈ انہیں کافی سرو کرنے لگا تو وہ دونوں خاموش ہو گئے۔ فریڈ فوجی بٹلر تھا اور اکثر اہم منصوبوں پر فوج کی طرف سے اسے ہی تعینات کیا جاتا تھا مگر تب بھی وہ سب اس کے سامنے بات کرنے سے احتیاط برتا کرتے تھے۔

فریڈ ویسے بھی اپنا زیادہ تر وقت کچن میں گزارتا یا واشوک میں تعینات میڈیکل اسٹاف کے ساتھ جا بیٹھتا۔ صفائی اور مینٹیننس اسٹاف بھی فریڈ کے ساتھ کچن میں محفل جمائے رکھتے۔ فریڈ کے ساتھ وہ مددگار بٹلر بھی یہاں مقیم تھے۔ تب بھی وہ اکتایا ہوا رہتا۔

کبھی تو یہ سارے گھنٹوں لیب میں بند رہتے اور اسے آدھی رات کو اٹھ کر ان کی بھوک کا انتظام کرنا پڑتا۔ ان چاروں کے علاوہ جو لیب اسسٹنٹ یہاں موجود تھے، وہ بھی ان کے ساتھ رہ رہ کر ان کے جیسے ہی ہو گئے تھے۔ اس خشک ماحول میں تھوڑی بہت تبدیلی تب آئی تھی جب ہیری کی منگیتر صوفیہ یہاں وقت گزارنے آتی۔ وہ اس سے گپ شپ کر کے اچھا محسوس کرتا تھا۔ وہ بھی حکومت کی طرف سے ملنے والے بھاری معاوضے کی وجہ سے یہاں کام کرنے پر مجبور تھا۔ اسے یہاں آنے سے پہلے لگا تھا کہ یہ مشکل چھ، آٹھ ماہ کی بات ہوگی مگر یہاں ڈیڑھ سال گزر گیا تھا اور یہ سائنس دان ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے تھے۔

اس نے کئی بار واپس جانے کی درخواست کی مگر منصوبے کی خفیہ نوعیت کو مدِنظر رکھتے ہوئے اس کی درخواست کو ہر دفعہ رد کر دیا جاتا۔ حکومت اس منصوبے پر بار بار تبدیلی اور تقرری کا عمل نہیں کرنا چاہتی تھی۔ لہٰذا بدلے میں اس کا معاوضہ بڑھا دیا گیا تھا اور وہ ہر دو ہفتے بعد اپنے گھر والوں سے مل آتا تھا مگر اب اس نے یہ دعائیں کرنا شروع کر دی تھیں کہ یہ سائنس دان اپنے منصوبے میں جلد از جلد کامیاب ہوں تا کہ اسے اس جگہ سے چھٹکارا مل سکے۔

فریڈ کے جانے کے بعد جیکال دوبارہ جوشوا کی طرف متوجہ ہوا۔

''تم نے یہ نہیں بتایا کہ انسانی تجربہ تم کس پر کرنے والے ہو؟'' جیکال بالآخر اپنے ذہن میں کلبلاتے اس سوال کو زبان پر لانے میں کامیاب ہو گیا۔

''میں نے یہ تجربہ خود پر کرنے کا سوچا ہے۔'' جوشوا نے دھماکا کیا۔

''کیا.....کیا کہہ رہے ہو تم؟ جانتے ہو کہ اس کے نتائج سنگین بھی ہو سکتے ہیں۔'' جیکال نے کافی کا کپ واپس رکھ دیا۔

''میں جانتا ہوں لیکن جب بنانے والا ہی اپنے تجربے پر بھروسا نہیں کرے گا تو میں باقی سب کو اس عمل کے لیے کیسے راضی کر سکتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ دو دن بعد تم سب کی موجودگی میں یہ ویکسین میرے جسم میں اتاری جائے اور مجھے دو دن تک انڈر آبزرویشن رکھنے کے بعد حکومت کو مطلع کیا جائے۔ اگر ہم اس تجربے میں کامیاب ہو گئے تو حکومت کے اہم لوگوں کو ویکسین لگانے کا عمل اسی دن سے شروع کر دیں گے اور سب کو ویکسین کی ڈوز بھی دی جائے گی۔'' جوشوا نے اسے اپنے منصوبے سے آگاہ کیا۔

''اور اگر.....'' جیکال نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

''اور اگر مجھے کچھ ہو گیا تو تب بھی یہ بات واشوک کی دیواروں میں ہی دفن ہو جائے گی اور میں یہاں بھوت بن کر گھوموں گا۔'' جوشوا مسکرایا۔

''میں نے تمہارے جیسا سرپھرا نہیں دیکھا۔'' جیکال

ہنس پڑا۔

"لگتا ہے تم فرید کے ساتھ زیادہ اٹھنے بیٹھنے لگے ہو تبھی مجھے سر پھرا کہہ رہے ہو۔" جوشوا بھی ہنسنے لگا۔

"میں دعا کرتا ہوں کہ تمہارا یہ تجربہ کامیاب رہے اور ہم سب کے لیے فائدہ مند ہو۔ مجھے امید ہے کہ یہ ناکام نہیں ہوگا۔" بیکال پُرخلوص لہجے میں بولا۔

جوشوا اثبات میں سر ہلا کر مسکرا دیا۔ بس ایک دن مزید انتظار کے بعد اس کی سالوں کی محنت کا نتیجہ سب کے سامنے آنے والا تھا۔

☆☆☆

Year 1723

Jungdaal-Parallel Universe

وہ آج رات پھر شکار کے لیے نکلا تھا۔ وہ ساتوں اس کے ساتھ ہی تھے۔ اس بار اسے نئے جنگلوں میں کثرت سے شکار کی اطلاعات موصول ہوئی تھیں۔ ویسے تو جنگداال کے ماہر شکاری کسی سے کم نہ تھے مگر کون سا عفریت کس طاقت کے ساتھ جنگداال میں اترتا تھا، اس کا اندازہ اور مقابلے کی سکت ہر ایک میں نہ تھی۔

ہر عفریت کا حملے کا طریقہ مختلف تھا۔ بدکال عفریتوں کی دنیا تھی اور وہاں لاکھوں اقسام کے عفریت آباد تھے۔ کس عفریت کی کیا کمزوری ہے اور اس سے کیسے لڑنا ہے، یہ سوائے شاکا کے اور کوئی نہیں جانتا تھا۔ جنگداال کے لوگوں نے مقابلہ ضرور کیا تھا مگر ہر بار ایک نئی مصیبت نازل ہو رہی تھی۔ ابھی وہ پچھلے عفریت سے نمٹ کر اس کے مطابق لائحہ عمل ترتیب دے ہی رہے ہوتے تھے کہ ایک نئی بلا نازل ہو جاتی تھی۔ جنگداال کے جنگل اور جھیلوں پر عفریتوں نے اپنی راجدھانی قائم کرنا شروع کر دی تھی اور شاکا کے ہوتے ہوئے کوئی اور جنگداال پر حکمرانی کرے، یہ اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔

اسے اب بدکال کا وہ خفیہ دروازہ جلد از جلد ڈھونڈنا تھا اور ساتھ ہی جنگداال میں موجود ان بلاؤں کو جہنم واصل کرنا تھا۔ وہ گھنے اندھیرے جنگل میں تیزی سے دوڑ رہا تھا۔ ہمیشہ کی طرح وہ ساتوں اس کی برابری نہیں کر پا رہے تھے۔ بارش کی وجہ سے جنگلی بڑھ گئی تھی اور جگہ جگہ کیچڑ کی وجہ سے پھسلن تھی۔ عفراش جو ان کے سروں پر منڈلاتا اپنی رفتار برقرار رکھے ہوئے تھا، اچانک ہی چنگھاڑا۔ عفریت کہیں قریب ہی تھا۔

شاکا کے کان کھڑے ہو گئے۔ وہ رک کر عفریت کی بُو کو محسوس کرنے لگا۔

جنگل وائلن کی آواز سے گونجا۔ ان سب کے چہروں پر حیرت پھیل گئی۔ یہ کیسی آواز تھی۔ یہ تو موسیقی کی طرح بھلی معلوم ہوتی تھی مگر اس موسیقی میں خوشی نہیں تھی۔ ایک دکھ تھا۔ ایسا دکھ جو انسان کو اپنی طرف کھینچنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ وہ ساتوں حیرت سے جنگل کے اطراف میں نظریں دوڑانے لگے۔ شاکا اپنی آنکھیں بند کر چکا تھا۔ اسے خطرے کی بو محسوس ہوئی تھی۔ وہ روحوں سے رابطے میں تھا۔

اس نے اچانک آنکھیں کھولیں مگر اس کے بھائی وہاں سے غائب ہو چکے تھے۔ وہ حیرت سے چاروں طرف گھوم کر جنگل کا جائزہ لینے لگا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ وہ اسے اکیلا چھوڑ کر کہیں غائب ہو جائے۔ عفراش نے اپنے پر پھڑپھڑا کر اسے خبردار کیا تھا۔ وہ تیزی سے ایک طرف کو دوڑنے لگا اور بالآخر ایک گہری، گھنے درختوں سے ڈھکی جھیل کے پاس پہنچ کر رک گیا۔ چاندنی میں نہائی جھیل کا پانی کسی کو بھی مبہوت کر دینے کے لیے کافی تھا مگر جس منظر نے شاکا کو رکنے پر مجبور کیا تھا وہ تھے اس کے ساتوں بھائی جو کسی ٹرانس کی صورت جھیل کی طرف بڑھ رہے تھے۔

"یاگا......" شاکا نے اپنے بھائی کو آواز دی مگر وہ اس کی آواز سن کر بھی نہیں رکا۔ شاکا کے چہرے پر حیرت پھیل گئی۔

"معروف....." اس نے اپنے سب سے چھوٹے بھائی کو خبردار کرنا چاہا مگر وہ اسے سن ہی نہیں رہے تھے۔

شاکا نے آس پاس کا جائزہ لیا۔ اسے قریب کوئی بھی عفریت نظر نہیں آیا تھا۔ پھر یہ کیا طلسم تھا؟

عفراش بھی قریبی درخت کی شاخ پر جا بیٹھا۔ وہ بھی حیرت سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔

شاکا تیزی سے ان ساتوں کی طرف بڑھا اور ان کے آگے جا کر کھڑا ہو گیا۔ شاکا کو اپنے سامنے کھڑا دیکھ کر وہ سارے جیسے ہوش میں آئے اور اپنا سر جھٹکنے لگے۔ شاکا کو یقین ہو گیا کہ ان پر طلسم کیا گیا تھا۔ اچانک وائلن کی آواز دوبارہ گونجی اور اس بار وائلن کی آواز میں پہلے سے زیادہ درد گھلا ہوا تھا۔

شاکا کو اپنے اعصاب شل ہوتے محسوس ہوئے مگر وہ ان پر قابو پانے میں کامیاب رہا تھا لیکن اس کے بھائی ایک بار پھر اس طلسم کی قید میں... جکڑے جا چکے تھے اور تیزی سے جھیل کی طرف بڑھ رہے تھے۔

اس بار شاکا نے انہیں روکنے کے بجائے اس وائلن

بجانے والے کو ڈھونڈنے پر اپنی توجہ مبذول کی۔ آس پاس کوئی بھی نہیں تھا۔ وائلن کی آواز میں مزید درد شامل ہو چکا تھا۔ اچانک اس کے بھائی بین کرنا شروع ہو گئے۔ اندھیری رات، گھنا جنگل، جھیل پر بکھری چاندنی، وائلن کی آواز اور اس کے بھائیوں کا بین۔ ماحول پر عجیب سا خوف طاری ہو چکا تھا۔

شاکا کو ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی اس کے ذہن کو قابو کر کے اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ اتنا شدید طلسم جلد ان میں کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ شاکا کو اس وائلن بجانے والے کو ڈھونڈ کر اس طلسم کو توڑنا تھا مگر وہاں کوئی ہوتا تو نظر آتا اور پھر جیسے اسے اپنی مشکل کا حل سامنے نظر آیا۔

اس نے پاگا کو جھیل کے کنارے بیٹھ کر آنسو بہاتے دیکھا۔ اس کے سارے بھائی ایک ایک کر کے جھیل کے کنارے بیٹھ گئے۔ ان کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ پاگا نے روتے ہوئے اپنا ہاتھ جھیل میں ڈال دیا۔ جھیل میں ہلچل ہوئی اور پاگا کو کسی نے ایک جھٹکے سے جھیل کے اندر کھینچ لیا۔

وہ جھیل کے اندر گرتے ہی بری طرح تڑپا اور یہ دیکھتے ہی شاکا نے جھیل کی طرف دوڑ لگا دی تھی۔ پاگا کا طلسم ٹوٹ چکا تھا اور وہ جھیل سے باہر آنے کی کوشش کر رہا تھا مگر ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی اسے اندر کی طرف کھینچ رہا ہے۔ شاکا کے دوسرے بھائی ابھی تک اس طلسم کی قید میں تھے۔ وہ پاگا کی اس جدوجہد کو دیکھنے سے قاصر تھے اور آہستہ آہستہ اپنا ہاتھ جھیل کی طرف بڑھا رہے تھے۔

شاکا نے جھیل میں چھلانگ لگا دی اور تیر کر گہرائی میں اترنے لگا۔ حیرت کی بات تو یہ تھی کہ پانی کے اندر بھی وائلن کی آواز اسی طرح برقرار تھی۔

اور پھر شاکا کو جھیل کے سب سے گہرے کونے میں دو لال آنکھیں نظر آئیں۔ وہ کوئی لاش نما جسم تھا جو شاید پانی میں ڈوبے رہنے کی وجہ سے گل سڑ چکا تھا۔ اس کے جسم پر جگہ جگہ کائی جمی ہوئی تھی۔ وہ جھیل کی تہ میں موجود چٹان پر بیٹھا وائلن بجا رہا تھا۔

شاکا کے لیے وائلن کے اس طلسم کو برداشت کرنا مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ پانی میں مسلسل ہوتے چھپاکوں سے اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کے بھائی ایک ایک کر کے جھیل میں چھلانگ لگا رہے ہیں۔ یہ عفریت انھیں اپنے قابو میں کر رہا تھا۔

شاکا کو قریب آتا دیکھ کر اس عفریت نے اپنا منہ کھولا جیسے وہ اسے نگل جائے گا۔ اس کے وائلن بجانے میں تیزی آ گئی تھی۔ شاکا تیزی سے اس کی طرف بڑھا اور اسے گردن سے دبوچ لیا۔ اس کا وائلن ایک طرف جا گرا۔

وائلن کے گرتے ہی شاکا کے بھائی اس طلسم کی قید سے آزاد ہوئے اور پانی میں پھڑپھڑاتے ان کے وجود تھم گئے۔ وہ حیرت سے چاروں طرف دیکھنے لگے۔ شاکا کہاں تھا؟ عفراش نے چنگھاڑ کر انھیں خطرے سے آگاہ کیا تھا۔

شاکا اس عفریت کو گردن سے دبوچے جھیل کی سطح پر نمودار ہوا۔ اچانک عفریت نے اپنے منہ کا دہانہ کھولا اور اس کا منہ کھلتے ہی اندر سے کالے رنگ کا گاڑھا مواد شاکا کے اوپر گرنا شروع ہو گیا۔ شاکا کو ایسا لگا جیسے وہ اپنی بینائی کھو بیٹھے گا۔

یہ منظر دیکھتے ہی وہ ساتوں بھیڑیوں کے روپ میں تبدیل ہو گئے اور انھوں نے اس عفریت پر چھلانگ لگا دی۔ شاکا کو اپنی آنکھوں میں شدید جلن محسوس ہو رہی تھی۔ وہ بہ مشکل اپنی آنکھیں کھولے یہ ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔ عفریت ان بھیڑیوں کے بیچ میں گھر چکا تھا۔

شاکا نے جھیل کے پانی سے اپنی آنکھوں کو دھونا شروع کیا۔ دھندلاہٹ کم ہوئی مگر اب بھی اس کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ اس کے بھائی اس عفریت کو ہاتھوں اور جبڑوں سے دبوچے کنارے کی طرف بڑھ رہے تھے۔

شاکا تیرتا ہوا جھیل کے کنارے پر آ پہنچا۔ اس کی آنکھیں لال ہو رہی تھیں۔ وہ باہر نکل آیا اور جھیل کے کنارے لگے اس عفریت کو ایک جھٹکے سے پکڑ کر زمین پر پٹخ دیا۔ عفریت کے منہ سے ایک دردناک چیخ بلند ہوئی اور وہ دوڑ کر دوبارہ پانی میں جانے کی کوشش کرنے لگا۔

وہ سب اسے گھیرے کھڑے تھے۔ وہ بری طرح تڑپ رہا تھا۔ شاید اس کی طاقتیں پانی کے اندر ہی کام کرتی تھیں۔ شاکا حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ اس نے ایسا عفریت اپنی زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔

ابھی وہ اس پر غور کر ہی رہا تھا کہ وہ سفید رنگ کے گھوڑے میں تبدیل ہو گیا۔ وہ سارے حیرت سے پیچھے ہٹے اور ان کے پیچھے ہٹنے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ ایک جست میں ان کے گھیرے سے باہر نکلا اور جھیل کے اندر کود گیا۔ شاکا اس کے پیچھے جھیل میں دوبارہ کودا مگر وہ لمحوں میں غائب ہو چکا تھا۔ شاکا جھیل کی گہرائی تک اترا جہاں اب سے کچھ دیر پہلے وہ اسے وائلن بجاتا نظر آیا تھا مگر اب وہاں اس کا وائلن بھی موجود نہیں تھا۔ شاکا واپس جھیل کی سطح پر نمودار ہوا۔ اس کے بھائی جھیل کے کنارے کھڑے حیرت

سے یہ سارا تماشا دیکھ رہے تھے۔ وہ جھیل سے باہر نکل آیا اور گہری گہری سانسیں لینے لگا۔

"کیا ہوا؟ کہاں گیا وہ؟" ترگ پوچھنے لگا۔

"وہ غائب ہو گیا۔ تہ میں بھی نہیں ہے۔" شاکا نے جواب دیا۔

"اب کیا کرنا ہے؟" کارا جوان میں سب سے بڑا تھا، محتاط طریقے سے ارد گرد کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"شرقال چلو۔ یہاں کے سردار سے بات کرتے ہیں۔" شاکا نے ہاتھ آگے بڑھایا اور عفراش درخت سے اڑ کر اس کے بازو پر آ بیٹھا۔

وہ اب شرقال قبیلے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ ساتوں اس کے پیچھے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ اسے شرقال کے سردار سے گزشتہ روز ہی مدد کی درخواست موصول ہوئی تھی مگر شرقال کے اس عفریت کا شکار کرنے میں وہ ناکام رہا تھا۔ اسے اب اندازہ ہو رہا تھا کہ حالات بے حد سنگین ہو چکے ہیں۔ یہ کوئی عام عفریت نہیں تھے۔

اسے ان کے بارے میں پوری طرح معلومات بھی حاصل نہیں تھیں۔ روحوں سے ایک تفصیلی ملاقات ازحد ضروری ہو چکی تھی۔ ایک وقت میں وہ ایک ہی قبیلے کی مدد کو پہنچ سکتا تھا مگر باقی قبیلوں کا کیا کرتا؟ لہٰذا اگلا قدم اسے سوچ سمجھ کر اٹھانا تھا۔ جلد ازل کو ان عفریتوں سے پاک کرنے کا وقت آ پہنچا تھا۔

☆☆☆

Year 1723

Capiz-Philippines

رینزو نے جنگل سے واپس آنے کے بعد آرام کیا اور پھر وہ ڈسپنسری چلا آیا۔ لوئس اب تک محو استراحت تھا۔ رینزو اس کے آرام میں خلل نہیں ڈالنا چاہتا تھا اور ویسے بھی اسے اکیلے میں اب تک جمع کیے گئے شواہد پر ایک تفصیلی نظر ڈالنی تھی تاکہ وہ کسی نتیجے پر پہنچ سکے۔

اس نے لکڑی کے تختے نما اسٹریچر پر ایک چمڑے کی طرز کا بڑا سا صفحہ بچھایا اور کاپز اور اس سے ملحقہ جنگلات کا نقشہ تیار کرنے لگا۔ نقشہ تیار کرنے کے بعد اس نے ان مخصوص جگہوں پر نشانات لگائے جہاں درندے کو دیکھے جانے کے شواہد ملے تھے۔ اس سلسلے میں وہ اپنی ڈائری میں نوٹ کیے گئے اہم نکات سے مدد لیتا رہا۔ زیادہ تر شکار جنگل اور جھیل کے قریبی علاقوں میں ہوئے تھے۔ ساحلی علاقے اس عفریت کے شر سے کسی حد تک بچے ہوئے تھے۔ البتہ جیکب کی بیوی کو اس کے گھر میں قتل کیا گیا تھا۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ درندہ جنگل میں ہی رہ رہا تھا۔ درندے کے حلیے کے حوالے سے لوگوں کی باتوں میں تضاد پایا جاتا تھا مگر شکار کا وقت زیادہ تر رات ہی کا لکھا ہوا تھا۔ یعنی وہ درندہ رات کے وقت ہی باہر نکلتا تھا۔

اس نقشے اور ڈائری میں لکھے گئے نکات پر کافی دیر تک غور کرنے کے بعد رینزو اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ لوگ جو درندے کو پرندے سے تشبیہ دے رہے تھے، وہی سچ بول رہے تھے۔ ان شاہدین نے اس پرندے کو جن علاقوں میں اڑتا دیکھا تھا، اس نے نقشے پر ان جگہوں پر لال رنگ کا گول دائرہ بنا دیا۔ وہ پہلے انہی جگہوں سے تفتیش کا آغاز کرنا چاہ رہا تھا۔ ایک بار وہ اس درندے کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا، اس کے بعد ہی وہ اس کے شکار کا لائحہ عمل تیار کرتا۔ کیونکہ درندے کی قد و قامت کا اندازہ لگانے کے بعد ہی وہ مخصوص ہتھیار تیار کرتا۔ ویسے تو اس کی بندوق ہمیشہ اس کے پاس ہی ہوتی تھی مگر وہ پوری تیاری کے ساتھ اس کا شکار کرنا چاہتا تھا۔

اس نے نشان لگا کر نقشہ لپیٹا اور جنگل سے اٹھائی گئی مٹی اور پودوں کے نمونوں کا جائزہ لینے لگا۔ اس نے اپنی خوردبین اور مخصوص آلات ڈسپنسری میں ہی سیٹ کر دیے تھے تاکہ وہ بہ آسانی ہر نمونے کا معائنہ کر سکے۔ اس نے جنگل کی گھاس کا نمونہ خوردبین کے گلاس پر رکھا اور اس کا معائنہ کرنے لگا۔ اچانک ہی ڈسپنسری کی چھت گڑگڑائی۔ ایسا لگا جیسے کوئی تیزی سے چھت پر دوڑ رہا ہو۔ رینزو نے حیرت سے اوپر دیکھا۔ کمرے میں چھتیں ڈھلان کی صورت میں بنی تھیں۔ ان پر اس طرح بھاگنا ناممکن تھا۔

وہ تیزی سے دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ دن کے گیارہ بجنے والے تھے مگر گھر کا فراب بھی ویران پڑا تھا۔ اس نے ڈسپنسری سے باہر نکل کر چھت کا جائزہ لیا مگر وہاں کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ اسے حیرت ہوئی کیونکہ اس نے واضح طور پر کسی کے دوڑنے کی آواز سنی تھی۔ اس ڈھلان والی چھت پر جو بھی دوڑتا، لازمی پھسل کر نیچے آ گرتا۔

وہ ڈسپنسری کے عقبی حصے کی طرف آ گیا۔ یہ حصہ جنگل سے منسلک تھا۔ جنگل کو رہائشی علاقے سے علیحدہ کرنے کے لیے خاردار باڑ لگائی گئی تھی۔ عقبی حصہ مکمل طور پر خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔

"کہیں یہ درندہ تو نہیں تھا؟" رینزو نے سوچا۔

اسے بے اختیار جھرجھری آ گئی۔ وہ اپنی بندوق بھی

ڈسپنسری میں چھوڑ آیا تھا لہٰذا تیزی سے واپس ڈسپنسری کے اگلے حصے کی طرف آ گیا۔ وہ بہادر بننے کے چکر میں بے وقوفی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کالفز میں ہونے والے واقعات اس بات کی دلیل تھے کہ یہاں بہادری سے زیادہ عقل مندی سے کام کرنے والے کی ضرورت تھی۔ اس نے ایک بار پھر گاؤں کا تفصیلی جائزہ لیا اور ڈسپنسری کے اندر داخل ہو گیا مگر اندر داخل ہوتے ہی وہ بری طرح چونکا۔ کوئی تھوڑو میز پر جھکا ہوا تھا۔ آہٹ پا کر وہ سایہ سیدھا ہوا۔

"اوہ لورین تم!" ریزو کی سانس واپس آئی۔

"کیا میں نے آپ کو ڈرا دیا؟ معاف کیجیے گا۔ میں آپ کے لیے کافی لے کر آئی تھی۔ میں نے سوچا آپ کام کرتے کرتے تھک نہ گئے ہوں۔" اس نے مسکراتے ہوئے کافی کے تھرماس کی طرف اشارہ کیا۔

"نہیں، میں بس اطراف کا جائزہ لے رہا تھا اور دو پیالیاں دیکھ کر مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ آپ کا بھی میرے ساتھ کافی پینے کا ارادہ ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے آگے بڑھا اور دونوں پیالوں میں کافی انڈیلنے لگا۔

"جی، میں نے دیکھا کہ آپ کمرے میں نہیں ہیں تو میں بھی کافی لے کر یہیں چلی آئی۔ کیا آپ رات بھر جنگل میں پھیرا دینے سے تھکے نہیں؟" اس نے مسکراتے ہوئے کافی کا کپ اٹھا لیا۔

"میرے لیے دو تین گھنٹے کی نیند بھی کافی ہوتی ہے اور ویسے بھی جب تک میں اپنا کام مکمل نہ کر لوں، چین سے نہیں بیٹھ سکتا۔" وہ بھاپ اڑاتے کپ کو اپنے لبوں سے لگاتے ہوئے مسکرایا۔ کافی کی خوشبو نے اس کی ساری حسیں بیدار کر دی تھیں۔

لورین تختے پر چپکے نقشے کی طرف بڑھی۔ "یہ کیا ہے؟" اس کی دلچسپی بڑھ گئی۔

"یہ کالفز اور اس سے ملحق علاقوں کا نقشہ ہے۔ ویسے یہ مکمل نقشہ نہیں ہے بلکہ صرف انہی علاقوں پر مشتمل ہے جہاں اس درندے نے شکار کیے ہیں۔ میں ایسے ہی کام شروع کرتا ہوں۔" وہ مسکرایا۔

"آپ کے سامان میں مجھے بہت سی نئی چیزیں بھی نظر آئی ہیں۔" وہ مختلف ریکس پر رکھی عجیب و غریب مشینیں دیکھ کر بولی۔

"ان میں کچھ جراحی آلات ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ ایسے آلات بھی ہیں جو کھوج لگانے میں میری مدد کرتے ہیں۔ یہ سب میری اپنی ہی ایجادات ہیں۔" وہ فخریہ لہجے میں بولا۔

"کمال ہے۔ آپ اپنی ان ایجادات اور مہم جوئی کے حوالے سے ایک کتاب بھی مرتب کریں تا کہ آگے آنے والی نسلیں آپ کی ایجادات اور کارناموں سے مستفید ہو سکیں۔" وہ واقعی متاثر ہوئی تھی۔

ریزو ہنس پڑا۔ "ضرور۔ فی الحال تو میں یہ ساری چیزیں اپنی اس ڈائری میں نوٹ کر رہا ہوں۔ زندگی نے موقع دیا تو ان معلومات کو ضرور کتابی شکل میں لے کر آؤں گا۔ مجھے لگتا ہے کہ کالفز کا یہ سفر میری زندگی بدلنے والا ہے۔"

"آپ کی سب سے پہلی کتاب میں ہی خریدوں گی۔" وہ جوش سے بولی۔

ریزو نے اس پر ایک گہری نظر ڈالی۔ وہ بے انتہا حسین تھی۔ یا تو وہ اس بات سے حقیقتاً بے خبر تھی یا پھر یہ بھی اس کی ایک ادا تھی۔

وہ ریزو کے اس طرح دیکھنے پر تذبذب کا شکار ہوئی۔

ریزو کو اپنی بے باکی کا احساس ہوا تھا وہ کافی کا کپ رکھ کر نقشے کی طرف بڑھ گیا۔

"آپ کو تب کیسا لگے گا جب آپ کا ذکر بھی اس کتاب میں موجود ہو؟" وہ نقشے پر نظریں گاڑے مسکرایا۔

"واقعی..... وہ کیسے؟" وہ ایک دم سے خوش ہو گئی۔

"وہ ایسے کہ آپ میری اس کیس میں مدد کریں گی۔ یہ وہ علاقے ہیں جہاں مجھے درندے کے ہونے کا یقین ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آج رات ہم ان علاقوں کا جائزہ لیں اور اندھیرا ہونے سے پہلے ہی نکل جائیں۔ کیا آپ مجھے بتا سکتی ہیں کہ یہ جگہیں ایک دوسرے سے کتنے فاصلے پر موجود ہیں اور کیا ہم آج کی رات ہی ان دونوں جگہوں کا جائزہ لے سکتے ہیں؟" وہ سنجیدگی سے نقشے پر لال نشان لگانے لگا۔

"ضرور بتا سکتی ہوں۔ یہ سمندری علاقہ تو ہم اندھیرا ہونے سے پہلے پہلے دیکھ سکتے ہیں مگر یہ دوسری جگہ جنگل کے اندر ہے۔ یہاں پہنچتے تک ہمیں رات ہو جائے گی اور یہاں سے واپسی بھی ممکن نہیں ہوگی۔ دوسری جگہ دیکھنے کے لیے ہم کل کی رات متعین کر سکتے ہیں۔" وہ بھی سنجیدگی سے جواب دینے لگی۔

"تو پھر چلنے کی تیاری کرو۔" وہ نقشہ موڑنے لگا۔

"ٹھیک ہے۔ میں تمام ضروری سامان رکھ لیتی ہوں۔" وہ ڈسپنسری سے باہر نکل گئی۔

(باقی حصہ اگلے ماہ)

اسیر

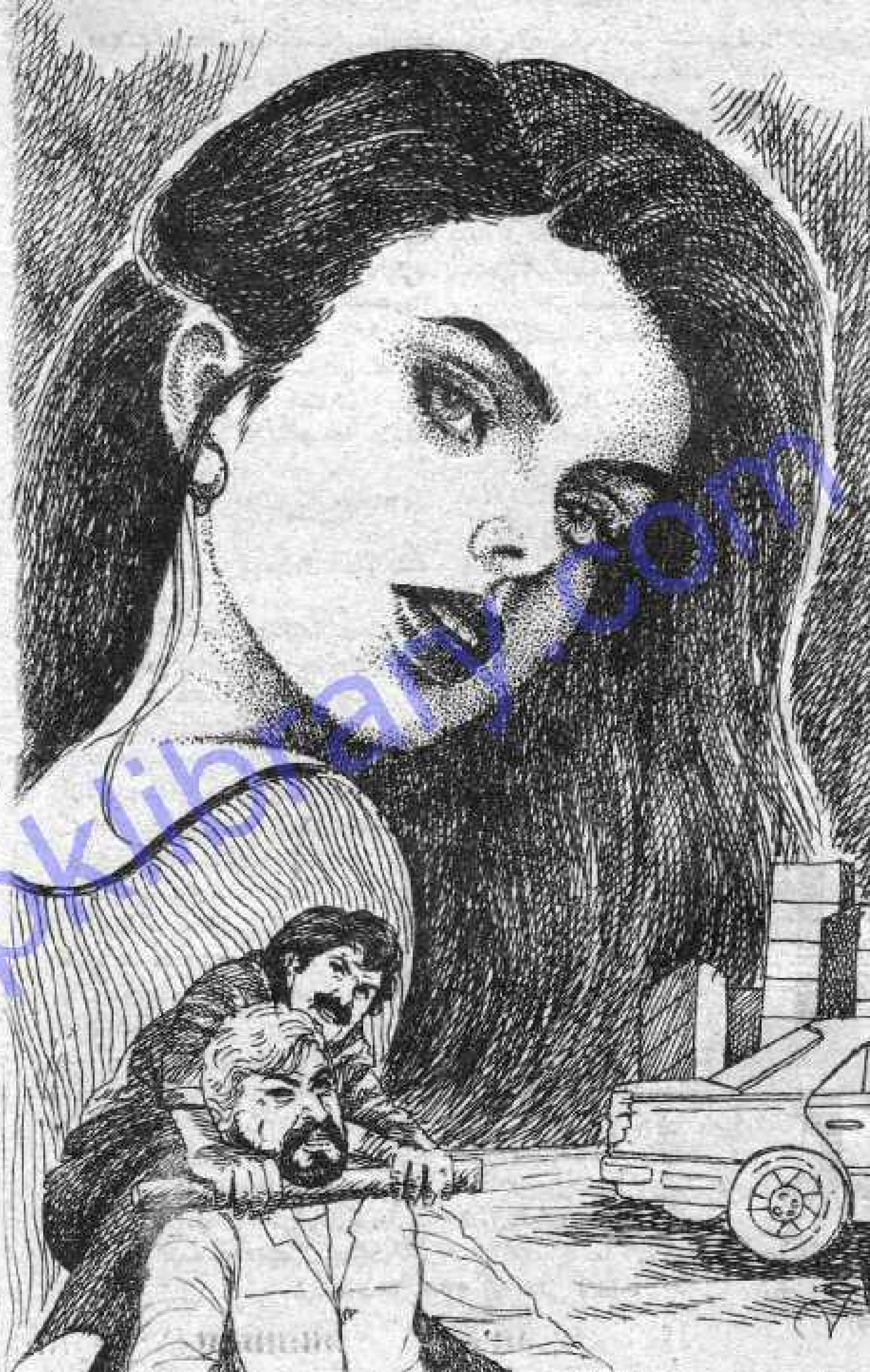
محمد فاروق انجم

زندگی اگر خواہشوں کی اسیر ہو جائے تو نشیب و فراز بھی ایسے مسافروں کی کوئی رہنمائی نہیں کر سکتے جب تک کوئی بڑی ٹھوکر نہ لگ جائے انہیں دوسروں کی تکلیف کا احساس نہیں ہو سکتا... وہ بھی بے جا خواہشوں کی ڈور تھامے ناقابلِ یقین سازشوں میں اتنے مصروف تھے کہ... انہیں قدرت کی آزمائشوں کا ادراک ہی نہ ہو پایا... اور... کوئی بھی شدید ٹھوکر لگنے تک ان کی بے حسی کمال پر رہی اور ان کے رستوں میں وبال بچھاتی رہی... انہیں احساس ہی نہیں ہو سکا تھا کہ دوسروں کی زندگی اجاڑ کر اپنا مفاد حاصل کرنے کی جستجو کبھی انہیں بھی آباد نہیں ہونے دے گی... کیونکہ آگ اور پانی کا ملاپ حقیقت تو دور کی بات کبھی تصور میں بھی ممکن نہیں ہوتا... اور جو انگاروں سے کھیلا کرتے ہیں ہمیشہ آبلوں کی زد پر ہی رہتے ہیں...

دولت کی جھنکار پر محوِ رقص... خواہشوں کے تعاقب

سپنے دوڑنے والوں کی عبرت اثر داستان...





وہ چوتھے فلور کے ایک اپارٹمنٹ کے کمرے کی بڑی کھڑکی کے پاس کرسی پر ٹانگ پر ٹانگ جمائے براجمان تھی۔ کھڑکی کے آگے سے پردے ہٹے ہوئے تھے اور شفاف شیشے سے باہر کا منظر، نیلا آسمان اور دور دور تک پھیلا ہوا شہر صاف دکھائی دے رہا تھا۔

اس کی عمر اٹھائیس اور تیس سال کے درمیان تھی۔ اس کی نیلی آنکھیں اور چہرے کی خوبصورتی میں ایک کشش تھی۔ اس نے جینز کے ساتھ... شرٹ زیب تن کی ہوئی تھی اور گلے میں رنگین دوپٹا لٹک رہا تھا۔ وہ شیشے سے باہر کا منظر دیکھ رہی تھی کہ اچانک ایک اور اس کی ہم عمر لڑکی کچن سے باہر نکلی۔ اس کے ہاتھ میں کافی کے دو کپ تھے۔ اس نے قریب جا کر ایک کپ اس کی طرف بڑھایا تو اس نے چونک کر اپنی گردن گھما کر دلکش مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کافی کا کپ پکڑ لیا۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" وہ اس کے قریب ہی دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔

"اپنی غلطی کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔" اس نے کافی کا ایک گھونٹ بھرا۔

"کس غلطی کے بارے میں سوچ رہی ہو؟" اس نے پوچھا۔

"میں سوچ رہی ہوں مجھے اس سے شادی نہیں کرنی چاہیے تھی۔" اس نے کہہ کر اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

"میں نے تمہیں پہلے ہی منع کیا تھا مگر تم نے میری بات کے بجائے اپنی ماں کی بات کو اہمیت دی حالانکہ تم اس وقت بھی اس سے شادی کرنے کے لیے دل سے رضامند نہیں تھیں اور میرے کہنے کے باوجود تم نے انکار نہیں کیا تھا۔" وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔" اس نے تاسف بھرے لہجے میں کہہ کر کافی کا کپ ہونٹوں سے لگا لیا۔ "مما کی ضد اور ان کا یہ کہنا کہ وہ بہت دولت مند اور کیا ہے...... میں انکار کرنا چاہتی تھی لیکن اس کے باوجود انکار نہ کر سکی اور اس سے شادی کر لی۔"

"تمہاری مما اپنے بیٹے کے پاس ملک سے باہر چلی گئیں۔ تمہاری شادی اس شخص سے ہوئی جو تم سے عمر میں دس سال بڑا ہے۔ اس کا مزاج تم سے نہیں ملتا...... اس کی عادات تم سے مختلف ہیں...... بعض اوقات وہ عجیب گندی سی حرکتیں کرتا ہے...... میں حیران ہوں کہ تم نے اس کے ساتھ سات ماہ کیسے نکال لیے ہیں...... میں تمہاری جگہ ہوتی اور ماں کی بات رکھنے کے لیے اگر ایسے شخص سے شادی کر بھی لیتی تو جانتی ہو کہ میں کیا کرتی......؟" اس نے کہہ کر متانت بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

اس نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک اتر آئی ہے۔ ایسی چمک جس کے اندر وحشت تھی۔

"تم کیا کرتیں؟" اس نے کچھ توقف کے بعد پوچھا۔

وہ اس کی آنکھوں میں مسلسل دیکھنے کے بعد پراسرار انداز میں بولی۔ "میں اسے قتل کر دیتی اور اس سے ہمیشہ کے لیے جان چھڑا کر اپنی زندگی جیتی۔"

"قتل کرنا آسان نہیں ہے...... قتل کرنے کے بعد بچنا بہت مشکل ہے۔" اس کے دل کی دھڑکن کچھ تیز ہو گئی تھی۔ "میں ایسا ایک بار نہیں، بلکہ کئی بار سوچ چکی ہوں۔ اسے قتل کر کے میں کہاں جاؤں گی؟ میرا مقدر جیل بن جائے گا اور جو زندگی میں جی رہی ہوں، میری زندگی اس سے بھی کہیں زیادہ اجیرن ہو جائے گی۔"

اس نے اطمینان سے کافی کا گھونٹ لیا اور اپنی نگاہیں کھڑکی کی طرف لے گئی اور باہر دیکھنے کے بعد اس نے اپنا چہرہ اس کی طرف کیا اور معنی خیز انداز میں کہا۔ "قتل کیا نہیں جاتا...... کروایا جاتا ہے...... اور وہ بھی ایسے کہ ثبوت کوئی نہ مل پائے۔"

"میں یہ بھی سوچ چکی ہوں۔"

"پھر اس پر عمل کیوں نہیں کرتی ہو؟"

"میرے پاس کوئی راستہ نہیں ہے۔"

"میں عجیب سے انسان سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے راستہ میں دکھاتی ہوں......" اس نے کہتے ہوئے اپنے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ سجا لی۔

اس نے ایک لمحہ توقف کیا اور سرگوشی کی۔ "تم میری اسکول کے زمانے کی دوست ہو، ہم دونوں ایک دوسرے کی رازداں ہیں...... مجھے بتاؤ کیا کرنا ہے...... مجھے اس شخص سے نجات چاہیے۔"

"تم شادی کے بعد بزدل لڑکی بن گئی ہو۔ تمہیں یاد ہے کالج میں سب لڑکیاں ہم دونوں کو بوائز کہا کرتی تھیں کیونکہ ہم کسی کے ساتھ بھی لڑکوں کی طرح لڑ پڑتی تھیں۔ تمہیں وہ لڑائی تو یاد ہوگی جب ہم نے دو لڑکیوں کے ساتھ ایسے ہی لڑائی کی تھی جیسے لڑکے آپس میں لڑ پڑتے ہیں...... اب تم بزدل کیوں ہو گئی ہو؟" وہ کھلکھلا کے ہنس پڑی۔

"میں بزدل نہیں ہوں، بس میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا تو آج میں تمہارے پاس آ گئی۔"

"تم کو مدثر یاد ہے؟" اس نے اچانک کہا۔

"ہاں یاد ہے۔ وہ میرے عشق میں پاگل تھا اور ہر وقت عینی، عینی کی رٹ لگائے رکھتا تھا۔" وہ مسکرائی۔

"اس نے ایک دن تم سے کیا کہا تھا؟"

اس نے یاد کرنے کے بعد کہا۔ "اس نے کہا تھا تمہارے لیے کسی کو بھی جان سے مار سکتا ہوں۔"

"کیوں نہ ہم تمہارے شوہر کو قتل کرنے کا کام اسے دے دیں۔" اس نے کہا تو وہ اس کی طرف متحیر سی نظروں سے دیکھنے لگی۔

"جب اسے پتا چلا تھا کہ میری شادی ہو رہی ہے تو وہ مجھ سے آخری بار مل کر جانے کہاں چلا گیا تھا۔"

"وہ اسی شہر میں ہے۔ میری اس سے اچانک ملاقات ہوئی تھی۔ وہ آج بھی تم کو پسند کرتا ہے اور کسی معجزے کا انتظار کر رہا ہے کہ تم اس کی ہو جاؤ۔" وہ کہہ کر شرارت سے مسکرائی۔

"وہ یہ کام کرے گا؟"

"تم اپنی محبوب مدثر سے وہ کام تمہاری دوست ماریہ کرائے گی۔" اس نے کہتے ہوئے اپنی گردن کو تھوڑا سا خم دیا اور مسکرائی۔

کمرے میں خاموشی چھا گئی اور دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھتی رہیں۔ اس کے بعد وہ بولی۔ "میں اب مزید اپنے شوہر کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ مجھے اس سے نجات چاہیے۔"

"پھر تمہیں وہ کرنا ہوگا جو میں کہوں گی۔ مدثر سے ایک ملاقات کرتے ہیں اور مدثر کے ہاتھوں تمہارے شوہر کا قتل کرانا میری ذمے داری ہوگی۔"

"تم جو کہوگی میں کروں گی۔" اس نے کہہ کر اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور دوسری نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔ دونوں کے چہروں پر زہر آلود مسکراہٹ تھی۔

اس نے کافی کا کپ ایک طرف رکھا اور وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور گھوم کر اس کے عقب میں جا کر اپنے دونوں ہاتھ اس کے کندھوں پر رکھ کر جھکی اور پراسرار سرگوشی میں بولی۔ "تم واقعی فیصلہ کر چکی ہو کہ اپنے شوہر کو جان سے مار دو گی۔"

اس نے جواب دیا۔ "وہ مجھے طلاق نہیں دے گا۔ میں اس کی اذیت ناک قید سے آزادی اس کی موت کے بعد ہی حاصل کر سکتی ہوں۔"

"پیسا خرچ کرو گی، یہی کوئی چالیس پچاس لاکھ روپے؟"

"پیسا خرچ کرنا میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اس کا پیسا گھر میں کہاں ہوتا ہے مجھے معلوم ہوتا ہے۔" وہ بے پروائی سے بولی۔

"چلو پھر کھیل شروع کرتے ہیں۔" اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کے کندھوں کو دبایا اور سیدھی ہو کر کھڑی ہو گئی۔

اس کا نام ماریہ تھا اور اس کے چہرے پر شاطرانہ مسکراہٹ تھی۔ وہ عینی کی پرانی دوست تھی لیکن اس کی نظر میں اب وہ اس کی دوست نہیں بلکہ سونے کی چڑیا تھی جس سے پیسا وصول کرنے کا اس نے مدثر کے ساتھ مل کر منصوبہ بنایا تھا۔

☆☆☆

جس بلند و بالا عمارت کے چوتھے فلور پر وہ دونوں باتیں کر رہی تھیں اس سے ایک کلومیٹر کے فاصلے پر ایسی ہی ایک بلند و بالا عمارت کچھ دوسری عمارتوں کے درمیان کھڑی ہوئی تھی۔ اس عمارت میں بڑی بڑی کمپنیوں کے دفاتر تھے اور تیسرے فلور پر کمال اینڈ کمپنی کا دفتر تھا جہاں اس کا اسٹاف اور کمپنی کا مالک کمال حسن بیٹھتا تھا۔

کمال حسن ایک بڑا کاروباری شخص تھا۔ اس کے چہرے پر ہر وقت کرختگی براجمان رہتی تھی۔ اس کی عمر چالیس سال تھی۔ اس عمر میں اس کے پاس بہت سی دولت آجانے سے آنکھوں میں زعم رہتا تھا۔ اس کا ایک کاروبار نہیں تھا۔ اس کے آفس کی تجوری میں ہر وقت ڈیڑھ کروڑ کے لگ بھگ رقم موجود رہتی تھی۔ وہ کسی بھی وقت کوئی بھی ڈیل کرنے کو تیار رہتا تھا۔

اس کا کہنا تھا کہ کسی کے ساتھ مرضی کی ڈیل کرنے کے لیے چیک کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اس کے سامنے جب نوٹوں کا ڈھیر لگا دیا جائے تو نوٹوں کی خوشبو اس کو ڈیل کرنے پر مائل کر ہی لیتی ہے۔ سامنے رکھے نوٹ اپنے اندر سحر رکھتے ہیں۔

کمال حسن کی سیکریٹری کا نام رابی تھا جو خوب صورت اور نشیلی آنکھوں کی مالک تھی۔

وہ ایک چھوٹے سے شہر سے اس بڑے شہر میں آئی تھی۔ اس کا باپ فوت ہو گیا تھا اور اس کی ماں نے دوسری شادی کر لی تھی۔ اس کا سوتیلا باپ بھی اچھا انسان تھا لیکن اس کے کچھ خواب تھے جن کی تعبیر کے لیے وہ چھوٹا شہر چھوڑ کر اس شہر میں آ گئی تھی۔ حالانکہ وہاں اس کا ایک کزن بھی تھا جو اسے دیوانگی کی حد تک چاہتا تھا لیکن رابی کو کوئی پروا نہیں تھی۔

یہاں اس کی ایک دوست اپنے شوہر کے ساتھ رہائش پذیر تھی۔ چند دن وہ اس کے ساتھ رہی اور اس کی سہیلی نے کسی نہ کسی طرح سے... رابی کو کمال اینڈ کمپنی میں نوکری دلا دی۔

رابی چاہتی تھی کہ اس کی رہائش الگ ہو، اور ایسا اس کی دوست بھی چاہتی تھی۔

جب سے رابی نے کمال اینڈ کمپنی میں جاب کی تھی اس نے پہلی کوشش ہی یہ کی تھی کہ وہ کسی طرح سے اپنے باس کمال حسن کو اپنے حسن کا اسیر بنا کر اس سے شادی کر کے ملازمہ سے مالکن کا سفر طے کرلے۔ لیکن کمال حسن اپنے کام میں توجہ رکھتا تھا وہ اس کی اداؤں کو اگر دیکھتا بھی تھا تو نظرانداز کر دیتا تھا۔

ایک دن کمال حسن نے بہت بڑی ڈیل کی اور اس میں اسے بہت فائدہ ہوا۔ وہ کامیابی اور مسرت میں سرشار تھا اور اس کا مزاج خوشگوار تھا۔ رابی کو بھی اس کی دوست بار بار یہی کہہ رہی تھی کہ وہ اپنی رہائش کا الگ انتظام کرلے۔ اس دن جب رابی نے دیکھا کہ کمال حسن خوشگوار موڈ میں ہے تو اس نے بات چھیڑ دی۔

"سر! ایک بات کرنی تھی۔"

"ہاں کہو۔" اس نے فائل سے نگاہیں اٹھالیں۔

"میں اس شہر میں اکیلی ایک دوست کے گھر میں رہتی ہوں۔ وہ مجھے مجبور کر رہی ہے کہ میں اس کے گھر سے چلی جاؤں۔ میری رہائش کا کوئی انتظام ہو سکتا ہے......؟" رابی نے اس کے سامنے کھڑے ہو کر بات کچھ اس انداز میں کی تھی کہ کمال حسن اٹھ کر اس کا ہاتھ پکڑ کر...... لے کر وہ اسے اپنے بنگلے میں لے جائے گا۔ رابی کی سوچ کے برعکس کمال حسن نے ایک لمحہ سوچا اور انٹرکام پر اپنے منیجر سے بات کی اور ریسیور رکھ کر بولا۔

"تم نظامی سے مل لو۔"

کمال حسن یہ کہہ کر پھر اپنی فائل کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ رابی نے دیکھا اور باہر چلی گئی۔

نظامی پچاس سال سے زائد عمر کا شخص تھا۔ وہ اس کمپنی میں جب سے تھا جب کمال کا باپ زندہ تھا۔ اس نے رابی کی طرف دیکھا اور اپنی دراز سے دو چابیاں نکال کر میز پر رکھیں اور ایک کاغذ پر کچھ لکھنے کے بعد، چابیاں اور کاغذ رابی کی طرف بڑھا کر کہا۔ "یہ لو...... کاغذ پر پتا لکھا ہے اور یہ چابیاں اس فلیٹ کی ہیں۔"

رابی نے کاغذ اور چابیاں لے کر پتا پڑھا تو وہ ششدر سی رہ گئی۔ کمال حسن نے اسے رہنے کے لیے فلیٹ دے دیا تھا اور وہ بھی ایک ہی درخواست پر...... اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ...... خوشگوار موڈ میں تھا۔

کمال حسن کو رابی اپنے دام میں پھانسنے کی کوشش میں تھی اور ایک تیمور بھی تھا جو کمال حسن کی تجوری صاف کرنے کے لیے دس دنوں سے اس پر، اس کے اسٹاف، رابی اور خاکروب پر مسلسل نظر رکھے ہوئے تھا۔

تیمور پچیس سال کی عمر کا وجیہہ نوجوان تھا۔ اس کی شکل و صورت ایسی تھی کہ کوئی بھی لڑکی اس کی طرف مائل ہو جاتی تھی۔

تیمور کا باپ بھی چور تھا جو پولیس کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ تیمور کی ماں جس ماحول سے آئی تھی، شوہر کے مرنے کے بعد تیمور کو چھوڑ کر وہ واپس چلی گئی تھی اور تیمور کو اس کے باپ کے دوست نے پالا تھا۔ اس کی کوشش تھی کہ تیمور پڑھ لکھ کر باپ کی راہ اختیار نہ کرے لیکن اس کے مرتے ہی تیمور ایک بار پھر جب یتیم ہوا تو وہ اسی راہ کا مسافر بن گیا جس راہ پر اس کا باپ تھا۔

تیمور اپنے ہم عمر لڑکوں کے ایک گروپ میں شامل ہو گیا تھا اور ان کے ساتھ مل کر اس نے کئی وارداتیں کی تھیں۔ وہ ایک ماہر چور تھا اور اپنا کام بخوبی کرتا تھا اس لیے وہ کبھی پولیس کی تحویل میں نہیں گیا تھا۔

دو ماہ قبل وہ اپنے لیڈر دلاور سے جھگڑ پڑا تو اس نے وہ گروپ چھوڑ دیا تھا اور اس شہر میں آ کر وارداتیں کرنے لگا تھا۔ پھر اسے معلوم ہوا کہ کمال حسن ایک بڑا بزنس مین ہے جس کی تجوری میں کئی لاکھ روپے ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ تب اس نے فیصلہ کیا کہ وہ چھوٹی موٹی چوریاں چھوڑ کر اب کمال حسن کی تجوری کو صاف کرے گا۔

وہ پچھلے چند دنوں سے کمال حسن کے ہر اہم آدمی پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ وہ کمال اینڈ کمپنی کے منیجر نظامی سے بھی نوکری کے بہانے ملا تھا اور اسی دوران اس نے اردگرد کا خوب اچھی طرح سے جائزہ لیا تھا۔ اس کی عقابی نگاہوں نے دیکھا تھا کہ کون کہاں ہے......

تیمور نے سوچا تھا کہ اگر وہ لڑکی جو کمال حسن کی سیکریٹری ہے اور جس کا نام اس نے آفس سے ہی معلوم کیا تھا، اس کے ساتھ مل جائے تو وہ بہت اچھے انداز میں کمال حسن کی تجوری صاف کر سکتا ہے۔ تیمور کی اب ساری توجہ رابی پر تھی۔

اس شام جب آفس ٹائم کے بعد رابی جانے کے لیے باہر نکلی تو تیمور اس کے تعاقب میں اس جگہ جا پہنچا جہاں وہ اپنی دوست کے گھر میں رہتی تھی۔ ابھی وہ وہاں کھڑا تھا کہ رابی بڑا سا بیگ لے کر باہر نکلی تو وہ رک گیا۔

اس کے بعد رابی اس بلڈنگ کے سامنے پہنچی جہاں اسے فلیٹ ملا تھا۔ تیمور اس کے پیچھے تھا۔

وہ چار منزلہ عمارت تھی جہاں کئی فلیٹس تھے۔ ایک بڑا

گیٹ اور کشادہ جگہ عبور کرنے کے بعد عمارت کا حصہ شروع ہوتا تھا۔ رابی اپنا بیگ لے لفٹ کی طرف چلی گئی۔ تیمور لفٹ میں داخل نہیں ہو سکا۔ دوسرے فلور کا بٹن دبا کر وہ تیزی سے سیڑھیوں کی طرف بڑھا اور سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اس وقت دوسرے فلور پر جا پہنچا جب ابھی رابی لفٹ سے باہر نکل کر فلیٹ کے دروازوں پر نمبر دیکھتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔

ایک دروازے کے پاس رک کر اس نے چابی لگا کر لاک کھولا اور اپنا بیگ کھینچ کر اندر لے گئی۔ تیمور نے آگے جا کر نمبر دیکھا اور راہداری میں ابھی چند قدم ہی چلا تھا کہ رابی کے سامنے والے فلیٹ کا دروازہ کھلا اور اندر سے ایک آدمی موبائل فون کان سے لگائے باہر نکلا اور کسی سے بات کرتے ہوئے لفٹ کی طرف جانے لگا۔ ”میں دس دن کی چھٹی لے کر اسلام آباد جا رہا ہوں۔ تم جانتے ہو.... میرا سارا خاندان اسی شہر میں رہتا ہے اور خاندان میں ایک ساتھ تین شادیاں ہیں......“ وہ لفٹ کے اندر گیا تو تیمور بھی اس کے پیچھے ہی چلا گیا۔ تیمور ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ لفٹ نیچے جانے لگی اور وہ دوسری طرف سے بات سننے کے بعد بولا۔ ”بس دسویں دن میری واپسی ہو گی..... میں اپنی ساری فیملی کے ساتھ جا رہا ہوں فلیٹ خالی ہوگا......“

لفٹ نیچے چلی گئی اور وہ بات کرتا ہوا باہر نکلا اور سڑک کنارے کھڑا ہو گیا جبکہ تیمور اس سے کچھ فاصلے پر چلا گیا۔ وہ باتیں کرتا رہا اور آنے جانے والی ٹیکسی کو بھی رکنے کا اشارہ کرتا رہا۔ ایک ٹیکسی رکی تو اس نے کال منقطع کر دی۔ ٹیکسی ڈرائیور سے بات کرنے کے بعد وہ واپس بلڈنگ کی طرف چلنے لگا اور ٹیکسی اس کے پیچھے ہی اندر چلی گئی۔ تیمور بھی پیچھے ہی تھا لیکن اس کی چال دھیمی تھی۔

وہ شخص لفٹ سے اوپر گیا جبکہ تیمور سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ تیمور اوپر جا کر کچھ آگے چلا گیا۔ وہاں گملے پڑے تھے۔ وہ ان کو ایسے دیکھنے لگا جیسے وہ ان کی دیکھ بھال کے لیے یہاں آیا ہو۔

اسی دوران اس فلیٹ سے وہ شخص اپنی فیملی کے ساتھ باہر نکلا۔ دو بڑے سوٹ کیس بھی ساتھ تھے۔ اس نے دروازے کو مقفل کیا اور اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ... سوٹ کیس اٹھا کر لفٹ میں چلا گیا اور جونہی لفٹ کا دروازہ بند ہوا تیمور اپنی جگہ چھوڑ کر سیڑھیوں کے پاس چلا گیا۔ وہاں گرل لگی ہوئی تھی۔ اس نے دیکھا کہ وہ ٹیکسی میں بیٹھ رہے تھے۔ جونہی ان کی ٹیکسی اس بلڈنگ سے باہر نکلی وہ واپس اس شخص کے فلیٹ کی طرف گیا اور دروازے کے قریب رک کر پھر سیڑھیوں میں گرل کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اچھی طرح تسلی کرنے کے بعد وہ دروازے کے پاس گیا۔ اس نے جیب سے کوئی چیز نکالی اور قفل میں گھمانے لگا۔ تھوڑی کوشش کے بعد قفل کھل گیا۔ اس نے ایک دم دروازہ کھولا اور اندر جاتے ہی دروازہ مقفل کر دیا۔

تیمور نے دروازے کے پاس ہی رک کر اندر کا جائزہ لیا۔ وہ ٹی وی لاؤنج تھا جہاں بیٹھنے کے لیے صوفے پڑے تھے۔ دونوں کمروں کے دروازے بند تھے اور کچن اوپن تھا۔ تیسرا ڈرائنگ روم تھا۔

تیمور نے بیڈ روم کا دروازہ کھولا اور اندر نظر ڈالی اور الماری کی طرف جا کر اس نے الماری کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ وہ مسکرایا اور آہستہ سے بولا۔ ”نہیں بالکل نہیں تیمور صاحب...... جن لوگوں نے تم کو رہنے کے لیے جگہ دی ہے، اس جگہ چوری نہیں ہوگی...... صرف اپنا کام مکمل کرنے تک رہائش ہوگی......“

وہ پیچھے ہٹ گیا اور بیڈ پر گرا اور لیٹ گیا۔

☆☆☆

رابی کا فلیٹ ضرورت کے سامان کے ساتھ بہت اچھا تھا۔ اسے پسند آیا تھا۔ اس نے سوچا اب اسے اپنے باس کی طرف سے فلیٹ مل گیا ہے اور وہ بہت جلدی اس کے دل میں جگہ بنا کر اس کے بنگلے میں بھی چلی جائے گی۔

دوسری صبح وہ اچھی طرح تیار ہوئی اور آفس کے لیے نکل گئی۔ تیمور پہلے ہی اپنے دروازے کے کی ہول سے لگا ہوا تھا۔ اس نے رابی کو جاتے ہوئے دیکھا اور تھوڑی دیر کے بعد وہ بھی فلیٹ سے باہر نکل گیا۔

اس دن کمال حسن دوپہر کے بعد آفس میں آیا تھا۔ رابی نے کوشش کی تھی کہ وہ اس کی طرف ایک خاص نظر ڈالے، لیکن کمال حسن بے نیازی سے اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔

سیڑھیاں اور لفٹ ایک ساتھ ہی تھیں۔ وہاں سے نکل کر سامنے میں دروازہ آتا تھا اور کھول کر جب اندر جایا جاتا تھا تو سامنے ایک چھوٹی راہداری آتی تھی اور سامنے ایک اور دروازہ آتا تھا۔ اندر دیوار کے ساتھ رابی کی میز لگی ہوئی تھی اور اس کے سامنے چند کرسیاں قرینے سے رکھی ہوئی تھیں۔ رابی کی میز کے عقب میں ایک دروازہ تھا اس طرف کمال حسن کا سارا اسٹاف بیٹھ کر کام کرتا تھا جبکہ رابی کے دائیں جانب ایک اور دروازہ تھا وہ کمال حسن کا دفتر

تھا۔ رابی کے مل جانے سے وہ آسانی کے ساتھ کمال حسن کے کمرے میں جاکر اس کی تجوری سے پیسا نکال سکتا تھا۔ اس کے لیے اس نے ایک منصوبہ تیار کیا ہوا تھا۔

تیمور اس واردات میں کوئی ہنگامہ اور بدنظمی نہیں چاہتا تھا۔ وہ ایک ملاقاتی کی حیثیت سے اندر جاکر اس کی تجوری سے پیسے لے کر بڑی خاموشی سے باہر نکل جانا چاہتا تھا۔

رابی تین بار اپنے باس کے دفتر میں جاچکی تھی اور اس کو لگ رہا تھا اس کو جیسے آنا رائیگاں ہی گیا کیونکہ کمال حسن نے اس کی طرف بالکل بھی توجہ نہیں دی تھی حالانکہ اس نے متعدد بار اس کو اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کی تھی۔

آفس ٹائم ختم ہونے سے کچھ دیر قبل کمال حسن کی نظامی صاحب کے ساتھ طویل میٹنگ ختم ہوئی تو وہ باہر اپنا ماتھا صاف کرتے ہوئے کچھ پریشان سے نکلے تو رابی نے اس کی طرف دیکھ کر سوچا کہ اس آفس میں نظامی وہ واحد شخص ہے جس کے ساتھ کمال حسن کو اونچے لہجے میں بات کرتے ہوئے دیکھا تھا اور اس وقت نظامی پریشانی کے عالم میں باہر نکلا تھا۔

کچھ دیر ہی گزری تھی کہ کمال نے رابی کو اپنے کمرے میں بلایا۔ جب رابی کمرے میں گئی تو کمال حسن اپنے ہاتھوں کی انگلیوں میں پنسل لے کر اس کو گھما رہا تھا۔ ساتھ وہ کرسی کو ہولے ہولے ہلا بھی رہا تھا۔

رابی ہاتھ میں پنسل اور ڈائری لیے اس کے سامنے کھڑی تھی۔ کمال حسن کچھ کہنے کے بجائے اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور رابی کے دل میں جلترنگ سی بجی کہ اب کمال حسن اس سے کوئی ایسی بات کرے گا جس سے وہ خوش ہوجائے گی۔

"تم بہت خوبصورت ہو۔" اچانک کمال حسن نے خاموشی توڑی۔

رابی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ "شکریہ سر۔"

"تم اپنے حسن سے کسی کو بھی متاثر کرسکتی ہو۔" کمال حسن کی نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں اور پنسل اس کی انگلیوں میں گھوم رہی تھی۔ چہرے پر متانت تھی۔

رابی شرمائی۔ "مجھے معلوم نہیں سر......"

"حسن والوں کو کیا پتا ہوتا ہے کہ اسے دیکھ کر کون گھائل ہورہا ہے۔ اس لیے تم ٹھیک کہہ رہی ہو کہ تم کو معلوم نہیں ہے۔" وہ بولا۔ "کبھی تم کو کسی نے یہ کہا کہ تم بہت خوبصورت ہو؟"

"مجھے کبھی کسی نے ایسا نہیں کہا سر۔"

"ایک شخص نے کہا تو ہے کہ تم بہت خوبصورت ہو۔"

"کس نے سر......؟" رابی چونکی۔

"ابھی میں نے کہا تھا کہ تم بہت خوبصورت ہو۔" کمال حسن کے لہجے میں عجیب سا تغیر آگیا تھا۔

رابی نے شرما کر اپنا سر جھکالیا۔ "جی سر ابھی آپ نے کہا تھا۔"

"ٹھیک ہے...... تم کو اس سے پہلے بھی کسی نے یہ نہیں کہا تھا کہ تم بہت خوبصورت ہو وہ بات میں نے کہہ دی ہے۔ تمہاری ادائیں بھی اچھی ہیں اور تم پر پہنا ہوا کپڑا بھی اچھا لگتا ہے...... اتنی تعریف بہت ہے یا اور بھی تعریف کا پل باندھوں؟" اس نے کہا۔

"سر ابھی کچھ نہیں۔" رابی کو حیرت ہوئی اور اس کے چہرے پر تیرتی ہوئی مسکراہٹ معدوم ہوگئی تھی۔

"اب تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم اس آفس میں کیا کرتی ہو؟ تمہاری جاب کیا ہے؟" اس نے رابی کے سوال کا جواب دینے کے بجائے ایک اور سوال کردیا۔

"میں یہاں سیکریٹری ہوں۔" رابی نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے جواب دیا۔

"پورا مہینا کام کرنے کے بعد تم مجھ سے تنخواہ لیتی ہو۔ میری دی ہوئی تنخواہ سے تمہارا گزارہ ہوتا ہے۔ کل میں خوش تھا اور تمہیں بیٹھنے کے لیے چھت بھی دے دی ورنہ میں تم جیسی لڑکی کی بات سن کر کمرے سے جانے کا کہہ دیتا۔ تم میرے ایک حکم پر آتی ہو اور میری انگلی کے اشارے سے کمرے سے باہر نکل جاتی ہو۔ میں بڑے بڑے ہوٹلوں میں جاتا ہوں۔ میرے ملنے والوں میں تم سے کہیں زیادہ حسین لڑکیاں ہیں جن کی ایک اوقات اور حیثیت ہے۔ میری بات سمجھ آرہی ہے تم کو؟" کمال حسن کے چہرے پر سختی آگئی۔ اس کی انگلیوں میں گھومتی ہوئی پنسل اس کی مٹھی میں ساکت ہوگئی۔

رابی کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آرہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ وہ اپنے باس کے اس سوال کا جواب کیا دے۔

کمال حسن نے اس کی طرف آنکھیں نکال کر دیکھا۔ "میں نے تمہاری تعریف کی کہ تم خوش ہوجاؤ اور اس کے بعد تم کو تمہاری اوقات یاد دلادی کہ تم کیا ہو۔ آئندہ میرے سامنے اپنی کوئی ادا مت دکھایا کرو۔ مجھے متاثر کرنے کی کوشش کی تو تم کو ایک جنبش سے کچرے کے ڈھیر میں پھینک دوں گا۔" کمال حسن نے کہتے ہی ہاتھ میں پکڑی پنسل کو توڑ دیا۔ ایک آواز پیدا ہوئی اور رابی ڈر گئی۔ "تم میری ایک معمولی ملازمہ ہو۔ ملازمہ بن کے رہو کوئی اور خواب مت دیکھو...... میں اپنی بات ایک بار کہنے کا عادی ہوں دوبارہ

"وہ ایسا نہیں کرتا..... اس پنسل کی طرح توڑ دیا کرتا ہوں۔"

رابی دم بخود کھڑی تھی۔ اس کا دل جیسے ایک دم رونے لگا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ریت اتر آئی تھی۔ ایسی تضحیک اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ اس کا کمال حسن کے سامنے کھڑے رہنا دوبھر ہو رہا تھا۔

کمال حسن نے درشت لہجے میں کہا۔ "دفع ہو جاؤ....."

رابی اسی وقت پلٹی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ اپنی کرسی پر بیٹھ کر وہ بمشکل اپنے آنسو روکتی رہی۔ وہ چاہتی تھی کہ اٹھ کر چلی جائے لیکن اس کے پاس کوئی راستہ نہیں تھا۔ اسے یہ نوکری مل گئی تھی یہ اس کی خوش قسمتی تھی۔ ان حالات میں نوکری تلاش کرنا جوئے شیر لانے سے زیادہ مشکل ہو گیا تھا۔

آفس ٹائم ختم ہوا تو وہ اٹھ کر باہر چلی گئی۔ وہ ویگن میں سوار ہو کر اس بلڈنگ تک پہنچی اور بے خیالی میں سیڑھیوں کی طرف چلی گئی پھر وہ رکی اور اپنا رخ لفٹ کی طرف کر لیا۔ اس کے دماغ سے کمال حسن کی باتیں محو نہیں ہو رہی تھیں۔ وہ باتیں اس کے جسم میں مسلسل کچوکے لگا رہی تھیں۔

جب وہ لفٹ سے باہر نکلی تو اس کا چہرہ افسردہ اور آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ وہ تیزی سے اپنے فلیٹ کے دروازے تک پہنچی اور کانپتے ہاتھوں سے قفل میں چابی لگانے کی کوشش کرتی رہی اور جب قفل کھلا تو وہ دروازہ کھول کر اندر چلی گئی اور دروازہ بند کیا تو دھماکا سا ہو گیا۔

جب رابی بلڈنگ کے گیٹ سے اندر آئی تھی تو تیمور سیڑھیوں میں کھڑا گرل سے دیکھ رہا تھا۔ جب وہ اوپر آئی تو اس نے پہلی نظر میں دیکھ لیا تھا کہ رابی کی آنکھوں میں پانی تھا۔ جب وہ اپنے فلیٹ کے اندر چلی گئی تو وہ بھی اس کے فلیٹ میں چلا گیا اور سوچنے لگا کہ رابی کو کیا ہوا جو اتنی مغموم تھی؟

☆☆☆

رابی کچھ دیر تک روتی رہی اور پھر منہ ہاتھ دھونے کے بعد جب آئینے کے سامنے کھڑی ہوئی تو اپنے آپ کو دیکھتی ہوئی دل ہی دل میں بولی کہ وہ اب کمال حسن سے نفرت کرے گی اور اسے اس کی باتوں کا جواب دے گی۔ پھر اس کے دماغ میں سوال پیدا ہوا کہ وہ ایک کمزور لڑکی ہے وہ اس طاقتور مغرور انسان کو کیسے جواب دے سکتی ہے؟

اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ چونکی اور اس نے دروازے کی طرف دیکھا۔ جب دوبارہ دستک ہوئی تو اس نے اٹھ کر جونہی دروازہ کھولا سامنے پیزا بوائے کھڑا تھا۔

"میم آپ کا آرڈر....." پیزا بوائے نے ہاتھ میں پکڑا پیزا اس کی طرف بڑھا دیا۔ رابی نے متحیر نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ پیزا میرا نہیں ہے۔ میں نے کوئی آرڈر نہیں کیا۔"

"یہ ایڈریس دیکھ لیں۔" اس نے ایک پرچی رابی کی طرف بڑھا دی۔ اس نے دیکھا کہ اسی فلیٹ کا پتا لکھا تھا۔ اسے مزید حیرانی ہوئی۔ وہ لڑکا بولا۔ "آپ کی طرف سے پے منٹ بھی ہو چکی تھی۔"

"پے منٹ بھی ہو گئی ہے؟" اس نے زیرِ لب کہا اور بادلِ ناخواستہ اس سے پیزا لے کر دروازہ بند کر دیا۔

اس نے پیزا ایک طرف رکھا اور سوچنے لگی کہ اس نے تو آرڈر نہیں کیا پھر پیزا کس نے بھیجا ہے؟ ایک خیال اسے یہ بھی آیا کہ اس فلیٹ کا پتا صرف اس کے پاس کمال حسن کو ہی ہے۔ کہیں اسی نے تو اس کے لیے پیزا نہیں بھیجا؟ اگر اس نے ایسا کیا ہے تو اس کی کیا وجہ ہے؟ وہ شخص پاگل ہے، یا اپنی کہی ہوئی باتوں کا اسے احساس ہو گیا تھا کہ اسے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا؟ رابی شش و پنج کا شکار ہوئی تھی۔ اس نے پیزا نکالا اور اس کی سوندھی خوشبو نے اس کی بھوک جگا دی اور وہ کھانے بیٹھ گئی۔ باقی پیزا اس نے ایک طرف رکھا اور جونہی وہ کچن سے باہر نکلی اسے بیل نے چونکا دیا۔

رابی یہ سوچتی ہوئی دروازے کی طرف چلی گئی کہ شاید کمال حسن آیا ہے۔ جونہی اس نے دروازہ کھولا وہ چونک گئی سامنے ایک نوجوان کھڑا تھا وہ اسے دیکھتے ہی بولا۔ "میں اس فلیٹ میں رہتا ہوں۔"

رابی نے کچھ کہنے کے بجائے سوالیہ نگاہیں اس کے چہرے پر جما دیں۔ وہ بولا۔ "میرا نام تیمور ہے اور میں یہ پوچھنے آیا تھا کہ پیزا پسند آیا؟"

"پیزا تم نے بھیجا تھا؟"

"جی ہاں۔"

"کیوں؟"

"میں نے دیکھا آپ کا چہرہ اترا ہوا ہے۔ آپ اداس ہیں اور آنکھیں بھی بھیگی ہوئی ہیں۔ مجھے لگا کوئی ایسی بات ہوئی ہے جس سے آپ دکھی ہو گئی ہیں۔ پھر خیال آیا کہ شاید اس صورتحال میں آپ کھانا بھی نہ کھائیں تو میں نے آپ کے لیے پیزا آرڈر کر دیا....."

رابی اس کی بات حیرت سے سن رہی تھی۔ "آپ بہت زیادہ ہمدرد انسان ہو؟"

"میں ہمدرد ہوں، یا نہیں..... یہ میں نہیں جانتا لیکن

اپنے مطلب کے لیے مجھے کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا ہے۔" وہ صاف گوئی سے بولا۔

"مجھ سے کوئی مطلب ہے؟" رابی کی حیرت میں دو چند اضافہ ہو گیا تھا۔

"کیا ہم اندر بیٹھ کر بات کر سکتے ہیں؟ آپ مجھ پر بھروسا کر سکتی ہیں۔" تیمور نے کہا۔

رابی نے سوچا اور دروازہ چھوڑ دیا۔ تیمور شکریہ کا لفظ ادا کرتا ہوا اندر چلا گیا۔ رابی دروازہ بند کر کے اس کے پیچھے ہی آ گئی۔

"آپ کمال حسن کی کمپنی میں کام کرتی ہیں، سنا ہے وہ بڑا کمینہ، کرخت اور بدتمیز انسان ہے۔"

"تم کیسے جانتے ہو؟"

"میں نے کہا کہ سنا ہے..... میری کبھی اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ کیا وہ واقعی ایسا ہی انسان ہے؟" تیمور نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ رابی کو پہلی بار قریب سے دیکھ رہا تھا وہ خوبصورت لڑکی تھی۔

"وہ شاید ایک عام سوچ سے بھی زیادہ برا انسان ہے۔" رابی کے لہجے میں تلخی عود کر آ گئی تھی۔

"آج کوئی بات ہوئی ہے۔ بہت دکھی تھیں کیا آپ؟"

"آپ اس لیے پوچھ رہے ہیں کہ آپ کو مجھ سے کوئی مطلب ہے؟" رابی نے کہا۔

"بالکل..... میں اس لیے پوچھ رہا ہوں۔"

"کیا مطلب ہے مجھ سے؟"

"میں وقت ضائع کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ دراصل میں تمہارے باس کمال حسن کی تجوری خالی کرنا چاہتا ہوں اور تم میرا ساتھ دو تو ہم دونوں لوٹا ہوا پیسا آپس میں تقسیم کر سکتے ہیں۔" تیمور نے بغیر کسی تمہید کے بات مکمل کی تو رابی کے جسم میں جیسے سراسیمگی پھیل گئی۔ اس کی آنکھیں ششدر اس کے چہرے پر منجمد ہو گئی تھیں۔

"تم میرے ساتھ مذاق کر رہے ہو؟"

"میں بالکل سنجیدہ ہوں۔ میں ایک چور ہوں۔ بڑی چوری کا ارادہ ہے اور تمہارے باس کی تجوری میں ہر وقت ایک، ڈیڑھ کروڑ روپیہ موجود ہوتا ہے۔ ممکن ہے پیسا اس سے بھی زیادہ ہو۔ تم میرا ساتھ دو تو ہم اس تجوری کو خالی کر کے بہترین زندگی گزار سکتے ہیں۔" تیمور نے اس کے اردگرد گھومتے ہوئے کہا۔ رابی لمحہ بہ لمحہ حیرت کی دلدل میں اترتی جا رہی تھی۔

"تم جانتے ہو کیا کہہ رہے ہو؟"

"میں اچھی طرح سے جانتا ہوں کہ کیا کہہ رہا ہوں۔" تیمور نے کہا۔

"ابھی پولیس کو کال کر کے سب کچھ بتا سکتی ہوں۔ اپنے باس کو بھی آگاہ کر سکتی ہوں۔" رابی نے اس کی طرف دیکھا۔

"کیا بتاؤ گی؟"

"جو ابھی تم نے کہا وہ سب کچھ بتا دوں گی۔"

"میں نے کہا.....؟ میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا۔ میں تو اس لیے یہاں آیا ہوں کہ میرا منگوایا ہوا پیزا غلطی سے وہ آپ کو دے گیا ہے۔" تیمور نے کہا۔

رابی نے اس کی طرف دیکھا اور مسکرا دی۔ "تم چالاک بھی ہو۔"

"میرا کام ہی چالاکی ہے۔ بولو میرا ساتھ دو گی۔" تیمور بولا۔

"میرا حصہ کیا ہوگا.....؟" رابی نے پوچھا۔

"جو ملے گا اس میں چوتھا حصہ تمہارا ہوگا۔" تیمور نے بلا تامل جواب دیا۔

"چوتھا حصہ نہیں..... آدھا حصہ میرا ہوگا۔ ففٹی ففٹی..... بولو منظور ہے.....؟" رابی دوٹوک بولی۔

تیمور سوچتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گیا۔ رابی اس کی طرف دیکھتی رہی۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد رابی نے کہا۔ "تم ایک بار ہمارے آفس میں انٹرویو دینے آئے تھے۔ تمہیں نوکری کی ضرورت تھی اور جب نظامی صاحب سے ملاقات کے بعد تم باہر نکلے تو تم نے اردگرد کا اچھی طرح سے جائزہ لیا اور پھر اس طرف چلے گئے جدھر باتھ روم ہیں۔ وہاں تم کسی باتھ روم میں نہیں گئے بلکہ جائزہ لیتے رہے۔ اس کے بعد تم نے لفٹ اور پھر سیڑھیاں دیکھیں۔ تم بھاگتے ہوئے سیڑھیاں نیچے اترے اور تھوڑی دیر کے بعد تم لفٹ سے اوپر آئے اور اپنی گھڑی میں وقت دیکھا۔ یہی نہیں بلکہ... جس بلڈنگ میں ہمارا دفتر ہے اس کے باہر سامنے ایک کونے پر۔ اخبارات اور رسائل کی دکان ہے وہاں اکثر رسائل کی ورق گردانی کے ساتھ اس بلڈنگ کی طرف بھی نظر رکھے ہوئے دکھائی دیتے تھے..... ایک بات اور بتاؤں.....؟" رابی اتنا کچھ بتانے کے بعد متحیر پریشان تیمور کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا۔

تیمور اس کے منہ سے وہ باتیں سن کر دم بخود ہو رہا تھا۔ وہ اس کے بارے میں اتنا کچھ جانتی تھی یہ اس کی دانست میں ہی نہیں تھا۔

"وہ کیا بات ہے.....؟" تیمور نے حیرت زدہ آواز میں پوچھا۔

رابی کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔ ”تم میرا تعاقب کرتے یہاں تک آئے تھے اور جس وقت میں اپنے فلیٹ میں داخل ہوئی تھی تھوڑی دیر کے بعد میں اپنے دروازے کے ساتھ لگ کر اس کے کی ہول سے باہر دیکھنے لگی۔ حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی ویسے ہی دیکھ رہی تھی کہ اچانک میرے سامنے والے فلیٹ سے ایک آدمی فون سنتا ہوا باہر نکلا اور ایک طرف گیا تو اچانک میں چونک گئی۔ میں نے دیکھا تم بھی ایک طرف سے نکل کر اس کے پیچھے گئے ہو۔ میں نے سوچا کہ یہ وہ ہے جو ہمارے آفس میں بھی آیا تھا اور اکثر مجھے کتابوں کی دکان پر بھی دکھائی دیا تھا۔“

تیمور کی حیرت دوچند ہوتی جارہی تھی۔ وہ یہ سب نہیں جانتا تھا۔ اس کی دانست میں تھا کہ وہ اپنا کام بڑی خاموشی سے کررہا ہے اور اس پر کسی کی بھی نظر نہیں گئی۔

رابی بولی۔ ”میں تجسس لیے دروازے کے ساتھ لگی رہی۔ پھر میں نے دیکھا وہ لوگ گھر سے سامان لے کر دروازے کو لاک لگا کر چلے گئے۔ میں بھاگ کر کھڑکی کے پاس چلی گئی۔ وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر گئے تو میں پھر دروازے کے ساتھ لگ گئی۔ میں اس وقت حیرت سے چونک گئی جب تم نے جانے کس چیز سے دروازے کا لاک کھولا اور اندر چلے گئے۔“ اپنی بات مکمل کرنے کے بعد رابی نے مسکرا کر حیرت زدہ تیمور کی طرف دیکھا۔

”تم سب جانتی ہو......؟“ تیمور کے منہ سے نکلا۔

”میری بچپن کی عادت ہے۔ میرے اندر جب کوئی تجسس جنم لے لیتا تھا تو پھر میں اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی تھی۔ میں تو حیران تھی کہ تم مجھے اتنا دکھائی کیوں دیتے ہو اس لیے میں جس جگہ اپنے آفس میں بیٹھتی ہوں وہاں میرے سامنے جو کھڑکی ہے وہ باہر کی طرف کھلتی ہے اور وہاں سے کتابوں کی وہ دکان بالکل میرے سامنے ہے۔ کئی بار میں اٹھ کر وہاں جھانکتی تھی اور تم کو دیکھتی تھی اور جب تم مجھے دکھائی نہیں دیتے تھے تو میں سوچتی تھی کہ تم کہاں چلے گئے...... یہ جاننے کے باوجود کہ تم میرے تعاقب میں ہوتے ہو میں نے تم کو کبھی محسوس نہیں ہونے دیا۔“

”جب تم اتنا کچھ میرے بارے میں جانتی ہو تو پھر تمہیں اب یہ ابہام نہیں ہونا چاہیے کہ میں چور نہیں ہوں۔ میں سب کچھ اپنی منصوبہ بندی کی تکمیل کے لیے کررہا تھا۔ اب سب کچھ کھل ہی گیا ہے تو میرے ساتھ ہاتھ ملاؤ اور مل کے تمہارے باس کو لوٹتے ہیں۔“

”مجھے باس سے ایک حساب چکتا کرنا ہے۔ میں اس کی نوکری اس کے منہ پر تھوک کے چھوڑ کر جانا چاہتی ہوں اور یہ تب ہی ہوگا جب میرے ہاتھ میں کچھ ہوگا۔ اس لیے میں تمہارا ساتھ دینے کو تیار ہوں اور میرا حصہ آدھا ہوگا۔“ رابی نے اپنی شرط رکھ دی۔

تیمور اپنی جگہ سے اٹھا اور سوچنے لگا۔ ”مجھے منظور ہے۔“

”مجھے اپنا پلان بتاؤ اس کے بعد میں تم سے مزید کوئی بات کروں گی۔“ رابی کہتی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی اور تیمور نے اس سے کچھ فاصلے پر کرسی سنبھال لی۔

تیمور بتانے لگا۔ ”میں کل آفس آؤں گا اور میرا حلیہ کچھ تبدیل ہوگا جس سے میری اصل شکل و صورت پہچانی نہ جائے۔ تم اپنے باس کو بتاؤ گی کہ ظفر خان ملنا چاہتا ہے اس کے پاس ایک اچھی ڈیل ہے۔ وہ مجھے اندر بلائے گا۔ میں اندر جاکر اسے قابو کروں گا اور اسے باندھ دوں گا اس کے بعد اس کی تجوری سے سارے پیسے نکال کر اپنے بیگ میں ڈالوں گا اور باہر آجاؤں گا۔ اس دوران تم کسی کو اندر نہیں آنے دوگی۔ اس کا منیجر بھی اگر کسی ضروری کام سے باس کے کمرے میں جانا چاہے گا تو تم اسے روک دوگی کہ باس نے منع کیا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ منیجر کسی بھی میٹنگ میں کوئی بھی اہم بات کرنے اندر جاسکتا ہے اسے اجازت ہے۔ میرے جانے کے بعد تم باس کے کمرے میں جاؤ گی اور باس کو بندھا ہوا دیکھو گی تو اسے کھولو گی اور ظاہر ہے اس کے بعد پولیس آئے گی تمہارے پاس میری معلومات جعلی ہوں گی۔ پولیس تم سے تفتیش کرے گی اور تم میرا وہی حلیہ بتاؤ گی جو میں نے اپنایا ہوا ہوگا۔ میں پیسا لے کر اپنے فلیٹ میں آجاؤں گا اور تمہارا انتظار کروں گا۔ تم آفس کے بعد یہاں آنا اور میں تم کو تمہارا حصہ دے کر اس شہر سے چلا جاؤں گا۔“

رابی نے اس کی ساری بات غور سے سنی اور کہا۔ ”ایسا بھی تو ہوسکتا ہے کہ تم پیسا لے کر اس فلیٹ میں آنے کے بجائے فرار ہوجاؤ اور میں ہاتھ ملتی رہ جاؤں۔“

”میں وعدہ خلافی نہیں کروں گا اور تمہارا حصہ تم کو دے کر ہی جاؤں گا۔“ تیمور نے کہا۔

”میں اندھا یقین نہیں کرسکتی۔“ رابی نے صاف کہہ دیا۔ ”تم جب باس کے کمرے سے باہر نکلو گے تو میرا حصہ الگ ایک بیگ میں ڈال کرکے لے کر آؤ گے۔ میں بیگ کھول کر اپنا حصہ دیکھوں گی تو اس کے بعد تم کو جانے دوں گی۔“

”اس طرح تم پکڑی جاؤ گی۔ پولیس آئے گی اور تفتیش کے دوران تمہارے پاس سے پیسے برآمد ہوگئے تو تم بچ نہیں

پاؤ گی۔ اس لیے میرا یقین کرو اور میں تمہارا حصہ دے کر یہاں سے جاؤں گا۔"

"مجھے معلوم ہے کہ میں نے اپنا حصہ کہاں رکھنا ہے۔ اس آفس میں مجھے تم سے زیادہ معلومات ہے۔ تم اس بات کی فکر مت کرو۔" رابی اطمینان سے بولی۔

"جیسی تمہاری مرضی۔" تیمور نے کندھے اچکائے۔

"تم یہ کام کل کے بجائے پرسوں گیارہ بجے کرنا۔ کل ان کی مصروفیت زیادہ ہے اور پرسوں وہ گیارہ بجے سے لے کر ایک بجے تک فری ہیں۔ ان کی کوئی میٹنگ نہیں ہے اور تم آسانی سے اپنا کام کر سکو گے۔" رابی نے کہا۔

"ٹھیک ہے میں پرسوں ٹھیک گیارہ بجے آجاؤں گا۔ ہم دونوں کے پاس ایک دوسرے کا موبائل فون نمبر ہونا بہت ضروری ہے تاکہ ہم ایک دوسرے سے رابطے میں رہیں۔" تیمور نے کہتے ہی اپنا موبائل فون نکالا اور دونوں نے ایک دوسرے کا نمبر محفوظ کر لیا۔

"اب ایک بات اور ہے۔" رابی نے کہا۔

"وہ کیا بات ہے......؟" تیمور نے سوالیہ نگاہیں اس کے چہرے پر جما دیں۔

"مجھے کیسے پتا چلے گا تم نے اس کی تجوری سے ایک کروڑ، ڈیڑھ کروڑ یا پچاس لاکھ روپے لیے ہیں۔ تم ایک کروڑ روپے لے کر مجھے بیس لاکھ روپے دے کر ٹرخا سکتے ہو کہ وہاں سے ملے ہی چالیس لاکھ روپے ہیں۔" رابی نے اپنا اندیشہ عیاں کیا۔

تیمور نے طویل سانس خارج کی اور پھر بولا۔ "مجھ پر اعتبار کر لو، یا پھر جب میں تمہارے باس کو باندھ لوں گا تو تم کو اندر بلا لوں گا اور تم اپنے ہاتھوں سے نوٹ گن کر دونوں بیگ میں ڈال دینا۔"

"او کے...... مجھے تم پر اعتبار کرنا ہی پڑے گا۔"

"اب ڈیل ڈن ہے......؟"

"بالکل ڈن ہے۔" رابی نے فوری کہا اور تیمور اس کے فلیٹ سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد رابی نے اپنے آپ سے کہا۔ "اس واردات کے ایک ماہ بعد باس کے منہ پر زنانے دار تھپڑ رسید کر کے اس سے اپنی بے عزتی کا حساب چکتا بھی کر لوں گی اور اس کی نوکری کو بھی چھوڑ دوں گی۔"

☆☆☆

ریسٹورنٹ کے ڈائننگ ہال میں وہ دونوں الگ تھلگ میز پر براجمان تھیں۔ اس وقت ڈائننگ ہال میں زیادہ رش نہیں تھا۔ کئی میزیں خالی تھیں اور جہاں لوگ بیٹھے تھے ان میں کچھ کھانا کھا رہے تھے اور کچھ کھانے کے انتظار میں گپ شپ میں مصروف تھے۔ وہ دونوں دائیں بائیں کا جائزہ لے رہی تھیں اور ابھی تھوڑی دیر قبل ہی ویٹر ان سے کھانے کا آرڈر لینے آیا تھا اور انہوں نے یہ کہہ کر اسے بھیج دیا تھا کہ ابھی ان کو کسی کا انتظار ہے۔

اچانک موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی تو اسکرین پر نام دیکھ کر اس نے موبائل فون کی اسکرین اپنے سامنے بیٹھی ماریہ کو دکھائی اور اس نے برا سا منہ بنا کر چہرہ دوسری طرف کر لیا۔ اس نے موبائل فون کان سے لگا لیا۔

"کہاں ہو عینی......؟" دوسری طرف سے ایک مردانہ آواز آئی۔

"میں ماریہ کے ساتھ ہوں۔" عینی نے جواب دیا۔

"کیا ہو رہا ہے......؟" اس نے پوچھا۔

"ایسے ہی گپ شپ ہو رہی تھی۔"

"رات کے آٹھ بج رہے ہیں۔"

"آپ آفس سے آگئے ہو......؟" عینی نے پوچھا۔

"مجھے ابھی دیر ہے۔ میری بات ماریہ سے کراؤ۔" دوسری طرف سے کہا گیا تو اس نے موبائل فون ماریہ کی طرف بڑھا دیا۔ بادل ناخواستہ موبائل فون پکڑ کر اس نے کان سے لگایا اور بولی۔

"ہیلو......"

"کیسی ہو ماریہ......؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"نو بجے تک عینی گھر آجائے گی نا......؟" اس کا لہجہ خشک تھا۔

"آپ کہو تو ابھی بھیج دوں......؟" ماریہ نے منہ چڑایا۔

"اگر فضول باتیں ہو رہی ہیں تو عینی کو گھر بھیج دو ویسے بھی مجھے عینی کا گھر سے باہر رہنا پسند نہیں ہے۔" وہ بولا۔

"ہماری مشترکہ دوست کی شادی ہے اور ہم کچھ ڈسکس کر رہے ہیں۔" ماریہ نے کہا۔

"کس دوست کی شادی ہے؟ میں تم دونوں کی سب مشترکہ دوستوں کو جانتا ہوں۔" اس نے فوری سوال کیا۔

"آپ اسے نہیں جانتے، وہ کالج میں ہمارے ساتھ پڑھتی تھی کئی سال کے بعد اچانک ملی اور اس نے شادی پر انوائٹ کر لیا۔" ماریہ نے کہہ کر موبائل فون کو مکا دکھایا۔

"ٹھیک ہے تم عینی کو جلدی بھیج دینا۔" دوسری طرف سے کال منقطع ہوئی اور دونوں نے موبائل فون کو گھور کے دیکھا۔

"میرے ساتھ اس نے بات کر کے یہ تصدیق کی ہے

کہ تم واقعی میرے ساتھ ہو۔"

"نفرت ہے مجھے اس شخص سے۔" عینی بولی۔ اسی اثنا میں ماریہ نے دروازے کی طرف دیکھا اور آہستہ سے بولی۔

"مدثر آرہا ہے۔ اب ویسا ہی کرنا جیسا میں نے کہا تھا۔" یہ کہہ کر اس نے ہاتھ اٹھا کر اس کی طرف اشارہ کیا تو مدثر دیکھتے ہی ان کی طرف بڑھا۔ وہ دراز قد اور مضبوط جسم کا مالک تھا۔ وہ قریب آتے ہی عینی کو دیکھ کر چونکا۔

"کمال ہے..... تم نے مجھے بتایا ہی نہیں تھا کہ عینی بھی آرہی ہے۔"

"کیسا لگا سرپرائز.....؟"

"کیسی ہو عینی.....؟" مدثر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ عینی نے اپنے چہرے پر اداسی سجائے جواب دیا۔

"بس جی رہی ہوں۔"

"کیا ہوا..... خیریت تو ہے.....؟" مدثر متانت سے بولا۔ وہ اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔

"تم جانتے ہو کہ اس کی شادی اس کی امی نے اپنی مرضی سے کرادی تھی اور یہ اس شادی کو بھگت رہی ہے۔ بہت تنگ ہے بے چاری۔" ماریہ نے بتایا۔

"تو اس سے الگ ہو جاؤ۔" مدثر نے کہا۔

"وہ اسے جان سے ماردے گا اگر الگ نہیں کرے گا۔" ماریہ بولی۔

"ایسا ظالم ہے.....؟" مدثر نے حیرت سے ماریہ کی طرف دیکھا۔

"چھوڑو تم ان باتوں کو..... میں نے تمہیں کھانا کھلانے کے لیے بلایا تھا۔" ماریہ نے موضوع ختم کرنا چاہا۔

"ایک منٹ ماریہ....." مدثر نے اپنی شہادت کی انگلی کھڑی کرکے کہا۔ "میں اب بھی عینی کو کسی تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا۔ میری مدد کی ضرورت ہے تو مجھے بتاؤ میں وہ کام کردوں گا۔"

"اس کا ان کاؤنٹر کردو۔" ماریہ نے ایک دم اپنے لہجے کو ہموار رکھتے ہوئے کہا تو مدثر نے فوراً اس کی طرف دیکھا۔

"عینی کہے تو میں ایسا بھی کرسکتا ہوں۔" مدثر کے لہجے میں وحشت تھی۔

"میں کہتی ہوں اسے ماردو۔" عینی کرب ناک لہجے میں بولی تو مدثر کی گردن اس کی طرف گھوم گئی۔ "میں اب اس کے ساتھ مزید نہیں رہ سکتی۔ اس کا وجود مجھے زہر لگنے لگا ہے اور اس کی شکل سے مجھے نفرت ہوگئی ہے۔"

مدثر نے تھوڑی دیر تک عینی کے چہرے کی طرف دیکھا اور اپنی جیب سے سگریٹ اور لائٹر نکال کر سگریٹ اپنے ہونٹوں میں دبا کر لائٹر روشن کیا۔ سگریٹ سلگا کر اس نے کش لے کر دھواں چھوڑا اور بولا۔ "عینی تم نہیں جانتی ہو کہ تم میرے لیے کیا ہو۔ تمہارے سکھ کے لیے میں اسے مروادوں گا۔"

"تم خود نہیں مارو گے.....؟" ماریہ نے پوچھا۔

"ایسے کام کے لیے میرے پاس آدمی ہیں۔ عینی فیصلہ کرکے مجھے بتادے، میرے لیے یہ کام مشکل نہیں ہے۔" مدثر نے کہہ کر اشارے سے ویٹر کو اپنے پاس بلالیا اور اسے آرڈر دینے لگا۔ وہ جو کچھ بھی منگوا رہا تھا وہ تینوں کی پسند کا تھا۔ عینی سپاٹ چہرے کے ساتھ مدثر کا چہرہ دیکھے جارہی تھی۔ جب ویٹر چلا گیا تو مدثر نے طویل کش لے کر منہ سے دھواں ایسے چھوڑا جیسے کسی فیکٹری کی چمنی دھواں اگل رہی ہو۔ عینی نے ہاتھ بڑھا کر اس کے ہونٹوں سے سگریٹ لیا اور ایش ٹرے میں مسل دیا۔

مدثر مسکرایا۔ "میں یہی دیکھنا چاہتا تھا تمہیں اب بھی میری فکر ہے۔ اب بھی تم مجھے سگریٹ پینے سے روک دو گی.....؟"

"تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ کبھی سگریٹ نہیں پیئو گے۔" عینی نے کہا

"میں اس وعدے پر قائم ہوں بس ایک سگریٹ لے کر آیا تھا۔" مدثر بولا۔ "اب وہ میرے ہاتھ سے نہیں بچ سکے گا۔"

"عینی کو جلدی جانا ہے۔ اس کے شوہر کی کال آچکی ہے اور جلدی سے کھانا کھا کر اسے جانے دو باقی سب کچھ میں تم کو سمجھادوں گی۔" ماریہ نے گلاس میں پانی انڈیلا۔

"تم آج بھی بہت خوبصورت ہو عینی۔" مدثر اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے رومانس بھرے انداز میں بولا۔

"تم نے اب تک شادی کیوں نہیں کی.....؟" عینی نے پوچھا۔

"اب کرلوں گا۔" مدثر نے معنی خیز انداز میں اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

عینی کے چہرے پر خودبخود مسکراہٹ آگئی اور اس نے چہرہ دوسری طرف کرلیا۔ ماریہ بھی ہونٹ دبا کر مسکرا رہی تھی۔

تھوڑی دیر نہیں گزری تھی اور کھانا آگیا۔ وہ تینوں ادھر ادھر کی باتوں کے ساتھ کھانا کھانے لگے۔ عینی بار بار اپنی گھڑی دیکھ رہی تھی اور پھر وہ جلدی کھانا کھانے کے بعد اپنی جگہ سے اٹھی اور دونوں سے اجازت لے کر چلی گئی۔

عینی کے جاتے ہی مدثر اور ماریہ نے ایک دوسرے کی

طرف دیکھا اور دونوں ایک ساتھ مسکرا دیے۔

مدثر کے تعلقات پولیس والوں کے ساتھ بہت اچھے تھے۔ اس کے کئی دوست انسپکٹر تھے اور وہ ان کے لیے ہر طرح کے کام کرتا تھا۔ ماریہ جانتی تھی کہ مینی اپنے شوہر سے بہت زیادہ زچ ہے۔ کبھی کبھار تو وہ اپنے شوہر کو جان سے مار دینے کی بات کر دیتی تھی اور اسی بات کو لے کر ماریہ نے مدثر کے ساتھ ایک منصوبہ بنایا تھا کہ وہ مینی کو اس کے شوہر سے نجات دلانے کی بات کر کے اس سے بہت سا پیسا وصول کر کے ایک طرف ہو جائیں گے۔ مدثر نے اسی دن مینی کا خیال اپنے دل سے نکال دیا تھا جب اس کی شادی ہوئی تھی اور اب وہ ماریہ کی طرف مائل تھا اور ماریہ کے دل میں مدثر کے لیے محبت اسی وقت تک کے لیے تھی جب تک وہ مینی سے پیسا نہیں نکلوا لیتا۔ اس بات کا علم مدثر کو بھی نہیں تھا۔

☆☆☆

مینی کی گاڑی ریسٹورنٹ کے باہر کھڑی تھی۔ وہ گاڑی میں بیٹھی اور جلدی سے کار کا رخ اپنے گھر کی طرف کر دیا۔

جب وہ اپنے عالیشان گھر میں پہنچی اور گیٹ کھلا تو وہ یہ دیکھ کر پریشان اور گھبرا گئی کہ اس کے شوہر کی گاڑی گیراج میں کھڑی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ گھر میں موجود ہے اور اس نے جھوٹ کہا تھا اسے گھر آنے میں دیر ہو جائے گی۔

جونہی وہ تیزی سے اپنی گاڑی سے نکل کر مین دروازہ کھول کر نیم روشن ٹی وی لاؤنج میں گئی، مینی کو کسی نے پیچھے سے اس کے بالوں سے پکڑا اور زور سے سامنے دیوار کی طرف دھکا دے دیا۔

اس کا سر دیوار سے ٹکرایا اور اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ وہ کراہتی ہوئی زمین پر گری تو اس کی آنکھیں بند ہونے لگی تھیں۔ کوئی اس کی طرف بڑھا تھا اور مینی نے اس تکلیف دہ صورت حال میں اپنی بند ہوتی آنکھوں سے دیکھا کہ اس کا شوہر چہرے پر سفاکی سجائے کھڑا تھا۔

☆☆☆

صبح کا سورج طلوع ہو چکا تھا اور اجالا پھیل گیا تھا۔ ایک دم کھڑکی کے آگے سے پردے کھینچ کر ایک طرف ہٹائے تو کمرے میں چھائی خاموشی اور اندھیرا معدوم ہوا۔ مینی کی بند آنکھوں پر جب تیز روشنی پڑی اور تھوڑی دیر کی کوشش کے بعد اس کی خمار میں ڈوبی آنکھیں کھل گئیں اور اس نے اردگرد کا جائزہ لیا تو وہ اپنے بیڈروم میں تھی۔ کھڑکی سے تیز روشنی اندر آ رہی تھی۔ اس نے ڈریسنگ ٹیبل کی طرف دیکھا تو کوئی اس کی طرف پشت کیے ٹائی باندھ رہا تھا۔ مینی اٹھ کے بیٹھ گئی۔ اس کے ماتھے پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔

وہ گھوما تو اپنے شوہر کمال حسن کی صورت دیکھ کر مینی کے تن بدن میں جیسے خوف سرایت کر گیا۔ کمال اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا بھی رہا تھا اور اپنی ٹائی کی ناٹ بھی ٹھیک کر رہا تھا۔

کمال نے ایک طرف رکھا اپنا کوٹ اٹھایا اور اسے پہننے کے بعد ایک کرسی اٹھا کر مینی کے قریب رکھی اور اس پر براجمان ہوتے ہوئے بولا۔

"رات میں نے تم کو نیند کی ہلکی ڈوز دے دی تھی تاکہ تم سکون سے سوئی رہو۔ تمہارے ماتھے پر بھی میں نے مرہم پٹی کر دی تھی زخم زیادہ نہیں ہے۔ تم کچھ دیر کے بعد پٹی اتار دینا اور میں آفس جا رہا ہوں۔ گھر کے دونوں ملازموں کو میں نے چھٹی دے دی ہے اور تم گھر میں اکیلی ہو۔ باہر جانے کی تمہیں بالکل اجازت نہیں ہے کیونکہ تم جاتی تو ماریہ کے ساتھ ہو اور کھانا کسی اجنبی کے ساتھ کھاتی ہو۔"

کمال کی بات سن کر مینی چونکی۔ وہ سوچنے لگی جب وہ رات کھانا کھا رہے تھے تو کمال بھی کہیں آس پاس تھا۔ کمال بولا۔

"میری تم پر گہری نظر ہوتی ہے۔ میں تمہارے پیچھے نہ بھی ہوں تو میری آنکھیں تمہارے تعاقب میں رہتی ہیں۔ ویسے وہ لڑکا کون تھا جس کے ساتھ تم دونوں کھانا کھا رہی تھیں.....؟"

"وہ ہمارے ساتھ پڑھتا تھا اور ماریہ کا دوست ہے۔" مینی نے کچھ دیر سوچنے کے بعد جواب دیا۔

"وہ دوست ماریہ کا ہے اور کھانا تم بھی ان کے ساتھ کھا رہی تھیں۔ کباب میں ہڈی تم بنی تھیں یا ماریہ تم دونوں کی ملاقات کرا رہی تھی؟"

"آپ کو ایسی بات نہیں کرنی چاہیے۔"

"تم اس اجنبی سے ملو، اس کے ساتھ باتیں کرو۔ اس کے ہونٹوں میں دبا سگریٹ نکال کر ایش ٹرے میں مسل دو اور میں تم سے ایسی بات نہ کروں.....؟" کمال نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے حقارت سے کہا۔

مینی کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ اس وقت اسی ریسٹورنٹ میں موجود سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

کمال کے لہجے میں سفاکی آ گئی۔ "اگر اس جگہ میرے آدمی کی جگہ میں ہوتا تو یقین کرو تم دونوں کو جان سے مار دیتا۔ قسمت اچھی تھی کہ میں وہاں موجود نہیں تھا۔ ابھی میں دفتر جا رہا ہوں۔ تم شام تک اچھی طرح سے سوچ لینا کہ میرے سامنے سچ بولنا ہے یا جھوٹ..... مجھے تم دونوں کے

تعلق کے بارے میں سچ جانتا ہے، جس کی صحت کی تم کو اتنی فکر ہے کہ اسے تم سگریٹ پینے نہیں دے رہی ہو۔ مجھے جاننا ہے تمہارے دل میں اس کے لیے کیا ہے......؟"

مینی متوحش نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور آئینے میں اپنا جائزہ لینے کے بعد اس کی طرف گھوما اور مسکرایا۔ "میں شادی کر رہا ہوں۔"

یہ سنتے ہی مینی ایک دم چونکی۔

"یہ کوئی مذاق نہیں ہے۔ میں اپنے معاملے میں جھوٹ نہیں بولا کرتا۔ میں شادی کر رہا ہوں اور وہ لڑکی مجھے پہلی نظر میں اتنی اچھی لگی کہ میں اس کا دیوانہ ہو گیا...... اس کے ساتھ شادی میں کچھ مسئلہ تھا جو میں نے دور کر دیا ہے۔ دولت اور طاقت اپنی مرضی کے فیصلے کرا ہی لیتی ہے، اور ایسا ہی ہوا۔"

"آپ شادی کر رہے ہو تو مجھے آزاد کر دو۔" مینی کے اندر ایک دم سے ہمت آگئی۔

مینی کی بات سن کر اس کے چہرے سے یکدم مسکراہٹ معدوم ہو گئی اور وہ اس کی طرف قہر آلود نظروں سے دیکھتا رہا کہ مینی کو خوف محسوس ہونے لگا۔ وہ بولا۔ "تم ان دیواروں میں موت کو گلے لگا لو گی لیکن میں تمہیں آزاد نہیں کروں گا۔ بیوی میری ہو اور فکر اس کی ہے جس کو سگریٹ پیتا ہوا نہیں دیکھ سکتی۔ اس کے لیے تم کو آزاد نہیں کروں گا۔ دو، تین دن کی بات ہے اس گھر میں میری دوسری بیوی آجائے گی۔ تم سے کافی کم عمر ہے۔ لیکن تم سے بہت زیادہ حسین ہے...... آئندہ اپنی آزادی کی بات مجھ سے مت کرنا ورنہ زبان نکال کر پھینک دوں گا۔" کمال نے گاڑی کی چابی اٹھائی اور کمرے کا دروازہ کھول کر جانے سے قبل بولا۔ "شام کو بات ہوگی۔" وہ باہر چلا گیا۔

مینی غصے سے پیچ و تاب کھاتی رہی۔ پھر وہ متلاشی نظروں سے اپنا موبائل فون تلاش کرنے لگی۔ اس کا موبائل فون پورے کمرے میں نہیں تھا۔ مینی تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے گئی۔ ٹی وی لاؤنج کا دروازہ کھول کر باہر نکلی تو کمال اپنی گاڑی لے کر جا چکا تھا۔ وہ گیٹ کے پاس گئی تو اندر بڑے گیٹ کو تالا لگا ہوا تھا۔ اس نے چھوٹا گیٹ کھولنا چاہا تو وہ باہر سے مقفل تھا۔ اس کا مطلب تھا کمال نے اپنی گاڑی نکال کر اندر سے گیٹ کو تالا لگایا اور پھر چھوٹے گیٹ سے باہر نکل کر اسے بھی مقفل کر دیا تھا۔ مینی کو اور بھی غصہ آگیا تھا۔ وہ اندر بھاگی اور جس جگہ ٹیلی فون پڑا ہوتا تھا اب وہاں موجود نہیں تھا۔ وہ بیرونی رابطہ اور دروازہ بند کر کے گیا تھا۔ وہ اپنے گھر میں قید ہو گئی تھی۔

☆☆☆

گاڑی ایک شاپنگ پلازا کے کشادہ کار پارکنگ میں کھڑی تھی اور اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر مدثر اور اس کے برابر میں ماریہ براجمان تھی۔ دونوں کی نگاہیں سامنے تھیں اور ان کو مینی کا انتظار تھا۔

مدثر نے اپنی گھڑی پر وقت دیکھا اور کہا۔ "وہ ابھی تک نہیں آئی۔ اس کا ارادہ تو نہیں بدل گیا۔"

"اس کا ارادہ نہیں بدل سکتا۔ وہ اپنے شوہر سے بدظن تو تھی ہی اور میں نے اس کے دماغ میں اس کے شوہر کے خلاف مزید زہر بھر کر رہی سہی کسر بھی پوری کر دی تھی۔"

"اپنے شوہر کو قتل کروانے کے لیے وہ چالیس، پچاس لاکھ روپے دے دے گی......؟" مدثر نے اس کی طرف متحیر نگاہوں سے دیکھا۔

"اس نے مجھے خود یہ بات کہی تھی کہ وہ اپنے شوہر سے اتنی زچ ہے کہ وہ اسے قتل کرانے کے لیے پچاس لاکھ روپے بھی دے سکتی ہے۔ اس کا شوہر گھر میں کہاں پیسے رکھتا ہے وہ جانتی ہے۔ تبھی میں نے تمہارے ساتھ مل کر پلان بنایا تھا کہ اس سے قتل کرانے کے بجائے چالیس، پچاس لاکھ روپے لے کر ایک طرف ہو جائیں گے۔"

"ہم نے اتنی بڑی رقم لے کر ایک طرف ہونے کا نہیں، بلکہ ایک ہونے کا وعدہ کیا تھا۔" مدثر اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ جواباً وہ بھی مسکرائی۔

"ہاں...... ہم نے یہ وعدہ کیا تھا۔" ماریہ بولی۔

ماریہ اور مینی دوست تھیں۔ ماریہ جانتی تھی کہ مینی اپنے شوہر کے ساتھ خوش نہیں ہے۔ اور کمال کی عادات بھی ایسی تھیں کہ مینی کا اس کے ساتھ زندگی گزارنا دوبھر تھا۔ ایک وقت تھا جب مینی اور مدثر ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے اور مینی کی ماں کے مجبور کرنے پر اس کی شادی کمال سے ہو گئی تھی۔ اس کے بعد ماریہ اور مدثر ایک دوسرے کے قریب ہو گئے تھے۔

مدثر کے خاندان کے لوگ پولیس میں تھے۔ وہ بھی یہی کہتا تھا کہ وہ پولیس میں ہے حالانکہ وہ اپنے رشتے دار پولیس والوں کے لیے کام کرتا تھا۔ جہاں سے اسے پیسا ملنے کا موقع ملتا وہ اس کا کام کروانے کے عوض اچھی خاصی رقم وصول کر لیتا تھا۔

مدثر اور ماریہ شادی کرنا چاہتے تھے۔ دونوں منفی سوچ کے حامل تھے اور اس بار انہوں نے اپنی ہی دوست کو لوٹنے

کا منصوبہ بنایا ہوا تھا۔
''تم عینی کو کال کرو۔'' کار میں چھائی خاموشی کو مدثر نے توڑا تو ماریہ اسے کال کرنے لگی۔ عینی کا موبائل فون بند جا رہا تھا۔ اس نے متعدد بار کوشش کی لیکن ہر بار اسے ایک ہی ٹیپ سننے کو مل رہی تھی۔
اس نے جھنجلا کر مدثر کی طرف دیکھا۔ ''اب کیا کروں؟ وہ تو فون بند کر کے بیٹھی ہے۔''
''کہیں سونے کی چڑیا ہاتھ سے تو نہیں نکل گئی.....؟'' مدثر سوچنے لگا۔
''تم اترو اور ٹیکسی پکڑ کر چلے جاؤ میں اس کے گھر جاتی ہوں۔'' ماریہ نے کہا۔
''اس کا شوہر ہوا تو.....؟''
''وہ اس وقت آفس میں ہوگا۔'' ماریہ بولی۔
''میں بھی تمہارے ساتھ چلوں.....؟'' مدثر نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
''تمہیں میرے ساتھ چلنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں جا کر اس سے ملتی ہوں۔ فون بند ہونے کی وجہ پوچھتی ہوں اور اسے کہتی ہوں کہ مدثر نے تمہارے شوہر کو ٹھکانے لگانے کے لیے آدمی ڈھونڈ لیا ہے۔ وہ بھاری رقم مانگ رہا ہے اور مجھے پیسے دو۔''
''میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔'' مدثر کہہ کر کار سے باہر نکل گیا۔ ماریہ نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔
ماریہ اس جگہ سے سیدھی اس پوش علاقے کی کشادہ اور خاموش گلی میں چلی گئی جہاں عینی کا گھر تھا۔ ماریہ کی کار رینگتی ہوئی عینی کے گھر کے سامنے رک گئی۔ بڑے بڑے گھروں کے باہر بالکل خاموشی تھی۔ ماریہ نے اِدھر اُدھر دیکھا اور کار سے باہر نکل کر اس نے بیل پر انگلی رکھ دی۔
تیز بیل ہوتے ہی عینی جو اپنے سر کی پٹی اتار کر ہلکا سا زخم دیکھ رہی تھی، چونکی اور..... گیٹ کی طرف دوڑی۔ اس نے گیٹ کی درز سے باہر دیکھا تو ماریہ کھڑی تھی۔
''ماریہ.....'' عینی نے سرگوشی کی تو ماریہ گیٹ کے ساتھ لگ گئی۔
''گیٹ کھولو عینی۔''
''میں گیٹ نہیں کھول سکتی۔ کمال مجھے اندر قید کر کے گیا ہے۔'' عینی نے بتایا۔
''اس نے ایسا کیوں کیا ہے.....؟''
''کوئی ہمارے تعاقب میں تھا اس نے ہم تینوں کو ایک ساتھ دیکھا تھا اور ایک ایک بات کی اس نے رپورٹ کمال کو دی تھی۔ میرا موبائل فون اور نیل فون سیٹ بھی اس نے اپنے قبضے میں کیا ہوا ہے۔''
''اس طرح تو تمہاری جان کو خطرہ ہو سکتا ہے۔ وہ پاگل جنونی اور گندا انسان تمہارے ساتھ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ مدثر نے اسے ٹھکانے لگانے کا سارا انتظام کر لیا ہے اور اب اسے پیسا دینا باقی ہے۔ تمہاری جان چھوٹ جائے گی اس سے۔'' ماریہ سرگوشی کر رہی تھی۔ دونوں نے گیٹ سے کان اور منہ لگایا ہوا تھا۔
''اب میں کیا کروں.....؟'' عینی مضطرب ہوئی۔
''تم مجھے کسی طرح سے پیسا دے دو۔ اس کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' ماریہ نے کہا۔
''وہ کمرا لاک ہے جہاں پیسا موجود ہے۔ میں کوشش کر رہی ہوں کہ دوسری چابی ڈھونڈ لوں جو میں نے چابیوں کے گچھے کے ساتھ ایک جگہ رکھی تھی اور اب وہاں سے وہ گچھا غائب ہے۔ شاید میں نے کہیں رکھا ہے، یا کمال نے اِدھر اُدھر کر دیا ہے۔ تم دو گھنٹے کے بعد میرے پاس آنا۔ میں کوشش کر رہی ہوں۔''
''میں دو گھنٹے کے بعد آتی ہوں۔ تم تسلی سے چابی ڈھونڈ لو۔ آج ہی سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' ماریہ بولی۔
''ماریہ تم مدثر سے کہہ کر کمال کو اس کے انجام تک پہنچا دو۔ جتنا پیسا مانگ رہا ہے وہ دوں گی میں دے دوں گی۔''
''تم پیسے کا انتظام کرو، کام ہو جائے گا۔'' ماریہ زیرِ لب مسکرائی۔
دونوں اس طرح باتیں کر رہی تھیں اور ماریہ کے علم میں یہ بات بالکل بھی نہیں تھی کہ کمال کا ایک آدمی کچھ فاصلے پر ایک درخت کے نیچے کھڑا اس کی طرف دیکھتے ہوئے کان سے موبائل فون لگائے ساری اطلاع کمال کو دے رہا تھا۔
کمال خاموشی سے اس کی بات سننے کے بعد دانت پیستا رہا اور حقارت سے بولا۔ ''اس کا ایسا حال کر دو کہ یہ دوبارہ چل کر میرے دروازے تک جانے کے قابل نہ رہے۔''
حکم ملتے ہی اس نے موبائل فون کان سے الگ کیا اور ایک کال کرنے کے بعد کوئی ہدایت کی اور موبائل فون جیب میں رکھنے کے بعد وہ ماریہ کی طرف چل پڑا۔
اچانک ماریہ کی نظر اس شخص پر پڑی تو وہ حسبِ توقع خطرے کو بھانپ کر اپنی کار کی طرف دوڑی۔ اس شخص کی چال بھی تیز ہو گئی تھی۔ ماریہ نے عجلت میں کار اسٹارٹ کی اور اسے بیک کر دیا۔ لیکن اس سے قبل کہ وہ پیچھے اسی حالت میں چوک تک پہنچتی..... ایک بائیک تیزی سے اس کے پیچھے

کھڑی ہو گئی۔ بائیک پر سوار شخص نے ہیلمٹ پہنا ہوا تھا۔

ماریہ کو ایک دم بریک لگانا پڑے اور اس نے کار کا گیئر بدل کر اسے آگے بڑھا دیا۔ سامنے والا شخص ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔ کار آگے نکل گئی اور بائیک اس شخص کے پاس رک گئی۔ وہ جلدی سے بائیک پر سوار ہوا اور اس نے بائیک اس کے تعاقب میں لگا دی۔

ماریہ بار بار بیک مرر سے اپنے پیچھے آتی بائیک کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے کار کی رفتار تیز کر دی۔ بائیک اس کا مسلسل تعاقب کر رہی تھی اور ماریہ کی کار کی رفتار بھی بڑھتی جا رہی تھی۔

ماریہ نے اپنا موبائل فون نکال لیا اور مدثر کو اطلاع دینے کے لیے وہ اس کا نمبر ملانے لگی۔ ایک ہاتھ سے کار ڈرائیو کر رہی تھی اور دوسرے ہاتھ سے موبائل پکڑے وہ کبھی موبائل فون اور کبھی سامنے دیکھ رہی تھی۔ اس کے لیے ایسا کرنا مشکل تھا لیکن وہ مجبور تھی۔ ماریہ کا رخ اپنے اپارٹمنٹ کی طرف تھا۔ وہ جانتی تھی... بھاگ کر اپنی بلڈنگ میں گھس جائے گی تو ان سے محفوظ ہو جائے گی۔

اچانک اس بے خیالی میں اس کی کار سامنے دوسری گاڑی سے ٹکرانے لگی تو اس نے ایک دم دیکھا اور موبائل چھوڑ کر اسٹیئرنگ تھام لیا... بمشکل وہ اس حادثے سے تو بچ گئی لیکن اس کی کار بے قابو ہو گئی اور کچے میں اتر گئی۔ ماریہ نے بمشکل بریک لگائے۔

کار رکتے ہی اس نے اپنا موبائل فون تلاش کیا اور اسے اٹھا کر وہ کار کی چابی نکال کر دروازہ بند کرتے ہی ایک طرف بھاگ کھڑی ہوئی۔ اس کے پیچھے ہی بائیک تھی۔

سامنے وہ بازار میں گھس گئی۔ وہ دوڑتی جا رہی تھی۔ اچانک وہ کسی سے ٹکرا کر نیچے گری اور نیچے گرتے ہی اس کا سر کسی سخت چیز سے ٹکرایا اور خون بہنے لگا۔ وہ چکرا گئی تھی۔

جس سے وہ ٹکرائی تھی وہ تیمور تھا۔ وہ جلدی سے اٹھا اور اس کی طرف بڑھا۔ "آپ ٹھیک ہیں۔"

ماریہ نے جواب دینے کے بجائے اٹھنے کی کوشش کی تو تیمور نے اسے سہارا دے کر کھڑا کیا اور پہلی بار ماریہ نے تیمور کی طرف دیکھا۔ اس کا سر چکرا رہا تھا اور سانس پھولی ہوئی تھی۔

اس نے مڑ کر اپنے عقب میں دیکھا۔ کچھ فاصلے پر وہ بائیک کھڑی تھی اور ایک آدمی بائیک سے اتر کر کھڑا تھا۔ ماریہ تیمور سے بولی۔

"ساتھ ہی میرا اپارٹمنٹ ہے...... پلیز مجھے وہاں تک چھوڑ دو۔"

تیمور اسے سہارا دے کر ایک طرف لے کر چلنے لگا۔ ماریہ کے پیر پر بھی چوٹ آئی تھی جس سے وہ لنگڑا کر چل رہی تھی۔ وہ بار بار پیچھے مڑ کر بھی دیکھ رہی تھی۔ وہ دونوں اسی جگہ کھڑے تھے۔ ایک نے فون اپنے کان سے لگایا ہوا تھا۔

وہ بلڈنگ اس جگہ سے دور نہیں تھی۔ تیمور اسے اس کے اپارٹمنٹ تک لے گیا۔ اس نے ماریہ کو ایک طرف بٹھایا تو ماریہ جلدی سے بولی۔

"جلدی سے دروازہ بند کر دیں۔ مجھے کوئی جان سے مارنا چاہتا ہے۔"

تیمور نے دروازہ مقفل کر دیا۔

"آپ کو کون جان سے مارنا چاہتا ہے......؟" تیمور نے اس کے قریب جا کر پوچھا۔

"فریج سے مجھے پانی کی بوتل دینا۔" ماریہ نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے فریج کی طرف اشارہ کیا۔

تیمور نے اندر سے ایک پانی کی بوتل نکال کر اس کی طرف بڑھا دی۔ ماریہ نے دو گھونٹ لے کر پانی کی بوتل ایک طرف رکھ دی اور خوف زدہ نگاہوں سے دروازے کی طرف دیکھا۔

"مجھے لگ رہا ہے جیسے دروازے کے پاس کوئی ہے۔" ماریہ نے سرگوشی کی۔

تیمور نے اچٹتی نگاہ دروازے پر ڈالی اور پوچھا۔

"کون ہے......؟"

"دروازے کے ساتھ کان لگا کر دیکھیں کہ وہاں کوئی ہے۔" ماریہ کی آواز کانپ رہی تھی۔ تیمور نے دروازے کے ساتھ کان لگا کر کچھ سننے کے بجائے ایک دم دروازہ کھولا تو ماریہ کا ڈر کے مارے منہ کھلا کا کھلا رہ گیا اور اسے لگا جیسے وہ دونوں کسی طوفان کی طرح اندر آ جائیں گے اور اس کا جسم گولیوں سے چھلنی کر کے چلے جائیں گے۔

ایسا بالکل نہیں ہوا۔ تیمور نے دروازہ کھول کر دائیں بائیں دیکھا اور دروازہ بند کر کے واپس آ کر بولا۔ "کوئی نہیں ہے۔"

ماریہ نے ہاتھ میں پکڑے فون سے مدثر کو کال کی اور رابطہ ہوتے ہی بتایا کہ اس پر دو آدمی حملہ کرنا چاہتے تھے اور وہ مشکل سے اپنے اپارٹمنٹ میں پہنچی ہے۔ دوسری طرف سے مدثر نے فوراً آنے کا کہہ کر فون بند کر دیا۔

"آپ کو کوئی جان سے مارنا چاہتا تھا......؟" تیمور نے ایک بار پھر پوچھا۔

"نہیں...... " ماریہ نے نفی میں گردن ہلائی۔ "اکیلی لڑکی کو دیکھ کر وہ میرے پیچھے تھے...... شاید وہ مجھے کوئی نقصان پہنچانا چاہتے تھے۔"

"اب آپ ٹھیک ہیں؟ میں چلتا ہوں۔" تیمور نے کہا۔

"آپ تھوڑی دیر رک سکتے ہیں؟ دراصل مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ ابھی میرا منگیتر آرہا ہے تو پھر آپ چلے جائیں۔" ماریہ کا لہجہ ملتجی تھا۔

تیمور نے کہا۔ "مجھے رکنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔"

ماریہ بہ مشکل صوفے کا سہارا لے کر اٹھی اور چیزوں کا سہارا لے کر کھڑکی کے پاس پہنچی اور کھڑکی پر پڑا پردہ تھوڑا سا ہٹا کر باہر دیکھا تو وہ خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹ گئی۔ وہ دونوں بائیک ایک طرف کھڑی کیے دائیں بائیں دیکھ رہے تھے۔

"میرا خیال ہے وہ جا چکے ہیں اس لیے مجھے بھی جانا چاہیے۔" تیمور نے ماریہ کے چہرے کے تاثرات دیکھتے ہوئے جان بوجھ کر کہا۔

"بس میرا منگیتر آہی رہا ہے۔ تم تھوڑی دیر رک جاؤ۔" ماریہ نے یہ نہیں بتایا کہ وہ دونوں باہر موجود ہیں۔

تیمور بڑی ہوشیاری سے دائیں بائیں بھی دیکھ رہا تھا اور اس کا خون اس بات پر بھی جوش مار رہا تھا کہ وہ کوئی قیمتی چیز اٹھا کر یہاں سے جائے۔ ماریہ کے دل میں بھی ایک اجنبی کی موجودگی کا کھٹکا تھا لیکن وہ ڈر رہی تھی۔

ماریہ نے ایک بار پھر پردہ ہٹا کر دیکھا تو وہ دونوں موجود نہیں تھے۔ ماریہ نے دائیں بائیں اور دور تک دیکھا۔ جونہی وہ تیمور کی طرف گھومی، اسی اثنا میں ڈور بیل ہوئی اور ماریہ ڈر گئی۔

"دروازہ مت کھولنا......" ماریہ نے خوفزدہ لہجے میں سرگوشی کی اور تیمور بھی رک گیا۔ اس کے بعد پھر ڈور بیل ہوئی۔ دونوں دروازے کی طرف دیکھتے رہے۔ اچانک ماریہ کے موبائل فون کی بیل ہوئی۔ مدثر کی کال تھی۔

"دروازہ کھولو ماریہ...... میں باہر کھڑا ہوں۔"

مدثر کی آواز سن کر اسے حوصلہ ہوا اور اس نے تیمور کو دروازہ کھولنے کا اشارہ کیا۔ تیمور نے دروازہ کھولا تو ایک اجنبی کو دیکھ کر وہ چونکا۔

"اس نے مجھے یہاں تک لانے میں مدد دی تھی۔" ماریہ بولی۔

"اوہ...... شکریہ۔"

"اب تم جا سکتے ہو۔" ماریہ نے کہا۔

"ایک بار پھر تمہارا شکریہ۔" مدثر نے کہتے ہوئے اسے اپنے گلے سے لگا لیا اور اسی دوران تیمور نے مدثر کی پینٹ کی پچھلی جیب سے اس کا پرس خاموشی سے نکال لیا اور اس سے الگ ہوتے ہی وہ باہر چلا گیا۔ مدثر نے دروازہ بند کر دیا۔

مدثر دروازہ بند کرتا ہوا سوچ رہا تھا کہ اس نوجوان کو اس نے اس سے قبل کہاں دیکھا تھا؟

تیمور سیدھا لفٹ میں چلا گیا اور پرس نکال کر دیکھا۔ اندر مختلف کاغذات کی پرچیاں، آئی ڈی کارڈ اور ہزار کے کچھ نوٹ تھے۔ تیمور نے آئی ڈی کارڈ کو دیکھا اور معنی خیز انداز میں مسکرا کر واپس پرس میں رکھا اور پرس اپنی جیکٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیا۔

☆☆☆

کمال کے تن بدن میں غصہ آگ کی طرح دوڑ رہا تھا۔ وہ اسی وقت گھر واپس آگیا تھا جب اس کو اس کے آدمی نے ماریہ کی اطلاع دی تھی۔ عینی اس کے سامنے دیوار کے ساتھ لگی متوحش نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"تم نے شاید میرا سوال سنا نہیں ہے۔ میں پوچھ رہا ہوں ماریہ یہاں کیا کرنے آئی تھی اور تمہاری اس سے کیا باتیں ہوئی ہیں......؟"

"میری اس سے کوئی بات نہیں ہوئی ہے۔" عینی نے جواب دیا۔

"تمہاری اس کے ساتھ باتیں ہوئی تھیں۔ وہ گیٹ کے ساتھ ہی کھڑی تھی۔" کمال کا لہجہ درشت ہو گیا تھا۔

"بیل ہوئی تھی اور میں دروازے کی طرف نہیں گئی تھی۔ میں گیٹ کھول نہیں سکتی تھی اس لیے میں کمرے میں بیٹھی رہی۔" عینی کا لہجہ پُراعتماد تھا۔

"تم مجھ سے جھوٹ بول رہی ہو۔" وہ چیخا۔

"مجھے جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"تم، ماریہ اور اپنے اس بوائے فرینڈ کے ساتھ مل کر میرے خلاف کوئی سازش کر رہی ہو۔ ایک بات یاد رکھنا میرے سامنے تمہاری کوئی سازش چلنے والی نہیں ہے۔ تم مجھے اچھی طرح سے جانتی ہو میں کیا ہوں۔" اس نے آگے بڑھ کر عینی کو بالوں سے پکڑ لیا۔

"میں جانتی ہوں کہ تم کیا ہو۔ میں کوئی سازش نہیں کر رہی ہوں۔ میں تو مجبور ہوں۔"

کمال نے اس کے بال ایک جھٹکے سے چھوڑ دیے اور ٹہلتے ہوئے سوچنے لگا۔ اسی اثنا میں اسے موبائل فون پر اطلاع دی گئی کہ ماریہ اپنے کسی جاننے والے کے ساتھ کسی

گلی میں غائب ہو گئی ہے۔ اس بات کو سن کر کمال کو اور بھی غصہ آ گیا۔ اس نے موبائل فون بند کرتے ہی گھورتے ہوئے ممی کی طرف دیکھا۔
"ماریہ نے جو نیا فلیٹ لیا ہے اس کا مجھے پتا بتاؤ۔"
"میں نہیں جانتی۔"
"تم بکواس کر رہی ہو۔" وہ دہاڑا۔
"میں اس کے پاس ایک بار بھی نہیں گئی۔ ہم جب بھی ملے کہیں باہر ہی ملے تھے۔" ممی بولی۔
"کوئی بات نہیں...... تم مجھے اس کا نیا پتا مت بتاؤ۔ میں ڈھونڈ لوں گا۔ وہ اسی شہر میں رہتی ہے اور یہ شہر میری تلاش سے بڑا نہیں ہے۔" کمال نے کہا۔
ممی چپ چاپ اس کی طرف دیکھتی رہی۔ کمال دروازے کی طرف بڑھا اور رک کر بولا۔ "اب تم بھی باہر نہیں جا سکو گی۔ تمہارا یہ گھر ہی تمہارا قید خانہ ہے۔"
"مجھے اس گھر سے کہیں جانا بھی نہیں ہے۔"
"کہیں جانے کی کوشش بھی مت کرنا ورنہ باہر کھڑا میرا آدمی تم کو گولی مار دے گا۔ یہ میرا آرڈر ہے اسے۔" کمال سفاکی سے کہہ کر باہر چلا گیا۔ ممی نے سر کو جھٹکا دیا اور دل ہی دل میں کہا۔
"دیکھتے ہیں پہلے پتا کون پھینک کر دوسرے کو مات کرتا ہے۔" ممی کہہ کر کھڑکی کے پاس گئی تو کمال گاڑی باہر نکال کر گیٹ کو باہر سے مقفل کر رہا تھا۔

☆☆☆

شام کو رابی کے فلیٹ میں تیمور چلا گیا۔ اس نے مدثر کا آئی ڈی کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھایا اور اس کی تصویر دکھاتے ہوئے بولا۔
"اس کی شکل اچھی طرح سے اپنی آنکھوں میں بٹھا لو۔ پولیس تفتیش کرے گی تو تم اس کا حلیہ بتاؤ گی۔"
رابی نے اچھی طرح سے اس کی تصویر کو دیکھا اور بولی۔ "میرا بتایا ہوا حلیہ، باس کے بتائے ہوئے حلیے سے مختلف ہوگا۔ کیونکہ جب تم باس کے کمرے میں جاؤ گے تو وہ تمہاری شکل دیکھے گا۔"
"جب میں اندر جانے لگوں گا تو سر پر لی ہوئی ٹوپی کو گردن تک کھینچ لوں گا۔ میری آنکھیں دکھائی دیں گی جبکہ ناک اور منہ کے اوپر سوراخ ہوگا۔ میں اندر جاتے ہی باس کو قابو کر لوں گا اور اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دوں گا۔ تفتیش کے دوران تم بتانا کہ جب وہ شخص اندر گیا تھا تو اس کا چہرہ اوپن تھا اور اس کا حلیہ ایسا تھا۔" تیمور نے اسے سمجھایا۔
"ٹھیک ہے...... اتا پتا میں یہی لکھ دوں جو اس آئی ڈی کارڈ پر ہے۔" رابی نے پوچھا۔
"یہی سب لکھنا۔"
"ویسے یہ شریف آدمی ہے کون......؟"
"یہ شریف آدمی نہیں ہے۔ میری اس سے ایک ملاقات ہو چکی ہے۔ جس جگہ اس سے میری ملاقات ہوئی تھی وہاں سے مجھے پتا چلا کہ یہ کتنا بڑا کمینہ ہے۔ وہ ملاقات کیونکہ پہلی دفع تھی اور دوسرے لوگوں کے ساتھ تھی اس لیے اس نے مجھے پہچانا نہیں تھا۔"
"ایسی بات ہے تو پھر یہ پھنستا ہے تو پھنسے، ہمیں پیسے سے غرض ہے۔" رابی نے کارڈ اس کی طرف بڑھا دیا۔ "ایک بات پوچھوں۔"
"ہاں پوچھو۔"
"تم کیسے جانتے تھے کہ باس کی تجوری میں ہر وقت پیسا رہتا ہے......؟" رابی نے پوچھا۔
"ٹرین میں سفر ہو رہا تھا۔ میری برابر والی سیٹ پر جو نوجوان بیٹھا تھا وہ اس کے پاس کام کرتا تھا۔ ادھر ادھر کی باتوں میں اس نے اس نوکری کے بارے میں بتایا اور پھر اپنے باس کے بارے میں بتانے لگا۔ میں نے بھی اس سے کرید کرید کر معلومات لیں اور فیصلہ کیا کہ اب میں اسی کو لوٹوں گا۔"
"میں بھی سوچ رہی تھی کہ تمہیں اتنی معلومات کیسے ہے۔" رابی نے اس کی طرف دیکھ کر مسکراہٹ اچھالی۔ "اچھا یہ بتاؤ جب تم پیسا لے لو گے تو اسی وقت شہر چھوڑ دو گے؟"
"ایسا کرنا مشکل ہوگا۔ پہلے میں ان پیسوں کو کسی محفوظ جگہ پر رکھوں گا اور اس کے بعد خالی ہاتھ گنگناتا ہوا شہر سے باہر چلا جاؤں گا اور وہ پیسا اس شہر سے وصول کر لوں گا۔" تیمور نے بتایا۔
"ایسا کیسے ہوگا......؟"
"تم ان باتوں کو نہ ہی جانو تو بہتر ہے۔ کل کے بارے میں سوچو۔ ہمارا منصوبہ ناکام نہیں ہونا چاہیے۔" وہ مسکرایا۔
تیمور کچھ باتوں کے بعد اس فلیٹ میں چلا گیا جہاں اس نے رہائش رکھی ہوئی تھی۔ اس نے دروازہ بند کیا اور ایک لفافہ نکال کر اندر جھانکا اور اطمینان کرنے کے بعد اس نے وہ لفافہ اسی جگہ رکھا اور بستر پر نیم دراز ہو گیا۔ اب اسے کل کا انتظار تھا۔ وہ کمال کی تجوری خالی کرنے کے بعد ایمانداری سے رابی کا حصہ اسے دے کر شہر چھوڑ کر چلے جانا چاہتا تھا۔

☆☆☆

کمال اینڈ کمپنی میں ہر کام معمول کے مطابق ہو رہا تھا۔ کمال اپنے وقت پر اپنے کمرے میں پہنچ گیا تھا۔ جن کے ساتھ اس کی ملاقات طے تھی وہ ان سے ایک ایک کر کے ملاقات کر رہا تھا۔ اس کا منیجر اپنی میز پر براجمان کام میں مصروف تھا اور کام کے دوران اس نے اپنی جیب سے اپنی دوا... نکال کر پانی کے ساتھ کھائی اور پھر کام میں مصروف ہو گیا۔ کمال اینڈ کمپنی کا سارا اسٹاف اپنی اپنی جگہ کام میں مصروف تھا۔

رابی وقت دیکھ رہی تھی۔ وہ ملاقاتیوں میں مدثر کا نام بھی کمال کی میز پر رکھ آئی تھی۔ جس آدمی کے ساتھ کمال کی ملاقات چل رہی تھی اس کے بعد آخری ملاقات تیمور کے ساتھ تھی، جس نے مدثر کے نام سے ملنا تھا۔ ابھی تک تیمور نہیں آیا تھا۔

تیمور زیادہ دیر اس جگہ بیٹھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے ملاقات کے لیے دیے گئے وقت سے دس منٹ قبل وہ رابی کے پاس پہنچا تو وہ ڈائری پر اس کا نام بتا اور ضروری باتیں لکھ چکی تھی۔

تیمور اپنی جگہ براجمان تھا اور آنکھوں کے اشارے سے وہ رابی کو بتا رہا تھا کہ وہ ہوشیار رہے۔ اس نے ہاتھوں میں دستانے پہن لیے تھے۔ چوکیدار دروازے سے باہر بیٹھا تھا۔

جونہی وہ آدمی ملاقات کرنے کے بعد کمرے سے باہر نکلا، تیمور اٹھا اور کمرے کی طرف بڑھا۔ دروازہ کھولنے سے قبل اس نے اپنی ٹوپی کھینچ کر اپنا چہرہ چھپا لیا۔ اب اس کی آنکھیں اور ہونٹ ہی دکھائی دے رہے تھے۔ اس کی شناخت اس نقاب کے پیچھے چھپ گئی تھی۔

تیمور سرعت سے کمرے میں داخل ہوا تو کمال ایک فائل پر جھکا ہوا تھا۔ جونہی اس نے سر اٹھایا تیمور اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ ایک نقاب پوش کو اپنے بالکل قریب دیکھ کر کمال چونکا اور اس سے قبل کہ وہ کچھ کرتا، تیمور نے اس کے گلے پر تیز دھار خنجر رکھ دیا۔

"مجھے کوئی حرکت نہیں چاہیے ورنہ مارے جاؤ گے۔"

"تم کیا کر رہے ہو......؟" کمال کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا اور وہ حواس باختہ سا ہو گیا تھا۔

تیمور کے ہاتھ میں جو بیگ تھا اس نے میز پر رکھا اور اس میں سے رسی نکال کر پہلے کمال کو خبردار کیا۔

"اگر تم نے مزاحمت کی تو میں تمہارا گلا کاٹ دوں گا۔" تیمور کے لہجے میں سفاکی تھی۔ کمال ایسی صورت حال کا سامنا پہلی بار کر رہا تھا۔ "میرے آدمی تمہارے سارے اسٹاف کو یرغمال بنائے ہوئے ہیں۔ تمہارا چوکیدار بھی میرے آدمیوں کے قابو میں ہے۔ اس لیے کوئی تمہاری مدد کو نہیں آئے گا۔" تیمور اسے باندھنے کے ساتھ ساتھ بتا بھی رہا تھا۔ کمال نے یہ سن کر اپنے اعصاب ڈھیلے چھوڑ دیے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ کئی لوگ ہیں۔

تیمور نے اسے کرسی کے ساتھ ہی باندھ دیا۔ کمال کے موبائل فون کا اس نے سوئچ آف کر دیا۔ ٹیلی فون کی تاریں کھینچ دیں اور اس کی کرسی کھینچ کر دیوار کے ساتھ لگا کر درشت لہجے میں بولا۔ "اپنی تجوری کی چابی دو...... جلدی... جلدی......"

"اس دراز میں ہے۔" کمال نے بتانے میں دیر نہیں کی۔ تیمور نے دراز سے تجوری کی چابیوں کا گچھا نکالا اور کمال کی نشاندہی پر ایک ریک دھکیلا تو سامنے تجوری تھی۔ اس نے چابی لگائی اور دروازہ کھول دیا۔ اس کے بعد اس نے کئی خانے کھولے...... کچھ پراپرٹی کے کاغذات کے علاوہ ایک لاکھ روپے کی گڈی پڑی تھی۔

تیمور نے اچھی طرح سے تجوری کھنگال ڈالی اس ایک گڈی کے علاوہ کوئی اور پیسا موجود نہیں تھا۔ جس امید کے ساتھ تیمور یہاں تک آیا تھا، اس امید پر پانی پھر رہا تھا۔

تیمور تیزی سے اٹھ کر کمال کے پاس گیا اور اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "پیسا کہاں ہے؟"

"میری آج ایک ڈیل ہونی تھی اور میں نے پیسا اسے دے دیا ہے اس وقت بس یہی پیسے ہیں۔"

"تم بکواس کر رہے ہو۔" تیمور نے غصے سے اس کے منہ پر تھپڑ رسید کر دیا۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔"

"مجھے اور پیسا چاہیے...... مجھے بتاؤ اور پیسا کہاں ہے۔"

تیمور کو اس پر شدید غصہ آرہا تھا۔

"اس وقت یہاں بس اتنا ہی پیسا ہے۔ کچھ تو بینک سے دے دیتا ہوں لیکن اس شرط پر تم مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچاؤ گے۔" کمال جو اندر سے ڈر گیا تھا اور اس کے دماغ میں یہ بات بھی آگئی تھی کہ پیسا نہ ملنے کی وجہ سے کہیں وہ اسے غصے میں جان سے ہی نہ مار دے۔

"میرے پاس بینک تک جانے کا وقت نہیں ہے۔ مجھے یہاں پیسا دو۔" تیمور جھلایا۔

"سچ کہہ رہا ہوں اس وقت یہی ایک لاکھ روپے ہیں۔ میری جیب میں تیس ہزار روپے ہوں گے اور اس کے علاوہ

کریڈٹ کارڈز ہیں...... وہ لے لو۔" کمال نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"وہ کارڈ میرے لیے فضول ہیں۔ مجھے کیش چاہیے۔"

تیمور کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اپنی اس ناکامی پر کیا قدم اٹھائے۔ اس کی سوچ کے برعکس ہوا تھا اور اسے زیادہ پیسوں کی ضرورت تھی۔

"میرے پاس اور پیسا نہیں ہے۔" کمال نے کہا۔

اسی وقت تیمور کے موبائل پر سرسراہٹ ہوئی۔ اس نے دیکھا رابی کا میسج تھا۔ اس نے لکھا تھا جلدی باہر آجاؤ...... کچھ لوگ آرہے ہیں......

تیمور کمرے میں مضطرب اور ہیجانی کیفیت میں دائیں بائیں ٹہل رہا تھا۔ کمال اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس قدر خوف زدہ تھا کہ کہیں وہ اسے گولی ہی نہ مار دے۔

تیمور کا پلان چوپٹ ہوچکا تھا۔ رابی نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اسے جو کچھ کرنا ہے پانچ منٹ کے اندر کرنا ہوگا ورنہ اس کے لیے مشکل کھڑی ہوجائے گی اور اسے بھاگنے کے لیے راستہ نہیں ملے گا۔

ناچار اس نے وہ ایک لاکھ روپیا اپنی جیب میں ڈالا اور اپنا بیگ کندھے سے لٹکا کر سوچنے لگا وہ کیا کرے۔ کمال کے پاس مزید پیسا نہیں تھا۔ رابی کا پھر میسج آیا کہ وہ جلدی باہر آجائے۔ تیمور نے باہر نکلنے سے قبل کمال کی جیب سے اس کا پرس نکالا اور اس کے اندر رکھے پیسے نکال کر اپنے بیگ سے وہ چھوٹا بیگ نکالا جو رابی نے اسے دیا تھا۔ تیمور نے اس میں وہ پیسے رکھے جو اس نے کمال کے پرس سے نکالے تھے اور دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازہ کھولنے سے قبل وہ رکا اور اس نے غضبناک نظروں سے کمال کی طرف دیکھا تو کمال سہم کے رہ گیا۔ تیمور کو اپنی ناکامی پر شدید رنج تھا اور اس کا غصہ آسمان کو چھونے لگا تھا۔

کمال کے کمرے کا دروازہ یکدم کھلا اور تیمور تیزی سے باہر نکلا۔ رابی کا دیا ہوا بیگ رابی کے سامنے رکھ کر اس نے اپنی ٹوپی ٹھیک کی اور جلدی سے باہر نکل گیا۔ رابی نے وہ بیگ پہلے سے رکھے سیاہ شاپر میں رکھا اور ایک کونے میں رکھے کوڑے دان کے ڈرم میں پھینک کر اپنی جگہ کھڑی ہوگئی۔ ٹھیک اسی وقت نظامی اندر آگیا۔

"اندر کوئی ہے......؟"

"نو سر...... ابھی ملاقات ختم ہوئی ہے۔" رابی نے اپنا گلا صاف کرنے کے بعد جواب دیا۔ نظامی اندر چلا گیا۔ رابی کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اور اس کے ہاتھوں میں لرزش پیدا ہوگئی تھی۔

ایک دم دروازہ دھماکے سے کھلا اور نظامی گھبرایا ہوا باہر نکل کر چلایا۔ "ابھی اندر کون گیا تھا...... اسے پکڑو وہ باس کو قتل کرکے چلا گیا ہے......"

نظامی کی بات سنتے ہی رابی کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ نظامی نے چلا کر گارڈ کو بلایا۔ وہ بھاگتا ہوا اندر آیا اور نظامی کے ساتھ کمرے میں چلا گیا۔ اس کے پیچھے رابی تھی۔ اندر جاتے ہی رابی کی سانس رک گئی۔ اس کی نظریں کمال پر منجمد ہوگئی تھیں۔

کمال کرسی سے بندھا ہوا تھا اور اس کی گردن تیز دھار آلے سے کاٹ دی گئی تھی جس سے خون تیزی سے بہہ رہا تھا اور کمال کا جسم بے جان ہوچکا تھا۔

رابی سے وہ منظر دیکھا نہیں گیا اور وہ بھاگ کر باہر چلی گئی۔ نظامی موبائل فون کان سے لگائے پولیس کو فون کررہا تھا۔

☆☆☆

کمال اینڈ کمپنی کے دفاتر میں ہی نہیں بلکہ پوری بلڈنگ میں خوف و ہراس پھیل گیا تھا۔ کمال کے قتل کی خبر آگ کی طرح پھیل گئی تھی۔ نظامی نے بروقت پولیس کو اطلاع کردی تھی اور اس وقت بڑی تعداد میں پولیس اور افسران موجود تھے۔ لاش کا معائنہ کیا جارہا تھا اور شواہد اکٹھے کیے جارہے تھے۔ ہر طرف سراسیمگی تھی اور سب سے بری حالت رابی کی تھی۔ اسے رہ رہ کر تیمور پر غصہ آرہا تھا جس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ کمال کو قتل کردے گا اور اگر قتل اس کے پلان کا حصہ نہیں تھا تو پھر اچانک اس کے قتل کی نوبت کیوں آئی؟

نظامی نے اپنا بیان دیا تھا۔ "میں کمال اینڈ کمپنی کا پچھلے چودہ سال سے منیجر ہوں۔ میں ایک ضروری کام کے لیے جوں ہی ان کے کمرے میں گیا تو یہ دیکھتے ہی ٹھٹک گیا کہ کمال صاحب کو کرسی سے باندھا گیا تھا اور ان کی گردن سے خون بہہ رہا تھا۔ میں نے ان کے پاس جاکر ان کی نبض چیک کی اور باہر آکر چلایا کہ اس آدمی کو پکڑو جو ابھی ملاقات کرکے گیا ہے...... گارڈ دائیں بائیں بھاگے لیکن وہ غائب ہوچکا تھا۔"

"آخری ملاقات کس نے کی تھی؟" پولیس انسپکٹر رابی کی طرف متوجہ ہوا تو رابی خوف زدہ کانپتی آواز میں بولی۔

"مدثر خان نے آخری ملاقات کی تھی۔"

"اس کا کمال صاحب کے ساتھ کوئی کاروباری تعلق تھا......؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

"مجھے نہیں یاد کہ اس نام کے آدمی کا ہماری کمپنی کے ساتھ کوئی تعلق تھا۔" نظامی نے سوچتے ہوئے بتایا۔

"کمال صاحب کے ساتھ وہ کسی پراپرٹی کی ڈیل کرنا چاہتا تھا اور اس سلسلے میں ان کی میٹنگ تھی۔" رابی نے کہا۔

"ہاں...... کمال صاحب ایسی ڈیل کرتے رہتے تھے جن میں ان کو زیادہ مالی فائدہ نظر آتا تھا۔ اس کے لیے ان کے پاس ایسے لوگ بھی آتے تھے جو پہلے کبھی نہ آئے ہوں۔" نظامی نے مزید بتایا۔

"ملاقاتیوں کا ریکارڈ موجود ہوتا ہے......؟" انسپکٹر نے سوال کیا۔

"بالکل موجود ہوتا ہے۔" نظامی نے کہہ کر رابی سے ڈائری لانے کو کہا تو رابی نے وہ ڈائری نظامی کی طرف بڑھا دی اور نظامی نے انسپکٹر کو دے دی۔

آخری ملاقاتی کا نام مدثر خان تھا۔ اس کا مکمل پتا، آئی ڈی کارڈ اور فون نمبر موجود تھا۔

انسپکٹر نے ایک اہلکار کو کچھ ہدایت دی اور نظامی سے کہا۔ "سب کے بیانات ہوں گے اور ابھی کوئی باہر نہ جائے۔"

"آپ فکر نہ کریں ہم پورا تعاون کریں گے۔" نظامی نے یقین دلایا۔

اسی وقت انسپکٹر نے کسی کو فون کیا اور کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد وہ باہر چلا گیا۔ اس انسپکٹر کا نام نادر تھا۔ جب اس نے مدثر کا نام پتا دیکھا تو وہ چونکا اور اس نے اسی وقت مدثر کو کال کر کے آگاہ کر دیا اور اسے تاکید کی وہ کسی محفوظ مقام پر چلا جائے۔ وہ اس سے ملاقات کرے گا اور اس کے بعد اگلا عمل طے کریں گے۔

انسپکٹر نادر کو تک مدثر کے خاندان میں سے تھا۔ اس نے اپنی نوکری میں اتنے پیسے حلال کے جمع نہیں کیے ہوں گے جتنے اس کے پاس حرام کا روپیہ تھا۔

انسپکٹر نادر کے جانے کے بعد بھی کے بیان ہوئے اور کمال اینڈ کمپنی کے سارے اسٹاف میں صرف رابی واحد لڑکی تھی جو خوفزدہ اور گھبرائی ہوئی تھی ورنہ کسی کے چہرے پر ملال بھی نہیں تھا اور کوئی خوف بھی مترشح نہیں تھا۔

سب کے بیانات ہونے کے بعد ان کو جانے کی اجازت ملی۔ کمال کی لاش ایمبولینس میں لے گئے۔ اس کے کمرے کو سیل کر دیا گیا تھا۔ سب جانے لگے اور رابی کو کوڑے کے ڈرم سے وہ بیگ جو سیاہ شاپر میں تھا، نکالنے کا موقع مل ہی گیا۔ اس نے برق رفتاری سے وہ نکالا اور اپنے ہینڈ بیگ کے ساتھ ہی پکڑ کر باہر نکل گئی۔ جب تک وہ اس بلڈنگ سے نکل کر ایک ٹیکسی میں بیٹھ نہیں گئی تب تک وہ ڈرتی اور کانپتی ہی رہی۔

☆☆☆

مدثر سنتے ہی دم بخود رہ گیا تھا کہ وہ کمال اینڈ کمپنی میں بھی گیا تھا اور اس کے ہاتھوں اس کمپنی کے مالک کا قتل بھی ہو گیا۔

مدثر کے پاس زیادہ سوچنے کا وقت نہیں تھا وہ اس جگہ سے روپوش ہو گیا۔ مدثر کے دل میں ایک ہی بات تھی کہ کسی نے اپنے شوہر کو قتل کروا کے سارا الزام اس پر عائد کر دیا ہے۔ اس الزام کی نوعیت کیا تھی اس کا ابھی مدثر کو پوری طرح سے علم نہیں تھا۔ لیکن اسے اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ اس کے خلاف منظم سازش تیار کر کے اسے پھنسایا گیا ہے۔

پہلے وہ کسی محفوظ مقام پر پہنچا اور اس کے بعد اس نے اپنے ایک آدمی کے ذریعے سے ساری معلومات لی تو اس کے علم میں آیا کہ آخری ملاقاتی نے اس کا نام پتا لکھوایا تھا۔ تب وہ چونکا اور اسے ماریہ کے اپارٹمنٹ میں ملنے والا وہ لڑکا یاد آیا جو جاتے ہوئے اس سے گلے ملا تھا اور اس کے بعد جب ضرورت پڑنے پر اس نے اپنا پرس جیب سے نکالنا چاہا تھا تو وہ غائب تھا۔

مدثر کڑی سے کڑی ملانے لگا اور وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ ماریہ اور عتیق ایک ساتھ ملی ہوئی ہیں۔ ماریہ نے ڈراما کیا اور اسے اپنے اپارٹمنٹ میں بلا کر اس لڑکے سے اس کا پرس غائب کرایا تاکہ قتل کی اس واردات میں اسے ملوث کیا جا سکے۔

تب مدثر اور بھی چونکا جب اسے یاد آیا کہ وہ اس نوجوان سے ایک کلب میں مل چکا تھا۔ دونوں نے ایک ساتھ بلیئرڈ کھیلا تھا اور کچھ گپ شپ بھی کی تھی۔ جب مدثر کے بھی کچھ دوست وہاں موجود تھے۔ اسی مختصر سے تعلق میں اس نوجوان نے سب کے ساتھ باتیں کی تھیں اور جب وہ گیا تھا تو مدثر کا ایک دوست اپنے پرس سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ تب کسی کے دماغ میں یہ خیال نہیں آیا تھا کہ وہ کام اس لڑکے کا ہو سکتا ہے۔

مدثر نے اپنے تئیں بہت کچھ اخذ کر لیا تھا۔ ماریہ اور عتیق نے اسے دھوکا دیا تھا اور وہ اپنے اوپر لگے الزام کو دھونے کے ساتھ عتیق اور ماریہ کو سبق سکھانے کے لیے پیچ و تاب کھانے لگا تھا۔

اسی جگہ انسپکٹر نادر بھی پہنچ گیا۔ وہ مدثر کو ایک کمرے میں لے گیا اور پوچھا۔ "یہ کیا ہے مجھے حقیقت بتاؤ۔"

"میں تم سے کوئی بات نہیں چھپاؤں گا۔ میرا پرس میری جیب سے نکل گیا تھا اور اس میں میرا آئی ڈی کارڈ

تھا۔ میرے خلاف ایک سازش ہوئی ہے۔" مدثر نے بتایا۔

"کون ہے جس نے تمہارے خلاف سازش کی ہے؟"
انسپکٹر نادر نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"اس کا نام ماریہ ہے اور وہ میری دوست ہے......"

اس نے مدثر کی بات کاٹ دی۔ "میں مل چکا ہوں ماریہ سے۔" انسپکٹر نادر نے اس کا نام لیتے ہوئے اپنے ہونٹوں پر کسی حریص کی طرح زبان پھیری۔

"اس نے مجھے بہانے سے اپنے فلیٹ میں بلایا تھا اور وہاں پر ایک لڑکا پہلے سے موجود تھا۔ وہ مجھ سے گلے ملا اور میرا پرس غائب ہو گیا۔ یہ کل کی بات ہے اور آج یہ واقعہ رونما ہو گیا۔"

"ماریہ اسی فلیٹ میں ملے گی......؟"

"ہاں...... وہ اسی فلیٹ میں ہوگی۔"

"تم اس سے کوئی رابطہ مت کرنا۔ کمال ایک بڑا بزنس مین تھا۔ اس کے قتل پر ابھی چیمبر آف کامرس کا اجلاس بھی ہوا ہے۔ کچھ کاروباری شخصیات اور پریس ملاقات بھی کر آئی ہیں اس لیے بہت گرما گرمی کا ماحول ہوگا۔ تم ابھی یہاں سے باہر مت نکلنا۔ پہلے میں اچھی طرح سے جا کر دیکھ لوں پھر اس کے بعد کچھ سوچیں گے۔"

"تم ماریہ کو پکڑ لو وہ سب بتا دے گی۔ وہی اس لڑکے کا بھی پتا دے گی اور وہ لڑکا مل گیا تو سمجھو میں بے گناہ ثابت ہو جاؤں گا۔"

"تم اپنا موبائل فون بند رکھنا۔ رابطے کے لیے کوئی ایسا نمبر لے لو جو تمہارے نام پر نہ ہو۔" نادر کہہ کر دروازے کی طرف بڑھا تو مدثر نے اسے روک کر کہا۔

"ایک بات اور بتا دوں...... کمال کی بیوی تھی اپنے شوہر کو پیسے دے کر قتل کروانا چاہتی تھی۔"

اس انکشاف نے انسپکٹر نادر کو چونکا سا دیا۔ اس نے متحیر نظروں سے مدثر کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"تم یہ بات کیسے کہہ سکتے ہو......؟"

"ساری باتیں ماریہ سے شروع ہوتی ہیں اور اسی پر ختم ہو جاتی ہیں۔ ان باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے تم کسی طرح سے ماریہ کو پکڑ لو۔" مدثر نے کہا اور انسپکٹر نادر گردن ہلاتا ہوا چلا گیا۔

☆☆☆

رابی کے لیے اپنے آفس سے فلیٹ تک کا سفر پل صراط کے مانند تھا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور گھبراہٹ اس کے چہرے پر براجمان رہی تھی۔ وہ بار بار اپنے دائیں بائیں دیکھ رہی تھی اور راستہ ختم ہی نہیں ہو رہا تھا۔

جب اس کی بلڈنگ آئی تو وہ ٹیکسی کا کرایہ دے کر تیزی سے اندر کی طرف بھاگی۔ فلیٹ کی طرف گئی تو وہاں ایک کارڈ لگا ہوا تھا جس پر لکھا تھا کہ لفٹ خراب ہے۔ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جانا اس کے لیے سوہان روح تھا۔ پہلے ہی وہ بمشکل راستہ کاٹ کر آئی تھی۔ جب اس نے بہتری محسوس کی تو اس نے ہاتھ میں پکڑا اپنا پرس اور وہ شاپر ایک طرف رکھ کر پہلے ایک گلاس پانی پیا اور اس کے بعد وہ شاپر کی طرف متوجہ ہوئی۔

اس نے اٹھ کر پہلے یہ تسلی کی کہ اس نے دروازے کو اندر سے مقفل کیا ہے۔ جب اس کی تسلی ہو گئی تو اس نے شاپر میں سے چھوٹا بیگ باہر نکالا اور جب اس نے بیگ کے اندر جھانکا تو اس کا رنگ ہی اڑ گیا۔

بیگ کے اندر ایک کونے میں تھوڑے سے نوٹ دکھائی دے رہے تھے۔ رابی نے بیگ الٹ دیا۔ جو چند نوٹ تھے وہ باہر گر گئے۔ اس نے نوٹ گنے تو وہ بائیس ہزار روپے تھے۔

رابی کا غصے سے برا حال ہو رہا تھا۔ وہ اسی وقت اٹھی اور باہر جا کر اس فلیٹ پر دستک دینے لگی جس میں تیمور رہ رہا تھا۔ کئی بار دستک دینے کے باوجود جب تیمور نے دروازہ نہ کھولا تو اس نے اس بار سوچا کہ وہ زور سے ہاتھ مارے لیکن وہ رک گئی۔ اردگرد سے کسی نے دیکھ لیا تو اس کے لیے مشکل کھڑی ہو سکتی تھی۔

رابی نے نادانستہ دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر اس کو گھمایا تو دروازہ کھل گیا۔

رابی نے دائیں بائیں دیکھا اور اندر چلی گئی۔ لائٹ بند تھی۔ اس نے ٹی وی لاؤنج کی لائٹ روشن کی اور بولی۔

"تیمور...... تیمور...... کہاں ہو تم......؟"

جب اسے کوئی آواز نہ آئی تو اس نے سارے کمرے دیکھ لیے۔ وہ موجود نہیں تھا اس کا مطلب تھا کہ تیمور پیسا لے کر فرار ہو گیا تھا۔ رابی آگ بگولا اپنے فلیٹ میں چلی گئی۔ اس نے تیمور کو کال کی اور اس کا نمبر بند تھا۔

کچھ دیر پیچ و تاب کھانے کے بعد اس نے اپنا موبائل فون اٹھا کر ایک نمبر تلاش کیا اور کال کرنے کے بعد مضطربانہ انداز میں ٹہلتی ہوئی دوسری طرف سے آواز آنے کا انتظار کرنے لگی۔ اچانک دوسری طرف سے ایک پروقار آواز آئی۔

"ہیلو......"

"نظامی سر...... میں رابی بول رہی ہوں۔"

"ہاں بولو رابی کیا بات ہے؟ خیریت تو ہے......؟"

دوسری طرف سے نظامی کی آواز آئی۔

”سر مجھے اچانک ایک بات یاد آئی ہے۔ وہ میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں۔“ رانی بولی۔

”بتاؤ کیا بات یاد آئی ہے۔“

”سر جب مدثر نامی شخص آیا تھا تو اس کے ساتھ ایک لڑکا اور بھی تھا۔ وہ اس کے ساتھ آیا تھا اور پھر چلا گیا تھا۔ وہ باہر نہیں گیا تھا بلکہ جس طرف ہمارے باتھ روم وغیرہ ہیں وہ اس طرف چلا گیا تھا۔ مدثر باس کے پاس چلا گیا تو وہ تھوڑی دیر کے بعد آیا اور ایک نظر ڈال کر چلا گیا۔۔۔ مجھے لگتا ہے وہ بھی اس کا ساتھی تھا۔“ رانی بتانے لگی۔

”یہ بات تم نے اس وقت کیوں نہیں بتائی تھی؟“ نظامی نے پوچھا۔

”سر اس وقت میں بہت ڈر گئی تھی۔ زندگی میں پہلی بار میں نے کوئی لاش دیکھی تھی اور میرا دماغ ماؤف ہو گیا تھا۔“

”دیکھو یہ بہت اہم نکتہ ہے۔ میں آتا ہوں اور ابھی پولیس اسٹیشن جا کر اس بات کی بھی اطلاع دیتے ہیں۔“

”سر مجھے اس کا حلیہ بہت اچھی طرح سے یاد ہے۔“

”میں ابھی آرہا ہوں۔“ کال منقطع ہو گئی اور رانی کے چہرے پر تیمور کے لیے انتقام واضح دکھائی دینے لگا۔

نظامی جلد ہی اس کے پاس پہنچ گیا اور اسے پولیس اسٹیشن لے گیا۔ تیمور کے بارے میں اس نے اسی طرح پولیس کو بتایا جیسے وہ نظامی کو بتا چکی تھی۔ اس کے بعد اس نے تیمور کا حلیہ ان کو بتایا اور تیمور کا اسکیچ تیار ہونے لگا۔ کچھ محنت کے بعد جو اسکیچ تیار ہوا وہ تیمور کے بہت قریب تھا۔۔۔

”ہاں وہ ایسا ہی تھا۔“ اسکیچ کو دیکھتے ہی رانی بولی۔

اب مدثر کے ساتھ تیمور کی بھی تلاش شروع ہو گئی تھی۔

☆☆☆

کمال کے قتل کی اطلاع دینے جب نظامی اس کے گھر پہنچا تو اسے بیل دینے کے بعد انتظار کرنا پڑا۔ عینی بھی شاید ماریہ آئی ہے۔ وہ کمرے سے نکل کر گیٹ کے پاس گئی اور پوچھا۔

”کون ہے۔۔۔؟“

”جی میں نظامی ہوں آفس سے آیا ہوں۔“ نظامی نے بتایا۔

”جی انکل۔۔۔ کمال تو آفس میں ہیں۔“ عینی بولی۔

”مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔ پلیز گیٹ کھولیں۔“ نظامی نے کہا۔

عینی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا بتائے۔ ”کیا بات ایسے ہی نہیں ہو سکتی۔۔۔؟“

”گیٹ کھولنے میں کوئی مضائقہ ہے بیٹی۔۔۔؟“ نظامی نے کہا۔

”دراصل۔۔۔ بات یہ ہے کہ۔۔۔ پہلے آپ مجھے یہ بتائیں کہ آپ کو کمال نے بھیجا ہے۔“

”مجھے انہوں نے نہیں بھیجا۔ میں خود آیا ہوں اور مجھے ضروری بات کرنی ہے۔“ نظامی سوچنے لگا۔

”گیٹ باہر سے لاک ہے۔ میرے پاس گیٹ کی چابی نہیں ہے اور میں گیٹ نہیں کھول سکتی۔“ عینی نے بتایا۔

”آپ میری مدد کریں تاکہ میں کسی طرح سے باہر آسکوں۔“

نظامی نے سنا اور سوچنے لگا اس کے بعد وہ انتظار کرنے کا کہہ کر چلا گیا۔ واپسی پر اس کے ساتھ ایک کاریگر تھا جس نے گیٹ کے لاک کی نئی چابی تیار کر کے لگائی تو گیٹ کھل گیا۔ نظامی نے اسے مزدوری دے کر فارغ کیا اور اندر جا کر عینی کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے بتایا۔

”میں آپ کو یہ اطلاع دینے آیا ہوں کہ کسی نامعلوم شخص نے جو۔۔۔ ملاقات کے بہانے آیا تھا۔۔۔ اس نے کمال صاحب کو قتل کر دیا ہے۔“

عینی نے تحمل سے سنا اور اس کا دھیان فوراً ماریہ کی طرف چلا گیا۔ اسی کو اس نے کہا تھا کہ وہ جتنے چاہے پیسے لے کر کمال کا کام تمام کر کے اس کی جان اس عذاب سے نکال دے۔ اس کا مطلب تھا کہ ماریہ اور مدثر نے وہ کام کر دیا تھا۔

”آپ جو کہہ رہے ہیں کیا یہ سچ ہے؟“ عینی نے پوچھا۔

”حقیقت ہے۔“ نظامی نے متانت سے جواب دیا۔

”یہ کیسے ہوا۔۔۔؟“ عینی نے سوال کیا۔

”پولیس تفتیش کر رہی ہے۔ جس نے آخری ملاقات کی تھی وہ انہیں قتل کر کے نکل گیا تھا۔“

عینی کچھ دیر کھڑی رہی۔ پھر وہ اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کر ایسے اندر کی طرف بھاگی جیسے اسے شدید صدمہ پہنچا ہو۔ نظامی کچھ دیر اسی جگہ کھڑا رہا اور پھر موبائل فون پر کسی سے بات کرنے لگا۔ کمال کی تدفین کے تمام معاملات اسی کو دیکھنے تھے۔

عینی اپنے کمرے میں گئی اور اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ کمال قتل ہو گیا ہے۔ عینی نے جو وقت کمال کے ساتھ گزاری تھی وہ اس کے لیے تکلیف دہ خواب سے کم نہیں تھی۔

☆☆☆

ماریہ اپنے فلیٹ سے نکل کر نیچے مارکیٹ تک گئی تھی کہ اس کے چلتے قدم رک گئے۔

اس کی نظر شام کے اخبار پر پڑی جو اسٹال پر پڑا

تھا۔ کمال کے قتل کی خبر شائع ہوئی تھی۔ اس نے جلدی سے اخبار خریدا اور کچھ آگے جا کر ایک طرف کھڑی ہو گئی اور خبر پڑھنے لگی۔ اس کے لیے وہ خبر انتہائی حیران کن تھی کہ کمال کو اس کے آفس میں قتل کر دیا تھا اور مدثر نامی شخص کا بھی ذکر تھا جو اس سے ملاقات کے لیے گیا تھا اور کمال کو قتل کر کے وہ باہر نکل گیا تھا۔

مدثر کا نام آتے ہی ماریہ سوچ میں پڑ گئی تھی۔ اس نے یہ بھی سوچا کہ مثنی تو اپنے گھر میں قید تھی، رابطے کا بھی کوئی ذریعہ نہیں تھا...... پھر دونوں کیسے ایک دوسرے سے ملے اور کیسے مدثر نے کمال کو قتل کر دیا اور قتل سے پہلے مدثر نے اپنا ثبوت بھی چھوڑ دیا؟ ماریہ کے لیے بہت سی باتیں حیران کن تھیں۔

ماریہ جس مقصد کے لیے اپنے فلیٹ سے باہر نکلی تھی وہ بھول گئی اور اس نے اخبار تہہ کر کے اپنے ہینڈ بیگ میں رکھا اور ٹیکسی میں بیٹھ کر مثنی کے گھر پہنچ گئی۔

وہ ٹیکسی سے کچھ فاصلے پر ہی اتر گئی تھی۔ اس نے دیکھا کہ مثنی کے گھر کا گیٹ کھلا ہوا ہے اور کچھ لوگ باہر کھڑے ہیں۔ وہ خراماں خراماں چلتی مثنی کے بنگلے میں داخل ہو گئی۔

اندر بھی کچھ مرد اور خواتین موجود تھیں۔ ماریہ دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر اندر چلی گئی۔ مثنی ایک کرسی پر بیٹھی ہولے ہولے جھولتے ہوئے گہری سوچ میں مستغرق تھی۔

ایک دم اس نے ماریہ کو دیکھا تو وہ چونک کر سیدھی ہو گئی۔

"سمجھ میں نہیں آ رہا ہے میں افسوس کے لیے بیٹھوں یا تمہارے کان میں یہ کہوں کہ جو تم چاہتی تھیں وہ ہو گیا ہے اور تمہاری جان اس سے ہمیشہ کے لیے چھوٹ گئی اور اب تم آزاد ہو۔" ماریہ کا لہجہ دھیما تھا۔

مثنی اس کی طرف حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ "بیٹھ جاؤ۔"

ماریہ نے ایک کرسی کھینچ لی اور مثنی کے قریب ہو گئی۔ "تم تو گھر میں قید تھیں۔ پھر یہ آزادی کیسے ملی۔"

"ان باتوں کا وقت نہیں ہے۔ بہتر ہے تم میرے ساتھ ابھی ایسی کوئی بات مت کرو اور باہر جا کر تعزیت کے لیے آئی خواتین کے ساتھ بیٹھ جاؤ۔" مثنی نے اسے کہا۔

"مجھے کیا پتا تعزیت میں کیا کہتے ہیں۔" ماریہ مسکرائی۔

"میرے پاس بیٹھنا ہے تو چپ کر کے بیٹھی رہو۔" مثنی بولی۔

"میں یہاں بیٹھنے نہیں آئی ہوں۔ دراصل مجھے مدثر نے بھیجا ہے۔ وہ اپنے کام کا پیسا مانگ رہا ہے۔" ماریہ نے سرگوشی کی۔

"میں یہاں پیسا لے کر نہیں بیٹھی ہوں۔" مثنی کو غصہ آ گیا۔

"اب سب کچھ تمہارا ہے۔ مدثر مجھے مجبور کر رہا ہے کہ میں پیسا لے کر آؤں۔ اس نے جس سے کام کروایا ہے وہ اس کے پاس بیٹھا ہے۔ وہ ایسے ظالم لوگ ہوتے ہیں جو ایک منٹ کا بھروسا نہیں کرتے۔ مدثر کے کہنے پر بغیر کوئی ایڈوانس لیے انہوں نے تمہارا کام کر دیا ہے۔"

"ابھی میرے پاس کوئی پیسا نہیں ہے۔"

"تم کو معلوم ہے کہ کمال پیسا کہاں رکھتا تھا۔ سب کچھ تمہارے علم میں ہے اور تم ابھی کسی بہانے سے وہاں جاؤ اور پچاس لاکھ روپے پیک کر کے لے آؤ۔" ماریہ نے جلدی سے کہا۔

"پچاس لاکھ روپے......؟" مثنی نے اسے گھورا۔

"اس کام کے کوئی پچاس ہزار نہیں لیتا۔ تم نے خود کہا تھا جتنا پیسا لگے میں دے دوں گی۔"

"ہاں ٹھیک ہے لیکن ابھی موقع نہیں ہے۔ تم میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔" مثنی بولی۔

"میں تمہاری ہر بات کو سمجھ رہی ہوں لیکن مدثر کو کون سمجھائے؟ خیر میں مدثر کو بھی سمجھا لیتی ہوں اصل مسئلہ اس کا ہے جس نے یہ کام کیا ہے۔ ان کے سر میں دماغ نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی ہے۔" ماریہ نے کہا۔

مثنی نے اپنا پہلو بدلا۔ "ابھی دو دن رکنا پڑے گا جب تک اس گھر میں مہمان ہیں تب تک میں اس کمرے سے باہر نہیں نکل سکتی۔"

"ایک کام کرتے ہیں۔ تم مجھے بتاؤ پیسا کہاں ہے۔ میں وہاں سے پچاس لاکھ روپے نکال کر چلی جاتی ہوں۔"

"ابھی مجھے چابیاں بھی تلاش کرنا ہیں۔" مثنی جھنجلا گئی۔

ماریہ اس چکر میں تھی کہ وہ پیسا لے کر شہر سے رفوچکر ہو جائے۔ دیر کرنے کا مطلب یہ تھا کہ معاملہ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ "تم میری بات کو سمجھ کیوں نہیں رہی ہو۔"

"ماریہ ابھی تم جاؤ۔ مجھے رات تک کا وقت دو۔ میں رات کو چابیاں تلاش کر کے تم کو پیسے دے دوں گی۔" مثنی چاہتی تھی وہ کسی طرح چلی جائے۔ اسی وقت ملازمہ اندر آ گئی اور اس نے بتایا کہ باہر پولیس والے آئے ہیں۔

مثنی نے ماریہ کی طرف دیکھا تو ماریہ جلدی سے بولی۔ "میں رات کو آتی ہوں۔"

ماریہ نے پہلے تھوڑا سا دروازہ کھول کر باہر جھانکا تو مثنی نے کہا۔ "تم باہر پچھلے راستے کی طرف سے جانا۔" ماریہ نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر دوسرے راستے سے گیٹ کی طرف چلی گئی جبکہ پولیس والے ٹی وی لاؤنج میں کھڑے تھے۔

ماریہ کے جاتے ہی مثنی نے ملازمہ کو تاکید کی۔ "آمنہ

میری اجازت کے بغیر کوئی میرے کمرے میں نہ آئے۔ چاہے وہ ماریہ ہی کیوں نہ ہو...... انہیں اندر بھیج دو۔''

ملازمہ باہر چلی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد انسپکٹر نادر، ایک لیڈی اور ایک مرد اہلکار اندر آگئے۔ عینی اس جگہ سے اٹھ کر دوسری کرسی پر اپنا رخ دوسری طرف کر کے بیٹھ گئی تھی۔

انسپکٹر نادر اور اس کے دونوں اہلکار ایک طرف مؤدب ہو کر کھڑے ہو گئے۔ انسپکٹر نادر نے کہا۔ ''ہمیں کمال صاحب کی موت کا افسوس ہے اور میں معافی چاہتا ہوں صدمے کی اس گھڑی میں مجھے اپنے فرائض منصبی کے لیے آپ کا تھوڑا وقت لینا پڑ رہا ہے۔''

''کوئی بات نہیں...... آپ کو کچھ پوچھنا ہے تو آپ پوچھ سکتے ہیں۔'' عینی نے کہا۔

''ویسے تو ہماری تفتیش تیزی سے چل رہی ہے اور ہم جلدی ہی قاتل تک پہنچ جائیں گے...... آپ کے پاس اس لیے آئے ہیں شاید کوئی ایک بات قاتل تک پہنچنے میں مدد دے سکتی ہو۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''

''کمال صاحب نے آپ سے اپنی کسی پریشانی کا ذکر کیا ہو......؟'' انسپکٹر نادر نے سوال کیا۔

''نہیں...... کبھی نہیں۔''

''آپ نے محسوس کیا ہو کہ وہ چپ چپ رہنے لگے ہیں، ان کو کوئی پریشانی ہے اور فون کالز ایسی آرہی ہوں کہ وہ سننے کے لیے وہ کہیں باہر ہو جاتے ہوں اور فون کال سننے کے بعد وہ پریشان دکھائی دینے لگے ہوں۔''

''ایسا بالکل بھی نہیں تھا۔ ایسی فون کالز کا مطلب ہوتا ہے کہ کہیں سے ان کو دھمکی مل رہی ہو...... بالکل بھی نہیں وہ بہت خوش تھے۔''

''کاروباری رقابت بھی نہیں تھی......؟''

''وہ بہت خوش رہنے والے انسان تھے۔ چند ماہ قبل ہم دونوں میاں بیوی میں ان بن ہوئی تھی اور اس ان بن کی وجہ یہ تھی کہ وہ دوسری شادی کرنا چاہتے تھے۔'' عینی متانت سے بولی۔

''آپ ان کی دوسری شادی کے لیے راضی نہیں تھیں؟'' انسپکٹر نادر کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی تھی۔

''میں ان کے اس فیصلے کی مخالفت کر رہی تھی۔ ہماری ہنستی مسکراتی زندگی میں اچانک ایسی تلخی آگئی تھی کہ میرا سکون غارت ہو گیا تھا۔ وہ اپنی محبت میں مجھے نظر انداز کرنے لگے تھے اور ہم دونوں کے درمیان روز جھگڑا ہونے لگا تھا۔'' عینی بتاتے ہوئے چپ ہو گئی۔

''پھر کیا ہوا......؟''

''ایک دن میں نے اپنی امی کے پاس لندن جانے کا فیصلہ کر لیا اور جانے کی تیاری کرنے لگی۔ وہ ایسا نہیں چاہتے تھے۔ وہ مجھے روکنے لگے اور میں نے ایک شرط رکھ دی کہ آپ دوسری شادی نہیں کریں گے تو میں اسی گھر میں رہوں گی۔ جب کمال نے فیصلہ کیا اور میری خاطر...... میری محبت میں انہوں نے دوسری شادی کرنے کا ارادہ ترک

کر دیا۔ مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ دوسری شادی نہیں کریں گے اور جس کی محبت کے اسیر تھے، اس کو صاف کہہ دیا کہ وہ اس سے شادی نہیں کر سکتے۔ یہ انکار اس کے لیے بجلی بن کے گرا تھا اور وہ ایک دن اس گھر میں کمال سے لڑنے کے لیے آ گئی تھی۔ مجھے بھی اس نے سنگین دھمکیاں دی تھیں۔ کمال کو ڈر ہوا کہ کہیں ان کی غیر موجودگی میں وہ مجھے نقصان نہ پہنچا دے اس لیے وہ دو دن سے باہر گیٹ کو تالا لگا کر جاتے تھے کہ کہیں میں غلطی سے گیٹ نہ کھول دوں اور وہ مجھے نقصان پہنچا دے۔'' عینی نے بتایا۔

وہ تینوں عینی کی بات کو بغور سن رہے تھے۔ عینی پھر بولی۔ ''آج بھی انہوں نے باہر سے گیٹ کو تالا لگایا تھا اور نظامی صاحب نے آ کر گیٹ لاک کی نئی چابی بنوا کر گیٹ کھولا تھا۔ اس بات کی آپ نظامی صاحب سے تصدیق بھی کر سکتے ہیں اور گیٹ کے لاک کی نئی ڈپلی کیٹ چابی بھی دیکھ سکتے ہیں۔''

''اس کا مطلب تھا کہ آپ کی زندگی کو خطرہ پیدا ہو گیا تھا......'' انسپکٹر نادر بولا تو عینی بول پڑی۔

''اس لڑکی کی طرف سے میری جان کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ وہ میرے شوہر کی محبت کے جنون میں نہیں تھی...... اسے میرے شوہر کی دولت نظر آ رہی تھی۔'' عینی نے کہا۔

''وہ لڑکی کون تھی......؟'' انسپکٹر نادر نے پوچھا۔

عینی نے کچھ توقف کے بعد کہا۔ ''وہ کوئی اور نہیں میری بہترین دوست تھی اور اس کا اس گھر میں آنا جانا تھا اور اس آنے جانے میں اس نے کمال کو اپنا اسیر کر لیا تھا...... اس کا نام ماریہ ہے۔''

ماریہ کا نام سنتے ہی انسپکٹر نادر چونکا۔ ''ماریہ......؟''

''کیا آپ جانتے ہیں......؟'' عینی نے پوچھا۔

''نہیں......'' انسپکٹر نادر نے جلدی سے اپنی گردن نفی میں ہلائی۔ ''ماریہ کا پتا بتا سکتی ہیں آپ......؟''

عینی نے اس کے فلیٹ کا پتا اور اس کا موبائل نمبر بھی لکھوا دیا۔ انسپکٹر نادر نے پتا سنا تو وہ وہی تھا جو اسے مدثر نے بتایا تھا۔

''آپ کا شکریہ کہ آپ نے اس صدمے کی حالت میں ہمیں وقت دیا اور اس کیس میں آگے بڑھنے کے لیے ہماری مدد بھی کی۔''

''مجھے شک ہے یہ ماریہ کا کام ہے۔ باقی میں اور کچھ کہہ نہیں سکتی۔ آپ اسے بھی شامل تفتیش کر سکتے ہیں۔'' عینی نے کہہ کر قریب رکھے ٹشو کے ڈبے سے کچھ ٹشو کھینچے لیے۔ انسپکٹر نادر کو لگا کہ وہ رو رہی ہے۔ اس لیے وہ اجازت لے کر باہر چلا گیا۔ ان کے جاتے ہی عینی نے اپنی ملازمہ کو اندر بلا لیا اور تاکید کی ماریہ اس کے گھر کا گیٹ عبور نہ کرے۔ گیٹ پر ملازمہ کا شوہر چوکیدار بھی آ گیا تھا۔ اس نے اپنے شوہر کو تاکید کر دی۔

عینی پھر...... کرسی پر بیٹھ گئی اور ہولے ہولے جھولتے ہوئے وہ زیر لب مسکرا دی۔

☆☆☆

ماریہ سیدھی اپنے فلیٹ میں پہنچی اور اس نے ابھی اپنے فلیٹ کا دروازہ کھولا ہی تھا کہ پیچھے سے کسی نے اس کو اندر کی طرف دھکا دیا اور ماریہ سیدھی اندر جا گری۔ دھکا اتنا اچانک تھا کہ وہ کچھ سمجھ ہی نہیں سکی۔ وہ نیچے گرتے ہی سیدھی ہوئی اور دروازے کی طرف دیکھا تو ایک آدمی کھڑا تھا۔

ماریہ فوراً کھڑی ہو گئی۔ ''کون ہو تم...... اور یہ کیا بدتمیزی ہے......؟'' وہ غصے سے چلائی۔

اس شخص نے دو قدم آگے بڑھ کر اپنے ہونٹوں پر شہادت کی انگلی رکھ کر اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔

''ماریہ تم ہی ہو......؟'' اس نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

''تم کون ہو......؟''

''میرے سوال کا جواب دو۔ ماریہ تم ہی ہو نا؟'' اس نے پھر اپنا سوال دہرایا۔ اس کا چہرہ سپاٹ اور نگاہیں ماریہ پر جمی ہوئی تھیں۔

''میرے فلیٹ سے باہر نکلو......'' وہ چلائی۔

اس شخص پر اس کی بات کا کوئی اثر نہیں ہوا اور اس نے اپنے موبائل فون سے کال کرنے کے بعد بتایا۔ ''میں ماریہ کے فلیٹ میں ہوں اور وہ میرے سامنے ہے۔''

''ٹھیک ہے...... تم اکیلے ہو......؟'' دوسری طرف سے انسپکٹر نادر کی آواز آئی۔

''جی......''

''میں گاڑی بھیج رہا ہوں۔ انتظار کرو۔ گاڑی آ جائے تو اسے اٹھا کر لے آنا۔'' دوسری طرف سے کہتے ہی کال منقطع ہو گئی۔

''تم نے کس کو فون کیا ہے......؟'' ماریہ ٹھٹک گئی تھی۔

''چپ رہو اور اس کرسی پر بیٹھ جاؤ۔''

''تم کون ہو......''

''مجھے مجبور مت کرو کہ میں تمہارے منہ پر ایسا تھپڑ رسید کروں کہ تمہارا چہرہ بگڑ جائے۔'' وہ دھیمے مگر سفاک لہجے میں بولا۔

ماریہ کے جسم میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ ”تم کو شاید غلط فہمی ہوئی ہے۔“

”مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی۔ تم چپ چاپ اس کرسی پر بیٹھ جاؤ اور اس جگہ سے کوئی حرکت مت کرنا۔“

ماریہ سوچ رہی تھی کہ اب وہ کیا کرے۔ یہ کس کا آدمی ہے؟ اسے مدثر نے بھیجا ہے، یا کوئی اور معاملہ ہے۔

”ٹھیک ہے میں وہاں بیٹھ جاتی ہوں۔“ ماریہ کرسی کی طرف بڑھی۔

”تمہارے لیے یہی بہتر ہے۔“ وہ بھی اس کی طرف بڑھا۔ ماریہ کرسی کے پاس گئی اور اس کی نگاہیں دائیں بائیں گھوم رہی تھیں۔ جیسے ہی وہ کرسی کے پاس پہنچی وہاں قریب ہی پیتل کا گلدان پڑا تھا۔ ماریہ نے برق رفتاری سے وہ گلدان اٹھایا اور گھوم کر اس شخص کے منہ پر دے مارا۔

اس شخص پر حملہ اتنا اچانک اور اس کے لیے غیر متوقع تھا کہ وہ اپنے آپ کو بچا نہیں سکا اور کراہ کر اپنے چہرے پر ہاتھ رکھ کر نیچے بیٹھ گیا۔ ماریہ دروازے کی طرف بھاگی تو اس نے ماریہ کی ٹانگ پکڑ لی۔ ماریہ نیچے جا گری، لیکن اس نے گرتے ہی اپنے آپ کو سنبھالا اور دوسری ٹانگ اس کے منہ پر جما دی۔ اس کا چہرہ پہلے ہی زخمی ہو چکا تھا اس چوٹ نے اسے مزید کراہنے پر مجبور کر دیا اور ماریہ کی ٹانگ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔

ماریہ اٹھی اور باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔ وہ پہلے لفٹ کی طرف گئی اور اس کے بعد سیڑھیاں پھلانگ کر نیچے اترنے لگی۔

جس وقت ماریہ بھاگتی ہوئی اس بلڈنگ سے باہر نکلی اس سے کچھ ہی دور ایک جیپ رکی اور اندر سے تین آدمی باہر نکل کر بلڈنگ کے اندر چلے گئے۔

ماریہ بھاگتی ہوئی دوسری طرف چلی گئی۔ شام کے سائے بھی گہرے ہو رہے تھے۔ مگی کے پاس جانے کا سوچا تو اس نے فی الحال اس خیال کو رد کر دیا۔ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ کل مگی سے ملے گی تاکہ وہ فارغ ہو کر چابیاں تلاش کرلے اور مجھے چھپا دینے میں اسے کسی حیل و حجت کا سہارا نہ لینا پڑے۔

وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر اپنی ایک دوست کی طرف چلی گئی۔ وہ اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ رہتی تھی۔ ماریہ نے اس کے پاس جا کر اپنی ایسی مجبوری بیان کی کہ اس کی دوست اسے ایک رات اپنے ہاں رکھنے کے لیے راضی ہو گئی۔

☆☆☆

انسپکٹر نادر کو لگ رہا تھا اس کا دماغ پھٹ جائے گا۔ کمال کا قتل اس کے لیے سوہان روح بن گیا تھا اور اس پر قاتل کو گرفتار کرنے کا پریشر بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ بڑے کاروباری لوگوں کی میٹنگ نے اس کی ناک میں دم کر دیا تھا۔ کمال کا ایک بزنس مین دوست سیاست میں بھی قدم رکھتا تھا۔ اس نے کیمرے کے سامنے آنے کے چکر میں پولیس پر زور دیا ہوا تھا کہ پولیس کسی غفلت کا مظاہرہ نہ کرتے ہوئے قاتل کو گرفتار کرے۔

انسپکٹر نادر کو افسران بالا کی طرف سے مسلسل دباؤ کا سامنا تھا اور جب اسے اس کے آدمی نے فون کرکے یہ بتایا کہ ماریہ ان کے آدمی کو زخمی کرکے فرار ہو گئی ہے تو انسپکٹر نادر کا بلڈ پریشر اور بڑھ گیا۔ انسپکٹر نادر اپنے دوست مدثر کو بچانا چاہتا تھا۔ وہ اس کے کئی ناجائز کاموں کو سرانجام دیتا تھا۔

وہ اس وقت اپنے کمرے میں بیٹھا کمال کی فائل کھولے ہوئے تھا۔

وہ اس بات پر سوچ رہا تھا کہ مدثر کا نام پتا ضرور استعمال ہوا ہے لیکن اس نے قتل نہیں کیا ہے۔ چوکیدار کا بیان بھی اس کے سامنے تھا۔ اس نے مدثر کے ساتھ کسی دوسرے شخص کو نہیں دیکھا تھا۔ جبکہ رابی کا بیان تھا کہ اس کے ساتھ ایک اور بھی لڑکا تھا۔ اس لڑکے کی تلاش بھی جاری تھی لیکن وہ بھی کہیں نہیں مل رہا تھا۔

انسپکٹر نادر ایک کاغذ پر کچھ لکھ بھی رہا تھا اور ساتھ وہ لکیریں بھی کھینچ رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا مدثر کے خلاف سازش ہوئی تھی۔ اور مدثر نے اسے بتایا تھا کہ ماریہ نے بہانے سے اسے اپنے فلیٹ میں بلایا اور اس کا پرس غائب کرا کے اس کا نام پتا استعمال کیا تھا۔ مگی کے بیان کے مطابق اس کا شوہر کمال دوسری شادی ماریہ کے ساتھ کرنا چاہتا تھا۔ ماریہ نے جب کمال کے منہ سے انکار سنا تو وہ آگ بگولا ہوئی اور اس نے یہ سارا منصوبہ تیار کیا اور اس نے اپنے اس منصوبے میں رابی کو بھی شامل کرلیا...... رابی یقیناً اس کے ساتھ ملی ہوگی۔ ماریہ کے فرار کی وجہ بھی یہ ہے کہ وہ قانون سے بھاگنا چاہتی ہے۔

”کیوں نا رابی کو الجھا کر اپنے دوست کو بچا لیا جائے؟“ انسپکٹر نادر نے سوچتے ہوئے اپنے آپ سے کہا۔

انسپکٹر نادر نے اسی وقت گاڑی تیار کرنے کے لیے کہا اور وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی گاڑی کا رخ اپنے آدمیوں کے ساتھ رابی کے فلیٹ کی طرف تھا۔

☆☆☆

رابی کو رہ رہ کر تیمور پر غصہ آرہا تھا جس نے اس کو دھوکا دیا اور ایسے گم ہوا جیسے گدھے کے سر سے سینگ...... اس کا موبائل فون مسلسل بند جارہا تھا۔

رابی سوچ رہی تھی کہ تیمور اتنی جلدی شہر چھوڑ کر نہیں بھاگ سکتا۔ اس کے پاس ایک بڑی رقم تھی اور وہ اسے اپنے ساتھ لیے نہیں پھر سکتا تھا۔ پہلے اس رقم کو کسی محفوظ جگہ پر پہنچانے کے بعد ہی وہ شہر سے نکل سکتا تھا۔ ایسا تیمور نے اسے کہا بھی تھا۔

"کہیں وہ اس فلیٹ میں واپس تو نہیں آگیا......؟" اس خیال نے رابی کو چونکا دیا۔ وہ تیزی سے باہر نکلی اور سامنے والے فلیٹ کا دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔ اندر اندھیرا تھا۔ اس نے موبائل فون کی لائٹ روشن کی اور ایک ایک کمرا دیکھنے لگی۔ اس بار بھی فلیٹ میں کوئی نہیں تھا۔ اس کی امید ٹوٹ گئی۔

رابی بغیر آہٹ پیدا کیے دروازے کے پاس گئی اور جوں ہی اس نے دروازے میں لگے شیشے سے باہر دیکھا تو وہ ڈر گئی۔

اس کے فلیٹ کے اندر کوئی آدمی جارہا تھا۔ وہ اسی طرح دروازے کے ساتھ چپک گئی تھی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔

وہ بیس منٹ تک اسی حالت میں اسی جگہ کھڑی رہی۔ پھر اس کے فلیٹ کا دروازہ کھلا اور انسپکٹر نادر باہر نکلا تو اس کے پیچھے دو آدمی بھی باہر آگئے۔ انسپکٹر نادر نے دائیں بائیں دیکھا۔

"اس کے فلیٹ کا دروازہ کھلا ہے اور وہ غائب ہے۔" انسپکٹر نادر بولا۔

"مارکیٹ گئی ہوگی۔" ایک نے خیال ظاہر کیا۔

"کچھ دیر نیچے انتظار کرتے ہیں۔" انسپکٹر نادر نے کہا اور وہ تینوں چلے گئے۔ رابی کی سانس رک رہی تھی۔ اس نے سوچا اب اس کا اپنے فلیٹ میں رہنا خطرے کا سبب ہوسکتا ہے کیونکہ وہ دوبارہ آسکتے تھے۔ اسی اثنا میں اس نے فیصلہ کیا اور تیزی سے باہر نکل کر اپنے فلیٹ میں گئی۔ اپنا بیگ نکالا اور اس میں اپنا سامان ٹھونسنے لگی۔ جس چھوٹے بیگ میں اس نے پیسے رکھے تھے وہ بھی اس نے بیگ میں رکھ لیا تھا۔

اپنا سارا سامان لینے کے بعد اس نے ایک نظر ڈالی اور دروازے کے پاس جاکر تھوڑا سا دروازہ کھولا اور باہر جھانکا۔ ساتھ ہی وہ برق رفتاری سے باہر نکلی اور سامنے والے فلیٹ میں چلی گئی۔ اس نے دروازہ بند کردیا تھا۔ اس سارے عمل میں اس کے دل کی دھڑکن بے ترتیب رہی تھی۔

رابی کو لگ رہا تھا وہ مشکل میں آگئی ہے۔ پولیس اس کے پاس شاید اس لیے آئی تھی کہ وہ اس سے مزید کچھ جاننا چاہتی تھی۔ رابی کو لگا جیسے اس نے غصے اور جلد بازی میں تیمور کے بارے میں پولیس کو اطلاع دے کر غلطی کردی تھی۔ اب اس کا اس جگہ رہنا مناسب نہیں ہوگا اور اگر وہ نوکری کے ساتھ شہر بھی چھوڑ کر چلی جاتی ہے تو پولیس کی نظر میں وہ مشکوک ہوجائے گی۔

رابی سوچتی رہی اور پریشانی کے عالم میں اپنے آپ کو بچانے کا حل نکالتی رہی لیکن اسے کوئی راستہ سجھائی نہ دیا۔

وہ رات رابی کے لیے بہت بھاری تھی۔ وہ ایک پل کے لیے بھی نہیں سوئی تھی۔ بار بار اٹھ کر دروازے کے چھوٹے سے شیشے سے دیکھ کر واپس آجاتی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ انسپکٹر نادر نے اپنا ایک اہلکار دوبارہ بھی بھیجا تھا اور وہ فلیٹ کے اندر جھانک کر گیا تھا۔ اس کے بعد انسپکٹر نادر اپنے ساتھیوں کو واپس لے گیا تھا۔

رابی نے جیسے تیسے رات کاٹی اور بھاگ کر اپنے فلیٹ میں جاتے ہی اندر سے دروازہ مقفل کردیا۔ اس نے اپنا بیگ ایک طرف رکھا اور سوچنے لگی اب کیا کرے۔ اچانک اس کے موبائل فون پر سرسراہٹ ہونے لگی۔ اس نے چونک کر دیکھا تو نظامی کی کال تھی۔

"ہیلو سر......" رابی نے پچھلے کمرے میں جاکر آہستگی سے کہا۔

"تم ایسا کرو اپنا سامان پیک کرکے آفس پہنچ جاؤ۔" نظامی کی آواز آئی۔

"سامان پیک کرکے کیوں سر......؟" رابی نے متحیر انداز میں پوچھا۔

"تم یہاں آجاؤ میں بتاتا ہوں۔" نظامی نے اتنا کہنے کے بعد فون کال کاٹ دی۔

حیرت کے منجدھار میں الجھی ہوئی رابی اپنا بیگ اٹھا کر ڈرتی اور متوحش نظروں سے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے بلڈنگ سے باہر نکلی اور تیزی سے ایک رکشے تک پہنچی اور اسے پتا بتاتے ہوئے بیٹھ گئی۔

رابی آفس کی عمارت میں پہنچی تو وہ اور بھی ڈری ہوئی تھی۔ آفس کا ایک حصہ ابھی تک سیل تھا۔ اسٹاف کے لوگ موجود تھے اور نظامی اپنی سیٹ پر براجمان تھا۔

"تم فلیٹ کی چابی لائی ہو......؟" نظامی نے رابی کو دیکھتے ہی پوچھا۔

رابی آگے بڑھی اور ہاتھ میں پکڑی فلیٹ کی چابی نظامی کے سامنے میز پر رکھ دی۔ نظامی نے چابی اٹھا کر اپنی میز کی دراز میں رکھی اور پھر ایک لفافہ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔
"یہ کیا ہے سر......؟"
"یہ تمہاری سیلری ہے۔"
"اتنی جلدی سیلری مل گئی......؟"
"دراصل میم کا حکم ہے۔ پولیس تم سے اس کیس کے بارے میں تفتیش کرنا چاہتی ہے۔ انسپکٹر نادر نے مجھ سے رابطہ کیا تھا۔ ان کے دماغ میں کچھ تحفظات ہیں۔ میم سے مشورہ کرنے کے بعد انہوں نے مجھے حکم دیا کہ پہلے آپ پولیس کی تفتیش مکمل کرا دیں اور اس کے بعد ہم فیصلہ کریں گے آپ کو نوکری پر رکھنا ہے یا نہیں......" نظامی نے بتایا۔
نظامی کی بات سن کر رابی دم بخود اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ اس کے لیے یہ بات اچھی تھی کہ کمال ایجنسی اسے فارغ کر رہی تھی اور وہ واپس اپنے شہر جا سکتی تھی لیکن پولیس کی تفتیش کا سن کر وہ بے جان ہو گئی تھی۔
رابی نے بند لفافہ پکڑا اور اسے اپنے بیگ میں رکھنے کے بعد بولی۔ "اوکے سر میں چلتی ہوں۔"
جونہی رابی جانے کے لیے مڑی وہ ٹھٹک کر رک گئی۔ اس کے عقب میں انسپکٹر نادر کھڑا تھا۔ رابی کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔ انسپکٹر نادر اس کے پاس آیا اور اس نے ایک کرسی کھینچ کر سیدھی کی اور رابی کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ انسپکٹر نادر اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔
"اس کیس نے میری نیندیں حرام کر دی ہیں۔ مجھ پر اتنا پریشر ہے کہ مجھے لگ رہا ہے میرا دماغ پھٹ جائے گا۔ تم کہتی ہو مدثر جب ملاقات کے لیے آیا تھا وہ اکیلا نہیں تھا اور تم نے دوسرے آدمی کا حلیہ بھی بتایا تھا۔ جس طرح ہم اس کی تلاش کر رہے ہیں ہر اہم جگہ ہماری پولیس کھڑی ہے۔ شہر سے آنے اور جانے والے راستوں پر اس کا تصویری خاکہ لیے ہمارے لوگ موجود ہیں اور وہ ہے کہ جیسے کوئی جن ہو کوئی بھوت ہو ہماری تلاش کے باوجود وہ کہیں دکھائی نہیں دیا۔ چوکیدار کہتا ہے کہ وہ آدمی اکیلا ہی آیا تھا اس کے ساتھ کوئی نہیں تھا...... تم مجھے بتاؤ گی اصل معاملہ کیا ہے......؟" انسپکٹر نادر کا لہجہ درشت تھا اور اس کی آنکھیں رابی پر جمی ہوئی تھیں۔
رابی نے اپنی گھبراہٹ پر قابو رکھا اور تحمل سے جواب دیا۔ "میں نے سچ کہا ہے...... چوکیدار اس وقت موجود نہیں تھا۔ وہ کئی بار اپنی سیٹ سے اٹھ کر دائیں بائیں آتا جاتا رہتا ہے...... میرے سامنے اسے کئی بار کمال صاحب سے ڈانٹ بھی پڑی تھی...... ایک بار نظامی سر کے سامنے بھی اسے ڈانٹا تھا...... آپ ان سے پوچھ سکتے ہیں......"
انسپکٹر نادر نے اپنی سوالیہ نگاہیں نظامی کی طرف پھیر دیں۔ نظامی بولا۔ "ہاں یہ اس کی عادت ہے......"
اس جواب نے انسپکٹر نادر کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔ چوکیدار کے جس بیان کو بنیاد بنا کر وہ رابی کو اپنے چنگل میں لا کر اپنے دوست مدثر پر لگا الزام مٹانا چاہتا تھا وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔
"تم ماریہ کو جانتی ہو......؟" انسپکٹر نادر نے سوال کیا۔
"ماریہ کون......؟" رابی نے جواب دینے کے بجائے الٹا سوال کر دیا۔
"کوئی ماریہ نام کی لڑکی یہاں کمال صاحب سے ملنے آئی تھی......؟" نادر نے پوچھا۔
"یہاں ماریہ نام کی لڑکی کبھی ان سے ملنے نہیں آئی۔" رابی نے جواب دیا۔ "میری ڈائری میں آپ کو پچھلا سارا ریکارڈ مل جائے گا۔"
انسپکٹر نادر اٹھا اور وہاں سے چلا گیا۔
رابی اندر سے ڈری اور سہمی ہوئی تھی۔ انسپکٹر نادر کے جاتے ہی اس نے اپنا بیگ اٹھایا اور کہا۔ "سر اب میں یہ نوکری چھوڑ کر جانا چاہتی ہوں۔"
"میرا خیال ہے کہ تم نے انسپکٹر نادر کے سوالوں کے تسلی بخش جواب دے دیے ہیں...... تم کو جانے کی ضرورت نہیں ہے۔"
"اب میں نہیں رک سکتی...... مجھے چند دن آرام کی ضرورت ہے۔ میں واپس اپنے شہر جانا چاہتی ہوں اور پھر واپس آ جاؤں گی۔" رابی کو جانے کا جواز مل گیا تھا۔
"جیسی تمہاری مرضی۔" نظامی نے کندھے اچکائے۔
رابی پہلے ہی ایسا چاہتی تھی اور وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔ رابی اس عمارت سے باہر نکلی اور رکشے میں سوار ہو کر ریلوے اسٹیشن کی طرف چلی گئی۔ اسے اس بات کا افسوس تھا کہ اس نے پیسوں کے لالچ میں تیمور کا ساتھ دیا اور تیمور نے اس کی تجوری سے پیسے بھی نکالے اور اسے قتل کر کے فرار ہو گیا۔
رکشے میں سوار رابی کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ وہ اپنے کیے پر شرمندہ تھی۔ جب وہ ریلوے اسٹیشن پہنچی تو اس نے چلتے ہوئے وہ پیسے نکالے جو ایک شاپر میں لپیٹے ہوئے تھے اور وہ تیمور نے اسے دیے تھے۔ اس نے پیسے...... ایک غریب اخبار فروش کے ان اخبارات پر رکھ دیے جو اس نے اپنے ایک ہاتھ پر تہ در تہ رکھے ہوئے تھے۔

رابی وہ پیسے رکھ کر تیزی سے چلی گئی تھی اور مسافروں کے بیچ میں گم ہو گئی جبکہ وہ اخبار فروش حیرت سے اس شاپر کو دیکھتا رہا اور پھر ایک طرف چلا گیا تاکہ وہ دیکھے اس میں کیا ہے؟

رابی نے ٹکٹ لیا اور ایک طرف چلتے ہوئے اس نے موبائل فون سے ایک نمبر تلاش کر کے کال کی اور کان سے لگا لیا۔ دوسری طرف سے ایک مردانہ آواز آئی تو اس نے کچھ توقف کے بعد کہا۔ ”میں رابی بول رہی ہوں۔“

”رابی..... رابی تم..... ؟ کہاں ہو..... مجھے بتاؤ۔“ دوسری طرف سے ایک پرجوش سی آواز سنائی دی۔

”میں واپس آ رہی ہوں۔“ رابی نے بتایا۔

”کب واپس آ رہی ہو..... ؟“ اس بار اس کی آواز میں جوش بھر گیا تھا۔

”ابھی ٹرین آنے والی ہے..... تم مجھے اسٹیشن سے لینے آؤ گے..... ؟“ رابی نے پوچھا۔

”میں تمہارے انتظار میں ہی تو ہوں۔“ دوسری طرف سے سن کر رابی مسکرا دی۔

☆☆☆

ماریہ کو ایک رات اپنی دوست کے گھر رہنے کی اجازت ملی تھی اور وہ اس سے زیادہ دن رہنے کا ارادہ بھی نہیں رکھتی تھی۔ ناشتا کرنے کے بعد وہ اپنی دوست سے اجازت لے کر چلی گئی۔

ماریہ کا ایک ہی مقصد تھا وہ عینی سے کسی طرح سے پیسے نکلوا کر کہیں روپوش ہو جائے۔ دن کے ساڑھے بارہ بج گئے تھے اور اس نے چلتے ہوئے اپنے موبائل فون سے عینی کو کال کی۔

دوسری طرف سے عینی کی آواز آئی۔ ”بولو ماریہ۔“

”میں تمہاری طرف آ رہی ہوں۔“ ماریہ نے متانت سے کہا۔

”تم کو پیسے چاہئیں..... ؟“ عینی نے پوچھا۔

”پیسے مجھے نہیں..... مدثر مانگ رہا ہے۔ وہ خود تمہاری طرف آنا چاہتا ہے اور میں چاہتی ہوں کہ تم مجھے پیسے دو تاکہ میں اسے دے کر معاملہ ختم کروں۔“ ماریہ نے کہا۔

”مدثر مجھ سے نہ ہی ملے تو اچھا ہے۔ تم ایسا کرو میرے پاس آ جاؤ میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔“ عینی نے کہہ کر فون بند کیا اور اپنی ملازمہ کو بلا کر ہدایت کی۔

”میری طرف ماریہ آ رہی ہے۔ جونہی وہ آئے تم اسے کمرے میں لے جا کر بٹھانا اور باہر سے دروازہ لاک کر دینا.....“

”جی بہتر۔“ ملازمہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

عینی نے ملازمہ کو ہدایت دینے کے بعد اسے کمرے سے باہر جانے کا کہا اور انسپکٹر نادر کا دیا ہوا فون نمبر نکال کر ایک طرف رکھ دیا۔

ماریہ نے جب سنا کہ عینی اسے اپنے پاس بلانے کے لیے راضی ہو گئی ہے تو اس کی چال میں تیزی آ گئی تھی۔ اس نے ٹیکسی روکی اور ابھی وہ..... عینی کی طرف جانے کا کہنے ہی والی تھی کہ اس نے ایک لمحہ توقف کے بعد اپنے فلیٹ کا پتا بتا دیا۔

ماریہ نے اچانک ارادہ بدل لیا تھا اور ایک بار دیکھنا چاہتی تھی کہ اس کے فلیٹ میں کوئی ہے تو نہیں۔ ماریہ نے وہ فلیٹ مدثر کے ساتھ مل کر خریدا تھا۔ بلکہ اس فلیٹ کی خریداری میں مدثر کا ہی زیادہ پیسا تھا۔

ماریہ نے ٹیکسی اپنی بلڈنگ سے کچھ پیچھے ہی رکوا لی تھی۔ اس نے کرایہ ادا کیا اور ٹیکسی سے باہر نکل کر پیدل چلنے لگی۔ اس کی نگاہیں دائیں بائیں گھوم رہی تھیں۔

وہ جلدی سے لفٹ میں چلی گئی۔ اوپر پہنچ کر اس نے پہلے دائیں بائیں دیکھ کر تسلی کی اور چلتی ہوئی اپنے فلیٹ کے دروازے تک پہنچی اور اپنا ہاتھ ہینڈل پر رکھ کر آہستہ سے گھمایا تو دروازہ کھل گیا۔

دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے اندر جھانکا اور پھر جیسے دہل کر رہ گئی۔ اس کے فلیٹ کا برا حال تھا۔ ہر چیز الٹ پلٹ تھی۔ اس نے سارا فلیٹ دیکھا اسے کوئی چیز اپنی جگہ دکھائی نہیں دی۔ کچھ قیمتی چیزیں بھی غائب تھیں۔ اس کا مطلب تھا جو لوگ آئے تھے جو ہاتھ آیا وہ اپنے ساتھ لے گئے تھے، یا پھر یہ کسی اور کا کام تھا۔

ماریہ کو یہ تسلی ہو گئی تھی کہ اندر کوئی نہیں ہے۔ اس نے دروازہ بند کر کے اسے مقفل کیا اور کھڑکیوں کے آگے پردے کر دیے۔ اسے اپنے فلیٹ کی حالت دیکھ کر دکھ ہوا تھا۔

اسی اثنا میں اس کا موبائل فون بجنے لگا۔ اس نے دیکھا کوئی نامعلوم نمبر تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے فون کان سے لگا لیا تو دوسری طرف سے مدثر کی آواز آئی۔

”میں مدثر بول رہا ہوں..... ماریہ تم مجھے پلیز ابھی ملو۔“

”تم مدثر بول رہے ہو؟ تم کہاں چلے گئے تھے۔ تمہارا نمبر بھی بند تھا۔“ ماریہ نے جلدی سے پوچھا۔

”میں ایک بہت ضروری کام میں مصروف تھا۔ تم مجھ سے ملو۔ تمہارا مجھ سے ملنا بہت ضروری ہے۔ ویسے تم اس وقت کہاں ہو۔ کہو تو میں تمہاری طرف آ جاتا ہوں۔“ مدثر

نے کہا۔

''میں اپنی ایک دوست کی طرف ہوں۔'' ماریہ نے جھوٹ بولا۔

''تم اپنے فلیٹ میں نہیں ہو......؟''

''میں اپنی دوست کی طرف ہوں۔ کیا تم میرے فلیٹ کے باہر ہو......؟'' ماریہ نے جاننے کے لیے سوال کیا۔

''میں اس وقت کہیں اور ہوں۔ تم مجھ سے ملو...... میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔'' مدثر نے تاکید کی۔

''میں کہاں آجاؤں......؟'' ماریہ نے پوچھا۔

''تم ایسا کرو مجھے بتاؤ تم کہاں ہو۔ میں اپنے دوست کو بھیجتا ہوں وہ تم کو لے جاتا ہے۔ تم اکیلی مت آنا۔ تمہاری جان کو خطرہ ہے۔'' مدثر نے کہا۔

''میری جان کو کیوں خطرہ ہے۔ میں نے کیا کیا ہے؟'' ماریہ نے جلدی سے پوچھا۔

''تمہارے پیچھے پولیس ہے اور وہ خبیث نادر تمہارے پیچھے ہے۔ ساری باتیں اب فون پر نہیں ہو سکتی ہیں، مجھے بتاؤ کہاں ہو میرا دوست تم کو لے جائے گا۔'' مدثر نے کہا۔

ماریہ نے ایک لمحہ سوچا۔ ''یہ تمہارا نمبر ہے جس سے تم کال کر رہے ہو......؟''

''ہاں یہ میرا نمبر ہے۔''

''مجھے دس منٹ دو۔ میں اسی نمبر پر تم کو کال کرتی ہوں۔'' ماریہ نے کہہ کر کال کاٹ دی اور سوچنے لگی کہ مدثر کی اس بات کے پیچھے اس سے ہمدردی ہے یا کوئی چال...... وہ اس بات کو نہیں سمجھ رہی تھی لیکن جس وقت مدثر اسے کال کر رہا تھا اس کے ساتھ ہی انسپکٹر نادر بھی بیٹھا تھا۔ اسی کے کہنے پر مدثر نے ماریہ کو کال کی تھی تاکہ ماریہ اس کے پاس آجائے۔

انسپکٹر نادر اپنے دوست کو بچانے کے لیے پھندا ہاتھ میں لیے پھر رہا تھا اور اس کی کوشش تھی کہ وہ پھندا کسی کے گلے میں بھی پورا آجائے اور افسران بالا کی طرف سے وہ جس تناؤ کا شکار ہے وہ ختم ہو جائے اور اس کا دوست بچ جائے۔

مدثر اور انسپکٹر نادر نے تو جال پھینک دیا تھا جبکہ ماریہ اس جال میں پھنسنے سے قبل بیٹھی سوچ رہی تھی۔

اس نے یہی مناسب سمجھا کہ وہ اسی وقت جاکر ملی سے ملے اور اس سے جتنے بھی اور کیسے بھی پیسے نکلوا کر اپنا راستہ لے۔

ماریہ نے اپنا بیگ گلے میں ڈالا اور موبائل فون کا سوئچ فی الحال بند کرنے کے بعد...... فلیٹ کا دروازہ کھولا ہی تھا کہ پستول کی نال اس کے ماتھے کے ساتھ لگ گئی اور وہ ٹھٹک کر رک گئی۔

اس کے سامنے وہی آدمی کھڑا تھا جس کے چہرے پر اس نے گلدان مار کر اسے زخمی کیا تھا۔ اس نے ماریہ پر پستول تان رکھا تھا۔ وہ ماریہ کو الٹے قدم اندر لے گیا اور عقب سے دروازہ بند کر دیا۔

''میرا چہرہ دیکھ رہی ہو؟ میرے اچھے خاصے چہرے کو تم نے بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ تم مجھے زخمی کر کے بھاگ گئیں اور انسپکٹر صاحب نے میری ایسی بے عزتی کی کہ میں نے بھی قسم کھائی تھی کہ تم کو ڈھونڈ کے ہی سانس لوں گا۔ جب تم اس بلڈنگ میں داخل ہوئی تھیں تو میں سامنے ہی بیٹھا تھا۔ جانتی ہو میں کب سے اس جگہ ٹہل رہا ہوں؟ کئی گھنٹے ہو گئے ہیں مجھے۔ مجھے اپنی بے عزتی نہیں بھول رہی ہے۔'' اس نے کہا۔

اس کا پستول ماریہ کی طرف تھا اور ماریہ اسے دیکھے جا رہی تھی۔ جونہی وہ چپ ہوا ماریہ نے پوچھا۔

''تم لوگ مجھ سے کیا چاہتے ہو؟ میں نے ایسا کیا کیا ہے کہ تم لوگ میرے پیچھے ہو۔''

''اس سوال کا جواب تو انسپکٹر نادر صاحب ہی دے سکتے ہیں۔ میرا کام یہ ہے کہ میں تم کو ان کے حوالے کر دوں۔''

''دیکھو میں نے کچھ نہیں کیا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ تم سب میرے پیچھے کیوں ہو۔''

''میں کچھ نہیں جانتا۔ تم منہ دوسری طرف کر لو اور اپنے ہاتھ پیچھے باندھ لو۔ کوئی ایسی حرکت نہ کرنا ورنہ میں تمہیں گولی مار دوں گا۔''

''ہم ایک ڈیل کر سکتے ہیں......؟'' ماریہ نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''کیسی ڈیل......؟'' اس نے پوچھا۔

''مجھے چھوڑ دو۔ میرے پاس کچھ زیور ہے وہ تم لے لو۔'' ماریہ نے اپنی جان بچانے کے لیے اسے پیشکش کی۔

''میں کسی طرح کی کوئی ڈیل نہیں کروں اور بہتر ہے کہ تم میرے ساتھ ایسی بات مت کرو۔'' اس نے سختی سے اس کی پیشکش کو مسترد کر دیا۔

''اب تم اپنی بکواس بند کرو اور منہ دوسری طرف کر کے ہاتھ پیچھے باندھ لو۔'' اس کا لہجہ درشت ہو گیا تھا۔

ماریہ دوسری طرف گھوم گئی اور اس نے اپنے ہاتھ پیچھے کی طرف باندھ لیے۔ وہ آدمی اس کی طرف بڑھا اور اس نے اپنی پینٹ کی جیب سے نائلون کی رسی نکالی اور ابھی اس نے اس کا ہاتھ پکڑا ہی تھا کہ ماریہ گھومی اور پوری قوت سے اپنا مکا اس کے چہرے پر اس جگہ مار دیا جہاں پہلے ہی

گلدان لگنے سے زخم ہو چکا تھا۔
زخم کے اوپر چوٹ لگنے سے وہ شخص شدید تکلیف میں چلایا اور اس تکلیف میں اس کے ہاتھ میں پکڑا۔۔ پستول چل گیا اور گولی سیدھی ماریہ کے پیٹ پر جا لگی۔
اس شخص کو احساس بھی نہیں ہو سکا تھا کہ اس کے پستول سے گولی نکل کر ماریہ کو زخمی کر چکی ہے اور وہ فرش پر گر گئی ہے۔
وہ شخص شدت تکلیف سے نیچے بیٹھ گیا تھا۔ زخم سے خون رسنے لگا تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کی ہوئی تھیں۔ وہ بھول چکا تھا کہ اس کے ساتھ اس فلیٹ میں ماریہ بھی ہے۔
جب اس کی تکلیف کم ہوئی اور اس شخص نے آنکھیں کھولیں تو اسے دھندلا سا دکھائی دیا۔ اس نے اپنا سر جھٹکا اور دیکھا کہ ماریہ اس کے سامنے فرش پر پڑی تھی اور اس کے پیٹ سے خون نکل کر ارد گرد فرش پر پھیل چکا تھا۔
وہ شخص جلدی سے ماریہ کی طرف بڑھا۔ اس نے ماریہ کو چھوا اور اس کی نبض دیکھی...... ماریہ مر چکی تھی۔
وہ شخص پیچھے ہٹ گیا اور دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ اس کا زخم تکلیف سے تپ رہا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور اپنے موبائل فون سے کال کرنے لگا۔

☆☆☆

ماریہ کا دو لوگ شدت سے انتظار کر رہے تھے۔ ایک عینی تھی جو اس تاک میں تھی کہ ماریہ اس کے پاس آئے اور وہ اسے پولیس کے حوالے کر دے۔ اس نے سب سوچ لیا تھا کہ وہ پولیس کو کیا بیان دے گی۔
دوسرا شخص مدثر تھا جس کو انسپکٹر نادر نے کہا تھا کہ ماریہ اگر آ جائے تو وہ اسے گرفتار کر کے قتل کا سارا ملبا اس پر ڈال دے گا۔
دونوں ہی اس کے انتظار میں تھے اور ماریہ دونوں کے پاس نہیں آئی۔ انسپکٹر نادر کے موبائل فون پر اس شخص کی کال آئی اور اس نے بتایا کہ ماریہ اس کے ہاتھوں ماری گئی ہے۔ اس کے بعد اس نے ساری تفصیل بتائی جس کو سن کر انسپکٹر نادر کا غصہ دو چند ہو گیا تھا۔
انسپکٹر نادر سوچ رہا تھا کہ اب وہ کیا کرے۔ اسی اثنا میں عینی کی کال اس کے موبائل فون پر آ گئی۔
عینی نے انتظار کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ انسپکٹر نادر کو ماریہ کی کال اور اس کے آنے کے بارے میں آگاہ کر دے تاکہ انسپکٹر نادر کو یقین ہو جائے کہ ماریہ ہی کمال کی قاتل ہے۔
"میں عینی بول رہی ہوں اور مجھے تقریباً ایک گھنٹا پہلے ماریہ کی کال آئی تھی۔ اس نے مجھے دھمکیاں دیں اور اب وہ یہاں آ رہی ہے۔ وہ مجھ سے پانچ کروڑ روپے مانگ رہی ہے۔"
"ماریہ نے کال کی تھی......؟"
"جی ہاں...... میرے موبائل فون پر اس کی کال کا ریکارڈ موجود ہے۔ میں خوفزدہ ہوں اور چاہتی ہوں کہ آپ کسی لیڈی اہلکار کو بھیج دیں تاکہ میری حفاظت ہو سکے۔" عینی بولی۔
"اب آپ اطمینان سے بیٹھ جائیں میم...... کیونکہ مجھے ابھی میرے اہلکار نے اطلاع دی ہے کہ ماریہ مزاحمت کے دوران اس کی گولی کا نشانہ بن کر موت کے منہ میں چلی گئی ہے۔" انسپکٹر نادر نے انکشاف کیا۔
"کیا......؟ کیا یہ سچ ہے......؟" عینی چونکی۔
"یہ بالکل سچ ہے...... اور مجھے لگ رہا ہے ماریہ کے مرنے کے ساتھ ہی یہ فائل بند ہو جائے گی...... کمال صاحب کا قاتل اپنے انجام کو پہنچ گیا ہے۔" انسپکٹر نادر نے کہنے کے بعد سکون کی سانس لی۔
"کیا یہ ثابت ہو گیا کہ ماریہ ہی کمال کی قاتل تھی......؟" عینی کے سوال نے انسپکٹر نادر کے تن بدن میں جیسے خار بھر دیے ہوں۔ وہ جس کیس کو ختم کرنا چاہتا تھا وہ کسی ایک نکتے کی وجہ سے پھر زندہ ہو جاتا تھا۔
"کچھ شواہد ملے ہیں، میں اس کی تفصیل آپ کو پھر بتاؤں گا۔ مجھے کچھ پریس تیار کرنا ہیں۔"
انسپکٹر نادر نے فون کال منقطع کر دی۔ عینی کال کرنے کے بعد ریلیکس ہو گئی...... ماریہ بھی اپنے انجام کو پہنچ گئی تھی۔ یہ بات عینی جانتی تھی کہ ماریہ نے کمال کو قتل نہیں کیا تھا...... کمال کو مدثر نے کسی کے ذریعے قتل کروایا تھا۔ اسی نے عینی کو بتایا تھا کہ جس شخص نے کمال صاحب سے ملاقات کی تھی اس کا نام مدثر تھا اور اسی کا نام پتا ڈائری میں لکھا تھا۔
عینی اس بات کو ماننے کے لیے بالکل تیار نہیں تھی کہ کمال کو قتل کرنے والا مدثر تھا...... مدثر اسے قتل کرنے گیا تھا اور اتنا بے وقوف تھا کہ وہ اپنا پورا نام پتا لکھواتا اور اس کے بعد وہ کمال کو قتل کرتا؟ مدثر اور عینی کی ایک ملاقات الگ بھی ہوئی تھی جس میں ماریہ شامل نہیں تھی۔ تب عینی نے مدثر سے کہا تھا۔ اس نے غصے اور جذبات میں آ کر یہ بات کہہ دی تھی کہ وہ کمال کو قتل کروا دینا چاہتی ہے۔ وہ اس سے نجات چاہتی ہے لیکن اس کے پاس کوئی راستہ نہیں ہے۔ تب مدثر نے کہا تھا وہ تھوڑا انتظار کرے وہ ایسا پلان دے گا جس سے کمال اسے خود آزاد کر دے گا۔ عینی نے صاف الفاظ میں

مدثر سے یہ بھی کہا تھا وہ اس سے شادی کا خیال دل سے نکال دے۔ تب مدثر نے بتایا تھا وہ ماریہ سے شادی کرنا چاہتا ہے اور دونوں نے طے کیا تھا وہ فی الحال کمال کے بارے میں ماریہ سے کوئی بات نہیں کریں گے۔

عینی کے سامنے سب کچھ تھا۔ وہ نظامی سے ایک ایک پل کی خبر بھی لے رہی تھی اور یہ بھی سوچ رہی تھی کہ آخر کمال کو قتل کس نے کیا تھا؟

☆☆☆

افسران بالا کی میٹنگ میں انسپکٹر نادر پھنس گیا تھا۔ ہر طرف سے اس پر سوالوں کی بوچھاڑ ہو رہی تھی۔ بار بار ایک بات کی جا رہی تھی کہ کمال کا قاتل ابھی تک گرفتار کیوں نہیں ہوا؟ اس میٹنگ میں انسپکٹر نادر نے یہ بات سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ مدثر نامی شخص، کمال کا قاتل نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ قتل کرنے سے قبل اپنا پورا نام پتا نہ لکھواتا...... جب انسپکٹر نادر سے کہا گیا ایسا بھی ممکن ہے دونوں کے بیچ کسی بات پر تکرار ہوئی ہو اور تب مدثر نے کمال کو باندھ کر قتل کر دیا ہو۔ غصہ اور جنون میں دیکھتا کب ہے آگے کیا ہوگا۔

انسپکٹر نادر نے قتل ماریہ کے سر بھی ڈالنا چاہا تھا لیکن اس کی کوئی وکیل طاقتور نہیں تھی اور یہی فیصلہ ہوا تھا کہ اگر اگلے بارہ گھنٹوں میں کمال کا قاتل گرفتار نہ ہوا تو اسے اپنی نوکری سے ہاتھ دھونے پڑ جائیں گے۔

انسپکٹر نادر اپنے دوست مدثر کو بچا رہا تھا۔ جب ایسا دوٹوک فیصلہ اسے سنا دیا گیا تو وہ سیدھا مدثر کے پاس گیا اور اس کے سامنے ایک سفید کاغذ رکھ دیا۔ سفید کاغذ کو دیکھ کر مدثر نے پوچھا۔

"یہ کیا ہے......؟"

"میں نے سارا ملبا ماریہ کے سر پر ڈال دیا ہے اور یہ کیس ختم ہو گیا ہے۔ یہاں تمہارا بیان چاہیے کہ تم وہاں نہیں گئے تھے۔" انسپکٹر نادر نے کہا۔

"اس پر تو کچھ بھی نہیں لکھا۔"

"کیا تم کو مجھ پر بھروسا نہیں ہے؟ میں اپنے دوست کو بچانے کی کوشش کر رہا ہوں اور وہ مجھ پر بھروسا ہی نہیں کر رہا ہے۔" انسپکٹر نادر نے کاغذ اس کے ہاتھ سے کھینچا اور کہتا ہوا جانے کے لیے دروازے کی طرف بڑھا۔

"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" مدثر جلدی سے بولا۔

"تمہارا جو بھی مطلب تھا مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے، میں جا رہا ہوں۔" انسپکٹر نادر ناراض ہو گیا تھا۔ وہ آگے بڑھا اور اس نے کاغذ لے کر دستخط بھی کر دیے اور اپنے انگوٹھے کا نشان لگا کر اس کی طرف کاغذ بڑھا کر کہا۔

"تم تو ایسے ہی ناراض ہو رہے ہو۔"

انسپکٹر نادر نے کاغذ پکڑ کر دیکھا اور اسے اپنے اہلکار کو دے کر مدثر کے گلے ملا اور کہا۔ "ایک بات بتاؤ...... جب کوئی ایسی جگہ کھڑا ہو جائے جہاں اسے نوکری یا دوست کا انتخاب کرنا پڑے تو پھر وہ کس کا انتخاب کرے گا......؟"

مدثر اس کا سوال سن کر حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ "تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" مدثر نے دھیرے سے پوچھا۔

"میں وہی کہنا چاہتا ہوں جو تم سمجھ گئے ہو۔ میرے پاس اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے کہ میں اپنی نوکری بچاؤں۔ کیونکہ ابھی مجھے ملازمت میں رہ کر بہت کچھ کرنا ہے۔ میرا فارم ہاؤس ابھی زیر تعمیر ہے اور اس کے علاوہ بھی میں نے کئی پنگے لیے ہوئے ہیں۔" انسپکٹر نادر کے لہجے میں تغیر آ گیا تھا۔

"تم نے میری ہی قربانی دے دی۔" مدثر نے انسپکٹر نادر کا گریبان پکڑنا چاہا لیکن وہ پھرتی سے پیچھے ہٹ گیا اور اس کے اہلکاروں نے مدثر کو دبوچ لیا۔ وہ مزاحمت کرتا رہا لیکن سب بے سود گیا۔

مدثر نے انسپکٹر نادر کے ساتھ مل کر کئی بے گناہ لوگوں سے ان کی مجبوریوں کا فائدہ اٹھاتے ہوئے پیسا لیا تھا اور کئی گناہ گاروں کو پیسا لے کر آزاد کروایا تھا شاید وہ ان میں سے کسی کی آہ کا شکار ہو گیا تھا۔ ورنہ کمال کا قتل تو اس نے بھی نہیں کیا تھا۔

☆☆☆

وقت نے سب کچھ تبدیل کر دیا تھا۔ ایک بار پھر زندگی معمول پر آ گئی تھی۔ عینی گھر بیٹھ کر کاروبار دیکھ رہی تھی اور اپنی عدت کے بعد وہ باقاعدہ آفس جا کر کام کرنے کی منصوبہ بندی کر چکی تھی۔ نظامی ہر کام کی اچھی طرح سے دیکھ بھال کر رہا تھا۔

عینی کے کہنے پر رابی کو واپس کام پر بلا لیا تھا اور اس نے اپنے شہر جاتے ہی اپنے اسی کزن سے شادی کر لی تھی جو اس کے انتظار میں اس کا راستہ تک رہا تھا اور رابی اسے بھی شہر لے آئی تھی اور دونوں ہی کمال اینڈ کمپنی میں جاب کرنے لگے تھے۔

ایک دن رابی اپنے شوہر کے ساتھ اسپتال میں گئی۔ اسے اپنا چیک اپ کرانا تھا۔ جب وہ لیڈی ڈاکٹر سے چیک اپ کرانے کے بعد ہال میں بیٹھی تھی اور اس کا شوہر ادویات لینے گیا تھا تو اچانک رابی کی نظر وہیل چیئر پر بیٹھے

تیمور پر پڑی۔

وہ چونکی اور اس کی طرف بھاگی۔ تیمور کے سر پر کئی پٹیاں بندھی ہوئی تھیں اور وہ بے حال سا بیٹھا تھا۔ رابی نے اس کے قریب جا کر حیرت سے مخاطب کیا۔

"تیمور..... تم یہاں....." اپنا نام سن کر تیمور نے اس کی طرف دیکھا اور اس کی نگاہیں رابی کے چہرے پر ٹھہر گئیں اور اس کی آنکھیں جیسے بھیگ گئی ہوں۔

اسی وقت اسپتال کا ملازم آیا اور اس نے وہیل چیئر پیچھے سے پکڑتے ہوئے رابی سے پوچھا۔ "آپ انہیں جانتی ہیں؟"

"اس کے ساتھ یہ کیا ہوا ہے.....؟" رابی نے پوچھا۔

"چند ہفتے پہلے اسے کوئی اسپتال میں لے کر آیا تھا۔ یہ سڑک کراس کرتے ہوئے گاڑی سے ٹکرا گیا تھا۔ سر پر شدید چوٹ لگی تھی اور یہ کومے میں چلا گیا تھا۔ اس کے سر کا آپریشن ہوا اور اب یہ ہوش میں آچکا ہے لیکن اسے ٹھیک ہونے میں کچھ وقت لگے گا۔ اس کا کوئی وارث نہیں تھا اور اب اس کا علاج ایک فلاحی ادارہ کرا رہا ہے..... آپ جانتی ہیں اسے.....؟" اس نے بتانے کے بعد پھر پوچھا۔

رابی چپ ہی تھی کہ ایک اور ملازم آگیا اور دونوں آپس میں باتیں کرنے لگے اور باتیں کرتے ہوئے وہ ایک طرف چلے گئے۔ تیمور نے اشارے سے رابی کو اپنے قریب بلایا۔

رابی اس کی طرف جھک گئی۔ "جب میں آفس سے نکلا تو سڑک کراس کرتے ہی مجھے کسی چیز نے ٹکر ماری اور میں بے ہوش ہو گیا..... جانے کتنے دنوں کے بعد مجھے ہوش آیا..... اس کی تجوری سے صرف ایک لاکھ ملا تھا..... وہ بھی جانے اب کہاں ہے....." تیمور نے ٹھہر ٹھہر کر اپنی بات مکمل کی۔

"تم نے ایک لاکھ روپے ملنے کی وجہ سے کمال کو قتل کر دیا تھا.....؟" رابی نے سرگوشی کی تو تیمور کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔

"کمال کا قتل ہو گیا تھا..... لیکن میں نے تو اسے صرف باندھا تھا..... قتل نہیں کیا تھا....." تیمور سے زیادہ حیرت رابی کو اس کا جواب سن کر ہوئی تھی۔ اس کے ٹوٹے پھوٹے لہجے میں سچائی نظر آ رہی تھی۔

اسی وقت وہ ملازم آگیا اور رابی پیچھے ہٹ گئی اور اپنی سیٹ کی طرف چلی گئی۔ ملازم اس کی کرسی دھکیل کر لے جا رہا تھا اور تیمور رابی کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔

رابی نے پلٹ کر دیکھا تو تیمور کی آنکھوں میں اسے بے بسی اور آنسو دکھائی دیے۔ ملازم اسے دوسری طرف لے گیا اور رابی افسردہ کھڑی سوچ رہی تھی تیمور نے بھی کمال کو قتل نہیں کیا تھا تو پھر کمال کا قاتل کون تھا؟

☆☆☆

کمال کا قاتل اس لڑکی کا باپ تھا جس کو کمال نے ایک نظر دیکھا تو وہ اس کی خوبصورتی اور حسن کا اسیر ہو گیا تھا۔ وہ اس کا ایسا دیوانہ ہوا کہ اس نے اس لڑکی سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ کمال نے لڑکی کے باپ کو اپنے پاس بلایا اور اپنے دل کی بات اس سے کرنے کے بعد دھمکی دی کہ اگر اس نے اپنی بیٹی کی شادی اس سے نہ کی تو وہ اسے اغوا کرا لے گا۔ وہ اسے سنگین دھمکیاں بھی دے رہا تھا۔

لڑکی کا باپ شریف آدمی تھا اور وہ خوفزدہ ہو گیا۔ کمال سے لڑنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ اتنا پریشان ہوا کہ دن رات سوچ میں پڑ گیا۔ اس کی بیٹی کی منگنی ہو چکی تھی اور اس کی عمر بھی کمال کی عمر سے آدھی تھی۔ وہ دولت مند تھا لیکن اس کا باپ اپنی بیٹی کی شادی اس سے بالکل نہیں کرنا چاہتا تھا۔

کمال نے ایک دن پہلے لڑکی کے باپ کو سخت الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ کل دوپہر کو اس کی بیٹی کا نکاح اس کے ساتھ ہوگا۔ انکار کی صورت میں وہ لڑکی کو اغوا کرا لے گا۔ لڑکی کے باپ نے وہ باتیں کسی سے نہیں کی تھیں..... یہاں تک کہ اپنی بیوی سے بھی نہیں۔

اس دن جب کمال کی میٹنگ تیمور سے ہونے والی تھی تو اس نے لڑکی کے باپ کو فون کر کے کہا تھا میری اس میٹنگ کے بعد تیار رہنا میں نکاح کے لیے آ رہا ہوں۔ لڑکی کے باپ کے پاس ایک ہی چارہ تھا کہ وہ کمال کو جان سے مار کر خود جیل چلا جائے یہ لازم تھا اس کی پھول جیسی بیٹی اس بھیڑیے سے تو محفوظ رہے گی۔ اس نے دو دن قبل ایک چھوٹا لیکن انتہائی تیز دھار کا چاقو خرید کر اپنی جیب میں رکھا تھا۔

جب تیمور نے کمال کو کرسی کے ساتھ باندھ دیا تھا اور پیسے لے کر نکلا تھا تو لڑکی کا باپ اندر گیا تھا۔ اس نے دیکھا کمال بندھا ہوا ہے۔ یہ اس کے لیے اچھا موقع تھا۔ اس نے تیز دھار چاقو کی نوک اس کی شہ رگ پر پھیر دی اور کمال کی گردن سے خون کا فوارہ چھوٹ گیا۔ اس نے بڑی احتیاط سے اپنے آپ کو بچایا اور کمال کے قتل کا شور برپا ہو گیا۔

اب یہ راز ہی تھا کہ اپنی بیٹی کے لیے نظامی نے کمال کو قتل کیا تھا۔ نظامی نے اس دوران انتہائی پُراعتماد رہ کر سارے معاملات کو سنبھالا تھا اور اب جبکہ سب کچھ معمول پر آچکا تھا تو نظامی بھی اس واقعے کو برے خواب کی طرح بھول چکا تھا۔

×××